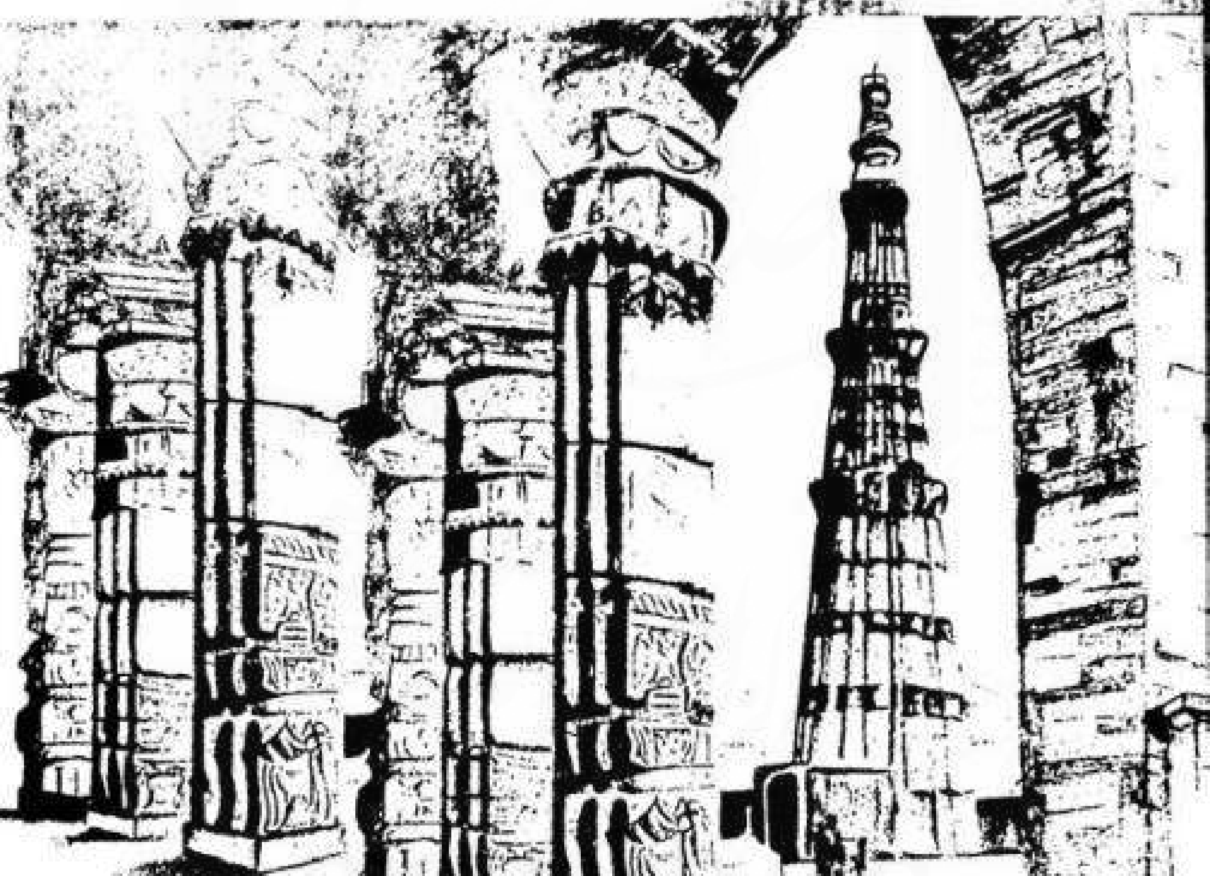
ایک شہر کی تاریخ اور ایک طوائف کی کہانی۔ زمانہ دونوں سے کھیلتا رہا۔

دلّی



خوشونت سنگھ

ایک شہر کی تاریخ، ایک طوائف کی کہانی، زمانہ دونوں سے کھیلتا رہا

دِلّی

خوش ونت سنگھ

ترجمہ: محمد احسن بٹ

نگارشات

A translation of

"DEHLI"

Written by:

Khushwant Singh

Translated by:

Muhammad Ahsan Butt

Published by:

Asif Javed

نامِ کتاب: دِلّی

مصنف: خوشونت سنگھ

ترجمہ: محمد احسن بٹ

ناشر: آصف جاوید (0321-9414442)

برائے: نگارشات پبلشرز، میاں چیمبر 3۔ ٹمپل روڈ، لاہور

فون: 0092-42-36303438

Facebook nigarshatpublishers-E-mail nigarshat@yahoo.com

مطبع: حاجی منیر پرنٹرز، لاہور

سالِ اشاعت: 2019ء

قیمت: -/1000 روپے

فہرست

❁❁❁

عرضِ مصنف

میں نے اس ناول میں دِلّی کی داستان، شروع سے موجودہ زمانے تک لکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اسے دلی کا آنکھوں دیکھا احوال لکھنے والوں کی بیاضوں کی مدد سے لکھا ہے۔ لہٰذا ناول کا بیشتر حصہ صیغہ واحد میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ نے مجھے ڈھانچہ مہیا کیا تھا۔ جسے میں نے گوشت سے ڈھانپا اور اس کی رگوں میں خون دوڑایا۔ مجھے اسے مکمل کرنے میں 25 برس لگے ہیں، تاہم مجھے یقین نہیں کہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔

اس ناول کے ایک ابتدائی خاکے کے چند باب نیویارک کے ''ایورگرین ریویو'' اور ''دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں شائع ہو چکے ہیں۔

خوش ونت سنگھ

نئی دلی

15 ستمبر 1989ء

دِلّی

میں دلی کی طرف ویسے ہی لوٹتا ہوں، جیسے غیر ممالک میں طوائف بازی سے جی بھر جانے کے بعد اپنی معشوقہ بھاگ متی کی طرف لوٹتا ہوں۔ دلی اور بھاگ متی کی بہت سی خصوصیات ایک جیسی ہیں۔ طویل عرصے تک بے ہودہ لوگوں کی بدسلوکی کا نشانہ بنے رہنے سے انھوں نے اپنے مسحور کن حسن کو کراہت انگیز بدصورتی کے پردے میں چھپانا سیکھ لیا ہے۔ وہ صرف اپنے چاہنے والوں پر ہی، کہ جن میں میں اپنے آپ کو شمار کرتی ہوں، اپنی حقیقی ذات عیاں کرتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ دِلّی کسی اجنبی کو شور سے بھرے بازاروں اور جھونپڑوں میں گھرے ٹوٹے پھوٹے قلعوں اور ایک مردہ دریا کے ساتھ ساتھ تعمیر کی گئیں مسجدوں کا ایک بے ہنگم پھیلاؤ دکھائی دے۔ اگر وہ اس کی تنگ، بل کھاتی ہوئی گلیوں سے گزرے تو ممکن ہے غلاظت کی بدبو سے اُسے قے آجائے۔ دلی کے باسی دوسروں کی نگاہ میں اچھا بننے کی بہت کم کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہر جگہ بلغم اور پان کی پیک تھوکتے ہیں؛ جب بھی اور جہاں بھی حاجت محسوس ہو، وہ اسی وقت اور وہیں پیشاب کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں اور اپنے اعضائے نہانی کو گفتگو

کے دوران کھجاتے رہتے ہیں۔

بھاگ متی بھی ایسی ہی ہے۔ جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ اسے غیر دلکش پاتے ہیں۔ اس کا رنگ سیاہ ہے اور اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ وہ ناٹی اور موٹی ہے۔ اس کے دانت ٹیڑھے میڑھے ہیں، جو تمبا کو چبانے اور بیڑیاں پینے کی وجہ سے پیلے پڑ چکے ہیں۔ وہ بھڑ کیلے لباس پہنتی ہے، اونچی آواز میں بولتی ہے، اس کی باتیں بے ہودہ اور اطوار ناشائستہ ہیں۔

تاہم جیسا کہ میں کہتا ہوں، ایسا صرف اوپر سے ہے...... ویسے ہی جیسے لوگ مچھروں، پسوؤں اور دوسرے خون چوسنے والے کیڑوں کو دور رکھنے کے لئے بدبودار تیل مل لیتے ہیں۔ اگر آپ چیزوں کو مختلف دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر دلی سے محبت کیجئے اور بھاگ متی جیسی کسی عورت کے ساتھ تعلق قائم کیجئے۔ تب دلی کے سنگ مرمر کے محلات کے اوپر آسمان کا رنگ نیلا ہو جائے گا، اس کی مسجدوں کے گنبدوں اور پنسل جیسے میناروں کے درمیان قوسِ قزح رونما ہو جائے گی، زمین سے خس، یاسمین اور مولسری کی خوشبوئیں اٹھنے لگیں گی۔ تب کسی مندر کی رقاصہ کے مانند اپنے بڑے بڑے کولھے مٹکاتی کالی بھاگ متی آپ کو چمکتی دمکتی دکھائی دے گی۔ اس کے منہ سے تازہ لونگوں کی مہک امنڈے گی اور وہ ملکۂ ہندوستان کے سے شاہانہ لہجے میں بات کرے گی۔ جب اس کے ساتھ ہم بستری کی جائے تو وہ صرف تبھی ایک شہوت پرست طوائف کا سا رویہ اپناتی ہے، جیسا کہ ہر عورت کو اپنانا چاہئے۔ یہ ایک سادا سا فارمولہ ہے، اپنا سر نہیں بلکہ دل استعمال کرو، عقل نہیں جذبات سے کام لو۔ میں دلی اور بھاگ متی کو پر اسرار سا بنا رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے خیالات تھوڑے سے الجھے ہوئے ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دلی میں رہنا پسند نہ کرنے اور بھاگ متی کے ساتھ اپنے تعلق پر شرمندہ ہونے کے باوجود میں ان میں سے کسی سے بھی زیادہ عرصے دور نہیں رہ پاتا۔ میں آئندہ صفحات میں اس شہر اور اس عورت کے ساتھ اپنے زندگی بھر کے محبت و نفرت

(Love-Hate) والے تعلق کے انوکھے تضاد کو بیان کروں گا۔ ہو سکتا ہے یہ ناول Fucking Man's Guide To Delhi: Past And Present لگے، تاہم میں نہیں چاہتا کہ ایسا محسوس ہو۔

☆☆☆

جہاز ایک گھنٹے کی تاخیر سے نو بجے پالم ائیرپورٹ پر اُترتا ہے۔ سپیکر سسٹم پر ایک آواز ہمیں نشستوں پر بیٹھے رہنے کا حکم دیتی ہے۔ میں اپنے قریب سے گزرتی ایک ائیر ہوسٹس سے پوچھتا ہوں: ''کیوں؟''

وہ میرے کان میں سرگوشی کرتی ہے: ''صحت!'' انسان جن بیماریوں کو جانتا ہے، اُن میں سے بیشتر کی ماں یعنی ہندوستان اپنی فہرست میں مزید بیماریوں کا اضافہ نہیں چاہتا۔ ہم روشنی میں نہائے ہوئے سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور بغیر آواز پیدا کیے اخبار کے صفحے الٹتے پلٹتے بیٹھے رہتے ہیں۔

کوئی شخص جہاز پر زور سے ہاتھ مارتا ہے، تھپ، تھپ۔ سٹیورڈ دروازہ کھول دیتا ہے۔ دو آدمی سفید طبی جھنڈے اور گرم ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اندر آتے ہیں۔ وہ مسافروں میں مطبوعہ فارم بانٹتے ہیں۔ ہم فارم پُر کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں: آپ نے پچھلے دس دن کہاں گزارے؟ نو دن؟ کل؟ ایک شخص اپنی جیب سے ایک بوتل نکالتا ہے اور ہم پر سپرے کر دیتا ہے۔ ہسپتال کی سی مہک پھیل جاتی ہے۔ اب ہم جہاز سے اتر سکتے ہیں۔

ہم قطار بنا کر باہر آتے ہیں۔ باہر ایک بہت لمبی خاکستری رولز رائس کھڑی ہوئی ہے، جس کی نمبر پلیٹ پر صدر کا تین شیروں کے چہروں والا نشان بنا ہوتا ہے۔ کار کے پاس صدر کا اے ڈی سی اور ڈھیر سارے پھول اٹھائے ہوئے ایک اردلی کھڑا ہوتا ہے۔ ان کے پیچھے آدھا درجن کے قریب فوٹو گرافر اپنے کیمرے آنکھوں سے لگائے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک سفید فام عورت ایک بازو پر فرکوٹ لٹکائے اور دوسرے ہاتھ میں ایک

ہیٹ باکس تھامے جہاز کی سیڑھیاں اُترتی ہے۔ فلیش بلب چمکنے لگتے ہیں۔ اے ڈی سی اپنی ایڑھیاں بجا کر سلیوٹ کرتا ہے۔ وہ سفید فام عورت کا کوٹ اور ہیٹ باکس لے کر انہیں اردلی کو دے دیتا ہے۔ وہ عورت کو ہار پہناتا ہے، گلدستے پیش کرتا ہے اور ایک بار پھر سلیوٹ کرتا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ وہ رولز رائس میں بیٹھ جاتے ہیں اور رولز رائس اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔

وہ کون ہے؟

ہمیں اکٹھا کیا جاتا ہے اور ہدایت دی جاتی ہے کہ ائیر انڈیا کے ایک اہل کار کے پیچھے پیچھے آئیں۔ ہم ائیر پورٹ کی تیز روشنیوں اور ڈھیر سارے پروانوں سے آنکھیں بچانے کے لیے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ ہم چوہوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں جس پر "انٹرنیشنل" لکھا ہوتا ہے۔ پنڈت نہرو کا ایک بہت بڑا پوسٹر ہمیں ہندوستان میں خوش آمدید کہتا ہے۔

ایک پولیس سارجنٹ ہمارے ہیلتھ فارموں کا جائزہ لے کر اپنی میز پر رکھی "آؤٹ" باسکٹ میں ڈال دیتا ہے۔ ایک سب انسپکٹر ہمارے پاسپورٹوں کا جائزہ لے کر مہریں لگاتا ہے اور ہمیں واپس دے دیتا ہے۔ ایک کسٹم افسر ہمیں بھرنے کے لئے ڈھیر سارے فارم دیتا ہے۔ بیرون ملک خریداری کے لئے تین فارم۔ ہمیں فارم پر کرنے میں آدھا گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ کسٹم افسر ہم پر نگاہ رکھتا ہے کہ کہیں ہم کوئی چیز چھپا تو نہیں رہے۔ ہم تو اکتائے ہوئے دکھائی دے رہے ہوتے ہیں اور ہمارے تاثرات سے کچھ پتا نہیں چلتا۔

چالیس منٹ بعد کسٹمز شیڈ میں ٹرالیاں کھڑکھڑاتی ہیں۔ قلی سوٹ کیس اتار کر فرش پر رکھتے ہیں۔ میں اپنے سوٹ کیس کو ڈھونڈ کر ایک کسٹم انسپکٹر سے بات کرتا ہوں۔ میں نے نہ تو کچھ خریدا ہوتا ہے اور نہ ہی میرے پاس غیر ملکی کرنسی ہوتی ہے۔ اسے میری بات پر یقین نہیں آتا۔ وہ میرے ڈیکلریشن فارمز اور پاسپورٹ کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ

میرے سوٹ کیس کو کھولتا ہے اور میرے کپڑوں کو ٹٹولتے ہوئے سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔

''کوئی وسکی شسکی؟''

''نہیں۔''

''کوئی ٹیپ ریکارڈر؟''

''نہیں۔''

''ٹرانزسٹر، شرانزسٹر؟''

''نہیں۔''

''کیمرا شیمرا؟''

''نہیں۔''

''گھڑی شڑی؟''

''نہیں۔''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کلائی پر بندھی نئی چمکتی ہوئی گھڑی کا جائزہ لیتا ہے۔ میں نے یہ گھڑی بیروت ایئر پورٹ پر ڈیوٹی فری شاپ سے پینتیس پونڈ میں خریدی تھی۔

میں اپنی ہپ پاکٹ میں رکھی، اپنے باورچی کے لیے خریدی ہوئی گھڑی کی رسید نکالتا ہوں اور اس کی قیمت بتاتا ہوں: ''سات پونڈ۔''

وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا ہے۔ وہ میرے سوٹ کیس پر اس طرح چاک سے نشان لگاتا ہے جیسے گندی گالی لکھ رہا ہو۔ یہ کسٹم والے بڑے حرامزادے ہوتے ہیں۔

ایک قلی میرا سوٹ کیس اٹھالیتا ہے، ہم غل غپاڑہ مچانے والے ٹیکسی ڈرائیوروں کی بھیڑ سے گزر کر ایک ٹیکسی حاصل کرتے ہیں۔ قلی میرا سوٹ کیس ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر رکھتا ہے اور کہتا ہے: ''او کے سر، سلام!'' ایئر پورٹ کے قوانین کے مطابق قلیوں کو بخشش نہیں دینی چاہیے، وہ مجھ سے پانچ روپے لیتا ہے۔

سکھ ٹیکسی ڈرائیور کا ایک سکھ دوست ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم بیس منٹ میں اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک دیا سلائی جلا کر میٹر پڑھتا ہے۔ ''ساڑھے اٹھارہ روپے اور سامان کے دو روپے پچیس پیسے''۔

''ساڑھے اٹھارہ؟'' میں اپنی آواز میں زیادہ سے زیادہ بے یقینی بھر کر کہتا ہے۔ میں نے چند ہفتے پہلے پالم ایئرپورٹ سے آتے ہوئے جتنا کرایہ دیا تھا، یہ اس سے دگنا ہوتا ہے۔

''ساڑھے اٹھارہ،'' ٹیکسی ڈرائیور دہراتا ہے۔ اس کا دوست ایک اور دیا سلائی جلا کر پڑھتا ہے: ''ساڑھے اٹھارہ بنتے ہیں، میٹر دیکھ لیں۔''

کوئی سکھ ایک سکھ کے ساتھ تو بحث کر سکتا ہے لیکن اسے دو سکھوں سے کبھی بحث نہیں کرنی چاہئے........ اندھیرا چھا جانے کے بعد تو بالکل نہیں۔ میں ساڑھے پچیس روپے کے علاوہ دو روپے بخشش کے طور پر ادا کرتا ہوں۔

ہمارے اپارٹمنٹس کے بلاک کا چوکیدار بھی سکھ ہے۔ جب میں دلی سے باہر جاتا ہوں تو اپنے فلیٹ کی چابی اسے دے جاتا ہوں۔ وہ ایک دیانت دار انسان ہے لیکن پگڑی تلے دماغ نامی کوئی شے نہیں رکھتا۔ اسے فوج سے اس کی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ محض ٹرک ڈرائیور تھا، لیکن اس نے کبھی فراموش نہیں کیا کہ وہ کبھی فوجی یونیفارم پہنا کرتا تھا۔ وہ اپنی چارپائی سے چھلانگ لگا کر اترتا ہے اور اپنے آپ کو حکم دیتا ہے: ''سلیوٹ!'' وہ مجھے اس طرح سلیوٹ کرتا ہے جیسے میں اس کی رجمنٹ کا کرنل ہوں۔ ''برطانیہ کے شہنشاہِ معظم کا کیا حال ہے؟'' وہ مجھ سے انگریزی میں پوچھتا ہے۔

''اب برطانیہ کی حکمران ملکہ ہے۔''

وہ میری بات کو اہمیت نہیں دیتا۔ ''ویری ویل سر۔ کیا آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

''بدھ سنگھ، تمہارا یہ حال کب سے ہے؟'' میں بہت نرمی سے اس سے پوچھتا ہوں، بدھ (علم) سنگھ سال میں تین مرتبہ اس کیفیت سے گزرتا ہے اور بدھو (احمق) سنگھ بن جاتا ہے۔ بدھو سنگھ کے ساتھ آپ کو بڑی نرمی سے برتاؤ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں دہک اٹھتی ہیں: ''آپ کا خیال ہے میں پاگل ہوں؟'' وہ چیخ کر پوچھتا ہے۔ میں کچھ نہیں بولتا۔ وہ دروازے کا قفل کھولتا ہے، بتیاں جلاتا ہے اور مجھے اندر جانے کے لیے راستہ دیتا ہے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا میرا سوٹ کسی تاریک خواب گاہ میں لے جاتا ہے۔ وہ واپس آ کر اپارٹمنٹ کی چابی اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر اس طرح مجھے پیش کرتا ہے، جیسے کوئی شکست خوردہ جرنیل اپنی تلوار سے دستبردار ہوتا ہے۔ ''سر! یہ رہی آپ کی چابی اور یہ رہی آپ کی نوکری!''

''بدھ سنگھ! میں نے تو صرف اتنا پوچھا تھا کہ تمہارا یہ حال کب سے ہے؟'' میں چابی لیتے ہوئے کہتا ہوں۔

''ہاں، لیکن مجھے حقیقت کا علم ہے،'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ ''لوگ کہتے ہیں بدھ دوبارہ بدھو بن گیا ہے۔ صاحب غیر ملک سے آئے گا تو اسے ملازمت سے نکال دے گا۔ میں کہتا ہوں ہنوز دِلّی دوراست۔ آپ کو اس کا مطلب پتا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ دلی ابھی دور ہے۔''

''لیکن میں تو دِلّی میں ہوں،'' میں اسے یاد دلاتا ہوں۔

وہ مجھے گھور کر دیکھتا ہے۔ ''او کے! معافی چاہتا ہوں، سب بھلا دیجئے۔''

وہ مجھے بتاتا ہے کہ اپارٹمنٹ اور فرنیچر کی صفائی کی جاتی رہی ہے۔ ''آل او کے۔ کولڈ مشین او کے، ایئر کنڈیشنر او کے، آئیں، دیکھ لیں۔'' وہ آگے آگے چلتا ہے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے خواب گاہ میں جاتا ہوں اور سوئچ دباتا ہوں۔ کلک۔ کچھ نہیں ہوتا۔ کلک، کلاک، کلک، کلک۔ کچھ نہیں ہوتا۔

''معافی چاہتا ہوں، بلب فیوز ہو گئے ہیں۔'' بدھا سنگھ وضاحت کرتے ہوئے

بجاتا ہے۔ وہ دوسرا سوئچ دباتا ہے۔ تیز روشنی ہوتی ہے تو وہ ڈر جاتا ہے۔ وہ اچھلتا ہے اور کسی رقصاں درویش کی طرح گھومتا ہے۔

وہ اپنی پگڑی پر انگلی رکھ کر کہتا ہے: "بہار کے موسم میں یہاں کچھ ہو جاتا ہے۔ خفامت ہوئیے گا۔ سلیوٹ!"

"کوئی بات نہیں،" میں اسے تسلی دیتا ہوں۔ وہ میرے اتنا قریب آجاتا ہے کہ اس کی داڑھی میری داڑھی سے چھونے لگتی ہے۔ وہ سازشی لہجے میں سرگوشی کرتا ہے: "ایکسیوزمی! آپ کا ہیجڑا کئی مرتبہ آپ کی واپسی کا پوچھنے آیا تھا۔"

بدھا سنگھ میری معشوقہ کو پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ اسے پاگل سنگھ کہتی ہے۔ بدھ سنگھ اسے کبھی معافی نہیں دیتا۔ وہ اسے مونث کی بجائے مذکر کی حیثیت سے پکارتا ہے یا ہیجڑا کہتا ہے۔ بھاگ متی کی چھاتیاں چھوٹی ہیں اور آواز بھاری ہے۔

"ایکسکیوزمی" وہ میری ڈاڑھی کو چھوتے ہوئے کہتا ہے: "ہر شخص اس کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں، عورت ٹھیک ہے، لڑکا ٹھیک ہے........ لیکن ہیجڑا! یہ نہیں چلے گا۔ میری بات کو محسوس مت کیجئے گا!"

میں خاموش رہتا ہوں۔ بدھ سنگھ میری خاموشی کو میری خفگی تصور کرتا ہے۔ وہ اٹینشن کھڑا رہتا ہے۔ وہ کئی مرتبہ سیلوٹ کرتا ہے اور اپنے آپ کو حکم دیتا ہے: "دائیں مڑ!" وہ دائیں طرف مڑ جاتا ہے۔ "بائیں طرف تیز چل۔" پھر وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔

"ہاہ!"

میں اپنے اتار کر غسل خانے میں جاتا ہوں۔ ٹونٹی کھولتا ہوں تو جمی ہوئی گندی کیچڑ بالٹی میں گرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد گدلا پانی بہنے لگتا ہے۔ پھر ایک پاد۔ پانی بہنا بند ہو جاتا ہے۔ میں نہانا ترک کرتا ہوں۔

میں اپنی سٹڈی میں جاتا ہوں۔ فون اٹھا کر رات کی ڈیوٹی پر موجود نگران کا نمبر

ملاتا ہوں۔ فون پر دو لڑکیاں اپنے ڈیڈی جی اور انکل جی کے بارے میں باتیں کر رہی ہوتی ہیں۔ میں ریسیور رکھ دیتا ہوں اور اپنی توند پہ بیٹھے ہوئے مچھر کو تھپڑ مارتا ہوں اور دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔ سب کچھ پہلے جیسا ہوتا ہے، اس مرتبہ وہ اپنی ممی جی اور آنٹی جی کے حوالے سے باتیں کر رہی ہوتی ہیں۔ میں ریسیور رکھ دیتا ہوں، اپنی ناف سے میل نکالتا ہوں، اس کی غلیظ بو سونگھتا ہوں اور تیسری مرتبہ کوشش کرتا ہوں۔ وہ بنگالی مارکیٹ میں ملنے والی چاٹ کے تیز مصالحوں کا ذکر خوشی کے ساتھ کر رہی ہوتی ہیں: ''یم! یم!'' میرے صبر کا پیمانہ چھلک جاتا ہے۔ میں انھیں کہتا ہوں کہ آدھی رات ہونے والی ہے، انھیں وہی کرنا چاہیے جو ان کی ممی جی اور ڈیڈی جی کر رہے ہیں۔

''کوئی گندا شخص ہماری لائن پر ہے،'' ایک کہتی ہے۔ پھر بات کریں گے۔ ٹاٹا''

میں اپنا مطلوبہ نمبر ملاتا ہوں۔ وہ نمبر انگیج ملتا ہے۔ میں تین منٹ بعد دوبارہ نمبر ملاتا ہوں۔ وہ اب بھی انگیج ملتا ہے۔ میں ٹیلیفون کے محکمے کے شعبۂ امداد سے رجوع کرتا ہوں۔ آپریٹر کہتا ہے: ''یہ فون خراب ہے۔ شعبۂ شکایات سے رجوع کیجیے۔''

میں نگران سے رابطے کی کوشش ترک کر دیتا ہوں۔ میں اپنے جسم اور غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے خواب گاہ میں جا کر ایئر کنڈیشنر چلاتا ہوں۔ جلد ہی مجھے اونگھ آجاتی ہے۔ تاہم تھوڑی دیر بعد ایئر کنڈیشنر بند ہو جاتا ہے۔ خواب گاہ ''کلکتہ بلیک ہول'' جیسی بن جاتی ہے۔

بجلی چلی جاتی ہے۔ نہ روشنی ہے، نہ پنکھا چلتا ہے۔ میں باغ میں آکر بید کی کرسی پر ڈھیر ہو جاتا ہوں۔ موسم گرم اور مرطوب ہوتا ہے۔ تاریکی چھائی ہوتی ہے اور حبس ہوتا ہے۔ آسمان پر کچھ ستارے ہیں لیکن وہ بہت بہت دور ہوتے ہیں۔ مچھر بہت ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ میں غصے میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں ایئرپورٹ پر ہونے والی تاخیر، کسٹم انسپکٹروں کے رویے، ٹیکسی ڈرائیوروں کی دھوکا دہی، بجلی کمپنی، دلی کے ٹیلیفون اور واٹر سپلائی کے اداروں کی نااہلی کے بارے میں اخباروں کو خط بھیجوں

گا........پھر میں بھاگ متی کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں اس نے کتنی جسم فروشی کی ہوگی؟ وہ مجھے اپنے معرکوں کی روداد مزے لے لے کر سناتی ہے کیونکہ اسے پتا ہے کہ اس طرح اُس کے لئے میری خواہش بھڑک اٹھتی ہے۔ میں کئی گھنٹے تاریکی میں بیٹھا رہتا ہوں۔ مجھے غصہ آرہا ہوتا ہے۔ مجھ پر شہوت غالب ہوتی ہے۔ پھر غصہ کم ہو جاتا ہے اور شہوت بڑھ جاتی ہے۔ آسمان پر زرد، بوڑھا چاند آوارہ پھر رہا ہوتا ہے۔ میرے اپارٹمنٹ کے پیچھے واقع مندر میں روشنی ہو جاتی ہے۔ جب ضرورت نہیں ہے تو بجلی آگئی ہے۔ میں اٹھتا ہوں اور پاؤں گھسیٹتا ہوا نشست گاہ میں چلا جاتا ہوں۔

میں صبح کے سوا پانچ بجے ٹیبل لیمپ جلاتا ہوں اور کھڑکی کو پورا کھول دیتا ہوں۔ پردے لہرانے لگتے ہیں۔ دیوار کو ڈھانپنے والی مدھو مالتی کی خوشبو سے بھری ٹھنڈی ہوا گزرے ہوئے دن کی مردہ ہوا سے پیدا ہونے والی کوفت کو ختم کر دیتی ہے۔ میں اپنی آرم چیئر پر بیٹھ جاتا ہوں اور کھڑکی سے باہر تکنے لگتا ہوں۔ سٹریٹ لائٹس ایک ''خاموش دھماکے'' کے ساتھ بجھ جاتی ہیں۔ شہتوت کے درختوں کی اوٹ سے خاکستری سویرا نمودار ہوتا ہے۔ پرندے کوئی آواز پیدا کیے بغیر اڑتی ہوئی ارجن کے گھنے درختوں میں اکٹھے ہو رہے ہوتے ہیں۔ میرے اپارٹمنٹ کے اوپر والے اپارٹمنٹ میں مقیم لیڈی سڑک پر سرگشت کر رہی ہوتی ہے۔ وہ میرے باغ کے گرد لگی بیل کے قریب رکتی ہے، ادھر اُدھر دیکھتی ہے کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا اور تیزی سے کچھ پھول توڑ کر انھیں اپنے دوپٹے میں چھپا لیتی ہے اور مندر کی طرف چل پڑتی ہے۔ اس کا بوڑھا خاوند اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہوتا ہے۔ وہ بھی باڑھ کے قریب رکتا ہے، ادھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی سن تو نہیں رہا اور اپنی توند کو دباتا ہے اور زور دار پاد مارتا ہے۔ پھر وہ چہرے پر ایسا تاثر لاتے ہوئے کہ جیسے پاد اس نے نہیں کسی اور نے مارا ہو، تیزی سے قدم اٹھاتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ سامنے والے بلاک میں ایک بتی روشنی ہوتی ہے۔ ایک عورت اپنے گھر

کے پردے سمیٹتی ہے، اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو باندھتی ہے اور اپنے بازو میری طرف پھیلا دیتی ہے۔ دوسرے گھروں کی بتیاں بھی جلتی بجھتی ہیں۔ گلابی آسمان پر صبح کا ستارہ مدھم سا دکھائی دیتا ہے۔ کوّے ایک دوسرے کے مقابلے میں کائیں کائیں کر رہے ہوتے ہیں۔ ہلبری کے درخت پر چڑیاں جھگڑا کرنے لگتی ہیں۔ مؤذن کی آواز آسمانوں تک جا رہی ہوتی ہے۔ مندروں کی گھنٹیاں دیوتاؤں کو جگانے کے لئے زور زور سے بجتی ہیں۔ دودھ والا دودھ کے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ کا شور پھیلاتا سائیکل پر بلاک کا چکر لگاتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور سائیکل سوار گھنٹی بجاتا ہوا چلاتا ہوا آ رہا ہوتا ہے: ''پیپر والا! اسٹیٹسمنٹ، ٹیم آف انڈیا، ٹیم، ایکسپریس، ہیرالڈ، پیپر والا!'' میں اخباروں کے اپنے دروازے کے نیچے سے اندر دھکیلے جانے کی آواز سنتا ہوں۔ میں آرم چیئر پر بیٹھا رہتا ہوں۔ صبح کی ہوا سحر کے اجالے کو کمرے میں بھر دیتی ہے۔ ہوا ٹھنڈی، خوش بو دار، مایوسی اور آرزو سے لبریز ہے۔ یہ بادِ صبا ہے...... صبح کی ہوا...... جو محبت کرنے والوں کے لئے مقدس ہوتی ہے۔ لیجئے میں اپنے محبوب شہر میں واپس آ چکا ہوں۔

☆☆☆

میں ''ہندوستان ٹائمز'' پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ فرنٹ پیج پر اُسی سفید فام عورت کی تصویر چھپی ہوتی ہے جو گزشتہ شب ہوائی جہاز سے اُتر رہی تھی۔ خبر کی سرخی تھی ''لیڈی ہائی ٹائی کا کہنا ہے کہ انھیں دلی واپس آ کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔'' اچھا تو یہ لیڈی ہائی ٹائی ہے! وہ آثارِ قدیمہ پر کتاب لکھنے کے لئے مواد جمع کرنے آئی ہے۔ وہ راشٹر پتی بھون میں صدر کی مہمان کے طور پر مقیم ہے۔

میں سرخیوں اور تصویروں پر نظر دوڑاتا ہوں۔ میرا خانساماں ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ میں اسے اس کے لئے خریدی ہوئی جاپانی گھڑی دیتا ہوں۔ اس کی باچھیں کھل اٹھتی ہیں۔ وہ مجھے بلیک کافی کا مگ دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا میں دوپہر کے کھانے کے وقت گھر ہوں گا؟ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں

دوپہر کے کھانے کے وقت گھر نہیں ہوں گا۔ وہ رات کے کھانے کے بارے میں پوچھتا ہے۔ میں کہتا ہے کہ ہاں میں رات کا کھانا گھر ہی میں کھاؤں گا لیکن امکان ہے کہ دیر سے گھر آؤں گا لہٰذا وہ کھانا میز پر رکھ کر چھٹی کرسکتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ میں کھانے میں کیا پسند کروں گا؟ میں جانتا ہوں کہ وہ بھاگ متی کے حوالے سے پوچھ رہا ہے۔ اسے علم ہے کہ بھاگ متی صرف ہندوستانی کھانے کھاتی ہے جبکہ میں اینگلو انڈین ''اِسٹو'' وغیرہ کھاتا ہوں۔ مجھے علم نہیں ہوتا ہے کہ میں بھاگ متی سے کب، کہاں اور کس طرح ملوں گا۔ تاہم میں اسے بھاگ متی کے حوالے سے کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا لہٰذا میں کہتا ہوں کہ وہ کچھ بھی پکالے۔ وہ کچھ سوچتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔

اب دِلّی کی بانہوں میں سمانے کا وقت آگیا ہے۔ میں جلدی جلدی نہاتا ہوں اور اپنی ہندوستان ایمبیسڈر کار پر روانہ ہو جاتا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں کئی سڑکوں اور راؤنڈ اباؤٹس کے نام تبدیل کیے جا چکے ہوتے ہیں۔ وِنڈسروں، یارکوں، کیننگوں، اور ہارڈنگوں کی جگہ، تلکوں، پٹیلوں، آزادوں اور نہروؤں نے لے لی ہوتی ہے۔ ایک پٹرول سٹیشن کے باہر تین آدمی سرخ جھنڈے لہراتے ہوئے نعرے لگا رہے ہیں: ''پٹرول سٹیشن والے مردہ باد۔'' ڈاکٹر سین کے نرسنگ ہوم کے باہر بھی سرخ جھنڈے لہرا رہے ہوتے ہیں۔ چھ آدمی نعرے لگا رہے ہوتے ہیں ڈاکٹر مردہ باد۔ وزارتِ خوراک وزراعت کے عمارت کے باہر بھی سرخ جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ چار آدمی، جن کے گلے میں ہار ہیں، لان میں آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے ایک پلے کارڈ رکھا ہے، جس پر لکھا ہے: ''بھوک ہڑتال کا تیسرا دن۔'' پارلیمنٹ سٹریٹ پر ایک جلوس زعفرانی رنگ کے جھنڈے لہراتا، نعرے لگا رہا ہے: ''ہمارا دھرم اور ہماری سیاست ایک ہیں۔ گائے ہماری ماتا ہے۔ گائے خور مردہ باد۔'' کناٹ سرکس کے لان میں ایک سیاسی جلسہ ہو رہا ہے۔ مقرر سپیکر پر دھاڑ رہا ہے: ''سب مل کر کہو.........جے ہند۔'' مجمع جواب دیتا ہے: ''جے ہند۔'' مقرر خوش نہیں ہوتا۔ ''نہیں یہ

کافی نہیں ہے۔ ہم چینی سؤروں کا مقابلہ اتنی کمزور آوازوں سے نہیں کر سکتے۔ ہماری آوازیں تو اتنی ہونی چاہئیں کہ پیکنگ میں سنائی دیں۔ سب مل کر کہو........ جے ہند۔"

مجمع فلک شگاف نعرہ لگاتا ہے" جے ہند۔"

پیکنگ والے تمہیں ذلت آمیز شکست دے چکے ہیں۔ ہندوستانیوں جیسے دشمن ہمیشہ اپنی تذلیل کرواتے ہیں۔

میں جن پتھ پر (جو کبھی کوئنز وے ہوتی تھی) تبتی "نوادرات" کے ڈیلروں کی دکانوں کے قریب کار پارک کر دیتا ہوں۔ امریکی سیاح پیتل اور پتھر کے نوادرات کی خریداری کر رہے ہیں۔ سکھ نجومی غیر ملکیوں کو محبت اور سفر کے حوالے سے قسمت کا حال بتا رہے ہیں۔ ایک نجومی میری مارکس اینڈ سپارکس شرٹ دیکھ کر کہتا ہے "تم 'فورن' سے آئے ہو، تم دوبارہ 'فورن' چلے جاؤ گے۔" وہ کہتا ہے: "ادھر آؤ میں تمہیں تمہاری محبت کے بارے میں بتاتا ہوں۔ ایک امیر سفید فام عورت تمہارے لئے مری جا رہی ہے۔ میں تمہیں اس کا نام بتاتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم اسے اور اس کی دولت کو کس طرح حاصل کر سکتے ہو۔" میں پنجابی میں اس سے کہتا ہوں: "ایسی باتیں امریکیوں کو بتاؤ، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" وہ بہت کائیاں ہے۔ وہ برہمی سے کہتا ہے: "پیسہ؟ پیسہ تو میرے ہاتھ کی میل ہے۔ تمہارا مستقبل اچھا ہے۔ تمہیں بہت دولت ملے گی۔ تم 'فورن' کی بے شمار لڑکیوں کے ساتھ ہم بستری کرو گے۔ تاہم ایک نحس ستارہ تمہارے راستے کی رکاوٹ ہے۔ مٹھی بند کرو۔"

میں بے سوچے سمجھے مٹھی بند کر لیتا ہوں۔

"اب کھول دو۔"

میں مٹھی کھول دیتا ہوں۔ میری ہتھیلی کے درمیان ایک سیاہ دھبہ ہوتا ہے۔

"دیکھا!" وہ فاتحانہ لہجے میں کہتا ہے: "سیاہ ستارہ! تم صرف ایک روپیہ دے دو۔ میں امریکیوں سے دس روپے لیتا ہوں۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ سیاہ ستارے کو کس

طرح مغلوب کیا جا سکتا ہے۔"

میں اسے ایک روپیہ دے دیتا ہوں۔ وہ مجھے غیر ملکی عورتوں کو پھانسنے کے گر بتاتا ہے۔

"سردار جی! آپ کی محبوبہ کا نام جے۔ ایچ۔ ٹی سے شروع ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے؟"

میں کسی ایسی عورت سے واقف نہیں ہوں، جس کے نام کا مخفف جے۔ ایچ۔ ٹی ہو۔ تاہم وہ بولے جاتا ہے۔

"جب آپ کو جے۔ ایچ۔ ٹی نام کی سفید فام عورت ملے گی، تب آپ کو دنیا کا مشہور نجومی نتھا سنگھ یاد آئے گا۔"

میں آل انڈیا کوآپریٹو کافی ہاؤس چلا جاتا ہوں۔ وہاں بھی سرخ جھنڈے لہرا رہے ہوتے ہیں۔ ایک بینر پر لکھا ہوتا ہے: "ہمارے مطالبے پورے کئے جائیں۔" ایک آدمی مطالبات والا پرچہ مجھے تھما دیتا ہے۔ میں پرچے کو مروڑ کر اس آدمی کو واپس دے دیتا ہوں اور ایک فحش اشارہ کرتا ہوں۔ وہ شکوہ کرتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔ بے ہودہ آدمی!

میں شور مچاتے ہوئے ہجوم پر نظر دوڑاتا ہوں۔ مجھے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا، جسے میں اپنا ساتھی بنا سکوں۔ میں نیوز سٹینڈ سے "دلی انڈر ورلڈ" کا ایک شمارہ خریدتا ہوں اور جونہی ایک میز خالی ہوتی ہے، اس پر قبضہ کر لیتا ہوں۔ پھر میں دلی کے سکینڈل پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ ایک وزیر نے (جس کا نام اگلے ہفتے بتایا جائے گا) اپنی بہو کو حاملہ کر دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ تو "اقربا پروری" ہوئی! بیٹے کی مفت خدمت!

"کناٹ سرکس گرل کے اعترافات۔" وہ بے چاری ایک افریقی سفارت خانے کے ہندوستانی سٹاف کے ہاتھوں خود سے ہونے والی بدسلوکی پر شکوہ کناں ہے۔

وہ کہتی ہے کہ افریقیوں کو ہندوستانیوں سے زیادہ عطا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پیسے بھی زیادہ دیتے ہیں۔ کالج کے ایک طالب علم نے اپنے خط میں شکایت لکھی ہے کہ جب اس کا باپ شہر سے باہر دورے پر گیا ہوا تھا تو اس کی سوتیلی ماں نے اس کے ساتھ زیادتی (Rape) کی۔ مدیر حاشیے میں اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''جس جگہ سے تم نے جنم لیا ہے، اس جگہ میں تم اپنا عضو تناسل اپنے باپ کی طرح کیسے داخل کر سکتے ہو؟...... تمہاری سوتیلی ماں ہندوستانی عورت کے وقار پر دھبہ۔'' وہ وعدہ کرتا ہے کہ اگلے شمارے میں ایسی عورتوں سے نمٹنے کے طریقے شائع کرے گا۔ میں امریکی کاروں کے فینڈروں جیسی چھاتیوں والی ''جنسی بلیوں'' کی تصویریں غور سے دیکھتا ہوں۔ یہ وعدہ بھی کیا گیا ہے کہ اگلے شمارے میں تہاڑ جیل کے زنانہ حصے میں ہونے والی جنسی وارداتوں کا تفصیلی احوال شائع کیا جائے گا۔ بھاگ متی مجھے اس حوالے سے بہت کچھ بتا چکی ہے۔ کیونکہ وہ کئی مرتبہ تہاڑ جیل میں قید رہ چکی ہے۔

میں اپنے گینگ کے دو افراد کو آتے دیکھتا ہوں۔ ایک فوٹو گرافر ہے' دوسرا صحافی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ دلی کے سب سے بڑے عورت باز ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بانہیں پھیلائے میری طرف بڑھتے ہیں۔ ''ہلو، ہلو۔ بنکو کا کیا حال ہے'' فوٹو گرافر میرے وسطی حصے کو تھپتھپاتے ہوئے پوچھتا ہے: ''کیا اس نے میم صاحبوں کے ساتھ اپنی ڈیوٹی ادا کی ہے؟'' میں اس Fly کو تھپتھپاتا ہوں: ''اور ہاں دلی کے چیمپئن نسل کش بیل کا کیا حال ہے؟''

وہ اپنے کندھے جھٹکتا ہے۔ ''پندرہ دن تک کچھ نہیں کرنا۔ میں اپنے اصول کا پکا ہوں: جب عورت مل جائے تو ہم بستری کرو، جب نہ ملے تو کنواروں کی طرح جیو۔ نہ مشت زنی، نہ لونڈے، نہ ہیجڑے۔'' یہ اس نے مجھ پر اوچھا وار کیا تھا۔

''اور تم سناؤ عظیم قلم گھسیٹ، تمہارے قطب مینار کا کیا حال ہے؟'' میں صحافی سے پوچھتا ہوں۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص ہے۔ اس کی ڈاڑھی زیر ناف بالوں جیسی ہے۔

وہ میرے سوال کا جواب یوں دیتا ہے: ''جب کوئی عورت مل جائے تو میں اس سے ہم بستری کرتا ہوں، جب نہیں ملتی تو مشت زنی کرتا ہوں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ عظیم گرو آسمان پر ہے اور معشوقہ میرے بستر میں!'' وہ اپنی ڈاڑھی کا ایک بال نوچتا ہے اور فلسفیانہ لاتعلقی کے ساتھ اس کا جائزہ لینے لگتا ہے۔

اسی اثنا میں ایک تیسرا دوست بھی آجاتا ہے۔ وہ وزارت دفاع میں اپر ڈویژن کلرک ہے۔ وہ بیماری کی اپنی غیر استعمال شدہ چھٹیاں استعمال کر رہا ہے۔ اور اس قسم کی باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

''بہار میں پچاس لاکھ انسان بھوک سے مر رہے ہیں اور تم ہو کہ عورتوں کے علاوہ کچھ نہیں سوچتے۔'' وہ اپنے پاؤں ہلاتا ہے، پھر اپنی ٹانگیں کسی اخروٹ توڑنے والے آلے کی طرح پھیلاتا ہے۔ وہ کرسی پر پاؤں رکھ کر سکون سے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بھاری کولھوں سے ایک پاد خارج ہو جاتا ہے: پوں۔ وہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔ وہ پاؤں کرسی سے نیچے رکھتا ہے اور معافی مانگتا ہے: ''سوری، یہ زبان کی لغزش تھی۔''

ہمارا ایک اور دوست آنکلتا ہے۔ وہ سیاستدان اور ہم دوستوں کا پولیٹیکل ایکسپرٹ ہے۔ اس نے پچھلے قحط کے دوران 'ایک چپاتی فی ہفتہ' تحریک چلا کر بڑا نام کمایا تھا۔ اب وہ خاندانی منصوبہ بندی کے لئے اسی طرح کی ایک تحریک چلانے پر غور کر رہا ہے، جس کا بنیادی نعرہ ہے: ''اگر تم خوش قسمتی چاہتے ہو تو ہفتے میں صرف ایک مرتبہ......''

ہم دوبارہ جنس اور کرپشن اور نا اہلی اور بہار کے پچاس لاکھ فاقہ زدگان کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ہم کافی کے کئی کپ پی اور مونگ پھلیوں کی کئی پلیٹیں کھا جاتے ہیں۔ صبح کا وقت یوں گزرتا ہے۔

مجھ پر شدید افسردگی طاری ہو جاتی ہے۔ میں اپنے کافی ہاؤس کے دوستوں سے اجازت لیتا ہوں اور پرانے شہر کے گرد بنی سڑک (Ring Road) پر کار چلانے لگتا

ہوں۔ میں مغل دور میں بنائی گئی شہر کی فصیل اور زینت محل کی مسجد کے پاس سے گزرتا ہوں۔ برقی چتاسوز کے قریب سے گزرتے ہوئے میں کار کی رفتار کم کر لیتا ہوں۔ وہاں نہ کوئی سوگوار ہوتا ہے، نہ دھواں۔ میں تین پل کی محرابوں سے گزرتا ہوا جمنا کے کنارے واقع نگم بودھ شمشان گھاٹ پہنچتا ہوں۔ میں کار پارک کر کے شمشان گھاٹ کے اندر چلا جاتا ہوں۔

دلی والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ اس طرح مر بھی نہیں رہے، جیسے کہ وہ مرا کرتے ہیں! صرف ایک چتا جل رہی ہے جبکہ سلگتی ہوئی راکھ کے صرف تین ڈھیر پڑے ہیں۔ کوئی سوگوار موجود نہیں ہے۔ میں جمنا کے کنارے چلا جاتا ہوں کہ شاید وہاں کوئی جیتا جاگتا فرد موجود ہو۔ وہاں ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔

دریا کے اندر تک اترنے والی سیڑھیوں پر سرخ چادر میں لپٹی ہوئی ایک لاش پڑی ہوتی ہے۔ کوئی درجن بھر مرد اور عورتیں رو اور چھاتیاں پیٹ رہے ہوتے ہیں۔ ایک برہمن پنڈت انھیں ایک طرف ہٹاتا ہے، سنسکرت میں کچھ اگڑم بگڑم پڑھتا ہے اور لاش پر پانی چھڑکتا ہے۔ درمیانی عمر کا ایک شخص لاش کے چہرے سے چادر ہٹاتا ہے۔ یہ ایک نوجوان لڑکی ہے......وہ گہری نیند سوئی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ آدمی اس کے چہرے کو تکتے ہوئے روتا ہے اور بے یقینی کے ساتھ اس کا سر ہلاتا ہے۔ لاش کی دوسری طرف ایک عورت اپنی پیشانی پیٹتی ہے اور پھر مردہ لڑکی کو اپنے بازوؤں میں بھر لیتی ہے۔ دوسرے لوگ گریہ وزاری کرنے والے اس جوڑے کو نرمی سے دور لے جاتے ہیں اور لاش کا چہرہ ڈھانپ دیتے ہیں۔ پنڈت ہاتھ پھیلاتا ہے۔ کوئی شخص اس کی ہتھیلی پر ایک روپے کا سکہ رکھ دیتا ہے۔ پنڈت سکے کو مایوسی سے دیکھتا ہے پھر سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔ اس کی لکڑی کی کھڑاویں کھٹ کھٹ کر رہی ہوتی ہیں۔ سوگوار لاش اٹھا کر اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگتے ہیں۔ اوپر پہنچ کر وہ لاش کو زمین پر رکھ دیتے ہیں اور لکڑیوں کا چبوترہ سا بنانے لگتے ہیں۔ درمیانی عمر والا جوڑا دوبارہ رونے لگتا ہے۔

عورت مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈالتی اور دونوں ہتھیلیوں سے ماتھا پیٹتی ہے۔ وہ روتے ہوئے کہتی ہے: ''ہائے، ہائے، ہائے!'' مرد مردہ لڑکی کے چہرے سے دوبارہ چادر ہٹاتا ہے، کوئی ایک منٹ تک اسے تکتا رہتا ہے اور پھر روتے ہوئے کہتا ہے: ''ہائے ربا!'' وہ مردہ بچی سے نظریں نہیں ہٹا پاتا۔ وہ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کو دباتا اور اس کے تلوؤں کو رگڑتا ہے۔ چتا تیار ہوگئی ہے۔ لاش کو اٹھا کر اس پر رکھ دیا جاتا ہے۔ لاش پر مزید لکڑیاں رکھ دی جاتی ہیں اور دیسی گھی سے بھرا ہوا لوٹا ان پر انڈیل دیا جاتا ہے۔ ایک شخص ایک لکڑی کے سرے پر لپٹے تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑوں کو جلاتا ہے اور پھر چتا کے گرد گھومتے ہوئے اس مشعل سے اسے آگ لگاتا ہے۔ چتا جلنے لگتی ہے۔ ایک اور شخص نوکدار بانس کے ذریعے چتا میں لڑکی کے سر کو ڈھونڈتا ہے اور پھر بانس کو اس کی کھوپڑی میں کھبا دیتا ہے۔

مردہ لڑکی کے ماں باپ اپنے چہرے مٹی میں چھپا لیتے ہیں، زمین پر ہاتھ مارتے ہیں اور گریہ کرتے ہیں۔ کلکتہ سے آنے والی طوفان میل دلی سٹیشن کی طرف جانے کے لئے دریائے جمنا پر بنے آہنی پل سے گزرتی ہے۔

میں اپنے چہرے پر شعلوں کی تپش محسوس کرتا نگم بودھ گھاٹ سے نکلتا ہوں جبکہ بے بسی کے ساتھ روتے ہوئے الم زدہ والدین کی چیخیں میرے کانوں میں گونج رہی ہوتی ہیں۔ میں حقیقتاً الم گرفتہ ہوتا ہوں۔ دکھ دل میں سوئی کی طرح اترا ہوتا ہے۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ورنہ اپنی بچی کی موت کے سوگ میں سر پر مٹی ڈالنے والا میں بھی ہوسکتا تھا! بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنی ایمبیسڈر چلاتا اپنے اپارٹمنٹ واپس جا رہا ہوں! میں جن لوگوں کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں، اُن کے دکھ اور میرے غصے، حسد اور اضطراب کا کیا مقابلہ! وہ گھر جائیں گے تو انھیں بیٹی کی کمی بری طرح محسوس ہوگی۔ جبکہ میں گھر جاؤں گا اور مزے سے سکاچ پیوں گا۔

بدھ سنگھ میرا منتظر ہوتا ہے۔ وہ بانہیں اور باچھیں پھیلائے میری طرف بڑھتا

ہے۔ میں شرمندہ ہونے سے بچتا ہوں۔ وہ میرے زیادہ قریب آجاتا ہے اور رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کرتا ہے: "ایکسکیوزمی سر، آپ کا ہیجڑا آپ سے ملنے آیا ہوا ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ آپ 'فورن' سے واپس نہیں آئے۔ مجھے امید ہے آپ مجھ سے خفا نہیں ہوں گے، کوئی عورت لے آئیں، لڑکا لے آئیں، لیکن ہیجڑا......"

میں بدھ سنگھ کے ڈاڑھی والے چہرے پر تھپڑ مار سکتا تھا۔ تاہم میں نے ایسا کرنے کی بجائے اندر جا کر زمی سے دروازہ بند کر دیا اور ایک جام پیا۔

یہ ہے دلی۔ جب آپ زندگی سے بیزار ہو رہے ہوں تو صرف اتنا کریں کہ نگم بودھ گھاٹ میں ایک گھنٹہ گزاریں، مرے ہوؤں کو شعلوں کی نذر کیا جاتا دیکھیں اور ان کے عزیز و اقارب کو ان کے لئے روتے ہوئے سنیں۔ پھر گھر آکر وسکی کے دو جام پئیں۔ دلی میں موت اور شراب زندگی کو جھیلنے کے لائق بنا دیتی ہیں۔

❁❁❁

لیڈی جے۔ ایچ۔ ٹی

میں سکاچ کے دوسرے جام کے ساتھ دوسرا سینڈوچ کھا رہا ہوتا ہوں کہ فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

"کیا یہ 420420 ہے؟"

"ہاں، یہی ہے۔"

"سر، پلیز سیکرٹری وزارت اطلاعات سے بات کیجئے۔"

"میں لیڈی ہائی ٹائی کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے اس کے بارے میں صبح کے اخبارات میں ضرور پڑھ لیا ہوگا! مشہور ماہر آثار قدیمہ، ملکہ کی کزن، صدر کی مہمان، وی۔وی۔آئی۔پی وغیرہ وغیرہ۔ ہوسکتا ہے وہ اچھی عورت بھی ہو۔ وہ کھدائی کے لئے کچھ پرانے مقامات دیکھنا چاہتی ہے۔ ہر شے تیار ہے۔ لیموزین، کیویز، شیمپین، ہر وہ شے جو ہمارا غریب ملک مہیا کرسکتا ہے۔ کیا تم اسے سیر کرواسکتے ہو؟"

"کیوں نہیں، ضرور کرواسکتا ہوں۔"

"خوب! کار صبح پانچ بجے تمہیں لینے پہنچ جائے گی۔ تم وقت پر تیار ہو جانا، ایسا

نہ ہو کہ لیڈی کو تمہارا انتظار کرنا پڑے۔''

''پانچ بجے!'' لیکن اس سے پہلے کہ میں پھٹ پڑتا، وہ ریسیور رکھ دیتا ہے۔ میں اپنے آپ کو سمجھانے لگتا ہوں۔ ایک دن صبح سویرے جاگنے سے پوری زندگی سنور سکتی ہے۔ شہوت بھری محبت کا ایک گھنٹہ گمنامی کی پوری زندگی سے قیمتی ہوتا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ پورا دن گزارنا ہے، ایک عالمی شہرت یافتہ عورت کے ساتھ، یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ اسے پھنساؤ اور اس کے چاہنے والے کی حیثیت سے تاریخ میں اپنا نام لکھوالو۔

میں اسے قوالی نائٹ دکھانے موتی محل لے جاسکتا تھا۔ لوگ حسد کرتے اور میں اپنے دوستوں سے کہتا:

''جین نے کہا......''

''یار یہ جین کون ہے؟''

''تم نہیں جانتے لیڈی جین ہائی ٹائی کو؟......ملکہ کی کزن ہے وہ......مشہور ماہر آثار قدیمہ! ہم مٹی کے خاکستری برتنوں کے لئے کھدائی کر رہے ہیں۔ وہ میری قریبی دوست بن گئی ہے......''

میں تھوڑی دیر ہی سوتا ہوں۔ میں بار بار بتی جلا کر وقت دیکھتا ہوں۔ 4:30 بجے الارم کلاک میرے کانوں کے پردے پھاڑ دیتا ہے۔ میں جلدی جلدی رفع حاجت کرتا ہوں، نہاتا ہوں اور آدھے گھنٹے بعد اپنے اپارٹمنٹ کے باہر جا کھڑا ہوتا ہوں۔

مارچ کا مہینہ ہے۔ صبح کے وقت ماحول مہکا ہوا ہوتا ہے۔ صبح کا ستارہ غروب ہوتے ہوئے چاند سے زیادہ چمک رہا ہوتا ہے۔ اپارٹمنٹ بلاک ایک کار کی ہیڈ لائٹس سے روشن ہو جاتا ہے۔ ایک ٹرک شور مچاتا گزرتا ہے۔ پھر خاموشی اور صبح کا ستارہ اور صبح کی تازہ ہوا ہوتی ہے۔ مشرقی افق روشن تر ہو جاتا ہے۔ بڑی بڑی چمگادڑیں اڑتی ہوئی اپنے گھروں کو واپس جا رہی ہوتی ہیں۔ ایک اور کار گزرتی ہے، اس کے بعد ایک اور۔

میری گھڑی میں 5:40 بج رہے ہوتے ہیں۔ مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔ میں مزید آدھا گھنٹہ سوسکتا تھا۔

ہیڈ لائٹس کی چکا چوند مجھے اندھا کر دیتی ہے۔ ایک رولز رائس رکتی ہے اور سرخ و سفید وردی پہنے ایک شخص مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا میں ہی میں ہوں۔ میں ہاں میں جواب دیتا ہوں۔ وہ اگلا دروازہ کھول دیتا ہے۔ میں خود کو شوفر اور وردی والے کے درمیان پھنسا ہوا پاتا ہوں۔ میں پچھلی نشست پر نظر دوڑاتا ہوں۔ بہت بڑی نشست پر فر میں لپٹی ہوئی ایک دھان پان سی عورت بیٹھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بے رنگ چہرے کو سکوڑتی ہے اور پوچھتی ہے: ”کیا تم ہی گائیڈ ہو؟“

”یس، میڈم۔“ میں جواب دیتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب اسے پتا چلے گا کہ میں اصل میں کون ہوں تو وہ احمق دکھائی دے گی۔ یہ سوچ میرا غصہ ختم کر دیتی ہے۔

”پرانا قلعہ چلو۔“ میں شوفر کو حکم دیتا ہوں۔

”نہیں اسے بتایا جاچکا ہے کہ کہاں جانا ہے۔“

اچھا تو وہ دہلی سے واقف ہے! تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟

ہم متھرا آگرہ روڈ سے گزرتے ہوئے پرانا بڑا پل پار کرتے ہیں۔ رولز رائس کی ہیڈ لائٹس بند ہیں۔ صبح کی روشنی بے شمار رفع حاجت کرنے والوں کے کولھوں کو عیاں کر دیتی ہے۔ ہم ریلوے پل پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہم فرینڈز کالونی اور متعفن ڈسپوزل فارم کے پاس سے گزرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے پاس سے گزرتے ہیں۔ ہم بستی بدر پور سے گزرتے ہیں اور ہائی وے سے اتر کر ابھرتے ہوئے سورج کی سمت بڑھنے لگتے ہیں۔ کھیت رفع حاجت کرنے والوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے منہ ہماری طرف ہوتے ہیں۔ ان کے عضو تناسل ان کی رانوں کے درمیان جھول رہے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ہماری طرف پشت کیے ہوتے ہیں اور ان

کے کولھے دکھائی دے رہے ہوتے ہیں...... فضلے کے تکونے ڈھیروں سے بمشکل ایک انچ اوپر۔ ہندوستانی کسان رفع حاجت میں دنیا کے چیمپئین ہیں۔ وہ دن میں دو مرتبہ ڈھیر ساری چپاتیاں ساگ اور مکھن کے ساتھ کھاتے ہیں اور دن میں دو مرتبہ رفع حاجت کرتے ہیں۔ ہم مغربی جمنا کینال کو پار کرتے ہیں۔ تازہ پکی ہوئی گندم کے سمندر کے پار ایک پہاڑی پر واقع تل پت دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ شوفر کہتا ہے: ''تل پت، میڈم۔''

وہ خوش ہو کر کہتی ہے: ''آہا! ہم تل پت پہنچ گئے!'' اس کی آواز بھاری سی ہوتی ہے۔ ''گاڑی کہیں روک دو۔ میں ناشتہ کرنا چاہتی ہوں۔''

میں شوفر سے کہتا ہوں کہ کار کو سڑک کے آخر پر لے جائے۔ میں آکسفورڈ والی انگریزی میں لیڈی سے کہتا ہوں: ''بستی کے پرے کھجور کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ آپ وہاں سکون کے ساتھ ناشتہ کر سکتی ہیں ورنہ یہاں تو تل پت منہ پھاڑے محترمہ کو تک رہا ہوگا۔''

وہ میری بات سن کر مسکراتی ہے۔

''خوب، خوب! میں تو گرم کافی کے ایک کپ کے لئے مری جا رہی ہوں۔ یقیناً تم بھی کافی پیو گے۔''

میں اس کی دعوت کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔ جب تک وہ معافی نہیں مانگتی میں اسے سزا دوں گا۔ ہم تل پت کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ سڑک ایک مندر کے ساتھ کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ وردی پوش تیزی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولتا ہے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے کار سے اتر پڑتا ہوں۔

لیڈی ہائی ٹائی کار سے نکلتی ہے۔ میں اس کے پورے سراپے کا جائزہ لیتا ہوں۔ عمر پچپن کے قریب، قد پانچ فٹ سے تھوڑا سا زیادہ لمبا، چھاتیاں ندارد، کولھے ندارد، جنسیت سے عاری سراپا، سنہرے بال، گلابی جلد۔ جبڑے کے پہلوؤں میں موجود

نشانات سے پتا چلتا ہے کہ آپریشن کے ذریعے فیس لفٹ کروایا گیا ہے۔ اس نے خاکستری رنگ کا کارڈیگن، نیلے رنگ کی ڈینمز اور خاکی رنگ کے جوتے پہنے ہوتے ہیں۔ چھوٹی جسامت، نیلی آنکھوں اور سنہرے سکوں والے کنگن کے علاوہ اس میں نسوانیت بالکل نہیں ہے۔

صدارتی ناشتہ دان کھولا جاتا ہے۔ انڈے والے سینڈوچز اور بھاپ اڑاتی کافی ہوتی ہے۔

''تم غیر معمولی طور پر اچھی انگریزی بولتے ہو'' وہ مجھے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہتی ہے: ''کیا تم نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی ہے؟''

میں سگریٹ لیتے ہوئے سر ہلاتا ہوں اور کہتا ہوں: ''ہیلی بری۔''

''پرانا ایسٹ انڈیا سکول!'' وہ بڑے سرپرستانہ انداز میں کہتی ہے۔

''اور یقیناً یہ کنگز ٹائی ہے!''

''ہاں۔'' میں ٹائی کو پکڑ کر کہتا ہوں کہ جسے باندھنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔

''میرا شوہر بھی کنگز مین ہے۔ تم کب وہاں گئے تھے؟''

''سات سال پہلے۔'' اس کا خاوند یقیناً مجھ سے کم از کم پینتیس سال بڑا رہا ہوگا لہٰذا جھوٹ پکڑے جانے کا ڈر نہیں۔

''تم کیا پڑھتے تھے؟''

''تاریخ۔''

وہ خوش ہو جاتی ہے: ''میرا شوہر بھی تاریخ پڑھتا تھا! تمہارا استاد کون تھا؟''

اگر میں اسے سوال کرنے دیتا تو مشکل میں پڑ جاتا، لہٰذا میں نے کہا'' میں اپنا وقت کلاس روم سے زیادہ کھیل کے میدان میں گزارتا تھا۔''

وہ مسکرانے لگتی ہے۔'' میں معافی چاہتی ہوں۔ میں نے تمہیں پیشہ ور گائیڈ سمجھا تھا۔ انھیں مجھے تمہارے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔ میری بدتہذیبی کو معاف کردو۔''

''اس بارے میں سوچو بھی نہیں! تمہاری خدمت کے لیے دِلّی کا بلا معاوضہ گائیڈ حاضر ہے۔''

''تم تو جو کر ہو! ہماری خوب نبھے گی۔ میرا نام جین ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتی ہے۔ اس کا ہاتھ گوشت سے عاری، مضبوط اور سرد ہوتا ہے۔

''سنگھ۔ ایک بہت منفرد نام، جو 5 کروڑ سکھوں، راجپوتوں، جٹیوں، ٹھاکروں، گورکھوں، بہاریوں اور بہت سے دوسروں کا مشترکہ نام ہے۔''

وہ خوشی سے کھلکھلانے لگتی ہے۔ میں اس کو مکھن لگاتا ہوں: ''کیمرا بلب چمک رہے تھے! میں تو سمجھا کہ تم کوئی فلم سٹار ہو۔ تم فلم سٹار بن بھی سکتی تھیں۔''

''جھوٹے! میں خوشامد نہیں تعریف پسند کرتی ہوں۔'' وہ ہنستے اور کھانستے ہوئے کہتی ہے۔

ہم کافی کی چسکیاں لیتے اور انڈوں والے سینڈوچز کھاتے ہیں۔

''تم تل پت کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' وہ پوچھتی ہے۔

''کچھ زیادہ نہیں۔ مشہور ہے کہ یہ پانڈووں کی پانچ میں سے ایک بستی ہے۔ کیا تمہیں پانڈووں کے بارے میں علم ہے؟''

وہ سر ہلاتے ہوئے کہتی ہے: ''مجھے دوبارہ بتاؤ۔''

''پانڈووں نے اپنے رشتے دار کورووں سے پانچ بستیوں پر مشتمل ترکے میں سے اپنا حصہ مانگا۔ وہ پانچ بستیاں تھیں: پانی پت، سونی پت، اندر پت، باگھ پت اور تل پت۔ کورووں نے انکار کیا تو پانڈووں نے جنگ چھیڑ دی۔ جنگ یہاں سے ستر میل دور شمال مشرق میں کوروکشیتر میں ہوئی تھی۔ کرشن کی مدد سے پانڈو جنگ جیت گئے۔ کیا تم گیتا کو جانتی ہو؟''

وہ دوبارہ سر ہلاتی اور کہتی ہے: ''یہ مہا بھارت کا حصہ ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ حق کی

خاطر جنگ کے حوالے سے کرشن کا وعظ ....اس کی کہانی میں بہت سے شوہروں والی ایک عورت بھی ہے؟''

''درو پدی! وہ پانچوں پانڈو بھائیوں کی بیوی تھی۔ ارجن نے اسے تیر اندازی کے ایک مقابلے میں جیتا تھا۔ جب وہ اُسے لے کر گھر پہنچا اور بولا: ''ماں، دیکھو، میں کیا لایا ہوں!'' تو اس کی ماں نے پیچھے دیکھے بغیر جواب دیا تھا ''اچھے بچے بنو اور اپنے بھائیوں کو بھی اس میں حصہ دو۔'' چنانچہ اس نے ایک فرمانبردار ہندوستانی بیٹے کی طرح اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ کوروؤں سے جنگ جیتنے کے بعد پانڈو واپس ہمالیہ پر چلے گئے۔ تمام اچھے ہندوستانی بوڑھے ہو جائیں تو مرنے کے لئے ہمالیہ پر چلے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس پہاڑی پر رہنے والے لوگ یہاں رہ جانے والے پانڈوؤں کی اولاد ہوں۔''

''جب میں پچھلی مرتبہ یہاں آئی تھی تو انہوں نے تل پت میں کھدائی کر کے مٹی کے خاکستری برتن دریافت کئے تھے۔ میں نے ان کا جائزہ لیا تھا۔ یقیناً وہ 1000ق۔م یا اس سے بھی پہلے کے تھے۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہتی ہے اور کافی کے آخری قطرے زمین پر گرا دیتی ہے۔ وردی پوش تیزی سے کپ تھامنے بڑھتا ہے۔ ہم دھوپ سے روشن تل پت کی طرف دیکھتے ہیں۔ تل پت میں ایک مندر، کچھ پختہ اور بہت سے کچے مکان ہوتے ہیں۔

گایوں اور بھینسوں کا ایک ریوڑ تل پت سے ہماری طرف آتا ہے۔ لڑکے انہیں مل چلے ہوئے کھیتوں میں جانے سے روکنے کے لئے ان کے اردگرد بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں ان کے پیچھے بھاپ اُڑاتے گوبر کو اٹھا کر ٹوکریوں میں ڈال رہی ہوتی ہیں۔ گائیں رولز رائس کو دیکھتی ہیں اور شرما کر دور ہو جاتی ہیں۔ بھینسیں اس کے فینڈرز کو سونگھتی ہیں۔ لڑکے مویشیوں کو کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں بکھیر دیتے ہیں۔ لڑکے اپنے ڈنڈے ٹانگوں میں پھنسا کر ہم سے چند فٹ دور اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔

لڑکیاں ان کے پیچھے صف بنا کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

''یہ کیا چاہتے ہیں؟'' لیڈی ہائی ٹائی پوچھتی ہے۔

میں بچوں سے ہندی میں پوچھتا ہوں: ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں،'' ایک لڑکا جواب دیتا ہے، ''ہم تو بس دیکھ رہے ہیں۔''

میں اس کا جواب انگریزی میں دہراتا ہوں، ایک دیہاتی سائیکل سے اترتا ہے اور پوچھتا ہے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ ''کچھ نہیں'' لڑکے جواب دیتے ہیں۔ سائیکل والا ان میں جا شامل ہوتا ہے۔ مزید دیہاتی بھی آنکلتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے سامنے کافی تماشائی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

''بھائی کیا یہ کوئی تماشا ہے؟'' میں طنزیہ انداز میں ان سے پوچھتا ہوں۔

وہ ہنسنے لگتے ہیں اور ان میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاہم وہ وہیں بیٹھے ہماری تکتے رہتے ہیں۔ ایک لڑکا مجھ سے پوچھتا ہے، ''یہ میم ہے یا صاحب؟''

لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلانے لگتی ہیں۔ مرد بھی ہنسنے لگتے ہیں۔ لڑکا مزید کھل جاتا ہے: ''ارے اس نے تو صاحبوں کی طرح پتلون پہنی ہوئی ہے۔ اس کے آگے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ بھلا کون بتائے یہ میم ہے کہ صاحب!''

سب ہنسنے لگتے ہیں۔ ہائی ٹائی بھانپ جاتی ہے کہ لڑکے نے اس کے حوالے سے کچھ کہا ہے۔ وہ میرا بازو زور سے پکڑ لیتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ لڑکے کی بات اسے بتاؤں۔ میں اسے بتا دیتا ہوں۔ وہ مجھے گھسیٹ کر لڑکے کے پاس لے جاتی ہے اور کہتی ہے ''اسے کہو کہ ذرا جھاڑیوں میں چلے، میں اسے دکھاتی ہوں۔'' میں اس کی بات لڑکے کو بتاتا ہوں۔ وہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔ ہائی ٹائی لڑکے کو کان سے پکڑ کر اٹھاتی ہے: ''آؤ چل کر خود دیکھ لو۔''

لڑکا زور لگا کر کان چھڑواتا اور بھاگ لیتا ہے۔ دوسرے لڑکے اور لڑکیاں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ جاتے ہیں۔ سائیکل والا سائیکل پر سوار ہو کر رفو چکر ہو جاتا

ہے۔ دوسرے بھی وہاں سے کھسک جاتے ہیں۔

ہائٹی ٹائٹی فاتحانہ انداز میں ہاتھوں سے غیر مرئی گرد جھاڑتی ہے اور کہتی ہے:
"اب میں مضافات کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔ دریا یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہوگا۔"

"تیز تیز چلیں تو ایک گھنٹے کی دوری پر ہے۔"

"تو پھر چلتے ہیں۔"

ہم مشرق کی سمت چل پڑتے ہیں۔ ہم کھجور کے درختوں کے جھنڈ سے گزر کر کھلے میں آجاتے ہیں۔ ہم ایک دلدل کے گرد گھوم کر آگے بڑھتے ہیں۔ ہم پانی کے کھالوں میں سے گزرتے ہیں۔ زمین ریتلی ہوجاتی ہے۔ ہرنوں کی ایک ڈار کلیلیں بھرتی ہوئی ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ ایک سیاہ ہرن ہم سے چند گز آگے آکر رک جاتا ہے۔ ہائٹی ٹائٹی اس کی طرف بازو اٹھاتی ہے، نشانہ باندھتی ہے اور منہ سے آواز نکالتی ہے: "ٹھاہ۔" ہرن گولی کا نشانہ بن چکا ہوتا ہے، اس کے جسم کے پچھلے حصے سے خون بہہ رہا ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے جھاڑیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ رائفلوں اور شاٹ گنوں سے مسلح سکھوں سے لدی ایک جیپ جھاڑیوں میں سے گزر کر آتی ہے۔

سردار جی! کیا آپ نے ہرنوں کی ایک ڈار ادھر سے گزرتے دیکھی ہے؟" ایک سکھ مجھ سے پنجابی میں پوچھتا ہے۔ وہ سفید فام عورت کو دیکھتا ہے تو انگریزی میں پوچھتا ہے: "اور ایک بڑے سیاہ ہرن کو، مجھے یقین ہے، میں نے اسے نشانہ بنا لیا تھا۔"

میں دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہوں: "وہ ابھی ابھی گزرا ہے۔ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

ہائٹی ٹائٹی مسکرانے لگتی ہے۔ اس کی نیلی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں: "کوئی ٹھاہ، ٹھاہ نہیں چلے گی۔" وہ سرپرستانہ انداز میں میری ڈاڑھی پر تھپکی دیتی ہے۔

"میرے لڑکپن میں شہر کے فصیل کے ایک میل کی اندر اندر نیل گایوں اور جنگلی

سؤروں کے غول ہوا کرتے تھے۔آپ جس راشٹرپتی بھون میں مقیم ہیں، اس کے پیچھے پہاڑیوں میں شیر دیکھے جاتے تھے۔ ہمارے پارکوں میں ہرن، تیتر اور مور ہوتے تھے۔ شہر سے بیس میل دور ہرنوں کی ڈاریں دیکھی جاتی تھیں۔آج آپ دلی کے گرد سو میل کے دائرے میں کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔ سفارتی استحقاق رکھنے والے غیر ملکی حرامیوں نے ہمارے سارے جانوروں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان خونیوں کو گولی سے اڑا دیتا۔"

"وہ جیپ والے تو غیر ملکی حرامیوں سے زیادہ تم جیسے لگتے تھے،" وہ کہتی ہے۔

"میں انھیں بھی گولیوں سے اڑا دوں گا۔"

ہم آگے بڑھنے لگتے ہیں۔کھیت شروع ہو جاتے ہیں۔ گندم سبز سے زرد ہو رہی ہوتی ہے۔ ایک چنڈول ہمارے اوپر سے چہچہاتا ہوا گزر کر گندم میں اتر جاتا ہے۔ دوسرا آسمان کی طرف اٹھتا ہے، ایک جگہ رک کر پر پھڑپھڑاتا ہے اور پھر آگے اڑ جاتا ہے۔ پھر بہت سے چنڈول اڑتے ہیں۔کھیت ختم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پاؤں ریت میں دھنسنے لگتے ہیں۔ ہم ایک چھوٹے سے تالاب پر پہنچ جاتے ہیں۔ مرغابیوں کا ایک جھنڈ اٹھتا ہے اور ہمارے اوپر سے سیٹیاں بجاتے گزر جاتا ہے۔ میں بازو اوپر کرتا ہوں، نشانہ باندھتا ہوں اور کہتا ہوں: "ٹھاہ، ٹھاہ.......اچھا نشانہ، لیڈی ہائی ناٹی۔ چھ پرندے گر گئے ہیں!"

وہ ہنسنے لگتی ہے: "تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔"

ہم تالاب کے گرد گھوم کر آگے بڑھتے ہیں۔اب ہمارے پاؤں ٹخنوں تک ریتلی زمین میں دھنسنے لگتے ہیں۔ اچانک دریا ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ہم اونچے کنارے پر ہوتے ہیں۔ ہمارے نیچے دریائے جمنا تین میل لمبے اژدھے کی طرح بل کھاتا ہوا بہہ رہا ہوتا ہے۔ دریا میں گیندے کے پھولوں اور سرخ چادر سے ڈھکی ایک لاش آہستہ آہستہ بہہ رہی ہوتی ہے۔ تین کچھوے رینگتے ہوئے پانی میں چلے جاتے

ہیں۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ہزاروں آبی پرندے دھوپ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک سفید سر والا باز دریا کی سطح کا جائزہ لیتا ہوا اڑ رہا ہوتا ہے۔

لیڈی ہائی ٹائی تحیر کے عالم میں بازو پھیلاتی ہے: ''یہ تو ماقبل تاریخ کے کسی اژدھے جیسا ہے! اس کے خم و پیچ تو دیکھو!'' وہ میری کہنی تھامتے ہوئے ریت پر بیٹھ جاتی ہے۔ میں بھی اس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہوں۔ ہم اپنے پاؤں کنارے سے نیچے لٹکا لیتے ہیں۔ ڈھلواں کنارے میں پرندوں نے گھر بنائے ہوتے ہیں۔ وہ ایک سگریٹ سلگا لیتی ہے۔

''اس کی وجہ کرشن کا بھائی بلرام ہے۔ جمنا اس کی ہوس پوری نہیں کرتی تو وہ اسے بالوں سے پکڑ کر ہندوستان کے میدانوں میں ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے۔''

ایک مچھلی دریا کی سطح پر چھلانگ لگاتی ہے۔

دور سے شکاریوں کی بندوقیں چلنے کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں۔ دوسرے کنارے پر موجود آبی پرندے آسمان کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ وہ بہت شور مچاتے ہوئے گزرتے ہیں: بطخیں، بگلے، وغیرہ۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے جاتے ہیں اور دوبارہ واپس آ کر ہم سے کوئی سو گز دور بیٹھ جاتے ہیں۔ جمنا پھر سے پرسکون ہو جاتا ہے۔ ایک بار پھر سفید سر والا باز مچھلیوں کو ڈھونڈتا ہوا دریا کے اوپر اڑنے لگتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہائی ٹائی میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی ہے: ''کیا یہ تمہارا مقدس دریا ہے؟''

''یہ گنگا کے بعد مقدس ترین دریا ہے۔ اسے سر جوگا کہتے ہیں یعنی سورج کی بیٹی۔ اسے تری یم بھی کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے: مرے ہوؤں کے حکمران یم کی بہن۔ چونکہ یہ کالندہ پہاڑ سے شروع ہوتا ہے لہٰذا اس کا ایک اور نام بھی ہے.......کالندہ نامدنی یعنی کالے پہاڑ کی بیٹی۔ ویدوں کو اس کے پانی سے غسل دیا گیا تھا، کرشن اس میں

نہایا کرتا تھا۔میڈم! جمنا اتنا مقدس دریا ہے کہ اس میں ایک غوطہ لگانے سے ساری عمر کے گناہ دھل جاتے ہیں۔اگر میں محترمہ کو کنارے سے دھکا دے کر اس میں گرا دوں تو حقیقت میں آپ کا بھلا کروں گا۔'' میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔اس کے کنگن میں لگے سنہرے سکے کھنکھناتے ہیں۔وہ سگریٹ کا آخری حصہ پھینک دیتی ہے اور اپنی کولھے والی جیب سے سگریٹوں کا پیکٹ نکالتی ہے'لائٹر مجھے تھما دیتی ہے اور ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا لیتی ہے۔

میں شعلے کو ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بناتا ہوں اور لائٹر کو اس کے ہونٹوں کے قریب لے جاتا ہوں۔میں اوپر دیکھتا ہوں۔وہ بھی اوپر دیکھتی ہے۔ہماری نظریں ملتی ہیں۔اس کی آنکھیں نیلے آسمان تلے بہتی خلیج بنگال جیسی لگتی ہیں۔وہ انھیں استعمال کرنا جانتی ہے۔میں اس کی نظریں اپنے GULLET تک اُترتی محسوس کرتا ہوں۔میں آنکھیں جھکا لیتا ہوں۔وہ دھواں میرے چہرے پہ چھوڑتی ہے۔''شکریہ'' وہ اپنا لائٹر واپس لیتے ہوئے کہتی ہے۔اس کا ہاتھ دوبارہ میرے گھٹنے پر آجاتا ہے۔

میں اس کے کنگن کے سکوں سے کھیلنے لگتا ہوں۔ان پر مردانہ نام کندہ ہوتے ہیں: جم،فریڈی،ڈینس،ژاک۔

''بوائے فرینڈز۔'' وہ وضاحت کرتی ہے۔

''امیرا ور ہر قومیت کے۔'' میں ایک کنگن کو پکڑ کر کہتا ہوں۔اس کنگن پر ''اسلم'' کندہ ہوتا ہے۔

وہ دوبارہ ہنس پڑتی ہے۔''میں نے خود پیسہ خرچ کیا تھا— اور سب قومیتوں کے بھی نہیں۔ہندوستان سے کوئی نہیں ہے۔شاید اس مرتبہ میں ایک ہندوستانی کا اضافہ کروں گی۔'' وہ مجھ پر معنی خیز انداز میں نگاہ ڈالتے ہوئے کہتی ہے۔وہ آدھا پیا ہوا سگریٹ ریت میں بجھا دیتی ہے۔''میں تل پت کے کھنڈرات کو جلدی جلدی دیکھنے کے

بعد سورج کنڈ جانا چاہتی ہوں۔" وہ مجھے کندھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہتی ہے:
"اٹھو، چلیں۔"

وہ گویا دوبارہ جوان ہو جاتی ہے۔ وہ تیزی سے آگے آگے چلتی ہے جبکہ میں پیچھے پیچھے ہوتا ہوں۔

ہم جھاڑیوں پر گرد کے بادل اڑتے دیکھتے ہیں۔ وہ شکاریوں والی جیپ ہوتی ہے۔ جیپ میں سیاہ ہرن نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں دیکھ لیتے ہیں۔ لیڈی ہائی ٹائٹی فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتی ہے۔ ایک شکاری مٹھی بند کرکے بازو کو اوپر نیچے کرتا اور گالیاں دیتا ہے۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" ہائی ٹائٹی پوچھتی ہے۔

میں اسے بتاتا ہوں کہ وہ ہمیں گالیاں دے رہا ہے۔ لیڈی کہتی ہے کوئی بات نہیں، مشرقی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ میرے آگے آگے کھجور کے درختوں کے جھنڈ سے گزرتی ہوئی مندر کے پاس کھڑی رولز رائس تک جاتی ہے۔ متجسس دیہاتی کار کے گرد ہجوم کیے ہوتے ہیں۔ ہمارے پہنچتے ہی وہ غائب ہو جاتے ہیں۔ ہم کافی پیتے ہیں اور تل پت بستی چلے جاتے ہیں۔

بستی کے لڑکوں کے ساتھ میم صاحب کے سلوک کا قصہ مشہور ہو چکا ہوتا ہے۔ باقی کام کار پر موجود ریاستی نشان کرتا ہے۔ بستی کا سردار اور اس کے حاشیہ بردار جے ہند، نمسکار اور سلام کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہائی ٹائٹی سر ہلا کر ان کے سلام کا جواب دیتی ہے۔ ایک چارپائی بچھا دی جاتی ہے۔ چہرے پر نقاب والی ایک عورت چائے کے گلاس ٹرے میں رکھ کر لاتی ہے۔ ہائی ٹائٹی عورت کا نقاب اٹھا کر جھانکتی ہے تو سب ہنسنے لگتے ہیں۔ وہ چائے پینے سے انکار کر دیتی ہے لیکن ایک دیہاتی کے ہاتھ سے حقے کی نے لے کر چند کش لگاتی ہے۔ بستی والے تالیاں بجاتے ہیں اور بچوں کی طرح ہنستے ہیں۔

ہائی ٹائی میرے توسط سے ان سے پوچھتی ہے: ''کیا تم میں سے کسی کو ہل چلاتے یا نئے مکان کی بنیادیں کھودتے ہوئے کوئی انوکھی چیز ملی ہے؟''

وہ سر ہلا کر کہتے ہیں، ''نہیں۔''

ہم تل پت سے چل پڑتے ہیں۔ بدر پور سے ہم بائیں طرف مڑ جاتے ہیں، ایک ریلوے لیول کراسنگ کو پار کر کے دوبارہ بائیں طرف ہی ایک تنگ سڑک پر مڑ جاتے ہیں۔ ہم ایک ڈھلان سے اُترتے ہیں۔ ایک دلکش مور اپنے خوبصورت پر پھیلائے ہمارے سامنے سے تیزی سے سڑک پار کر جاتا ہے۔

''واہ! کتنا خوب صورت ہے یہ مور!'' ہائی ٹائی کہتی ہے۔

''یہاں مور بہت زیادہ ہوتے ہیں — اور انسان بھی! ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان میں انسانوں کی بے پناہ کثرت ہے۔''

وہ سورج کنڈ کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی بسوں، سکوٹروں، کاروں اور بائیسکلوں کی طرف ہاتھ لہراتی ہے۔ ہر طرف پکنک منانے والے موجود ہوتے ہیں۔ ٹرانزسٹروں، ٹیپ ریکارڈروں، گراموفونوں اور سپیروں کی بینوں کا شور فضا پر محیط ہوتا ہے۔

ہماری آمد تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کے ساتھ ہماری کار رکنے سے پہلے ہی ٹرانزسٹروں کی آواز دھیمی کر دی جاتی ہے۔ تین سپیرے اپنی اپنی بین بجانے میں مست ہوتے ہیں، ایک بوڑھا آدمی گلے میں کوبرا سانپ ڈالے ہمارے پاس آجاتا ہے۔

لیڈی ہائی ٹائی کہتی ہے: ''مجھے سانپ پسند نہیں ہیں، نہ ہی میں پکنک منانے والوں کو پسند کرتی ہوں۔'' وہ لمحہ بھر منظر کا جائزہ لیتی ہے، کراہت کا اظہار کرنے کے لئے منہ سے عجیب سی آواز نکالتی ہے اور پوچھتی ہے: ''ہمیں یہاں کتنی دیر رکنا ہے؟''

''ایک تو یہ ایمفی تھیٹر ہے۔ دوسرے یہاں سے تقریباً دو میل کی دوری پر ایک

پرانا بند ہے اور بند سے کوئی میل بھر آگے بستی انگ پور ہے۔ وہاں انگ پور کی حفاظتی فصیل کے آثار ہیں۔ ان سب کو دیکھتے دیکھتے ہمیں شام ہو جائے گی۔"

وہ عورت فیصلے کرنے میں بہت تیزی دکھاتی ہے۔ وہ نوکر کو حکم دیتی ہے کہ سامان کار سے اتار لیا جائے۔ وہ اندر جا کر کمرے اور غسل خانے کا جائزہ لیتی ہے، تو لئے کو سونگھتی ہے، ٹائیلٹ کے ساتھ ایک صندوق میں پڑے اخباروں کے ڈھیر کو دیکھ کر ناک سکیڑتی ہے۔ پھر وہ شوفر کو حکم دیتی ہے: "کار لے جاؤ اور نو بجے کے لگ بھگ واپس آجانا ہے۔" وہ مجھ سے نہیں پوچھتی ہے کہ کیا میں نو بجے تک فارغ ہوں۔

نوکر ہائی ٹائی کا سوٹ کیس اور دوسرا سامان فرش پر رکھ دیتا ہے۔ شوفر اور نوکر سلیوٹ کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہائی ٹائی ایک آرم چیئر میں ڈھیر ہو جاتی ہے، اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتی ہے اور کہتی ہے: "شراب نہ ملی تو میں مر جاؤں گی۔ جان من مجھے جن اور ٹانک ملا کر تو دے دو اور خود جو چاہو پیو........ سکاچ، شمپین، بیئر، جن........ سب تمہارے بڈھے صدر کے خرچ پر!" میں کسی بٹلر کی طرح لیڈی کے لئے جن اور ٹانک ملاتا ہوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا ہوتا ہوں کہ کیا پیوں، وہ اپنا پہلا جام ختم کر لیتی ہے۔ مجھے اس کے لئے دوسرا جام تیار کرنا اور اس کا سگریٹ سلگانا پڑتا ہے۔ میں اپنے لئے مارٹینی کا جام تیار کرتا ہوں اور بستر کے سرے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میں اپنا گلاس اوپر کرتا ہوں۔ وہ میرے اشارے کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

"مجھے اس جگہ........ سورج........ سورج........ کے بارے میں بتاؤ۔"

"کنڈ جرمن زبان کے لفظ بُنڈ کا ہم قافیہ ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے تالاب۔"

میں اسے سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں دلی پر حکومت کرنے والے راجپوتوں اور ان کے سردار سورج پال کے بارے میں بتاتا ہوں، جس کے نام پر اس ایمفی تھیٹر کو سورج کنڈ کا نام دیا گیا تھا۔

وہ اپنا گلاس مجھے دیتے ہوئے کہتی ہے: ''جانِ من! ایک اور۔''

میں اسے جن ٹانک کا ایک اور جام بنا دیتا ہوں۔

''مجھے بند اور بستی کے بارے میں بھی بتاؤ۔'' وہ اپنی ٹانگیں اس طرح کرسی کے ہتھوں پر رکھ لیتی ہے، جیسے کسی مرد کو دخول کا موقع دے رہی ہو۔ وہ اتنے شہوت انگیز انداز میں اپنی رانیں کھولے بیٹھی ہو تو میں راجپوتوں کے بارے میں کس طرح بات کر پاتا؟ میں اپنے ذہن کو اس کی رانوں کے درمیانی حصے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔

''بند انگ پال نے بنوایا تھا۔ اسی نے فصیل میں گھری بستی انگ پور آباد کی تھی۔ ہم وہاں سہ پہر کے وقت جائیں گے۔ انگ پال نے بعد ازاں اپنا دارالحکومت مغرب کو منتقل کر دیا اور سرخ پتھروں سے ایک قلعہ تعمیر کروایا جو لال کوٹ کے نام سے مشہور ہوا۔''

وہ میرے لیکچر میں دلچسپی کھو بیٹھتی ہے۔ اس کی آنکھیں مُندنے لگتی ہیں۔ پھر بھی وہ حکم دیتی ہے: ''بولتے رہو۔''

''نہیں، میں مزید نہیں بولوں گا،'' میں دُرشتی سے کہتا ہوں: ''تم تو نیم غنودہ ہو۔''

وہ ہنستی، کھانستی اور تھوکتی ہے۔ وہ سگریٹ کو فرش پر پھینک کر پیر سے مسل دیتی ہے: ''میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے نیند سے نکلنے کے لئے نہانا ہوگا۔'' وہ اپنے نیلے ٹراؤزر کو پکڑتے ہوئے کہتی ہے: ''ناراض مت ہونا۔''

وہ اپنے سوٹ کیس سے ایک سکرٹ نکال کر غسل خانے میں چلی جاتی ہے۔ غسل خانے میں دروازے کے علاوہ ایک چھوٹا سا پردا بھی ہوتا ہے، جو اندر کا منظر ڈھانپنے کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ وہ دروازہ بند نہیں کرتی۔ وہ ٹراؤزر اتار کر کھونٹی سے لٹکا دیتی ہے۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے کولہے ڈھانپنے کے لئے لیس والی سفید چینٹ پہنی ہوتی ہے۔ وہ منہ دھونے کے لئے بیسن پر جھک جاتی ہے۔ مجھے پتا ہوتا ہے

کہ وہ میری آتشِ شوق بھڑکانے کے لئے ایسا کر رہی ہے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے اور میری آتشِ شوق بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ تولئے سے چہرا پونچھتی ہے، مڑتی ہے اور جھک کر قمیض پہن لیتی ہے۔

''چلو'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتی ہے اور اردو میں کہتی ہے: ''جلدی.....ٹھیک بولا ہے نا؟''

ہم باہر آ جاتے ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوتی ہے۔ سپیرے درختوں تلے پڑے ہوتے ہیں۔ پکنک منانے والے اپنے ٹرانزسٹروں کے قریب لیٹے ہوتے ہیں اور عورتیں پوریاں تل رہی ہوتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں جسموں سے چپکی ہوئی قمیصیں اور پتلونیں پہنے ایمفی تھیٹر میں گھوم پھر رہے ہوتے ہیں۔

ہائی ٹائی پھولوں سے لدے پودوں کو دیکھتی ہے۔ وہ پہاڑیوں کے پار کا منظر دیکھ کر مسحور سی ہو جاتی ہے۔ ایک طرف رومن طرز کا وسیع و عریض ایمفی تھیٹر ہے، جس کی چوڑی سیڑھیاں تالاب تک جاتی ہیں۔ ایک شخص پتھر کی سل پر بیٹھا نہا رہا ہوتا ہے۔ اس سے تھوڑی دور دو بطخیں پانی میں ڈبکیاں لگا رہی ہوتی ہیں۔ ابابیلیں پانی کے اوپر مسلسل چکر کاٹ رہی ہوتی ہیں۔ دوسری طرف ایک وادی ہوتی ہے، جس میں کھجوروں کے بے شمار درخت اگے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بچوں کے سے تحیر کے ساتھ کہتی ہے: ''آہا! کتنا خوب صورت ہے یہ منظر!'' پھر پوچھتی ہے: ''سورج دیوتا کا مندر کدھر ہے؟''

میں ایمفی تھیٹر کے دوسری طرف سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتا ہوں۔ میں آگے آگے اور وہ میرے پیچھے زینہ اتر کر تالاب پر پہنچتی ہے۔ پھر ہم ویسا ہی زینہ چڑھ کر سورج دیوتا کے مندر کے کھنڈرات تک پہنچتے ہیں۔ میں اسے ارد گرد کے کچھ فطری مناظر دکھاتا ہوں: سرسبز درختوں کے گھنے جھنڈ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی ہے۔

''باقی آثار کل صبح دیکھیں گے۔ مجھے گرمی اور بھوک لگ رہی ہے۔ کیا تمہیں

بھوک نہیں لگی؟"

وہ اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتی ہے:"او کے! میری گھڑی کہتی ہے کہ جن ٹانک کا ایک اور جام پینے اور کچھ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

ہم ریسٹ ہاؤس واپس آجاتے ہیں۔ میں جن ٹانک کے مزید جام تیار کرتا ہوں اور میز پر تندوری مرغ اور روسی سلاد سجا دیتا ہوں۔ میں لیگر کی ٹھنڈی یخ بوتل کے ساتھ کچھ کباب کھاتا ہوں۔ وہ کھانا کھانے کے بعد مجھے کمرے سے جانے کا کہتی ہے:"مجھے قیلولہ ضرور کرنا چاہئے۔ تم مجھے ساڑھے چار بجے جگا دینا۔ ہم شام کو بند اور بستی دیکھنے جائیں گے۔"

وہ یہ بھی نہیں سوچتی کہ میرے لئے کوئی دوسرا کمرہ یا کرسی بھی ہے یا نہیں اور مجھے برآمدے میں نکال کر دروازہ بند کر دیتی ہے۔

"مجھے ہلا کر جگانا۔ میں گہری نیند سویا کرتی ہوں۔"

میں کھانے کے کمرے سے ایک کرسی نکال کر اس پر بیٹھ جاتا ہوں اور خود کو آرام پہنچانے کے لئے پاؤں ایک ستون سے ٹکا لیتا ہوں۔ میں درختوں تلے اونگھتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ نیند سے میرا سر بوجھل ہو جاتا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ سپیروں کی بین کی آواز میرے کان پڑتی ہے۔ پکنک منانے والے لوگ اپنا سامان سمیٹ رہے ہوتے ہیں جبکہ سپیرے ان سے کچھ اینٹھنے کی آخری کوشش میں مصروف ہوتے ہیں۔ مجھے اونگھ آجاتی ہے۔ مجھے وہاں سے روانہ ہونے والی کاروں، سکوٹروں وغیرہ کی آوازیں آتی ہیں۔ سپیروں کی بین کی آواز دور جاتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ صرف آوارہ کتے پکنک منانے والوں کے چھوڑے ہوئے کچرے کو کرید اور غرا رہے ہوتے ہیں۔ مجھے خواب دکھائی دیتا ہے کہ لیڈی ہائی ٹائی مجھے دعوت وصال دیتی ہے۔ میں اس کی دعوت فوراً قبول کر لیتا ہوں۔ بھاگ متی سے بے وفائی پر میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرتا۔ بھاگ متی طوائف ہے لہٰذا میں اس کے حوالے سے خطا کے احساس کا شکار

کیوں ہوؤں؟ میں ہائی ٹائی سے ہم بستری کررہا ہوتا ہوں کہ بھاگ متی آجاتی ہے اور پوچھتی ہے: "کیا تمہیں اس بڈھی میم صاحب سے بہتر کوئی عورت نہیں مل سکی؟" اگر ہائی ٹائی عمر میں کم ہوتی اور اس کے منہ سے جن ٹانک، تمباکو اور بڑھاپے کی بو نہ آرہی ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا!

ساڑھے چار بج جاتے ہیں۔ میں ہائی ٹائی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جاتا ہوں اور دروازہ بند کر دیتا ہوں۔ وہ بستر کی چادر اپنے اوپر تانے یوں سو رہی ہوتی ہے جیسے مردہ کفن میں لپٹا ہو۔ میں اندازے سے اس کا کندھا ہلاتا ہوں۔ وہ چہرے سے چادر ہٹا کر پوچھتی ہے: "کیا وقت ہوا ہے؟"

میں اسے وقت بتاتا ہوں۔

وہ جماہی لیتے ہوئے بازو پھیلاتی ہے۔ اس کی بغلوں میں زرد سے بال اگے ہوتے ہیں۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیڈ شیٹ کو ٹھوڑی تک تان لیتی ہے۔

"جان من! ایک سگریٹ تو دو۔"

میں اسے سگریٹ دے کر سلگاتا ہوں۔ وہ خوشی سے آہ اور اُوہ کی آوازیں نکالتے ہوئے اپنے نتھنوں سے دھوئیں کے مرغولے خارج کرتی ہے۔ وہ غسل خانے کے دروازے پر نصب کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے: "مجھے میرا ڈریسنگ گاؤن دے دو۔"

میں اسے ڈریسنگ گاؤن دیتا ہوں۔ وہ چھلانگ مار کر بستر سے اترتی ہے، وہ بالکل ننگی ہوتی ہے۔ اس کی چھاتیاں چھوٹی اور جھریوں دار ہوتی ہیں، بھٹنیاں لٹکی ہوئی ہوتی ہیں، پیٹ جھریوں دار ہوتا ہے، ناف کے نیچے ہلکی سی توند ہوتی ہے، ناف کے نیچے والے بال سنہرے ہوتے ہیں۔ میں گاؤن اس کو پہنا دیتا ہوں اور اس کی چھاتیوں کو دبوچ لیتا ہوں۔ وہ چھڑا جاتی ہے۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

''میں.......''

''کیا میں میں لگا رکھی ہے۔ اپنے ذہن سے ایسے ویسے خیالات نکال دو۔''

وہ بستر کی پائنتی پڑی قمیض اور ٹراؤزر اٹھا کر غسل خانے میں چلی جاتی ہے۔ وہ دروازہ بند کرنے کی زحمت نہیں کرتی۔ میں اسے دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا۔

وہ واپس آتی ہے تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے: ''محسوس مت کرنا۔ میرا مزاج ہی ایسا ہے۔'' پھر وہ میری ناک کو چوم لیتی ہے۔ یہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میرے دل کو تو ٹھیس لگ چکی ہوتی ہے۔ اب میں بھی اس کے دل کو ٹھیس لگانا چاہتا ہوں۔ اس کا رویہ مجھے درشتی اپنانے کا حوصلہ دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں: ''تم مجھے میرا شہر دلی یاد دلا دیتی ہو۔ ہمارے ہاں ایک ضرب المثل ہے: کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت حسین تھی۔''

وہ کہتی ہے: ''یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔''

ہم اجنبیوں کی طرح بنگلے سے باہر نکلتے ہیں۔ ہمارے درمیان خاموشی کی دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ موسم گرم ہوتا ہے۔ راستے کے پتھر دھوپ سے تپ رہے ہوتے ہیں۔ مور سانس لینے کے لئے چونچیں کھولے درختوں تلے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بولے یا ایک دوسرے کو دیکھے بغیر کوئی میل بھر فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔

ہم پہاڑی سلسلے کے آخر تک پہنچ جاتے ہیں۔ سامنے گندم اور جو کے کھیت پھیلے ہوتے ہیں۔ سبز اور سنہرے سمندر میں سے درختوں سے ڈھکے چٹانی جزیرے ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جزیروں سے پرے بستی اننگ پور ہے۔ ایک دوسرے سے بدگمانی کی دیوار سے منقسم افراد ایسے منظر کی تحسین سے قاصر ہوتے ہیں۔ میں ہائی ٹائٹی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہتا ہوں: ''کتنا خوب صورت منظر ہے!''

وہ جواب دیتی ہے: ''ہاں، بہت خوبصورت! آؤ کہیں بیٹھتے ہیں۔''

میں اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا ہوں۔ ہم اننگ پال بند پر چڑھتے ہیں۔ ہم

کھیتوں کی طرف پشت کر کے کھجور کے درختوں سے بھری وادی کی طرف رخ کیے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم سے پچاس فٹ نیچے شفاف پانی کا تالاب ہوتا ہے۔ دھوپ میں تالاب کا پانی چمک رہا ہوتا ہے۔ کھجور کے درخت سے ایک سبز اور سنہرے پروں والا پرندہ اڑتا ہے۔ وہ تالاب پر بجلی کا پٹر کی طرح چکر لگاتا ہے، پتھر کی طرح پانی میں گرتا اور ایک تڑپتی ہوئی مچھلی چونچ میں دبائے ابھرتا ہے۔ تالاب دوبارہ پرسکون ہو جاتا ہے۔ مچھلیاں دوبارہ تیرنے لگتی ہیں۔ وہ اچانک شعلوں کے فوارے کی طرح ہوا میں اچھلتی ہیں اور تالاب میں گر جاتی ہیں۔

ایک سانپ اوپر کی طرف رینگتا آتا ہے، زمین کی سطح سے سر اٹھاتا ہے اور چٹانوں کے سائے سائے رینگتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ہائی ٹائی سگریٹ پی کر بچا ہوا ٹکڑا تالاب میں پھینک دیتی ہے۔ مچھلیاں سگریٹ کے ٹکڑے کی طرف لپکتی ہیں۔ سگریٹ کا ٹکڑا مچھلیاں پکڑنے والوں کے چارے کی طرح اوپر نیچے ہلکورے لیتا ہے اور پھر پانی میں ڈوب جاتا ہے۔

ہم سہ پہر کا باقی وقت انگ پور کے کھیتوں میں ٹہلتے ہوئے گزارتے ہیں۔ ہم دیواروں پر اُپلے تھاپتی ہوئی گجر عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم انگ پور کے گرد چکر کاٹتے ہوئے اس کی فصیل کے کھنڈرات دیکھتے ہیں۔ سورج پہاڑی سلسلے پر آتا ہے تو ہم بند کی طرف واپس چل پڑتے ہیں۔ ہم کھجور کے درختوں والی وادی سے گزرتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے وقت ہم ریسٹ ہاؤس پہنچ جاتے ہیں۔

وہاں کوئی انسان نظر نہیں آتا۔ چوکیدار ہمارے لئے میز کرسیاں رکھ کر اپنے کوارٹر میں چلا جاتا ہے۔ میں سکاچ نکال لاتا ہوں۔ ہم میز پر ٹانگیں رکھ کر شراب کی چسکیاں بھرتے ہیں۔ طویل سیر کے بعد شراب اکسیر جیسی محسوس ہوتی ہے۔ میں ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا ہوں۔ وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ ہم آسمان کو تابناک خاکستری رنگ میں تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں۔ کوؤں کے جھنڈ کائیں کائیں

کرتے گزر رہے ہوتے ہیں۔ کھجور کے درختوں والی وادی میں مور زور وشور سے چہک رہے ہوتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر بیٹھے دو مور ان کی صداؤں کا جواب دے رہے ہوتے ہیں۔ پھر دھند لکا چھا جاتا ہے۔ ہائٹی ٹائٹی کھڑی ہو کر بازو پھیلا دیتی ہے۔ وہ اپنا سر میرے سینے سے لگا دیتی ہے: ''شکریہ آج کا دن بہت پیارا تھا۔'' وہ میرا منہ چوم لیتی ہے۔ میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اوپر اٹھاتا ہوں اور اس کے چہرے کو کئی بار چومتا ہوں۔

''کیا تم میرے ساتھ ہمبستری کرنا پسند کرو گے؟'' وہ بڑی عاجزی سے پوچھتی ہے۔

''ہاں، چلو اندر چلیں۔''

جونہی ہم برآمدے میں پہنچتے ہیں، صدر کی رولز رائس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی ہم پر پڑتی ہے۔ میرے منہ سے ایک غلیظ گالی نکلتی ہے۔

مجھے بہت زیادہ اضطراب محسوس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی سکون سا بھی محسوس ہوتا ہے۔ میں ایک بوڑھی بھدی عورت پر اپنی ''ہندو'' ضائع کرنے سے جو بچ گیا ہوتا ہوں۔ میں اسے بھاگ متی کے لیے محفوظ رکھ سکتا ہوں، جو ہر مرتبہ جنسی عمل اس طرح کرتی ہے، جیسے نو بیاہتا دوشیزہ ہو۔ بہار کے موسم میں اس کے منہ سے لونگ کی سی مہک آتی ہے۔

ہائٹی ٹائٹی ایک بار پھر لیڈی بن جاتی ہے سرد اور الگ تھلگ سی۔ وہ صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ جاتی ہے۔ جب ہم میرے کے پاس رکتے ہیں تو بڑے خشک لہجے میں کہتی ہے: ''ہر شے کا شکریہ۔ لندن آؤ تو مجھ سے ملنا۔''

''ضرور، مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میں اسے اندر آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ وہاں لٹھ سے مسلح بدھ سنگھ موجود ہوتا ہے۔ جونہی میں رولز رائس سے اترتا ہوں، وہ مجھے زوردار سلیوٹ کرتا ہے۔ جب ہائٹی ٹائٹی کار کی کھڑکی سے سر اور ہاتھ باہر نکال کر مجھے

الوداع کہتی ہے تو بدھ سنگھ پنجابی میں کہتا ہے: "بھگوان ہماری ملکہ کو سلامت رکھے۔"

میں بھی ہاتھ لہرا کر ہائی نائی کو الوداع کہتا ہوں۔ پھر میں بدھ سنگھ کی سلیوٹ کا جواب دیتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں: "سب ٹھیک ہے نا؟"

وہ مجھے دوبارہ سلیوٹ کرتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ "سب کچھ ٹھیک ہے۔آپ کا ہیجڑا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے اسے اندر جانے دیا تھا کیونکہ آپ کل بہت ناراض ہوئے تھے۔ معافی چاہتا ہوں، آپ عورت رکھ سکتے ہیں،لیکن یہ ہیجڑا......"

میں اس کا جملہ مکمل کرتا ہوں: "مناسب نہیں ہے اور تیزی سے اندر چلا جاتا ہوں۔"

بھاگ متی

وہ میری آرم چیئر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ایک کتاب کے صفحے الٹ پلٹ رہی ہوتی ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر انگلیوں میں سگریٹ دبائی ہوتی ہے۔ وہ زوردار آواز نکالتے ہوئے سگریٹ کے سوٹے لگا اور راکھ قالین پر گرا رہی ہوتی ہے۔ اس نے بالوں میں ڈھیر سارا تیل لگایا ہوتا ہے اور تتلی کی شکل کے ہیئر کلپ لگائے ہوتے ہیں۔ اس نے مصنوعی ریشم کی گلابی ساڑھی اور گہرے نیلے رنگ کا مصنوعی ریشم ہی کا بلاؤز پہنا ہوتا ہے۔ کرسی کے سامنے سفید سلیپروں کا جوڑا پڑا ہوتا ہے جس کے پنجے پر بوٹائی کی شکل کے ربن لگے ہوتے ہیں۔ بھاگ متی دلی کی ایسی طوائف ہے جس کا لباس سب سے زیادہ بھدا ہوتا ہے۔

ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس کے چہرے پر تھپے پوڈر اور غازے کی تہہ دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ اس سے اس کی جلد کی سیاہ رنگت اور چیچک کے داغ نہیں چھپتے ہیں۔ اس نے آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوتا ہے جو کہ بہہ کر اس کے رخساروں تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ اس نے ہونٹوں پر گہری سرخ لپ سٹک لگائی ہوتی ہے۔ اس کے دانتوں پر پان کے دھبے نمایاں ہوتے ہیں۔ بھاگ متی دلی کی سب سے بے کشش طوائف ہے۔

''اجی آپ ولایت سے آ گئے!'' میرے داخل ہوتے ہی وہ کہتی ہے اور مجھے ہاں کہنے کا موقع دیئے بغیر بات جاری رکھتی ہے: ''یہ کس قسم کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں آپ نے، ان میں تو کوئی تصویر ہی نہیں ہے۔'' وہ ہیجڑوں کی طرح ہر جملے پر سر ہلاتی اور ہاتھوں سے اشارے کرتی ہے۔ ''تصویر کوئی بھی نہیں بس مردہ مکھیوں جیسے کالے کالے لفظ ہی لفظ۔'' پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے کہتی ہے: ''کیا آپ نے لندن میں اُن سفید گھوڑیوں پر سواری گانٹھتے وقت اپنی بے چاری بھاگ متی کو بھی یاد کیا؟'' بھاگ متی دلی کی سب سے زیادہ ناشائستہ طوائف ہے۔

بھاگ متی دوسری عورتوں جیسی عورت نہیں ہے۔ اس نے اپنے ماضی کے بارے میں مجھے تھوڑا بہت بتایا ہے، باقی سب میں نے خود معلوم کیا ہے۔

بھاگ متی جامع مسجد کے نزدیک ''وکٹوریا زنانہ ہسپتال'' میں پیدا ہوئی تھی۔ جب اس کے باپ نے ڈاکٹر سے پوچھا: ''یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟'' تو ڈاکٹر نے جواب دیا: ''مجھے ٹھیک سے علم نہیں ہے۔'' اس کے ماں باپ کے ہاں اس سے پہلے تین بیٹے ہو چکے تھے۔ پس انھوں نے اپنے چوتھے بچے کو لڑکیوں والا نام .... بھاگ متی....... دے دیا۔ ہیجڑوں کی ایک ٹولی ان کے گھر ناچنے، گانے اور یہ پوچھنے آئی کہ ''ہمیں اپنا بچہ دکھاؤ۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ لڑکی ہے یا لڑکا یا ہم میں سے ہے۔'' اس کے باپ نے انھوں گالیاں بکتے ہوئے گھر سے نکال دیا اور انھیں ایک دھیلہ بھی نہیں دیا۔ ہیجڑوں نے اس کے ماں باپ کو چین سے نہیں رہنے دیا۔ جب بھی وہ اس علاقے میں بچوں کی پیدائش یا شادیوں کے موقع پر گانے بجانے آتے، ان کے دروازے پر رکتے اور کہتے: ''ہمیں اپنا آخری بچہ دکھاؤ۔ اگر وہ ہم میں سے ہے، تو اسے ہمارے حوالے کر دو۔''

بھاگ متی کی ماں دو مزید بچوں کو جنم دے چکی تھی.......دونوں لڑکیاں تھیں۔ دونوں مرتبہ بھاگ متی کا باپ اسے اپنے ساتھ ہسپتال لے گیا اور ڈاکٹر سے کہا کہ اس کا

معائنہ کر کے بتائیں کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ دونوں مرتبہ ڈاکٹر نے اس کے تناسلی اعضا کا معائنہ کر کے کہا: ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی، اس میں دونوں کے خواص موجود ہیں۔'' اس وقت بھاگ متی کی عمر چار سال تھی۔ جب ہیجڑوں کی ٹولی آخری بچے کے جنم کے موقع پر آئی تو بھاگ متی کے باپ نے انھیں اکیس روپے دیے اور کہا: ''اب میرے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ تم اسے لے جا سکتے ہو۔ یہ تم میں سے ہے۔''

ہیجڑے بھاگ متی کو لے گئے۔ انھوں نے اسے ہیجڑوں کی طرح گانا، تالیاں بجانا اور ناچنا سکھایا۔ وہ تیرہ سال کی ہوئی تو اس کی آواز آدمیوں جیسی ہو گئی۔ اس کے اوپری ہونٹ پر، ٹھوڑی کے گرد اور سینے پر بال اگنے لگے۔ اس کے کولھے اور چھاتیاں، جو کہ کسی لڑکے سے تو بڑے تھے، اس کی عمر کی لڑکیوں جتنے بڑے نہیں ہوئے۔ تاہم اسے حیض شروع ہو گیا۔ اگرچہ اس کا کلائی ٹورس بڑا ہو گیا، تاہم اس کے باقی تناسلی اعضا کسی عورت کی طرح کے ہو گئے۔ اب کی مرتبہ وہ خود جا کر ڈاکٹر سے ملی۔ ڈاکٹر نے کہا: ''تم عورتوں جیسا ہر کام کر سکتی ہو، فقط بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔''

مردوں اور عورتوں کی طرح ہیجڑے بھی کئی قسموں کے ہوتے ہیں۔ کچھ تقریباً مکمل مرد ہوتے ہیں، کچھ تقریباً مکمل طور پر عورتیں اور بعضوں میں مردوں اور عورتوں کی ملی جلی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ صنفی اعتبار سے ایسے ہیجڑوں کے بارے میں تعین کرنا دشوار ہوتا ہے کہ ان میں مردانہ خصوصیات زیادہ ہیں یا زنانہ۔ ان کے زنانہ لباس پہننے کو ترجیح دینے کا سبب یہ ہے کہ یہ دنیا مردوں کی ہے اور مردانگی کے مسلمہ معیارات سے کسی بھی انحراف کو غیر مردانہ تصور کیا جاتا ہے۔ عورتیں زیادہ فیاض ہوتی ہیں۔

بھاگ متی ایک ''زنانہ'' ہے۔ جب وہ پندرہ سال کی تھی، تب ہیجڑوں کے سردار نے اسے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ سردار کی اس سے پہلے دو ہیجڑا بیویاں تھیں، تاہم ان کے ہاں ایسی باتوں کی پروا نہیں کی جاتی۔ سردار کی پہلی بیویوں نے بھاگ متی سے رقابت

محسوس کرنے کی بجائے اس کا عروسی جوڑا سیا اور سہاگ رات کے لئے اُسے تیار کیا۔ انھوں نے اس کے چہرے اور جسم پر اگے ہوئے بال صاف کئے اور گلاب کے عرق سے اسے نہلایا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے خاوند کے کمرے میں لے گئیں۔ باہر نکل کر وہ دروازے کی درزوں سے اندر جھانکنے اور کن سوئیاں لینے لگیں۔ بعد ازاں وہ اکثر اس کے ساتھ جنسی عمل کرنے لگیں۔ سترہ سال کی عمر میں بھاگ متی کو چیچک ہو گئی۔ اس نے بتایا: ''انھوں نے مجھے مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسے ہسپتال میں پھینک گئے تھے جہاں انسان مکھیوں کی طرح مر رہے تھے۔ سیتلا مائی (چیچک کی دیوی) نے میری جان بخش دی، لیکن میرے چہرے پر اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ گئی۔''

حیران کن بات یہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں مَردوں کی ایک بہت بڑی تعداد عورتوں پر ہیجڑوں کو ترجیح دیتی ہے۔ ہیجڑوں سے اپنی ہوس کی بھوک مٹانے والے مردوں میں سے بھاگ متی کو دوسرے ہیجڑوں کی نسبت زیادہ سرپرست مل گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر لڑکی اور لڑکا دو کے سے انداز سے اپنے آپ کو پیش کر سکتی تھی۔ اسے اس حقیقت کا بھی پتا چلا کہ بہت سے مرد اپنے ساتھ عورتوں جیسا برتاؤ کیا جانا پسند کرتے ہیں۔ اس نے ایسے لوگوں کو بھی مقدور بھر مسرت فراہم کرنا شروع کر دیا۔ بھاگ متی ہر طرح کے جنسی عمل کو فطری سمجھتی اور اس سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ ہیجڑوں میں سب سے زیادہ سادہ ہونے کے باوجود بوڑھے، جوان، بانجھ، زرخیز، ہم جنس پرست، سادیت پرست اور مساکیت پرست سب اُسے ڈھونڈتے تھے۔

بھاگ متی بستر کو اکھاڑا تصور کرتی ہے۔ وہ مردانہ و زنانہ ہر قسم کے جنسی عمل کی دیوانی ہے۔

اگرچہ بھاگ متی فری لانس ہے، تاہم وہ لال کنواں کے علاقے میں اپنے شوہر اور دونوں سوتنوں کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ وہ اپنی ساری کمائی اپنی برادری کو دے دیتی ہے۔ اس کے بدلے میں اسے سر چھپانے کو چھت اور کھانے کو خواہش کے مطابق غذا

مل جاتی ہے۔ وہ بیمار ہو جائے تو برادری اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ وہ گرفتار ہو جائے تو برادری اسے ضمانت پر رہا کروالیتی ہے، اگر مجسٹریٹ اسے سزا سنادے تو برادری جرمانہ ادا کر دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ میں بھاگ متی سے کس طرح ملا تھا؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں آپ کو بعد میں سناؤں گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ میرے لئے اتنی اہم کس طرح ہوگئی؟ اس حوالے سے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مجھے زندگی میں سب سے زیادہ پیار دلی اور بھاگ متی سے ہی ہے۔ ان میں دو خصوصیات مشترک ہیں: دونوں بہت دلچسپ ہیں اور دونوں بانجھ ہیں۔

''تم کہاں منہ کالا کرتی رہی ہو؟'' میں صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے پوچھتا ہوں۔

وہ اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر کہتی ہے۔ ''اجی! میں تو منہ کالا کرتی ہوں، جبکہ آپ بڑی بڑی کاروں اور بڈھی گوری عورتوں پر سواریاں کرتے پھرتے ہیں! یہ کیسا انصاف ہے؟''

''تم بدھ سنگھ کے ساتھ باتیں کرتی رہی ہو۔''

''وہ پاگل!'' وہ ہاتھ کے اشارے سے بدھ سنگھ کو دفع کرتے ہوئے کہتی ہے: ''اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ پندرہ دن تک واپس نہیں آئیں گے۔ تاہم میرے دل نے کہا کہ آپ واپس آگئے ہیں۔''

وہ آدھا پیا ہوا سگریٹ میز کی سطح پر رگڑ کر بجھاتی ہے اور اپنے کان کے پیچھے رکھ لیتی ہے۔ وہ ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی انگلی سے دائرہ بناتی ہے، پھر دوسرے ہاتھ کی پہلی انگلی اس میں اندر باہر کرتے ہوئے پوچھتی ہے: ''وہ کیسی تھی؟''

میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ بھاگ متی دلی کی سب سے بے ہودہ طوائف ہے۔

"تم اتنی گندی باتیں کیوں کرتی ہو؟"

وہ حیرت کے ساتھ کہتی ہے: "اوفو! آج آپ نے ہمیں گندہ کہا ہے، کل جانے کیا کہیں گے!"

وہ میرے پاس آ کر فرش پر بیٹھ جاتی ہے اور میرے جوتے اور جرابیں اتارتی ہے۔ پھر وہ میرے پیروں کو مسلنے لگتی ہے۔ یہ عمل بڑا خوش گوار ہوتا ہے۔ وہ میرے ٹخنوں، پنڈلیوں اور رانوں کے اندرونی حصے کو مسلتی ہے۔ وقفے وقفے سے اس کا ہاتھ اوپر بھی پہنچتا رہتا ہے۔ وہ بڑے آرام سے میری پینٹ کے بٹن کھولتی ہے، میرے قضیب کو نرمی سے چومتی ہے اور میرے اوپر آ جاتی ہے۔ مجھے سوائے لیٹ کر لطف اندوز ہونے کے، کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں نا کہ بھاگ متی جانتی ہے کہ انسان کو کس وقت کیا چاہئے۔

☆☆☆

بھاگ متی میری زندگی میں کس طرح آئی؟ یہ تین سال پرانی بات ہے۔

میں اُن دنوں ایک صنعت کار کی سوانح عمری لکھنے میں مصروف تھا۔ صنعت کار کے خطوط میں سے مطلوبہ مواد ڈھونڈنے کے لئے مجھے ریسرچ اسسٹنٹ فراہم کر دیئے گئے تھے۔ ہمیں پہاڑی سلسلے کے پار واقع نئی آبادی پٹیل نگر میں کچھ کمرے دے دیئے گئے تھے۔

مجھے کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ میرے دفتر کو پہنچنے والا مختصر ترین راستہ پہاڑ کے اوپر سے ہو کر جاتا ہے۔ یہ راستہ بڑا دلکش تھا۔ کئی مقامات پر آپ نئی اور پرانی دلی کا بیک وقت نظارہ کر سکتے تھے۔ اس راستے کے دونوں اطراف میں مختلف قسم کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور ہر طرف پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں پھول دار درخت بھی تھے اور یہ سڑک کافی بدنام تھی۔

اس سڑک پر لوٹ مار روز کا معمول تھی۔ اخبارات نے اسے زیادہ بدنام کر دیا

تھا۔ پیدل چلنے والے اور سائیکل سوار اس سڑک سے گزرنے سے گریز کرنے لگے تھے اور کاریں رکے بغیر تیزی سے گزر جایا کرتی تھیں۔ یہ سڑک عموماً سنسان رہا کرتی تھی۔ میں اسی سڑک پر بھاگ متی سے پہلی مرتبہ ملا تھا۔

یہ امر حیرانی کا باعث ہے کہ پہلی ملاقات ذہن پر یوں نقش ہو جاتی ہے کہ کبھی نہیں بھولتی۔ مجھے بھاگ متی سے پہلی ملاقات کی مکمل تفصیل یاد ہے۔

یہ اپریل کا واقعہ ہے۔ موسم بہت گرم تھا۔ میں اپنے ٹھنڈے کمرے میں دو گھنٹے کام کر چکا تھا کہ اچانک برقی رو منقطع ہو گئی۔ (میں بلب کی روشنی میں کام کیا کرتا تھا) آج کی طرح اس زمانے میں بھی دلی میں برقی رو منقطع ہونا معمول کی بات تھی۔ میں تھوڑی دیر تو اندھیرے میں بیٹھا بجلی آنے کا انتظار کرتا رہا، پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان گرد آلود تھا۔ گرم ہوا مزید گرد اڑا رہی تھی۔ مجھے جھاڑیوں میں سے دونوں طرف موجود گھر دکھائی دے رہے تھے، تاہم زندگی کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ آسمان پر کوئی پتنگ بھی نہیں اڑ رہی تھی۔ میں نے آگے سو گز کی دوری پر دو سائیکل سواروں کو جاتے دیکھا۔ ان سے آگے سڑک پر کوئی بڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سائیکل سوار اس کے قریب پہنچ کر تھوڑا سا رکے لیکن پھر ٹھہرے بغیر آگے نکل گئے۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر کار روک لی۔ سائیکل سوار واپس آ گئے۔

وہ ایک عورت تھی، جو ہاتھ پاؤں یوں پھیلائے پڑی تھی، جیسے مصلوب کر دی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ اس کے منہ سے جھاگ اور خون بہہ رہا تھا۔ اس کی ساڑھی بھیگی ہوئی تھی۔ میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ سانس چل رہا ہے یا نہیں، اس کی چھاتیوں کو دیکھا۔ ساڑھی کا پلو پھڑ پھڑا رہا تھا، جس کی وجہ سے سانس چلنے کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ ”کیا یہ مر گئی ہے؟“ میں نے وہاں پہنچ جانے والے سائیکل سواروں سے پوچھا۔

انھوں نے عورت کے چہرے کو دیکھا۔ان میں سے ایک نے کہا: ''مرگی۔'' اس نے لکڑی کا ایک ٹکڑا سڑک سے اٹھا کر اس عورت کے دانتوں کے درمیان گھسا دیا۔ ''اس طرح یہ زبان نہیں کاٹے گی۔'' اس نے اپنا جوتا اتارا اور عورت کو سنگھانے لگا:

''یہ مرگی کا بہترین علاج ہے۔''

میں نے دیکھا کہ عورت کی چھاتیاں نیچے اوپر ہو رہی تھیں۔اس کی چھاتیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔عورت نے انھیں مصنوعی ریشم کے سستے سے پرنٹڈ بلاؤز میں چھپایا ہوا تھا۔اس کے پاؤں کالے تھے۔ناخنوں پر گہری سرخ نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ ہتھیلیاں مہندی سے لال تھیں۔وہ پست قامت اور تھوڑی سی فربہ تھی۔اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔وہ اتنی کالی تھی کہ ہندوستانی معیارات کے مطابق اسے دلکش نہیں کہا جاسکتا تھا۔اس کے چہرے پر چیچک کے داغ بھی نظر آرہے تھے۔

''یہ اکیلی یہاں پہاڑی والی سڑک پر کیا کر رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گرو ہی جانے!'' ایک سائیکل سوار نے کہا۔

''برا زمانہ آگیا ہے،'' دوسرے نے تبصرہ کیا۔اس نے عورت کے چہرے پر رکھا اپنا جوتا اٹھایا اور پہن لیا: ''یہ چند منٹوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس کے بعد وہ دونوں مجھے کوئی بات کرنے کا موقع دیے بغیر سائیکلوں پر سوار ہو کر وہاں سے چلے گئے۔

عورت کراہنے اور سر ہلانے لگی۔اس نے ہاتھ اٹھایا اور ہوا میں انگلی سے دائرہ بنایا۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔میں نے اس کی ساڑھی سے اس کے منہ سے نکلنے والا خون اور جھاگ پونچھا اور اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔اس کے جسم سے پسینے اور پیشاب کی بو آرہی تھی۔

''چکر'' اس نے ہوا میں دوبارہ انگلی سے دائرہ بناتے ہوئے وضاحت کی: ''براہ

مہربانی مجھے کسی بس سٹاپ پر پہنچا دو۔" اس کی آواز مردانہ تھی۔

میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ کوئی پھندا ہے؟ میں نے سنا تھا کہ لوگوں کو اس طریقے سے بلیک میل کیا گیا تھا۔ تاہم میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا اور میرا ضمیر صاف تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی سی بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں سائیکل سواروں کے پاس سے گزرا۔ میں نے عقب نما آئینے میں انھیں سائیکلوں سے اترتے اور ان میں سے ایک شخص کو اپنی پاکٹ بک میں کچھ لکھتے دیکھا۔ واضح بات تھی کہ وہ میری کار کا نمبر لکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ میں نے خود کو کس مسئلے میں پھنسا لیا ہے؟

"تم کہاں اترنا پسند کرو گی؟"

مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی...... یا شاید اسے دوبارہ دورہ پڑ گیا تھا۔ میں نے سوچا: اب میں کیا کروں؟ کیا اسے ہسپتال لے جاؤں؟ ہسپتال والے سوال کریں گے اور پولیس کو بلا لیں گے۔ کیا اسے کسی پولیس اسٹیشن لے جاؤں؟ بالکل نہیں! دلی پولیس سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے!

میں لوہیا ہسپتال کے سامنے سے گزر کر پارلیمنٹ کی طرف گیا اور پارلیمنٹ سٹریٹ سے ہوتا ہوا کناٹ سرکس کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں تو بڑی حماقت کر رہا ہوں۔ کسی بھی ٹریفک لائٹ پر کوئی شخص ایک عورت کو بے ہوش پڑا دیکھ سکتا تھا اور یوں ہنگامہ برپا ہو سکتا تھا۔ میں پارلیمنٹ کی طرف مڑ کر پالم ائیرپورٹ والی چوڑی سڑک پر جا نکلا۔ میں نے ایک سنسان مقام پر اس کی حالت کا معائنہ کرنے کے لئے کار روک دی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور نرمی سے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑبڑائی: "مجھے مت ستاؤ! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" پھر وہ دوبارہ سو گئی۔

میں نے تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ معمول

کے مطابق اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کے نزدیک کار کھڑی کی۔ گرو بڑا مہربان ہے، میرا کوئی ہمسایہ یا ان کا نوکر وہاں نہیں تھا۔ میں نے پچھلا دروازہ کھول کر اسے شانے سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا: ''چلو میرے ساتھ آؤ۔''

وہ باہر آ گئی۔ جب ہم بحفاظت اندر پہنچ گئے تو میں نے کہا: ''تم یہاں اس وقت تک سو سکتی ہو جب تک خود کو بہتر محسوس نہ کرو۔''

اس نے جواب دیا: ''آپ کی داسی کافی سو چکی ہے۔ اگر حضور مجھے غسل خانہ دکھا دیں تو آپ کی داسی انتہائی ممنون ہو گی۔''

میں اس کی مرصع ہندوستانی سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے اسے غسل خانہ دکھایا اور بتایا کہ گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل کس طرح کھولے اور بند کیے جاتے ہیں۔ میں نے اسے ایک صاف تولیہ، اپنی پرنسٹن ٹی شرٹ اور ٹراؤزر دیا: ''میرے پاس زنانہ لباس نہیں ہے۔ تم اپنی ساڑھی سوکھنے تک انھیں پہن سکتی ہو۔''

اس نے نہانے اور مٹی سے آلودہ کپڑے دھونے میں کافی وقت لگایا۔ وہ ڈھیلی پرنسٹن ٹی شرٹ پہنے اور ٹراؤزر کو ہاتھ میں تھامے ہوئے نشست گاہ میں آئی۔ میرے کپڑے اس کے سائز سے کئی گنا بڑے تھے۔

میں مسکرانے لگا۔ اس کا چیچک زدہ چہرا سرخ ہو گیا۔ وہ ٹراؤزر کو دیکھتے ہوئے بولی: ''یہ تو بہت ڈھیلا ہے۔''

میں نے اس کے لئے کوک گلاس میں انڈیلی اور اسے کہا کہ وہ اپنے لیے آم پلیٹ میں رکھ کر کھانے کی میز پر آ جائے۔

''میں بہت بھوکی ہوں،'' اس نے آم کھاتے ہوئے کہا: ''میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔''

''تم دوپہر کے وقت پہاڑی پر کیا کر رہی تھیں؟''

''میں تہاڑ سے اپنے گھر جا رہی تھی۔''

"تہاڑ"

"آپ کو پتا ہی ہوگا! تہاڑ جیل! انھوں نے مجھے پچھلی شام رہا کیا تھا۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں نے مزدوروں کے چھپر کے باہر رات گزاری۔ انھوں نے مجھے اندر نہیں آنے دیا تھا۔ دن ہوا تو میں اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ تہاڑ شہر سے بہت دور ہے۔"

"تم کس جرم میں تہاڑ گئی تھیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے نگاہیں مجھ پر جما دیں اور کسی رقاصہ کی طرح سر ہلانے لگی: "جسم فروشی اور کیا؟ میں ایک طوائف ہوں۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"آپ کو میرے نام سے کیا لینا؟ داسی کو بھاگ متی کہتے ہیں۔"

مجھے یونہی سا شک تھا کہ اس کی ہموار چھاتیوں اور مردانہ آواز کے علاوہ بھی کوئی شے ہے، جس نے اسے دوسری عورتوں سے مختلف بنا رکھا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا: "تمھارا گھر کہاں ہے؟"

"جہاں کہیں شام پڑتی ہے، میں وہیں اپنی دری بچھا لیتی ہوں اور اسے اپنا گھر قرار دے دیتی ہوں۔ ستاروں بھرا آسمان میری چھت ہے۔" اس نے اپنی فصاحت برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا: "آپ کی داسی کا غریب خانہ لال کنواں میں ہے۔"

میرا شک مضبوط ہو گیا۔ لال کنواں ہیجڑوں کا رہائشی علاقہ تھا۔ میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں کسی ہیجڑے سے کبھی واقف نہیں رہا تھا۔ میں نے صرف انھیں چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں اپنی بے سری مردانہ آوازوں میں گاتے، رقص کے نام پر بھونڈی حرکتیں کرتے اور پیچھے کو انگلیاں پھیلائے تالیاں پیٹتے ہی دیکھا تھا۔ میں ان کی جنسی زندگی اور تناسلی اعضا کے حوالے سے انوکھی کہانیاں سن چکا تھا۔ اگرچہ میں اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا، تاہم میں نے اس سے کہا کہ وہ پسند کرے تو میں اسے

اس کے گھر تک پہنچا آؤں۔

''حضور مجھ سے جان چھڑانے کے لئے بیتاب ہوئے جا رہے ہیں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ کیا تمہارے لوگ تمہارے لئے فکرمند نہیں ہوں گے؟''

''کسی کو میری فکر نہیں ہے!'' اس نے جواب دیا: ''میں اپنی خوشی سے آتی جاتی ہوں۔ میرا خاوند مجھ سے صرف یہ پوچھتا ہے کہ میں کیا لے کر آئی ہوں؟''

''کیا تمہارا خاوند ہے؟''

''میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ میرا خاوند نہ ہو؟ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی اور مردوں کے کسی کام کی نہیں رہوں گی تو وہ میری دیکھ بھال کرے گا۔''

اس نے بھانپ لیا کہ میں جنسی گفتگو کا دلدادہ شخص ہوں۔ اس نے پوچھا: ''کیا حضور نے ہماری بستی میں بھی کبھی قدم رنجہ فرمایا ہے؟''

''کبھی نہیں۔''

''آپ کی داسی آپ کو اس سمت میں چلانے کی عزت حاصل کرے گی۔''

میں عورتوں تک کے پیچھے لگنے کا عادی نہیں ہوں اور کسی ہیجڑے کے پیچھے لگنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے روکھے پن سے کہا: ''تمہارے کپڑے سوکھ گئے ہوں گے۔ آؤ چلیں۔''

وہ آگے بڑھی اور میرے قریب بیٹھ کر اپنا سر میرے پیروں پر رکھ دیا۔

''آپ کو رام کا واسطہ! مجھے یہاں سے نہ نکالئے۔ میں اتنی بیمار ہوں کہ کام پر واپس نہیں جا سکتی۔ اگر آپ مجھے رات یہاں گزارنے کی اجازت دے دیں تو میں اللہ کی قسم کھاتی ہوں کہ آپ کو مزید پریشان نہیں کروں گی۔ آپ کو آپ کے گورو کا واسطہ!'' (میں نے حیرت سے سوچا کہ وہ بیک وقت ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے خدا کے واسطے کس طرح دے رہی ہے!) اس نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف

دیکھا۔

میرے اپارٹمنٹ میں عورتیں راتیں بسر کر چکی تھیں لیکن وہ مغرب زدہ ہندوستانی عورتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کسی پست طبقے کے ہندوستانی بولنے والے ایسے ہیجڑے نے یہاں رات بسر نہیں کی تھی جو واضح طور پر محنت کش طبقے کے کج رو افراد یعنی گھریلو ملازموں، فوجیوں، سپاہیوں وغیرہ کو دو روپے ''فی پھیرا'' کے حساب سے جنسی لذت فراہم کرتا ہو۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا کہوں۔ وہ زیادہ شہوت انگیز بھی تو نہیں تھی۔

آخر میں نے عام سے لہجے میں کہا: ''ٹھیک ہے، لیکن میرے ملازم کے آنے سے پہلے ہمیں گھر سے نکلنا ہوگا۔ تم اس کے جانے کے بعد یہاں رہ سکتی ہو اور صبح سویرے تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ جاؤ جا کر کپڑے پہنو۔ تمہارے کپڑے یقیناً سوکھ چکے ہوں گے۔''

اس نے جھک کر میرے پیروں کو چوم لیا اور میری قمیض کے دامن سے اپنے آنسو پونچھے۔ وہ کھڑی ہوئی اور میری طرف پشت کر لی۔ ٹراؤزر اسے کمر سے ٹخنوں تک ننگا کرتا ہوا نیچے گرا۔ خواہ اس کے جسم کے دوسرے حصوں نے محنت کش طبقے کے لوگوں کے کھردرے ہاتھوں سے بہت ستم سہے ہوں، تاہم اس کے کولہے کسی سکول بوائے ایتھلیٹ کی طرح کسے ہوئے تھے اور ان میں پہلوؤں کے ہلکے ہلکے گڑھے تھے۔ اس نے سر میری طرف موڑا۔ اس کے لبوں پر ایک شرمندہ سی مسکراہٹ تھی۔ پھر اس نے جھک کر ٹراؤزر کو کمر تک کھینچا اور غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

جب وہ کپڑے بدل رہی تھی، تب میں رات کے منصوبے بنا رہا تھا۔ میں نے کھانے کی میز پر دو شمعیں رکھیں۔ یہ میرا اپنے ان پڑھ باورچی سے بات کرنے کا اپنا طریقہ تھا۔ ایک شمع کا مطلب تھا کہ میں رات کا کھانا باہر کھاؤں گا، دو شمعوں کا مطلب تھا کہ وہ صبح کی چائے لے کر میری خواب گاہ میں نہ آئے۔

ہم اپارٹمنٹ سے نکل آئے۔ بھاگ متی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا: ''کیا آپ مجھے ہوا خوری کے لئے لے جاسکتے ہیں۔ آپ کی داسی کے نصیب میں کار کی سواری بہت کم لکھی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا تھا۔

''تم کہاں جانا پسند کرو گی؟''

''جہاں حضور کا دل چاہے۔'' اب بھاگ متی بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اب وہ پرسکون اور پر اعتماد تھی۔ جب ہم روانہ ہوئے تو اس نے ڈیش بورڈ کو طبلے کی طرح بجاتے ہوئے گنگنانا شروع کر دیا۔ جب ہم اشوکا ہوٹل کے پاس سے گزر کر سفارتی علاقے میں داخل ہوئے تو وہ سفارت خانوں کے نام پڑھنے لگی: ''امریکی ایمبسی......اور روسی، پاکستانی، جاپانی، جرمنی۔''

''تم ان سفارت خانوں کو کیسے جانتی ہو؟''

''آپ کی داسی کو کئی غیر ملکی جنٹل مینوں کی خدمت کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔'' اس نے میرا ردعمل بھانپنے کے لئے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ضرور انھوں نے تمہیں کافی پیسے دیے ہوں گے۔''

شاید ایسا ہوتا لیکن دلوسوں اور سفارت خانوں کے شوفروں کا حصہ نکالنے کے بعد آپ کی داسی کو صرف دو روپے ہی ملتے رہے ہیں۔ خاوند الگ سے ہے۔ اللہ کا شکر ہے! اس پیٹ کو بھرنے کے لئے تھوڑا سا شوربہ اور ایک چپاتی ہی کافی رہتی ہے۔'' اس نے اپنی توند کو تھپکتے ہوئے کہا۔

''تم ان سے باتیں کس طرح کرتی ہو؟''

''اجی واہ!'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا: ''بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے؟ انھیں مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ شراب پیتے اور اپنی زبان میں گٹ مٹ کرتے رہتے ہیں اور کہ پھر انھیں میری خدمت کی ضرورت پڑتی ہے۔'' اس نے چپ

ہو کر ذرا سی دیر کو میری طرف دیکھا اور پھر بولی: ''ان غیر ملکیوں کی بعض عادتیں بہت عجیب ہوتی ہیں۔''

''وہ ایک دن ہی سب کچھ نہیں کرتے۔ بہر حال وہ عجیب طریقوں سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ مجھے تو سوچ کر ہی بخار ہو جاتا ہے۔'' وہ کھڑکی سے باہر تھوکتے ہوئے بولی۔

''کیا حضور مجھے بھوکا ماریں گے؟ مجھے کسی اچھے ہوٹل لے چلیں اور زعفرانی پلاؤ، تندوری مرغ اور قلفی کھلائیں۔''

''اور تمہارے ساتھ دیکھ لیا جاؤں؟ کیا تم میری ناک کٹوانا چاہتی ہو؟''

وہ شرمندہ ہو گئی۔ مجھے بھی ایسا کہنا بھلا نہیں لگا تاہم میں بے عزت بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے پرانے شہر کا رخ کیا۔ ہم دہلی گیٹ سے گزر کر فیض بازار میں داخل ہوئے۔ میں نے موتی محل کے باہر کار روک دی۔ میں اسے کار میں چھوڑ کر دو افراد کا کھانا پیک کرنے کا آرڈر دینے گیا۔ میں کھانا خرید کر کار میں واپس آ گیا: ''میں تمہاری پسند کی ہر چیز لے آیا ہوں: زعفرانی پلاؤ اور نان، مرغ اور تلی ہوئی مچھلی اور ربڑی۔'' اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں پرانی فصیل کے ساتھ ساتھ شہر کے باہر کار چلانے لگا۔ اس کی خاموشی پر مجھے غصہ آنے لگا تھا: ''اگر تم منہ بناؤ گی تو میں تمہیں یہیں کار سے اتار دوں گا۔'' میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ پرے پھیر کر اپنی قمیض کے دامن سے ناک پونچھی۔

''اچھا، اگر تم ایسا کرو گی تو میں تمہیں لال کنواں اتار آؤں گا۔''

ہم کشمیری گیٹ سے شہر میں داخل ہوئے اور چاندنی چوک سے گزرتے ہوئے فتحپوری مسجد تک چلے گئے۔ یہاں سے میں نے کار کو لال کنواں کی طرف موڑ لیا۔ میں نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی: ''آپ نے تو وعدہ کیا تھا......''

"میں اپنا وعدہ واپس لیتا ہوں۔ تم گھر جاؤ۔"

جب ہم ہیجڑوں کے علاقے میں پہنچے تو وہ بولی: "ہائے رام!" اس نے سیٹ سے پھسل کر میرا بایاں پاؤں دبوچ لیا اور منتیں کرنے لگی: "آپ جو چاہیں گے، میں وہی کروں گی۔ رام کے واسطے مجھے یہاں مت اتاریں۔"

"وعدہ کرو کہ نخرے نہیں کرو گی۔"

"میں ساری زندگی آپ کی داسی رہوں گی۔"

میں نے کار کی رفتار ہلکی کر لی۔ فٹ پاتھ سے دلال لپکتے ہوئے آئے: "عمدہ نئی چیزیں، بالکل تازہ......کالج گرل......تیرہ سال کی کنواری......" بھاگ متی جہاں تھی وہیں دبکی "ہائے رام......یا اللہ!" کرتی رہی۔

ہم لال کنواں سے نکل کر قاضی کا حوض پہنچے اور شہر کی فصیل سے باہر آ گئے۔

"ہم اجمیری گیٹ سے باہر آ گئے ہیں" میں نے کہا۔

اس نے سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

"حضور مذاق بہت عجیب طریقے سے کرتے ہیں!" اس نے شکوہ کیا: "اگر وہ آپ کی داسی کو آپ کی کار میں دیکھ لیتے تو اس کا گلا کاٹ دیتے۔"

"اگر تم دوبارہ منہ بناؤ گی تو میں تمہیں واپس لے چلوں گا۔"

میں نے کناٹ سرکس میں کار ایک ڈرگ سٹور پر روکی۔ میں واپس آیا تو وہ بولی: "نصیبِ دشمناں، حضور کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"محض عمر کے تقاضے!" میں نے جواب دیا۔ "ایک گولی بھوک بڑھانے کے لئے، دوسری کھانا ہضم کرنے کے لئے، تیسری گہری نیند کے لئے، چوتھی جاگنے کے لئے، پانچویں جسمانی نظام کی بہتری کے لئے۔"

میں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ اسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

چوکیدار بدھ سنگھ مجھے عورتوں کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے جاتا دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ میں اسے ہر ماہ بخشیش دیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ پاگل تھا، تاہم اس نے کبھی میرے لئے مشکل کھڑی نہیں کی تھی۔ وہ اندھیرے میں نہیں جان سکتا تھا کہ میں کسے گھر لے جارہا ہوں۔ اگرچہ وہ ایک عام سا بازاری ہیجڑا تھا، لیکن میں یوں جھینپ رہا تھا جیسے نوجوان دولہا اپنی دلہن کو گھر لاتے ہوئے جھینپ رہا ہوتا ہے۔ بھاگ متی بھی محتاط انداز سے چل رہی تھی۔

کھانے کے دوران ہم نے بہت کم باتیں کیں۔

"کسی سکھ سے سگریٹ کا پوچھنا تو بہت برا ہوتا ہے:" اس نے ڈکار مارتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے سگریٹ کا ڈبا لا دیا۔ اس نے دو سگریٹ نکالے اور ایک اپنے کان کے پیچھے رکھ لیا۔ پھر وہ انتظار کرنے لگی کہ میں دوسرے سگریٹ کو سلگا دوں۔ میں نے سگریٹ لگایا تو اس نے بیباکی سے میری آنکھوں میں دیکھا اور دھوئیں کا مرغولہ میرے چہرے پر چھوڑ دیا' پھر اسے ہاتھ ہلا کر دور کر دیا۔

میں نے نشست گاہ کا پنکھا چلا دیا اور اسے آرام سے صوفے پر لیٹنے کا کہا: "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو دروازے پر دستک دے دینا۔" یہ کہہ کر میں اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

ائیر کنڈیشنر کی دھیمی دھیمی آواز نے اپارٹمنٹ کی دوسری آوازوں کو دبا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ کیا کر رہی ہوگی۔ کیا میں نے اس کی بے عزتی کی ہے؟ چکلے میں رہتے ہوئے اسے دوسری طوائفوں کے مقابلے میں اپنے رد کر دیے جانے کی عادت ہو گئی ہوگی! بہرحال مجھے یہ بھی تو نہیں پتا تھا کہ کسی ہیجڑے کے ساتھ آدمی کو کیا کرنا چاہیے۔ اسے تو اس سہ پہر مرگی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ کیسے سوئی ہوگی؟ میں نے تو اسے کپڑے بدلنے کو بھی نہیں دیے تھے۔ کیا وہ ننگی ہوگی؟ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی۔ تاہم

میں سوچ رہا تھا کہ ننگا ہیجڑا کیسا لگتا ہوگا؟ مجھ میں جنسی عمل کی خواہش بیدار ہوگئی۔ میں نے اسے اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی۔ میں اور ایک بیمار بدشکل ہیجڑا؟ میں ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کا عریاں جسم لفظوں پر حاوی ہوگیا۔ میں سوچنے لگا کہ ہیجڑے کی چھاتیاں کیسی ہوتی ہیں؟ اس کے تناسلی اعضا کس شکل کے ہوتے ہیں؟ کیا وہ اپنی ناف کے نیچے والے بالوں کی شیو کرتی ہے؟ میں نے رسالہ پرے رکھ کر بلب بجھا دیا۔

خواب گاہ کا دروازہ کھلا۔ بیڈ لیمپ کی روشنی میں بھاگ متی کا جسم دو حصوں میں بٹا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ میرے قیاس کے مطابق اس کی چھاتیاں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس نے ہاتھوں سے رانوں کا درمیانی حصہ ڈھانپا ہوا تھا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا: "اس حقیر فقیر کے پاس آپ کی مہربانی کا صلہ دینے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

میں نے اس کے لیے اپنے پہلو میں جگہ بنائی۔ وہ منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گئی۔ میں تھوڑی دیر اس کی ناف اور پیٹ کے نچلے حصے کو تھپتھپاتا رہا۔ یوں کرتے ہوئے میں گرم ہوگیا۔ میں نے اسے کھینچ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا، اپنے تکیے کے نیچے رکھا حفاظتی غبارہ نکال کر اپنے قضیب پر چڑھایا اور اس پر سوار ہوگیا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے دخول میں مدد دی۔ اس کی یونی کسی عورت سے مختلف نہیں تھی۔ اس کے جسم سے پسینے کی بو آرہی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹ چومنے سے گریز کیا۔ وہ بھاری بھاری سانسیں لینے لگی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میں کلائمیکس پر پہنچ چکا ہوں تو ٹانگیں میری کمر کے گرد لپیٹ لیں اور کراہنے لگی۔ میں اس پر سے اتر گیا۔ مجھے اپنا آپ گندہ محسوس ہورہا تھا۔ میں نے غسل خانے جا کر دوسری مرتبہ دانتوں کو برش کیا۔ میں شاور تلے نہا رہا تھا کہ وہ غسل خانے میں آگئی۔ اس نے مجھ سے پوچھے بغیر میری ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب سے پیسٹ نکالا اور انگلیوں ہی سے اپنے دانت صاف کرنے لگی۔ جب میں

شاور بند کر کے جسم پونچھنے لگا تو اس نے شاور چلا کر نہانا شروع کر دیا۔ مجھ میں اس کی یونی کا نظارہ کر کے یہ دیکھنے کی امنگ نہیں پیدا ہوئی کہ وہ کیسی لگتی ہے۔

میں اسے غسل خانے میں چھوڑ کر بستر میں واپس آ گیا۔ میں اس سے مزید ہم بستری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنا ارادہ اس پر واضح کرنے کے لیے میں نے بیڈ لیمپ بجھا دیا۔ مجھے شاور بند کیے جانے اور غسل خانے کی بتی کا سوئچ دبانے کی آواز آئی۔ وہ آ کر میرے بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا کولون خود پر بہت زیادہ چھڑکا ہوا تھا۔ مجھے شرمندگی محسوس ہوئی اور میں نے اس کے لیے بستر پر جگہ چھوڑ دی۔

وہ اپنا سر میری بغل میں دیے کچھ دیر تو بے حرکت پڑی رہی پھر اس نے میری چھاتیوں سے کھیلنا شروع کر دیا....... پہلے اپنی انگلیوں سے' پھر زبان سے۔ اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور میرے پیٹ کو پہلے ہاتھ سے سہلایا اور پھر زبان سے چاٹنے لگی۔ اس نے اپنا عمل جاری رکھا، یہاں تک کہ میری جھجک ختم ہو گئی۔ میں نے کروٹ لے کر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سرگوشی میں بولی: ''اس کی ضرورت نہیں ہے، میں صاف ستھری ہوں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے دخول میں مدد دی اور اپنی ٹانگوں میں جکڑ لیا۔ اس نے زبان میرے کانوں پر پھیری۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پھر اس نے اپنا منہ میرے منہ سے چسپاں کر دیا۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے بو نہیں آئی۔ اس نے جنونیوں کی طرح خود کو اوپر نیچے جھٹکے دیے اور میرے لنگم کو اپنی یونی کی شدید حرکات سے اپنے اندر سمو لیا۔

میں بے دم سا ہو کر اس کے اوپر پڑ گیا۔

اس کے بعد ہم دونوں اکٹھے نہائے۔ میں نے اب تک جتنی عورتوں سے جنسی عمل کیا تھا، اس کا جسم ان سب سے ہموار تھا۔ اس کے چیچک کے دھبے اب پہلے سے زیادہ کالے دکھائی دینے لگے تھے۔ اس کے دانتوں پر پان اور تمباکو کے داغ جمے تھے۔

''آپ یوں مجھ کو کیوں تک رہے ہیں؟'' اس نے پانی کی دھار میں سے مجھے

دیکھتے ہوئے اور ستر پوشی کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں، ایسا تو نہیں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اگرچہ مجھ میں جنسی عمل کی ذرا سی بھی خواہش نہیں رہی تھی، پھر بھی میں اسے اپنے ساتھ لے کر غسل خانے سے باہر آیا اور سونے کے لیے اپنے بستر پر اپنے پہلو میں لٹا دیا۔

مجھے گہری نیند آگئی۔ رات کا ابتدائی پہر رہا ہوگا کہ مجھے ایک خواب دکھائی دیا۔ وہ حقیقت اور فنتاسی کا امتزاج تھا۔ بھاگ متی سڑک پر یوں پڑی تھی کہ اس کا سڑک پر پھیلا پیشاب میری طرف بہہ رہا تھا۔ بھاگ متی مجھے گردن سے پکڑ کر یوں گرا رہی تھی جیسے کوئی پہلوان اپنے حریف کو گراتا ہے۔ مجھے ادراک ہوا کہ یہ محض خواب نہیں ہے اور بھاگ متی حقیقت میں میرے اوپر لیٹی ہوئی ہے۔ وہ میرے کانوں کی لوؤں کو چوس رہی تھی۔ اس کا یہ عمل مجھے اپنے خوابوں کے نگر سے نکال کر اس کی دھندلی شہوانی دنیا میں لے آیا۔ وہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی تھی، جیسا برتاؤ کوئی مرد کسی عورت سے کرتا ہے۔ اس نے میری کھوپڑی کو جکڑا، میری گردن پر دانت کاٹے اور اتنی وحشت سے میرے لنگم پر کودی کہ جس سے میں کبھی آشنا نہیں رہا تھا۔ میں نے خود کو مکمل طور پر اس کی بے کراں شہوت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مجھے کمرا گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری قوتِ حیات میرے سارے جسم سے نکل کر میری رانوں کے وسط میں اکٹھی ہو رہی ہے۔ پھر وہ یوں پھوٹی جیسے کسی آتش فشاں سے لاوا پھوٹتا ہے۔ یہ تینوں جنسی عمل اتنے بھرپور تھے، گویا ایشور سے ملاپ عمل میں آگیا ہو۔ ایشور سے ملاپ کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ پاک ہونے کا ہوتا ہے، دوسرا تلاش کا اور تیسرا مرحلہ ہوتا ہے دو روشنیوں کے ایک دوسرے میں جذب ہونے کا۔ سادہ لفظوں میں اسے بیان کیا جائے تو پہلا مرحلہ مشت زنی، دوسرا مرحلہ جنسی اختلاط اور تیسرا مرحلہ جسموں کے ملاپ کا ہے۔ تاہم میں ہنوز لاعلم تھا کہ بھاگ متی جیسا ہیجڑا کسی چھاتیوں سے عاری عورت سے کس

طرح مختلف ہے۔

صبح کے پانچ بجے تھے۔

جب وہ ساڑھی پہن رہی تھی تو میں نے بک شیلف کے پیچھے پوشیدہ سیف میں سے دس روپے کے نوٹوں کا بنڈل نکالا۔

''یہ کیا ہے؟'' جب میں نے نوٹ اس کو دیے تو وہ حیرت سے بولی۔

اس نے نوٹ گنے اور بولی: ''ایک سو روپے! آپ کو مجھے پیسے تو نہیں دینے تھے۔'' اتنا کہنے کے بعد اس کا ارادہ شاید بدل گیا اور وہ تیزی سے بولی: ''میں اپنے خاوند کی دی ہوئی کسی شے کو لینے سے انکار نہیں کرسکتی۔ ہے نا؟''

''بے شمار خاوند!'' میں نے جملہ کسا۔

اس نے بازو میری گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا: ''اللہ گواہ ہے، آج کے بعد سے صرف آپ میرے خاوند ہوں گے۔ آپ نے مجھ پر بہت مہربانیاں کی ہیں۔''

میں نے اس کی بانہوں میں کو ہٹاتے ہوئے کہا: ''چلو چلیں۔''

''کیا آپ کو مجھ پر یقین نہیں آیا؟'' اس نے سوال کیا۔ اس نے روپے دوبارہ گن کر مجھے واپس کردیے: ''ٹھیک ہے، میں اپنے خاوند کو دینے کے لیے دس روپے رکھ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ میں موجود روپوں میں سے دس روپے کا ایک نوٹ لے لیا۔ ''باقی میرے لیے رکھ لیجیے۔ میں انھیں کسی اور دن لینے آؤں گی۔''

میں نے باہر دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں۔ بدھ سنگھ اپنی چارپائی پر پڑا گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ہم دبے قدموں اس کے پاس سے گزر کر کار میں بیٹھ گئے۔ کار سٹارٹ ہونے کی آواز سے بھی چوکیدار بدھ سنگھ کی نیند نہیں ٹوٹی۔ ہم بآسانی وہاں سے نکل گئے۔ ہم سنسان کناٹ سرکس سے گزر کر منٹو برج سے گزرتے ہوئے اجمیری گیٹ پہنچ گئے۔

''مجھے یہیں اتار دیجیے۔'' بھاگ متی نے سٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھتے ہوئے

کہا۔

میں نے کار روک کر دروازہ کھول دیا۔ اس نے میرا ہاتھ دبایا: ''آپ کی داسی آپ کی بے حد شکر گزار ہے۔ مجھے بھلایئے گا نہیں۔'' پھر وہ ننگے پاؤں سنسان سڑک کے بیچوں بیچ چلنے لگی۔

بھاگ متی نے مجھ سے میرا نام تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس نے میرے اپارٹمنٹ یا بلاک کا نمبر بھی نہیں پوچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ اپنی رقم لینے کے لیے دوبارہ کس طرح پہنچے گی؟ جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں اسے ڈھونڈنے کے لیے ہیجڑوں کے علاقے لال کنواں میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں سوچنے لگا کہ شاید بھاگ متی ویسی طوائف نہیں ہے، جیسا کہ میں نے اسے پہلے سمجھا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ گزاری ہوئی ایک رات کی یاد آئی تو دل ملول سا ہو گیا۔ مجھے اسے دوبارہ دیکھنے کی امید بالکل نہیں رہی تھی۔

بھاگ متی جس انداز سے دوبارہ میری زندگی میں آئی، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ دیوتا مجھے تماشا بنا رہے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی کا معمول بحال کر لیا تھا۔ صبح کے وقت چند گھنٹے کام میں صرف کرتا، سہ پہر کے وقت گولف کلب کا چکر لگاتا، شام کو کاک ٹیل پارٹی میں شرکت کرتا اور رات کو دیر گئے ڈنر کرتا۔ انسان دلی میں سال کے 365 دن لوگوں کے خرچ پر شراب پی اور ڈنر کر سکتا ہے۔ میں زیادہ وقت سفارتی حلقے میں گزارتا تھا۔ میں اپنی مطلوبہ خوراک اور شراب سفارت کاروں سے حاصل کر لیتا تھا۔ کناٹ سرکس میں سکاچ کی بوتل ڈیڑھ سو روپے کی ملتی تھی، اس کے کریٹ مجھے تیس روپوں میں یا بالکل مفت مل جاتے تھے۔ دلی میں سو سے زیادہ سفارتی عملے کے افراد خارجہ امور کے افسروں اور ہندوستانی حکومت کے وزیروں سے ربط ضبط بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

میرے جیسے کسی شخص کے لیے ان میں سے کسی اکتائی ہوئی بیوی یا ہندوستانیوں کو جاننے کے خواہاں کسی شخص کو واقف بنالینا اور اس کے ذریعے باقاعدگی سے اپنی مے نوشی اور جنسی ضروریات کی تکمیل کرنا مشکل نہیں تھا۔

جس زمانے میں مجھے بھاگ متی سڑک پر ملی تھی، میں مغربی جرمنی کے سفارتخانے کی ایک سٹینوگرافر کو اپنے دام میں پھانس رہا تھا۔ اس سے میری ملاقات ایک قونصلر کے استقبالئے میں ہوئی تھی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہ ابھی حال ہی میں ہندوستان آئی ہے اور ہندوستانیوں سے واقفیت پیدا کرنے کی بے حد مشتاق ہے۔ وہ زیادہ دلکش نہیں تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ آنکھیں خاکستری، ہونٹ پتلے پتلے، قد لمبا اور جسم دبلا تھا۔ وہ اپنے بال سختی سے باندھے رکھتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ درشت سی دکھائی دیتی تھی۔

☆☆☆

میں نے فرالین ارما ویسکرمان کو بآسانی زیر کرلیا۔ ایک اتوار میں نے اسے دلی کی تاریخی یادگاریں دکھائیں اور اس کے اپارٹمنٹ میں جرمن بیئر پی۔ اگلے اتوار میں نے اسے لال قلعے کی سیر کرائی اور موتی محل میں ڈنر کرایا۔ چونکہ ریستورانوں میں الکوحل مہیا کرنا ممنوع تھا، اس لیے میں ایک ہپ فلاسک (Hip-Flask) میں ہندوستانی وسکی لے آیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ ویٹر کی نظر ہم پر سے ہٹی ہوئی ہے تو میں نے ڈھیر ساری وسکی اس کی کوک میں ملادی۔ میں نے اسے بتایا کہ سکاچ اتنی مہنگی ہے کہ ایک ہندوستانی مقامی وسکی پر ہی اکتفا کرسکتا ہے۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گئی۔ (سفارت کاروں پر یہ حربہ ہمیشہ کارگر رہتا ہے)۔ اس کے بعد میں نے جب بھی اسے اپنے گھر مدعو کیا یا اُسے باہر لے گیا، وہ ہمیشہ اپنے ساتھ سکاچ کی ایک بوتل لے کرآئی۔

فرالین ویسکرمان کو جنس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جنسی کشش سے عاری سراپے کی وجہ سے اس میں دفاعی میکانزم کے طور پر ایک درشتی سی پیدا ہوگئی تھی۔ جب

میں نے پہلی مرتبہ اس کی کمر کے گرد بازو ڈالے تو اس نے کہا: "کیا تم ضرور ایسا کرو گے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔" اس کے بعد سے جب بھی میں اس کے دبلے پتلے رخسار کا بوسہ لیتا تو وہ چہرا آگے کر دیا کرتی تھی۔ ایک شام میں نے اسے کہا: "ارما! میں تمہیں بہت زیادہ پسند کرنے لگا ہوں۔" اس نے جواب میں مجھے چومتے ہوئے کہا: "یہ تو بہت اچھا ہے۔" ایک اور موقعے پر میں نے اسے کہا۔ "ارما! بات بڑی تہلکہ خیز ہے، شاید میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔" کوئی عورت ایسی نہیں ہے، جو اس کے بعد موم نہ ہو۔ اس نے پوچھا: "تم اس سے پہلے یہ بات کتنی عورتوں سے کر چکے ہو؟" ساتھ ہی اس نے مجھے اپنے ہونٹوں کو چومنے بھی دیا۔

ہمارا تعلق دھیرے دھیرے مزید قربت میں ڈھلتا گیا اور ہر مرتبہ ہمارے درمیان حجابات کم سے کم ہوتے گئے۔ جلد ہی یہ مرحلہ بھی آ گیا کہ میں اس کی چھاتیوں سے کھیل رہا تھا۔ ایسا کب تک ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت اپنی چھاتیوں سے کھیلنے دے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر مرد کے حوالے نہ کر دے؟ میرے ہاتھ مزید آگے بڑھ گئے۔ تاہم جب میرا ہاتھ اس کی یونی کی طرف بڑھتا تو وہ اپنی خاکستری آنکھیں کھول دیتی اور سختی سے کہتی: "نہیں۔" بہر حال میں جانتا تھا کہ اس کی یہ مزاحمت زیادہ دیر نہیں رہے گی۔ پھر ایک شام جب میں اس کی رانوں کے درمیانی حصے کو سہلا رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ جنسی عمل کے لیے آمادہ ہے۔ میری بات سن کر اس کے سارے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا: "ایسا بالکل بھی نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے اس سے معذرت کی اور یوں ظاہر کیا کہ جیسے میں مغموم ہوں۔ "کوئی بات نہیں۔ غلطی میری ہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میرے ہونٹوں کو اس طرح چوما کہ میرے کانوں کی لویں تک سلگنے لگیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگلی ملاقات میں وہ میری بات ضرور مان جائے گی۔

یہ بھاگ متی سے ملاقات کے دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ فرالین ویسکر مان میرے اپارٹمنٹ میں میرے ساتھ رات کا کھانا کھا رہی تھی۔ ایک مخصوص بیگانگی، اونچی آواز میں گفتگو اور جبری قہقہے اس امر کے غماز تھے کہ وہ "ہاں" کہنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ ہم کھانے کے دوران اس کی لائی ہوئی سکاچ کی بوتل ختم کر چکے تھے۔ میری فرمائش پر اس نے کافی میں کونیک شراب ملا کر پی۔ جونہی میرا باورچی رخصت ہوا، ہم صوفے پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کرنے لگے۔ میں نے اسے بازوؤں میں بھر کر سرگوشی میں پوچھا: "کیا وصال ہوگا؟" اس نے بھی سرگوشی میں کہا: "جیسی تمہاری مرضی۔ بس ذرا مجھے اپنے آپ کو تیار کرنے دو۔"

وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر غسل خانے میں چلی گئی۔ میں نے خواب گاہ کا ائیر کنڈیشنر چلا دیا۔ ویسکر مان میرا ڈریسنگ گاؤن پہنے نمودار ہوئی۔ وہ شرما رہی تھی۔ کہنے لگی: "مجھے مت تکو۔ پلیز بتی بجھا دو۔"

میں ہنسنے لگا۔ میں نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈالے اور بولا: "ایک ہندوستانی کہاوت ہے کہ دائی سے پیٹ چھپایا نہیں جاتا۔ اگر تم جنسی عمل کرنے لگی ہو تو تمہیں ننگا تو ہونا پڑے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ننگا کر دیا اور بستر پر لے گیا۔

فرالین ویسکر مان نے پشت کے بل لیٹ کر رانیں کھول دیں۔ میں نے دخول کیا۔ مجھ پر زیادہ شہوت طاری نہیں ہوئی تھی۔ وہ کنواری نہیں تھی۔ وہ مرطوب تو تھی لیکن زیادہ پرجوش نہیں تھی۔ اس کے منہ سے صرف ایک کراہ نکلی......آہ......اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ہم کوئی لفظ بولے یا کوئی حرکت کیے بغیر ایک دوسرے سے لپٹے پڑے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اس عمل سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ جنسی عمل بھاگ متی کے ساتھ کیے گئے جنسی عمل سے کتنا مختلف ہے!

ائیر کنڈیشنر کی آواز میں مجھے دروازے کی گھنٹی سنائی دی۔ میں متوجہ ہو گیا۔ گھنٹی

دوبارہ بجی۔ ''دروازے پر کوئی ہے۔'' فرالین نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا: ''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' پھر اسے تسلی دیتے ہوئے میں نے کہا: ''فکر کی کوئی بات نہیں۔''

اُس نے مجھے اپنے اوپر سے ہٹاتے ہوئے کہا: ''ہو سکتا ہے ٹیلیگرام آیا ہو یا ایسی کوئی اہم بات ہو۔''

میں نے اٹھ کر ڈریسنگ گاؤن پہنا اور دبے پاؤں دروازے پر پہنچا۔ میں نے ایک درز سے باہر جھانکا۔ وہ بھاگ متی تھی۔

گھنٹی مسلسل بجنے لگی۔ میں دبے پاؤں واپس گیا۔ فرالین ویسکرمان اٹھ کر بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے احمقانہ انداز میں جواب دیا: ''ایک عورت۔ میں نے اس کے کچھ پیسے ادا کرنے ہیں۔''

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا: ''کسی مرد سے ملنے کا کیا خوب وقت ہے یہ!''

میں نے کہا: ''ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ بیمار ہے۔ ایک صبح وہ مجھے ایک سڑک پر پڑی ملی تھی......''

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

''میں بہت بے وقوف ہوں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے کپڑے اٹھائے اور غسل خانے میں چلی گئی۔ وہ پورا لباس پہنے غسل خانے سے نکلی: ''آپ کو پہچان کر خوشی ہوئی مسٹر سنگھ! خدا حافظ۔'' اس نے دروازہ کھولا اور متحیر بھاگ متی کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کر بولی: ''ایکسکیوزمی، میڈم!'' اس کے بعد وہ اپنی واکس ویگن کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے صوفے پر ڈھیر ہو کر چہرا ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ میں نے دروازہ

بند ہونے اور پھر بھاگ متی کی آواز سنی: ''اگر آپ کی داسی سے مخل ہونے کی خطا ہوئی ہے تو وہ انتہائی معذرت خواہ ہے۔''

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور کہا: ''کیا تمہیں آنے کا کوئی اور بہتر وقت نہیں مل سکتا تھا؟''

''حضور! آپ کی داسی کو مصری سفارتخانے میں بلایا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی سی رقم عالی جناب کے پاس رکھوا دیتی ہوں اور ساتھ ہی اپنی عاجزانہ خدمات بھی پیش کرتی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے حضور کو ناراض کر دیا ہے۔ لہٰذا مجھے آپ کی نظروں سے دور ہونے سے پہلے معافی ضرور مانگنی چاہیے۔''

وہ میرے قدموں میں بیٹھ کر میری ٹانگیں دبانے لگی۔ اس نے میری رانوں کو اندرونی جانب سے دباتے ہوئے کہا: ''آپ کی داسی ذرا سی نظروں سے کیا اوجھل ہوئی آپ اس سے بے وفائی کرنے لگے!'' پھر اس نے شوخ لہجے میں پوچھا: ''یہ زرانے جیسی عورت کون تھی؟''

''بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

''ارے!'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک لمبے ایک عورت کے ساتھ، دوسرے لمبے دوسری عورت کے ساتھ۔''

☆☆☆

آج جون کی پندرہ تاریخ ہے۔ دلی میں مون سون سے پہلے کی پہلی ہلکی بارش ہو چکی ہے۔ بارش نے پچھلے تین دن سے فضا میں معلق گرد سے فضا کو صاف کر دیا ہے۔ تازہ ہوا نے نیلے آسمان پر برف جیسے سفید بادل پھیلا دیے ہیں۔ زمین مہک رہی ہے۔ ہوا مزید بارش کا پتا دے رہی ہے۔ اس طرح کے دن کوئی شخص گھر میں کیسے رہ سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ مہرولی جانا چاہیے یا اوکھلا۔ مہرولی میں قطب مینار، چمن، یادگاریں اور ایکڑوں پر محیط آم کے باغات ہیں۔ اوکھلا میں یادگاریں تو نہیں البتہ پانی

بہت ہے، یہاں دریائے جمنا سے ایک نہر نکلتی ہے۔ مون سون کے موسم میں اس دریا کا نظارہ انسان کو مرعوب کر دیتا ہے۔ ایسے میں وہ ترئی یم یعنی ہیڈیز کی بہن ہوتا ہے۔ خود کشی کے آرزومند دلی والے مون سون کے موسم میں اوکھلا آ کر خود کو جمنا کی بانہوں میں دے دیتے ہیں۔ زندگی کے آرزومند آموں سے بھری ٹوکریاں لے کر آتے ہیں۔ وہ آم چوستے ہیں اور مقابلہ لگاتے ہیں کہ وہ آموں کی گٹھلیوں کو دریا میں کتنی دور پھینک سکتے ہیں۔ مہرولی ہو یا اوکھلا تمہیں لطف اندوز ہونے کے لیے اپنی معشوقہ کو ضرور لانا چاہیے؟ ایسی معشوقہ جس کے کان میں تم یہ سرگوشی کر سکو کہ "میں بارش میں تمہارے ساتھ جنسی عمل کرنا چاہتا ہوں، یہاں تک کہ تمہارا نچلا حصہ کیچڑ سے اور میرا مون سون سے بھر جائے۔"

میں نے باہر تانگہ رکنے کی آواز سنی۔ میں نے تانگے والے اور مسافر کے بیچ تکرار سنی۔ تانگے والے نے چیخ کر کہا: "تانگہ چلانے سے زیادہ پیسہ جسم فروشی میں ہے۔"

مسافر نے زیادہ اونچی آواز میں کہا: "ابے جا! تمہارا جسم کون خریدے گا! تمہاری گندی....... میں تو کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔"

اس کے گھنٹی بجانے سے ہی پہلے میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔ وہ کولھے مٹکاتی اور تانگے والے کو گالیاں بکتی ہوئی اندر آتی ہے: "سالا، بھین.......! میں نے اس بھین.......کو لال کنواں سے یہاں تک کا کرایہ ایک روپے دیا ہے اور وہ مجھ سے مزید پیسے اینٹھنا چاہتا ہے۔ اس سنسار میں انصاف تو ہے ہی نہیں۔" پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "کیا یہ بھی کوئی ایسا دن ہے کہ آپ پردہ پوش عورتوں کی طرح گھر میں گھسے بیٹھے ہیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ مجھے اپنی موٹر کار میں باہر لے جا کر تازہ ہوا اور آم کھلانا پسند کریں گے۔"

میں تو باہر نکلنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوتا ہوں۔ بھاگ متی سے بہتر کون ایسا ہو سکتا

ہے کہ میں جس کی رفاقت پسند کرتا۔ اس نے سرخ اور نیلی ساڑھی باندھی ہوتی ہے اور اس کا سر تتلیوں کا گھونسلہ دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ میں اس حلیے میں تو اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ میں اس کے لیے دو پتلونیں اور کھلے کالر والی ایک شرٹ خرید لایا تھا، جو اس نے میرے اپارٹمنٹ ہی میں رکھ چھوڑی تھیں۔

''میں اپنے ولایتی کپڑے پہن لوں۔'' اس نے میری خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

وہ چہرا دھو کر پوڈر، غازہ اور لپ سٹک صاف کر دیتی ہے، بالوں میں سے تتلی کی شکل کے کلپس نکال کر کنگھی سے بال سیدھے کرتی ہے اور بالوں کو سر کے پیچھے اکٹھا کر کے جوڑا باندھ لیتی ہے۔ اب وہ ایک مختلف بھاگ متی ہوتی ہے۔ آدھے بازوؤں والی سپورٹس شرٹ اور تنگ پتلون میں وہ بہت دلکش دکھائی دینے لگتی ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ ایک ہیجڑا ہے یا لڑکی جیسا دکھائی دینے والا لڑکا۔

ہماری بات چیت کا آغاز بحث سے ہوتا ہے۔ بھاگ متی کہتی ہے: ''آج تو اوکھلا کی سیر کا دن ہے۔ بارش ہوتی ہے تو سارا جہان آم چوسنے بند پر جاتا ہے۔''

''نہیں، ہم اوکھلے نہیں جائیں گے،'' میں جواب دیتا ہوں: ''مجھے بھیڑ بھاڑ پسند نہیں ہے، پنجابیوں کا ہجوم تو بالکل پسند نہیں ہے۔ وہاں تو چیختا چلاتا، بے ہودہ طریقے سے کھاتا پیتا اور ہر طرف گند بکھیرتا ہوا ایک ہجوم ہوگا۔''

''اگر آپ کو میرے ساتھ دیکھے جانے سے شرمندگی ہوتی ہے تو میں موٹر کار ہی میں رہوں گی،'' بھاگ متی کہتی ہے۔

یہ بات سچ ہے۔ تاہم میں اس کا دن غارت نہیں کرنا چاہتا۔ ''گورو کی سوگند یہ بات نہیں ہے! اوکھلا میں لوگ بہت زیادہ ہوتے ہیں، بہت زیادہ بندر، بہت زیادہ سانپ ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے پانچ سانپ مارے تھے۔ یکے بعد دیگرے پانچ سانپ!''

سانپ فیصلہ مہرولی کے حق میں کروا دیتے ہیں۔

مہروی جانے والی سڑک پر سائیکلوں، تانگوں، سکوٹروں، کاروں اور پیدل چلتے لوگوں کا نہ ختم ہونے والا جلوس رواں ہوتا ہے۔ ہر شخص یا تو اونچی آواز میں ہُو، ہُو کر رہا ہوتا ہے یا فلمی گانے گا رہا ہوتا ہے۔

پردہ دار عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی ایک دو پہیوں والی کھلی بگھی ہجوم کو چیرتی ہوئی آتی ہے اور ہمارے پاس سے گزر جاتی ہے۔ کوچوان نے اپنا چابک پہیوں میں اڑایا ہوا ہوتا ہے، جس سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز پیدا ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ پکار کر ہر ایک کو اپنے راستے سے ہٹ جانے کا کہہ رہا ہوتا ہے۔ ایک سائیکل پر لدے ہوئے ایک سکھ میاں بیوی اور ان کے چار بچے بگھی کی زد میں آکر گرتے گرتے بچتے ہیں۔ سکھ حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک مسلمان خاندان کے لیے غلیظ ترین گالی نکالتا ہے: "سور کی اولاد! کیا تم ہمیں مارنا چاہتے ہو؟" برقعوں کے انبوہ میں سے اک نوجوان ابھرتا ہے۔ وہ ازاربند کھول کر اپنا ختنہ زدہ قضیب باہر نکالتا ہے اور چیخ کر کہتا ہے: "ابے سکھڑے! حرامی! کیا تو میرے قطب مینار پر بیٹھنا چاہتا ہے؟"

اس کا قطب مینار محض ڈھائی انچ کا ہوتا ہے جبکہ حقیقی قطب مینار 283 فٹ کا ہے!

بھاگ متی بے تحاشا ہنسنے لگتی ہے: "کتنا ذرا سا...... ہے اس کا! ہندوؤں کے گائے کے دم جیسے...... سے تو بہت اچھا ہے۔ کیا آپ نے ختنہ کروایا ہے؟"

"تمہیں پتا تو ہے۔"

"ایستادہ ہوں تو سب ایک سے لگتے ہیں۔ اگلی مرتبہ میں تب دیکھوں گی جب وہ ایستادہ نہیں ہوگا۔"

ہم قطب مینار پہنچ جاتے ہیں۔ کار پارکنگ لاٹ کاروں سے بھرا ہوتا ہے، باغات لوگوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے ہوتے ہیں کہ کہاں جائیں

تیز بارش شروع ہو جاتی ہے اور ہر شخص سائبان ڈھونڈنے دوڑتا ہے۔

''یہاں نہیں رکنا،'' میں کار آگے بڑھا دیتا ہوں۔ ہم میٹکاف مینشن کے کھنڈر اور جمالی کمالی مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے مہرولی قصبے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ میں اولیا مسجد کے ساتھ واقع کار پارکنگ میں کار کھڑی کر دیتا ہوں۔ تیز بارش پھوار میں بدل چکی ہوتی ہے۔ شمسی تالاب اور پھوار گویا ایک ہو جاتے ہیں۔ ہم کار میں بیٹھے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ بھاگ متی سیٹ سے نیچے پھسل کر میری ٹانگیں کھول دیتی ہے۔ میں گھبرایا ہوا ہوتا ہوں۔ کسی بھی لمحے کوئی بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ سکتا ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

''یہاں نہیں'' میں اس کا سر پرے ہٹاتے ہوئے کہتا ہوں: ''ہم یہ کام جہاز محل میں کریں گے۔''

میں کار کو چند فٹ مزید آگے لے جا کر جہاز محل کے پاس کھڑا کر دیتا ہوں۔ میں بھاگ متی کو سیڑھیوں سے نیچے فرش پر لے جاتا ہوں' جس کی سطح تالاب کے پانی کی سطح کے برابر ہوتی ہے۔ میں بھاگ متی کو بازوؤں میں لے کر اتنے زور سے دباتا ہوں کہ اس کا سانس رک سا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہے: ''کیا آپ میری ہڈیاں توڑنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ مجھے مار دینا چاہتے ہیں؟''

''اگر تم یہاں مر گئیں تو سیدھی سورگ میں جاؤ گی۔''

''اچھا جی! اب آپ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں! میں جا کر انھیں بتا دوں گی کہ مجھے میرے عاشق نے مارا تھا۔ بھگوان میرے پاپ معاف کر دے گا۔ میں اگلا جنم اندرا گاندھی کے روپ میں لوں گی اور ہندوستان کی عالمی شہرت یافتہ بیٹی بن جاؤں گی۔''

ہم اپنا شغل دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کا ایک کان' ایک آنکھ اور آدھا ذہن جنسی عمل میں محو ہو اور ایک کان' ایک آنکھ اور آدھا ذہن کسی اچانک آنکلنے والے کی طرف لگا ہو تو جنسی عمل زیادہ پر لطف نہیں رہتا۔ ہم دو مرتبہ جلدی جلدی جنسی

عمل کی کوشش کرتے ہیں لیکن دونوں مرتبہ سیڑھیاں اُترنے کی آوازیں خلل ڈال دیتی ہیں۔ وہاں اتنی ناکافی روشنی ہوتی ہے کہ کوئی بتا نہیں سکتا کہ بھاگ متی لڑکا ہے یا لڑکی...... یا دونوں ہی۔ ہندوستان کے لوگ ایک دوسرے سے لطف اندوز ہونے والے لوگوں کے حوالے سے بہت سمجھدار ہوتے ہیں۔ جب سیدھے سیدھے جنسی عمل کا معاملہ ہوتب ہی اس پر امتناع لگایا جاتا ہے۔

ہم یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے ہمیں آثار قدیمہ، تاریخ، اور فنِ تعمیر میں بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ میں دیا سلائیاں جلا جلا کر ٹائلوں کا معائنہ کرتا ہوں اور پتھر پر کندہ کی گئیں تحریروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھوار مسلسل پڑ رہی ہوتی ہے۔ سیسے جیسے آسمان پر کوئی شگاف دکھائی نہیں دیتا۔ ہم دیا سلائیوں کی روشنی میں اندھیرے کونوں کا معائنہ کرتے ہوئے ترخانوں میں گھومتے رہتے ہیں۔

مجھے فرش پر ایک پتھر پڑا ہوا ملتا ہے، جس پر کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ میں اسے اٹھا کر روشنی میں دیکھتا ہوں۔ اس کے اوپری حصے پر سواستیکا اور دونوں پہلوؤں پر کنول کے پھول اور عربی میں لفظ ''اللہ'' کندہ ہوتے ہیں۔ نیچے فارسی میں لکھا ہوتا ہے:

''مسدی لال کائیستھ ولد چکن لال کائیستھ، مرید وحلقہ بگوش پیر حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی' جن کی دعا سے مجھے ایک بیٹا کمل کائیستھ عطا ہوا۔ درزمانہ سلطان غیاث الدین بلبن، شاہ شاہاں، شہنشاہ ہندوستان۔''

❀❀❀

مُسدّی لال

میں یعنی مسدی لال ولد لالہ چکن لال' ہندو کائستھ دلی شہر کے علاقے مہرولی کا رہنے والا ہوں۔ میری ایک آنکھ موتیا بند کی وجہ سے ضائع ہو چکی ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ دوسری آنکھ کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے۔ ذیل میں مَیں خود پر بیتنے والے کچھ واقعات درج کر رہا ہوں۔ میں ایشور اور اللہ، رام اور رحیم کو حاضر ناظر جان کر حلفاً کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے، وہ سچ ہے اور میں نے کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔ میں 633 ہجری بمطابق 1265 عیسوی میں پیدا ہوا۔ اسی سال سلطان غیاث الدین بلبن تخت نشیں ہوا۔ میرے آباؤ اجداد دلی کے حکمرانوں کی خدمت بجا لاتے رہے تھے۔ انہوں نے راجپوت راجہ اننگ پال کی خدمت کی' جس نے لال کوٹ بسایا اور شہر کے درمیان وشنو بھگوان کا آہنی ستون نصب کروایا۔ انھوں نے راجہ پرتھوی راج چوہان کی بھی خدمت کی، جس نے شہر کو قلعہ رائے پتھورا کا نام دیا۔ جب محمد غوری نے راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر قتل کر دیا اور دلی کا حکمران بن گیا تو میرے آباؤ اجداد نے ترکی، عربی اور فارسی کا علم حاصل کیا اور نئے حکمران کی خدمت کرنے لگے۔ میرے پڑدادا نے سلطان قطب الدین ایبک کی خدمت کی۔ اس نے جامعہ مسجد کو اپنی آنکھوں

کے سامنے تعمیر ہوتا دیکھا۔ بعد ازاں اس مسجد کو قوت الاسلام کا نام دیا گیا۔ اس نے فتح کے مینار "قطب مینار" کو بھی تعمیر ہوتے دیکھا۔ میرے دادا نے قطب الدین کے داماد اور جانشین سلطان التمش کی خدمت کی۔ میرے دادا نے شمسی تالاب کے لیے مزدوروں کی طرح زمین کھودی اور قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کی تعمیر کے لیے پتھر ڈھوئے۔ اس نے 1220ء میں قطب مینار کی تعمیر مکمل ہوتے دیکھی۔ میرے دادا نے شمسی تالاب کے پاس وہ گھر تعمیر کروایا تھا، جس میں میں نے جنم لیا اور اپنی بیشتر زندگی بسر کی۔ اس نے التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کی بھی خدمت کی تھی جو ہندوستان پر ساڑھے تین سال تک حکمران رہی تھی۔ میرا باپ لالہ چکن لال غیاث الدین بلبن کے دور میں مہرولی کی کوتوالی میں محرر تھا۔ اس نے 1265ء سے 1287ء تک ملازمت کی۔ (میرا باپ 1280ء میں فوت ہوا تھا)۔

اپنے کائستھ آباؤ اجداد کی طرح مجھے بھی وقائع نگاری کی تربیت دی گئی تھی۔ ایک پنڈت نے مجھے سنسکرت اور ہندی پڑھائی۔ میرے والد کے اثر رسوخ کی وجہ سے مجھے ایک مدرسے میں داخلہ مل گیا' جہاں میں نے عربی' ترکی اور فارسی پڑھی۔ پہلے پہل تو ترک لڑکوں اور نومسلم ہندوؤں کے بیٹوں نے میرے ساتھ برا سلوک کیا، تاہم جب میں نے ترکی بولنا اور ترکوں کے جیسا لباس پہننا سیکھ لیا تو انھوں نے مجھے تنگ کرنا چھوڑ دیا۔ مولوی صاحب نے مجھے ہراساں کیے جانے سے محفوظ رکھنے کی خاطر میرا ایک مسلم نام، عبداللہ، رکھ دیا۔ لڑکے مجھے عبدل کہتے تھے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ میری منگنی متھرا میں رہنے والے سات افراد پر مشتمل خاندان کی ایک لڑکی سے کر دی گئی۔ جب ہماری شادی ہوئی تو میری عمر صرف نو سال تھی جبکہ میری بیوی رام دلاری کی عمر صرف سات سال تھی۔ چار سال بعد' کہ جب میں ہم بستری کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تھا' میرے والدین نے میری شادی کا انتظام کرنے والے نائی کو متھرا بھیج کر میری بیوی کو بلوا لیا۔ بعض وجوہات کے تحت،

جن کی وضاحت میں آگے چل کر کروں گا، اس کے والدین نے ہماری خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر ہمارا خاندان المیوں کا شکار ہو گیا۔ پہلے میرا باپ فوت ہوا اور اس کے چند دنوں بعد میری ماں بھی فوت ہو گئی۔ میں تیرہ سال کی عمر میں دنیا میں اکیلا رہ گیا۔

کوتوال صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے۔ جب وہ تعزیت کرنے آئے تو انھوں نے مجھے میرے باپ والی ملازمت پیش کی۔ اسی زمانے میں میرے مسلم دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں اسلام قبول کر لوں تو میرا مستقبل زیادہ روشن ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ممکن ہے تم مہرولی کے کوتوال بن جاؤ۔ شادی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اگر میری قسمت اچھی ہوئی تو ممکن ہے کسی ترک، ایرانی یا افغان بیوہ یا مطلقہ سے شادی ہو جائے۔

مجھے نہیں علم کہ کیا تھا، بہر حال کچھ تھا، کہ جس نے مجھے تبدیلیٔ مذہب سے روکے رکھا۔ میرا خیال ہے کہ میری بیوی کے والدین نے اسے میرے پاس بھیجنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ افواہ پھیل چکی تھی کہ میرے والدین نے مسلمانوں والے طور طریقے اپنا ہوئے ہیں۔ اگر میں مسلم ہو جاتا تو وہ کہتے: "دیکھا ہم نہ کہتے تھے؟ ہم اپنی بیٹی کسی ملیچھ کے حوالے کیسے کر سکتے تھے؟"

میری ماں کے سوگ کے آخری دن میری بیوی کا چچا مجھ سے تعزیت کرنے متھرا سے آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ میں نے سر منڈوایا ہوا تھا، مقدس دھاگہ پہنا ہوا تھا اور برہمنوں کی سیوا کرتا تھا۔ میں نے نائی سے کہا کہ وہ اسے میری بیوی کو بھیجنے کا کہے۔ چچا نے کوئی بات نہ کی اور متھرا واپس چلا گیا۔ چند دن انتظار کرنے کے بعد میں کوتوال صاحب کے پاس چلا گیا۔ کوتوال صاحب نے مجھ سے میری بیوی کے والدین کے خلاف رپٹ لکھوائی کہ وہ میرے ازدواجی حقوق پورے نہیں ہونے دے رہے۔ انہوں نے یہ رپٹ فوری کارروائی کی سفارش کے ساتھ متھرا کے کوتوال کو بھجوا

دی۔ انھوں نے لکھا کہ اگر متعلقہ خاندان کسی قسم کا اعتراض کرے تو انھیں گرفتار کر کے مہرولی بھیج دیا جائے۔

ایک ہفتے بعد میری بیوی اپنی چھوٹی بہن اور چچا کے ساتھ میری دہلیز پر پہنچ گئی۔ چند دنوں بعد اس کی بہن اور چچا متھرا واپس چلے گئے۔

رام دلاری ایک ہندو بیوی کی طرح رہنے لگی۔ وہ ہر صبح میرے چرن چھوتی اور اپنی مانگ میں سیندور بھرتی۔ مگر وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ اگر میں اسے دلاسا دینے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا تو وہ بدک کر مجھ سے پرے ہو جاتی تھی۔ ایک رات میں اس کے بستر پر گیا تو اُس نے چیخنا شروع کر دیا۔ ہمارا پڑوسی جاگ گیا اور چھت پر سے پکار پکار کر پوچھنے لگا کہ خیر تو ہے نا۔ میری بڑی سبکی ہوئی۔

ایک ماہ گزر جانے کے بعد بھی مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسی دکھائی دیتی ہے، کیونکہ وہ ہر وقت اپنا چہرا دوپٹے کے پلو سے ڈھانپے رکھتی تھی۔ میں نے اس کی گردن اور ہاتھوں سے اندازہ لگایا کہ اس کا رنگ صاف ہے۔ اس کی چھاتیاں بھرپور اور کولہے گول گول تھے۔

مجھے اس حقیقت کو جاننے میں کئی ہفتے لگ گئے کہ میری بیوی میرے ساتھ ہم بستری نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اپنا کھانا الگ چولھے پر پکاتی اور اپنے ساتھ لائے ہوئے برتنوں میں کھاتی تھی۔ وہ مجھے مسلم ملیچھ سمجھتی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ جبراً ہم بستری کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی پٹائی بھی کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے ماں باپ کے گھر واپس جانا چاہتی ہے؟ اس نے کہا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر اس صورت میں جائے گی کہ میں اپنے گھر سے اسے نکال دوں یا پھر اس گھر سے اس کی ارتھی ہی نکلے گی۔ اب بھلا میں کیا کرتا؟ کیا میں کوتوال صاحب سے جا کر کہتا کہ وہ میری بیوی کو حکم دیں کہ وہ میرے لیے اپنی ٹانگیں کھول دے! رفتہ رفتہ میں اپنی تقدیر پر شاکر ہو گیا۔ ہم ایک چھت تلے تو سوتے لیکن ایک چارپائی پر

بالکل نہیں۔

ایک صبح میں رام دلاری کو قطب مینار دکھانے لے گیا۔ ہم پہلی منزل تک چلے گئے، جہاں سے میں نے اسے قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مزار اولیا مسجد اور اپنا چھوٹا سا مکان دکھایا۔ میں نے اسے مسجد قوت الاسلام بھی دکھائی۔ اس نے مسجد میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر وہ ایک ستون سے لگ کر رونا شروع ہو گئی۔ کافی لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہو اور اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے آگے لے گیا۔ اگر میں نے مسلمانوں جیسے کپڑے نہ پہنے ہوئے ہوتے اور اگر رام دلاری نے برقعہ نہ اوڑھا ہوا ہوتا تو صورت حال خراب ہو سکتی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے اُسے خوب ڈانٹا۔

مسلمانوں سے ہندوؤں کی نفرت مجھے تو کبھی سمجھ نہیں آئی۔ مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا۔ ہمارے دیوتاؤں نے ہمیں ان سے کیوں نہیں بچایا؟ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے......ایک دو نہیں سترہ۔ اس نے سومناتھ کا مندر فتح کیا۔ کہا جاتا تھا کہ سمندر چوبیس گھنٹوں میں دو مرتبہ سومناتھ کے چرن چھونے آتا ہے، لیکن سمندر بھی سومناتھ کو محمود غزنوی سے بچانے نہ آیا۔

مسلمان ہندوستان کے حکمران بن گئے۔ انہوں نے ہم ہندوؤں کو ہماری مرضی کے مطابق جینے کی آزادی دی۔ تاہم ہندو احمقانہ تفاخر رکھتے تھے۔ وہ کہتے: ”یہ ہمارا دیش ہے۔ ہم ان گائے کا گوشت کھانے والوں کو یہاں سے نکال دیں گے۔“ وہ اسلام قبول کر لینے والے ہندوؤں کی خصوصاً تذلیل کرتے اور ان کے ساتھ اچھوتوں سے بھی برا سلوک کرتے تھے۔ ہندو ماضی کی شان و شوکت کی یادوں میں جیتے تھے۔ وہ جب اکٹھے ہوتے تو ماضی کے ہندو حکمرانوں کو یاد کرتے۔

میں نے اپنے ہندو دوستوں سے سینکڑوں مرتبہ کہا: ”ارے بھائی! کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پُرکھے عظیم نہیں تھے! لیکن ہمیں آج کا بھی تو سوچنا ہے۔ ہم مسلمانوں

سے لڑنہیں سکتے، وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں، بہت مضبوط ہیں اور ہم سے زیادہ جنگجو ہیں۔ ہمیں ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ امن کے ساتھ رہنا چاہیے۔" لیکن ہندو کی کھوپڑی میں عقل نہیں ہوتی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں چاروں وید اور دوسرے پلڑے میں عقل سلیم کو رکھا جائے تو عقل سلیم والا پلڑا بھاری ہوگا۔ تاہم ہندو اسے نہیں مانتے۔ وہ مجھے حقارت سے دیکھتے اور مسلمانوں کا ایجنٹ قرار دیتے۔ ان کا عظیم ہیرو پرتھوی راج چوہان ہے، جس نے 1191ء میں ترائین میں غوری کو شکست دی تھی۔ تاہم اگلے ہی سال اسی میدان جنگ میں غوری کے ہاتھوں پرتھوی راج نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ میرے ہندو دوستوں کے پاس اس کا بھی ایک جواب تھا۔ وہ کہتے تھے: "پرتھوی راج کی واحد غلطی ملیچھ غوری کو شکست دینے کے بعد اسے ہلاک نہ کرنا تھی۔" پرتھوی راج کے بارے میں حقائق کا علم کسی کو نہیں ہے۔ بس ایک شاعر چاند بردائی نے اس کے حوالے سے ایک نظم لکھی تھی۔ اس کے مطابق عظیم سورما پرتھوی راج نے بے شمار عورتوں کے ساتھ شادیاں کی تھیں۔ اس نے ایک پڑوسی راجہ کی بیٹی کو اغوا بھی کر لیا تھا۔ بہر حال آپ ہندوؤں کے سامنے پرتھوی راج کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ سری رام چندر جی کے بعد اس کی دیوتاؤں کے مانند پوجا کرتے ہیں۔

مجھے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ میں نہ تو ہندوؤں میں سے ہوں نہ مسلمانوں میں سے۔ میں اپنی بیوی کو کس طرح سمجھاتا کہ برہمن دیوتاؤں کو چڑھائے جانے والے چڑھاووں پر گزر بسر کرتے ہیں، راجپوت اور جاٹ زمینوں کے مالک ہیں، اہیروں اور گجروں کے پاس مویشی ہوتے ہیں، بنیوں کے پاس دکانیں ہوتی ہیں جبکہ بے چارے کائستھوں کے پاس صرف دماغ اور سرکنڈے کی قلمیں ہوتی ہیں اور صرف حکمران ہی، جو کہ مسلمان ہیں، ان کے دماغوں اور قلموں کی قیمت ادا کر سکتے ہیں!

ہندوؤں نے مجھے قبول نہیں کیا اور میری بیوی نے مجھے دھتکار دیا۔ مسلمانوں

نے میری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا، حالانکہ وہ بھی میری صحبت کو ناپسند کرتے تھے۔ درحقیقت میری حالت کسی ہیجڑے جیسی تھی، جو نہ تو یہ ہوتا ہے، نہ وہ، لیکن ہر کوئی اس کے ساتھ بدسلوکی کرسکتا ہے۔

پھر میں نے نظام الدینؒ کے بارے میں سنا۔ لوگوں نے کہا: ''دریائے جمنا کے کنارے غیاث پور کے درویش کے پاس جاؤ۔ تمہاری ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔'' لوگ انھیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کہتے تھے۔ بعض فاضل مسلمان ان پر انگشت نمائی بھی کرتے تھے۔ میں نے ایک اچھے کائستھ کی طرح اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی سے انتظار کرتا رہا کہ دیکھئے کیا ہو۔

آخر سلطان نے نظام الدین اولیاؒ کو بلا بھیجا کہ وہ خود پر لگائے جانے والے الزامات کا جواب دیں۔ جس دن اس مقدمے کی کارروائی ہونا تھی، میں نے نوکری سے رخصت لی اور محل چلا گیا۔

غیاث الدین بلبن کا دبدبہ ایسا تھا کہ اس کا نام سنتے ہی لوگوں کے پیشاب خطا ہو جاتے تھے۔ وہ بڑے خوفناک مزاج کا مالک تھا اور مشہور تھا کہ اگر کوئی اس کی جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے تو وہ اسے ہلاک کروا دیتا ہے۔ دو حبشی ہمیشہ اس کے پیچھے کھڑے رہتے تھے۔ سلطان جسے سزائے موت دیتا، وہ اس کا سر کاٹ دیتے تھے۔

کیا نظارہ تھا وہ بھی! سلطان تخت پر بیٹھا تھا، اس کے دائیں بائیں حبشی محافظ تلواریں تانے کھڑے تھے۔ داڑھیوں والے سینکڑوں ترک جرنیل بھی موجود تھے۔ تخت کی ایک طرف پانچ علما عمدہ ریشمی ملبوسات پہنے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا، جس کی عمر تقریباً میرے برابر تھی۔ اس نے کالی اون کی کھردری لمبی قمیض پہنی ہوئی تھی اور سر پر سبز رومال باندھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے تین مرید بھی تھے، جن کے لباس اس کے لباس کی طرح سادہ تھے۔ وہ غیاث پور کے درویش نظام الدینؒ تھے۔

سلطان پہلے نظام الدینؒ سے مخاطب ہوا: ''درویش! علماء نے شکایت کی کہ ہے کہ تم مسلمانوں اور کافروں میں فرق روا نہیں رکھتے ہو، تم خود کو خدا اور انسان کے مابین وسیلہ قرار دیتے ہو، تم ایسے لفظ استعمال کرتے ہو کہ انسان اور اس کے بنانے والے میں فرق مٹ جاتا ہے، تمہارے مرید مسجد کے احاطے میں رقص و موسیقی میں غلطاں رہتے ہیں۔ چنانچہ تم شریعت کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ تم اپنے دفاع میں کیا کہنا چاہتے ہو؟''

نظام الدینؒ نے مسکرا کر جواب دیا: ''سلطانِ معظم! یہ سچ ہے کہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا کیونکہ میں دونوں کو خدا کی مخلوق تصور کرتا ہوں۔ علما آپ سے کہتے ہیں کہ کافروں کو ہلاک کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ اللہ کو خوش کرنے کا بہترین طریقہ اس کی مخلوق سے محبت کرنا ہے۔ جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ میں خود کو انسان اور اس کے بنانے والے کے مابین وسیلہ قرار دیتا ہوں تو عرض یہ ہے کہ ہم صوفی اس اصول پر یقین رکھتے اور عمل کرتے ہیں کہ جس کا شیخ نہیں ہوتا، وہ دین سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ علما کو علم نہیں کہ اللہ کو کتابی علم یا منطق کے ذریعے جانا نہیں جاسکتا ہے۔''

سلطان نے علماء کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ان کے سربراہ نے جھک کر تخت کے سامنے زمین کو بوسہ دیا اور بولا: ''جہاں پناہ! آپ تمام بادشاہوں سے زیادہ دانا اور انصاف پسند ہیں۔ آپ کو ضرورت نہیں کہ ہمارے جیسے حقیر لوگ آپ کے سامنے مقدس قانون کی توضیح کریں۔ جہاں پناہ ضرور جانتے ہوں گے کہ یہ شخص نظام الدینؒ سادہ لوح لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے محبت کی بات کرتا ہے۔''

سارا مجمع بولا: ''واہ، واہ، سبحان اللہ!''

سلطان نے درویش کی طرف رخ کیا اور اس سے پوچھا کہ خدا سے اتصال کے دعوے کی وضاحت کرے۔ نظام الدینؒ نے بڑے شاعرانہ انداز میں جواب دیا، ''اے

سلطان! اے قانون کے جاننے والے عالمو! اور اے یہاں موجود لوگو! کیا تم محبت کرنا اور محبوب ہونا جانتے ہو؟ شاید آپ سب عورتوں کی محبت سے آشنا ہیں اور اسی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم صوفی لوگ صرف اور صرف خدا سے محبت کرتے ہیں۔ جب ہم پر الوہی روح حاوی ہوتی ہے تو ہم ایسے الفاظ بولتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کو خدائی کا دعویٰ لگتے ہیں۔ تاہم ایسے الفاظ کو سنجیدگی سے نہیں لیا جانا چاہیے۔''

لوگ واہ واہ کرنے لگے۔

سلطان نے علما سے موسیقی کے حوالے سے سند مانگی۔ علما نے ایک کتاب کھولی (وہ اپنے ساتھ ڈھیر ساری کتابیں لائے ہوئے تھے)۔ ان کے سربراہ نے عربی میں کچھ پڑھا اور پھر ترکی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر مجمعے کو دیکھا، کچھ لوگوں نے واہ واہ کی۔

سلطان نے پھر نظام الدینؒ کی طرف رخ کیا۔ درویش کوئی کتاب نہیں لایا تھا۔ اس نے اپنی یادداشت سے رقص اور موسیقی کے حوالے سے ایک حدیث کا حوالہ دیا۔

سلطان نے اس معاملے پر کچھ دیر غور کیا۔ اس نے انگلیاں ڈاڑھی میں پھیریں اور ہاتھ میں آنے والے بالوں کو جھاڑا۔ خاموشی خوفناک ہو گئی۔ آخر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور واضح بلند آواز میں بولا: ''ہم غیاث پور کے درویش نظام الدینؒ کو علما کے لگائے ہوئے الزامات سے بری قرار دیتے ہیں۔''

سارا مجمع سلطان کی انصاف پسندی کی داد دینے لگا۔ بہت سے لوگ درویش کی طرف بڑھے اور اس کی کھردری اونی قمیض کا دامن چومنے لگے۔

اگلی صبح میں نے کوتوال صاحب سے نظام الدین کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کہا: ''وہ بے شمار کافروں کو سیدھے راستے پر لے آئے ہیں۔ کسی جمعرات یا چاند کی پہلی تاریخ کو ان کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا معجزے دکھاتے ہیں۔''

اگلی جمعرات میں نے ایک تانگا لیا اور مہرولی سے ایک کوس دور واقع غیاث پور

روانہ ہو گیا۔ میں نے درگاہ پہنچ کر وہاں موجود خادم سے پوچھا کہ کیا میں خواجہ نظام الدینؒ سے مل سکتا ہوں۔ اس نے بتایا: ''وہ اپنی کوٹھڑی میں مراقبہ کر رہے ہیں۔ وہ صرف شام کے وقت لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ آپ لنگر خانے جا کر کھانا کھا لیں۔''

میں لنگر خانے چلا گیا۔ وہاں بے شمار ہندو، مسلمان، امیر و غریب دال روٹی کے لیے موجود تھے۔ مجھے ایک چپاتی حاصل کرنے کے لیے ایک بڑے ہجوم سے گزرنا پڑا۔ میں باہر آکر صحن میں بیٹھ گیا جہاں قوالوں کی ایک ٹولی ہندی میں گا رہی تھی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ یہ گیت خواجہ نظام الدینؒ کے مقرب خاص ابوالحسن نے لکھا ہے اور اس کی دھن بھی انھی نے بنائی ہے۔

سہ پہر کو دیر گئے پتا چلا کہ درویش اپنی کوٹھڑی سے باہر آچکے ہیں۔ لوگ ان کے گرد یوں جمع تھے جیسے مٹھائی کے گرد مکھیاں۔ میں ہجوم میں سے راستہ بناتا آگے گیا اور ان تک پہنچ کر ان کی قمیص کے دامن کو بوسہ دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ درویش نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے مشک کی خوشبو میرے ہر طرف پھیل گئی ہو۔ انھوں نے میرا آنسوؤں بھرا چہرہ اوپر کیا اور بولے: ''جس طرح اللہ نے تمہارے آنسو میرے دامن میں بھر دیے ہیں، اُسی طرح وہ تمہارے غم مجھے دے دے۔'' ان کے یہ لفظ سنتے ہی مجھے اپنا آپ بے حد ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔

وہ بولے: ''عبداللہ! میرے فرزند! تم تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے نزدیک رہتے ہو۔ ہر صبح وہاں جا کر اللہ کے ننانوے ناموں کا ورد کیا کرو۔ تمہاری ہر خواہش پوری ہو جائے گی۔ جب کبھی تمہارا دل بوجھل ہو تو یہاں آجایا کرو۔ ہمارے غریب خانے کے دروازے ہر کسی کے لیے کھلے ہیں۔''

میں نے مہرولی واپس جاتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا: ''انھیں کس طرح پتا

چلا کہ میں بختیار کاکیؒ کے مزار کے قریب رہتا ہوں؟ انہیں کس طرح پتا چلا کہ میرے مسلم دوست مجھے عبداللہ کہتے ہیں؟ اگر انھیں کسی نے بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں تو ایسا کیوں ہے کہ انھیں میرے ہندو ہونے کا علم کیوں نہیں اور انھیں یہ کیوں نہیں علم کہ ہو سکتا ہے مجھے اللہ کے ننانوے ناموں کی جانکاری نہ ہو؟''

میں خود پر ضبط نہ کر سکا۔ چونکہ ایسا کوئی نہیں تھا، جس کے سامنے میں دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا، اس لیے میں نے جو گزرا تھا اپنی بیوی کو سب سنا دیا۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ رام دلاری نے مجھ میں کوئی دلچسپی ظاہر کی۔ جب میں اپنی رام کہانی سنا چکا تو اس نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''آپ کسی روز مجھے وہاں کیوں نہیں لے چلتے؟'' میں اتنا پرجوش ہو گیا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ میری گرفت میں ڈھیلا پڑ گیا۔

اسلامی قمری تقویم کے مطابق نئے مہینے کی پہلی تاریخ کو میں رام دلاری کو غیاث پور لے گیا۔ کچی سڑک پر ہمارے تانگے کے علاوہ بے شمار تانگے رواں تھے۔ ہم عورتوں اور بچوں سے بھری بیل گاڑیوں کے پاس سے گزرے جبکہ مرد جوتے لاٹھیوں سے لٹکائے ننگے پاؤں ان کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔

وہاں بہت ہجوم تھا۔ چوڑیاں، مٹھائیاں، کپڑے اور ادویات بیچنے والوں نے بازار لگایا ہوا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ رام دلاری کو خواجہ صاحب کا درشن نہیں کر سکے گی۔ میں اسے لنگر خانے نہیں لے گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کی پکائی ہوئی کسی شے کو نہیں چھوتی تھی۔ ہم نے کھوکھوں کے گرد چکر لگایا، رقاصوں اور کرتب بازوں کو اور ناچنے والے ریچھ اور بندروں کو دیکھا۔ ہم ایک درخت تلے بیٹھ گئے۔ مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ تانگے والا اصرار کر رہا تھا کہ اندھیرا چھانے سے پہلے مہرولی واپس چلیں۔ میں انھی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ایک درویش آیا اور مجھ سے بولا: ''کیا تمہارا نام عبدل یا عبداللہ ہے؟ خواجہ صاحب تمہیں بلا رہے ہیں؟'' وہ ہمیں مسجد کے عقب میں واقع ایک دروازے سے ایک صحن میں لے گیا۔

جہاں خواجہ صاحب لوگوں کو شرف ملاقات بخش رہے تھے۔ درویش ہمیں اپنے پیچھے پیچھے ہجوم سے گزار کر آگے لے گیا۔

میں نے خواجہ صاحب کی قمیض کے دامن کو بوسہ دیا۔ رام دلاری ان کے سامنے جھک گئی۔ خواجہ صاحب نے ہاتھ پھیلا کر اسے دعا دی: ''بیٹی! اللہ تمہارے من کی مراد پوری کرے۔ اگر اس نے چاہا تو تمہاری کوکھ ہری ہو جائے گی۔ جاؤ سکون سے رہو۔''

کوکھ ہری ہو جائے گی؟ کہا جاتا ہے کہ خواجہ صاحب لوگوں کے ذہن پڑھ لیتے ہیں، تو کیا انھوں نے رام دلاری کا ذہن نہیں پڑھا؟ رام دلاری نے جس طرح منہ پھیرا تھا، میں بتا سکتا تھا کہ وہ شرمندہ تھی۔ مہرولی واپس جاتے ہوئے وہ مجھے چھونے سے گریزاں رہی۔ ہم اولیا مسجد کے سامنے تانگے سے اُترے۔ ہم گھر کی طرف یوں چلے جیسے ہمیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ میں آگے آگے چل رہا تھا اور بند دکانوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے انھیں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو، وہ میرے پیچھے پیچھے برقعے میں لپٹی چل رہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی وہ صبح کا پکایا ہوا کھانا گرم کرنے لگی۔ میں تیل کا چراغ جلا کر اس دن کا احوال لکھنے لگا۔ اس نے مجھے کھانا دیا اور خود باورچی خانے میں کھانے چلی گئی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے پیتل کی پلیٹ اسے دی اور پان لینے بازار چلا گیا۔

میرے واپس آنے تک رام دلاری برتن دھو کر دیوار کی طرف منہ کر کے چارپائی پر لیٹ چکی تھی۔ میں چراغ بجھا کر اپنی چارپائی پر سو گیا۔ مجھے نیند نہ آئی۔ میں خواجہ صاحب کی اس دعا پر غور کرتا رہا کہ اللہ ہمیں اولاد سے نوازے گا۔ میں نے سوچا کہ کیا رام دلاری بھی یہی سوچ رہی ہو گی؟ کوئی گھنٹہ بھر بعد میں نے نرمی سے اسے پکارا: ''رام دلاری!''

''ہوں!''

''کیا تم سو رہی ہو؟''

"نہیں۔"

کوتوالی کے گھڑیال نے نصف شب کا گجر بجایا۔ میں نے رام دلاری سے دوبارہ پوچھا کہ کیا وہ سو رہی ہے۔ اس نے کہا: "نہیں۔" مجھے خیال آیا کہ وہ میرے چھونے سے بدکے گی نہیں۔ میں اٹھ کر اس کی چارپائی پر چلا گیا۔

"کیا میں تمہارے ساتھ لیٹ سکتا ہوں؟ مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

وہ میرے لیے جگہ بناتی ہوئی بولی: "آپ کی مرضی۔"

میں اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ میرے اندر مہینوں سے دبی ہوئی شہوت ابھر آئی۔ جس طرح سمندری طوفان راستے میں آنے والی ہر شے کو بہا لے جاتا ہے' اسی طرح شہوت نے میرے ہر خوف کو مٹا دیا۔ میں نے اس کی ساڑھی پھاڑ دی اور دخول کی کوشش کی۔ اس نے بھی اپنی رانیں کھول دیں۔ تاہم ابھی میں نے دخول کیا ہی تھا کہ مادۂ منویہ خارج ہو گیا۔ مجھے خود سے بڑی شرمندگی ہوئی۔

رام دلاری خود کو صاف کرنے کے لیے اٹھی۔ اس نے گھڑے سے پانی اپنے پیتل کے لوٹے میں انڈیلا۔ اس نے ساڑھی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور اپنی رانوں کے درمیان پانی بہایا۔ ستاروں کی روشنی میں مَیں نے اس کا زرد بدن دیکھا۔ اس کی گول گول چھاتیاں اور بڑے بڑے کولھے دیکھے۔ اس نے ساڑھی سے ہی بدن پونچھا اور اسے بدن سے لپیٹ لیا۔ وہ جھجک رہی تھی کہ کونسی چارپائی پر لیٹے۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے کھینچ کر اسے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ میری شہوت دوبارہ ابھر آئی۔ اس نے مجھے اپنی گیلی ساڑھی اتارنے دی۔ میں نے اس کے ننگے جسم کو اپنی آغوش میں لے کر حرارت پہنچائی۔ اس مرتبہ میں خود پر دیر تک قابو رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس نے بھی اس مرتبہ زیادہ اشتیاق کا اظہار کیا۔ میں نے دخول کیا تو اس کے ہونٹوں سے درد بھری چیخ نکلی۔ بالآخر میں نے رام دلاری کو اپنا بنا لیا تھ۔

میں نے چراغ دوبارہ جلا کر بستر کی چادر پر لگنے والے خون کے دھبے دھونے

میں اس کی مدد کی۔ چادر صاف ہوئی تو ہمارے جسم دوبارہ ایک دوسرے کے بھوکے ہو چکے تھے۔ یوں ہی ساری رات گزر گئی۔

دھوپ میرے چہرے پڑی اور مکھیاں میرے کانوں میں بھنبھنانے لگیں' تو میں جاگ اٹھا۔

رام دلاری نہا کر ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ اس نے وہ سرخ ساڑھی باندھی ہوئی تھی جو دلہن بن کر مہرولی آتے وقت پہنے ہوئے تھی۔ اس نے مجھ سے پردہ نہیں کیا لیکن جب مجھے اپنی چارپائی سے اٹھتے دیکھا تو شرم سے سرخ پڑ گئی اور اندر بھاگ گئی۔ میں نے اس کے پیچھے اندر جا کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

اس کے بعد میں رام دلاری پر سے نگاہیں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس کی ہر حرکت مجھ میں اس کی خواہش کی آگ بھڑکا دیتی۔ اس سے دور گزرنے والا ہر لمحہ مجھ پر عذاب بن کر گزرتا اور میں جلد از جلد گھر واپس جا کر اسے آغوش میں لے لیتا۔ وہ نخرے کرتے ہوئے کہتی: ''اجی میں کوئی طوائف تھوڑی ہوں، کہ جب آپ کا جی چاہے میرے ساتھ ہم بستری کریں۔ آپ تو مجھے معاوضہ بھی نہیں دیتے۔'' میں نے اسے سرخ یاقوت والا کوکا اور بازار میں دستیاب ہر رنگ کی کانچ کی چوڑیاں لا کر دیں۔ چند مہینوں کے لیے ہماری دنیا چھوٹی سی چارپائی تک محدود ہو گئی' جس پر ہم رات دن وصل کا کھیل کھیلتے تھے۔

رام دلاری اور میں اس برادری میں شامل ہو گئے تھے، جو ہندوؤں کے مندروں میں پوجا کرتی اور صوفیا کی درگاہوں پر حاضری دیتی تھی۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تہوار بھی مناتے تھے۔ دسہرے پر ہم رام لیلا دیکھنے جاتے، دیوالی پر اپنے گھر کی منڈیروں پر دیے جلاتے اور ہولی پر اپنے ہندو دوستوں پر رنگ اچھالتے۔ عید پر ہم اپنے مسلمان شناساؤں کو تحفے دیتے اور مسلم صوفیا کے عرسوں میں شرکت کرتے۔ مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ ہم غیاث پور جاتے۔

رام دلاری ہندو عورتوں جیسا لباس پہنتی تھی۔ وہ اپنی مانگ میں سیندور بھرتی، ماتھے پر سرخ بندیا لگاتی اور گلے میں منگل سوتر پہنتی تھی۔ میں ترکوں کی طرح ٹوپی پہنتا اور پگڑی باندھتا تھا۔ میں نے ترکوں ہی کی طرح عمدہ ترشی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں انھی کے انداز میں بولتا تھا۔ وہ السلام علیکم کہتے تو میں جواباً وعلیکم السلام کہتا۔ وہ میرا حال پوچھتے تو میں کہتا الحمدللہ۔ تاہم جب وہ پوچھتے، ''عبداللہ! تم حقیقی مسلمان کب بنو گے؟'' تو میں جواب دیتا: ''جلد، انشاءاللہ۔'' اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ ہم مسلمان ہیں یا ہندو تو ہم جواب دیتے کہ ہم دونوں ہیں۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ سال کے اختتام پر رام دلاری حاملہ ہو گئی اور اسے بچے کی ولادت کے لیے اپنے میکے متھرا جانا پڑا۔ جب مجھے بیٹا پیدا ہونے کی خبر ملی تو میں نے کوتوال صاحب اور اپنے ہندو اور مسلمان دوستوں کو مٹھائی بھیجی۔ چند ہفتے بعد میں اپنی بیوی اور بیٹے کو لانے کے لیے متھرا گیا۔ رام دلاری کی بہنوں نے طرح طرح کے سوال پوچھ کر مجھے بہت تنگ کیا: ''کیا آپ لڑکے کا ختنہ کروائیں گے؟ کیا آپ اس کا نام محمد یا علی وغیرہ رکھیں گے؟'' میں نے انھیں بولنے دیا اور ان کی حالت سے خوب لطف اندوز ہوا۔

میں نے اپنے بیٹے کا ختنہ نہیں کروایا۔ میں اس کے سر کے بال کٹوائے اور برہمن کو بلا کر منتر پڑھوائے۔ میں نے اس کا نام کمل رکھا...... یہ ہندو اور مسلم نام ہو سکتا تھا۔ ہندی میں اس کا مطلب تھا کنول کا پھول۔ اسے عربی لہجے میں کمال بھی بولا جا سکتا تھا۔ ہم بچے کو جوگ مایا مندر لے گئے اور پروہت سے اس کے ماتھے پر صندل کا لیپ کروایا۔ پھر ہم نے اسے غیاث پور لے جا کر خواجہ صاحب سے دعا کروائی۔ میں نے اپنے پیر کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ان کا نام ایک پتھر پر کندہ کروا کر اسے اپنے گھر کی بیرونی دیوار میں نصب کروا دیا۔

جن لوگوں کا کوئی گرو یا پیر نہیں ہے، وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان کی اپنے چیلوں اور

مریدوں کے لیے کیا معنویت ہوتی ہے۔ وہ ان کے لیے ماں باپ سے سوا ہوتے ہیں۔ چیلا اپنے گرو کی اطاعت اور احترام اپنے باپ سے زیادہ کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ اپنے گرو سے وابستہ ہوتا ہے، وہ گرو کی چھاتی سے محبت کا دودھ پیتا ہے اور اس کی گود میں یوں ہمکتا ہے جیسے بچہ ماں کی گود میں ہمکتا ہے۔ جتنا پیار دلہا دلہن سے کرتا ہے درحقیقت چیلا گرو کو اس سے زیادہ پیار کرتا ہے' کیونکہ وہ اسے اپنا تن' من اور دھن سب کچھ سونپ دیتا ہے۔ گرو زمین پر بھگوان کی تجسیم ہوتا ہے۔ گرو دور ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟ یہ ہم پر خوب واضح ہو گیا۔ ہوا یہ کہ خواجہ صاحب پنجاب چلے گئے۔ دلی کے تمام چھوٹے چھوٹے قصبوں کا حال اس عورت جیسا ہو گیا جس کا خاوند پردیس چلا گیا ہو۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ ایک کے بعد دوسری مصیبت نازل ہونے لگی۔

سلطان غیاث الدین بلبن کا سب سے بڑا بیٹا شہزادہ محمد مغلوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ ہندوستان پر بائیس سال سے آہنی ہاتھ سے حکومت کرنے والا عظیم سلطان عورتوں کی طرح رویا۔ اس نے کھانا پینا اور سلطنت کے امور میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ وہ بیمار ہو گیا لیکن اس نے شاہی طبیب کو اپنی نبض نہ دیکھنے دی۔ چند ہی دنوں میں وہ ڈھانچہ بن کر رہ گیا اور بالآخر فوت ہو گیا۔

تخت کے بہت سے دعوے دار تھے۔ ان میں ہلاکت خیز کشمکش چھڑ گئی۔ مجھے تو ان کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ آخر خلجی خاندان کا بوڑھا شخص جلال الدین فیروز دلی کے تخت پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بیٹوں نے اس کے مرنے کا انتظار نہیں کیا۔ ان میں سے کئی ایک جھوٹے پیر سدی مولا کے اثر میں تھے۔

سدی مولا کی اپنی درگاہ تھی' جس کے لنگر خانے میں شاہی پکوان تیار کیے جاتے اور صرف امیروں اور مقتدر لوگوں کو پیش کیے جاتے تھے۔ سدی کے مریدوں کی فوج ظفر موج تھی جو اس کے گن گایا کرتی تھی۔ وہ ان امرا اور شہزادوں کے نام بیان کرتے پھرتے تھے جو کہ سدی کے عقیدت مند تھے۔ وہ کہتے کہ سدی مولا کو دنیاوی دولت اور

اقتدار کا ذرا بھی لالچ نہیں ہے۔ وہ کہتے کہ اس نے تو قاضی القضاۃ کے عہدے کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ کہتے کہ شرفاء کی بیٹیاں اس سے شادی کرنے کو تیار ہیں لیکن اس نے ان میں سے کسی سے شادی کی حامی نہیں بھری۔

''یا اللہ! یہ کس قسم کا درویش ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا: ''ایک قدم خدا کی کشتی میں اور دوسرا شاہوں کے دربار میں! ممکن ہے وہ ان لوگوں میں سے ہو جو اقتدار کے حصول کے اپنے عزائم کو چھپانے کے لیے انکسار کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں!''

میں نے سدی مولا کو دیکھتے ہی جان لیا کہ وہ میرے پیر نظام الدینؒ کی پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ بدمعاشوں جیسا تھا۔ ڈاڑھی گھنی سیاہ تھی اور مونچھوں کے سرے بچھو کی دم کی طرح اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ وہ کسی نواب کی طرح بیٹھا تھا اور ایک مسلسل سونگھ رہا تھا۔ نوجوان ہونے کے باوجود اس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ کوئی اندھا بھی دیکھ سکتا تھا کہ سدی کو روزے رکھنے یا نفس کو مارنے پر کوئی ایقان نہیں ہے۔ وہ امیروں کو مشورے دینے میں اتنا مصروف تھا کہ غریبوں کے لیے اس کے پاس وقت ذرا بھی نہیں تھا۔ وہ مغرور انسان تھا۔

درست کہا گیا ہے کہ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سماسکتیں، اسی طرح ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔ دلی کا حکمران جلال الدین فیروز خلجی تھا۔ سدی مولا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سلطان کے ایک بیٹے کے ساتھ مل کر اسے تخت سے ہٹانے کی سازش کر رہا ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو رہنا تھا۔ بوڑھے سلطان نے سدی مولا کو جس طرح قابو کیا، وہ ایک دلچسپ قصہ ہے۔ اس نے کچھ لوگوں سے کہا کہ وہ سدی کے خلاف رپٹ دیں کہ اس نے سلطان کے دشمنوں کو ایک نوجوان اور خوب صورت شہزادی سے شادی کروانے کے وعدے پر مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جیسے ہی یہ شکایت سلطان تک پہنچی، اس نے سدی مولا کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ میں اس وقت کوتوالی میں تھا کہ جب سدی مولا اور اس کے بے شمار چیلوں کو ہتھکڑیوں میں باندھ

کرلایا گیا۔ ان کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ خون بہے گا اور سدی مولا اپنے دشمنوں کا ساتھ دینے والوں کو بددعا دے گا۔ کسی درویش کی ناراضی کیوں مول لی جائے، خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو! میں نے کوتوال صاحب کو درخواست دی کہ مجھے دست لگ گئے ہیں اور حکیم نے آرام تجویز کیا ہے لہٰذا مجھے تین دن کی رخصت عنایت فرمائی جاوے۔

مجھے سدی مولا پر گزرنے والی افتاد کا علم منشی سے ہوا' جو کہ میری خیریت پوچھنے آیا تھا۔ کوتوال صاحب نے سدی مولا سے اعتراف جرم کروانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے اسے پٹوایا، اس کے خصیے بھنچوائے، اس کے مقعد میں سرخ مرچیں ڈلوائیں اور اس کے منہ میں فضلہ اور پیشاب بھروایا۔ تاہم سدی مولا نے ایک لفظ بھی بول کر نہ دیا۔ سلطان بہت ناراض ہوا۔ اس نے کہا: "اسے اور اس کے چیلوں کو آگ میں سے گزارا جائے۔ اگر وہ زندہ نکل آئے تو میں ان کو بے گناہ مان لوں گا اور آزاد کر دوں گا۔" اگلی صبح مہرولی سے تھوڑی دور واقع بستی بہار پور میں ایک بہت بڑا الاؤ دہکایا گیا۔ میں اس منظر کو دیکھنے گیا کیونکہ مشہور تھا کہ سدی مولا معجزے دکھا سکتا ہے۔

سلطان بھی یہ منظر دیکھنے آیا۔ الاؤ دہکایا گیا۔ جونہی سدی اور اس کے چیلوں کو الاؤ کی طرف دھکیلا گیا، سلطان حواس کھو بیٹھا۔ اس نے علما کو بلوا کر پوچھا کہ کیا آگ کی سزا دینا شریعت کی رو سے درست ہے؟ علما نے سر ہلا کر کہا: "جلانا تو آگ کی فطرت ہے۔" سلطان نے سدی مولا اور اس کے چیلوں کو آگ سے گزارنے کا حکم واپس لے لیا اور محل چلا گیا۔ سدی مولا اور اس کے چیلوں کو کوتوالی واپس لایا گیا۔ سلطان نے اپنا غصہ کوتوال صاحب پر اتارا: "اگر تم اس کو بولنے پر مجبور نہیں کر سکتے تو اسے ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم خود اس کا غلیظ منہ کھلوالیں گے۔"

رام دلاری کے اس احتجاج کے باوجود کہ مجھے گھر پر ہی رہنا چاہیے' میں قصرِ ہزار ستون کے نزدیک بسائے جانے والے شہر نو کو جانے والے منشیوں کے ساتھ چلا

گیا۔

سدی مولا اور اس کا گروہ پہلے سے ہال میں موجود تھا۔ پھر سلطان آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کا مزاج بہت برہم تھا۔ اس نے جس انداز سے بات کی' اس سے واضح ہو گیا کہ اس کا ذہن اس کے جسم کی طرح ضعیف ہو چکا ہے۔ اس نے دہاڑ کر کہا: ''اپنے جرائم کا اعتراف کرو نہیں تو ہم تمہاری زبان کھنچوا لیں گے۔'' اگر سدی مولا اعتراف کر لیتا تو اس کا سر کاٹ دیا جاتا۔

سلطان نے حکم دیا: ''اس فریبی کو ہمارے پاس لاؤ۔'' سدی مولا کو آگے لے جایا گیا۔ بوڑھا سلطان تخت سے نیچے اتر آیا۔ اس نے سدی مولا کے رخسار پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا: ''شیطان کی اولاد! تم اپنے آپ کو درویش کہتے ہو اور شاہوں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہو!''

سدی ڈٹا رہا۔ اگرچہ اس کا چہرا خراشوں سے سیاہ ہو رہا تھا اور آنکھوں کے گرد سوجن سے آنکھیں تقریباً بند تھیں، تاہم اس کی مونچھیں اب بھی اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور چہرہ بشرہ ویسا ہی گستاخانہ تھا۔ سلطان نے اسے دوبارہ تھپڑ مارا اور چیخ کر کہا: ''بول، ولدالزنا!''

سدی اتنی واضح اور طاقتور آواز میں بولا کہ ہر کوئی صاف سن سکتا تھا: ''جلال الدین! اللہ کے درویش سدی مولا کی بات دھیان سے سُن!'' اس نے یہ جملہ یوں کہا تھا جیسے کسی غلام سے مخاطب ہو۔ ''اللہ تجھے اپنے خادم پر ہاتھ اٹھانے کی سزا دے گا۔ تم اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں مرو گے۔ تمہاری لاش جہنم کی آگ میں جلے گی۔'' سدی مولا نے اچانک بلغم اور خون کا ملغوبہ سلطان کے چہرے پر تھوک دیا، جس سے اس کی سفید ڈاڑھی اور چہرہ لتھڑ گیا۔

بوڑھا سلطان کسی پاگل کی طرح چنگھاڑنے لگا: ''موذی، حرامی، سؤر کی اولاد!'' پھر وہ اپنے درباریوں کو گالیاں بکنے لگا: ''بزدلو! تمہاری وجہ سے اس کتے نے تمہارے

بادشاہ کی بے عزتی کی ہے!"

ہال میں سدی مولا سے نفرت کرنے والے درویشوں کی ایک ٹولی بھی موجود تھی۔ وہ سدی پر پل پڑے۔ انھوں نے مار مار کر اس کا کچومر نکال دیا۔ وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ مجھے نہیں معلوم وہ زندہ تھا یا مردہ۔ پھر سدی مولا کا سر کچلنے کے لئے ایک ہاتھی لایا گیا۔ اس کا سر ناریل کی طرح پھٹ گیا اور اس میں سے خون اور مکھن جیسی چربی بہنے لگی۔ میری ٹانگوں نے میرا بوجھ سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ میرا سارا جسم لرزنے لگا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ کر دعائیں مانگنے لگا۔ سنبھلتے سنبھلتے مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ میرے دوست مجھے سہارا دے کر گھر لائے۔

کتنا خوفناک دن تھا وہ! جب سدی مولا کو شہر نو لے جایا گیا تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ جونہی وہ مرا آسمان کوئلے کی طرح سیاہ ہو گیا۔ شہر پر ٹڈی دل نے حملہ کر دیا۔ ہر درخت اور جھاڑی پر ٹڈیاں رینگنے لگیں۔ لمحوں میں درخت پتوں سے محروم ہو گئے۔

اس کے بعد اتنی ہولناک آندھی آئی کہ میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے کالے ہاتھیوں کے حملہ آور غول کی طرح دیواریں گرا دیں، درخت جڑوں سے اکھاڑ ڈالے، انسانوں اور جانوروں کو اندھا کر دیا۔ آسمان اتنا کالا ہو گیا کہ انسان بتا نہیں سکتا تھا کہ کب سورج ڈھلا اور کب رات ہوئی۔ رام دلاری اور میں کمل کو اپنے بیچ سلائے، لیٹے ہوئے تھے۔ وہ بولی: "یہ سدی مولا کی بددعا کا اثر ہے۔"

سدی مولا کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ سلطان جلال الدین فیروز کو اس کے بھتیجے علاؤ الدین خلجی نے، جو کہ اس کا داماد بھی تھا، قتل کر دیا۔ مجھے علم نہیں کہ مقتول سلطان جہنم کی آگ میں جلا، یا نہیں، البتہ ہم نے جہنم کا مزا چکھ لیا۔ گرمی نے دلی کو تندور بنا دیا۔ سورج کی شعاعیں اتنی خوفناک تھیں کہ ہر روز گرمی سے بیس تیس انسان مر جاتے۔ بارش کا نام نشان تک نہیں تھا۔ کنویں سوکھ گئے۔ پیاس سے مویشی بھی مرنے لگے۔ فصلیں جل گئیں۔ بازاروں میں آٹا، چاول اور دالیں نایاب ہو گئیں۔ ہمیں اشیائے ضرورت

دور دراز کی بستیوں سے انتہائی مہنگے داموں خریدنا پڑیں۔ شہر فاقہ زدہ گداگروں سے بھرا ہوا تھا، جو گلیوں میں مر رہے تھے۔ ہندو اپنے دیوتاؤں سے دعائیں مانگنے لگے، مسلمان اللہ سے۔ ہم نے اپنے خواجہ صاحبؒ کے واپس آنے کی دعا مانگی۔

ہماری دعائیں رنگ لائیں۔ ایک صبح پنجاب سے آنے والے ایک درویش نے ہمیں اطلاع دی کہ خواجہ صاحبؒ مہرولی سے صرف دو دن کے فاصلے پر ہیں۔ اسی سہ پہر قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر شہریوں کا اجتماع ہوا، جس میں خواجہ صاحبؒ کے شایانِ شان خیر مقدم کے انتظامات کئے گئے۔

جب وہ عظیم دن آیا تو سینکڑوں شہری خواجہ صاحبؒ کے خیر مقدم کے لئے شہر کے دروازوں سے باہر چلے گئے۔

خواجہ صاحبؒ کا رنگ زرد تھا اور وہ تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ کوئی حیران کن امر نہیں تھا، کیونکہ انھوں نے گرم کچی سڑکوں پر سینکڑوں کوس سفر ننگے پاؤں کیا تھا۔ تاہم انھوں نے اپنے دامن کو چومنے یا پیروں کو چھونے والوں کو مسکراہٹ اور دعا سے نوازا۔ انھیں ہجوم سے بچانے کے لئے درویشوں کو ان کے گرد حلقہ بنانا پڑا۔

بازاروں کو خوش آمدید کے بینروں سے سجایا گیا تھا۔ عورتوں نے چھتوں پر سے ان پر گلابوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ ایک بہت بڑا جلوس، جس کے آگے آگے قوالوں کی ٹولیاں تھیں، مہرولی کے مرکزی بازار سے گزرتے ہوئے قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر پہنچا۔ خواجہ صاحبؒ نے درخواست کی کہ انھیں خلوت دی جائے۔ انھوں نے اولیاء مسجد کی زیرِ زمین کوٹھڑیوں میں سے ایک میں جا کر اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

رات کو ہم نے بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنی۔ مہرولی میں مون سون کے موسم میں بارش کا ایک قطرہ نہیں برسا تھا، اب وہاں خزاں کے موسم میں چھاجوں مینہ برسا۔ یقین نہ کرنے والوں کے منہ میں خاک!

میں اگلی جمعرات کمل اور رام دلاری کو خواجہ صاحبؒ کے درشن کروانے لے گیا۔ میں نے غیاث پور میں اتنا ہجوم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ موسم بہت گرم تھا۔ میرا حلق پیاس سے سوکھ گیا تھا۔ خواجہ صاحبؒ کی باتیں انتہائی رسیلی تھیں۔ آپ نے فرمایا: ''خدا ایک ہی ہے، حالانکہ ہم اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ اس تک پہنچنے کے لاتعداد راستے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے خیال کے مطابق بہترین راستے پر چلنے دو۔ تم جو راستہ چنتے ہو، وہ اہم نہیں ہوتا، اہمیت اس امر کی ہے کہ تم اس پر کس انداز سے چلتے ہو۔ اگر تمہارے دل میں محبت نہیں ہے تو بہترین راستہ بھی تمہیں دھوکے کی بھول بھلیاں میں لے جائے گا۔''

آپ نے حضرت موسیٰؑ کا ایک واقعہ سنایا۔ حضرت موسیٰؑ نے ایک بوڑھے چرواہے کو دعا مانگتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''اے خدا! تو کہاں ہے؟ آ میں تیری خدمت کروں۔ تیرے جوتے صاف کروں، تیرے بالوں میں کنگھی کروں، تجھے اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں۔'' حضرت موسیٰؑ نے چرواہے کو خدا سے اس انداز سے بات کرنے پر ڈانٹا۔ جب حضرت موسیٰؑ خدا سے ملنے گئے تو خدا نے کہا ''موسیٰؑ! تم نے میرے ایک سچے بندے کو دھتکارا ہے۔''

اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو سچے مذہب کا جوہر بیان کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ''میں بیمار تھا، تم میری عیادت کو نہیں آئے۔ میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا نہیں دیا۔''

حضرت موسیٰؑ نے پوچھا: ''اے اللہ! کیا آپ بھی بیمار اور بھوکے ہو سکتے ہیں؟''

''اللہ نے جواب دیا: ''میرا فلاں بندہ بیمار اور فلاں بندہ بھوکا تھا۔ اگر تم ایک کی عیادت کرتے اور دوسرے کو کھانا کھلاتے تو تم مجھے ان کے ساتھ پاتے۔''

خواجہ صاحبؒ نے ہمیں صوفیانہ سوال جواب کے ذریعے تعلیم دی:

سب سے زیادہ عقل مند انسان کون ہے؟

جو دنیا کو رد کر دیتا ہے۔

سب سے بڑا ولی کون ہے؟

جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا۔

سب سے امیر انسان کون ہے؟

جو قناعت پسند ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ ضرورت مند کون ہے؟

جو قناعت نہیں کرتا۔

قناعت کیسے کی جائے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ خواجہ صاحبؒ نے یہ سوال سن لیا، جو کہ میں نے دل ہی دل میں پوچھا تھا۔ انھوں نے فرمایا: ''اپنی خواہشات کو کم سے کم کر دو، اپنے نفس کو تسخیر کرو۔''

ہم باہر آئے تو سورج درگاہ کی دیواروں کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ کمل میری گود میں سو گیا تھا۔ تانگے والے مہرولی واپس جانے کے لئے صدائیں لگا رہے تھے۔

وہ وقت خطرناک تھا۔ ہمیں جاٹوں اور گجروں کی بستیوں سے گزرنا تھا، جو کہ بدنام ڈاکو تھے۔ ہم نے دس بارہ تانگوں کو اکٹھا کر لیا اور دونوں طرف دو درجن مرد تلواروں اور برچھیوں سے مسلح ہو کر چلنے لگے۔ ہم بخیریت مہرولی پہنچ گئے۔

وہ دن کافی لمبا رہا تھا۔ میں نے کمل کو بستر پر لٹا دیا۔ رام دلاری میرے لئے دودھ کا کٹورہ لائی۔ میں سونے سے پہلے دودھ پینے کا عادی تھا۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اس نے احتجاج کیا: ''آپ سارا دن نفس پر ضبط پانے کے وعظ سنتے رہے ہیں لیکن رات پڑتے ہی آپ یہ چاہتے ہیں۔''

''اری! تم بھی کتنی احمق ہو! تم نے سارا دن محبت کے بارے میں وعظ سنے لیکن شام ہونے تک جو سنا تھا، سب بھلا دیا۔''

اس نے جواب دیا: ''خواجہ صاحبؒ کی مراد یہ والی محبت نہیں تھی۔'' غرض یونہی چھیڑ چھاڑ کرتے ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے وصل کی لذتوں سے سرشار ہونے لگے۔

دن گزرتے گئے۔ ہمارے کوتوال صاحب اتنے بوڑھے ہو گئے کہ کام کے اہل نہ رہے۔ انہیں ملازمت ترک کر کے مکہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ان کی جگہ ان کے داماد کو متعین کر دیا گیا۔

نیا کوتوال متعصب تھا۔ وہ ہندوؤں کا ذکر حقارت سے کرتا تھا۔ وہ سلطان علاؤ الدین خلجی کا منہ چڑھا بن گیا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ علاء الدین، مرحوم سلطان کا بھتیجا، داماد اور قاتل تھا۔ سلطان علاؤ الدین خلجی جنوب کی ہندو ریاستوں کو تسخیر کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے جرنیل ملک کافور نے اس کی سلطنت کو سمندروں تک وسعت دے دی۔ وہ ہزاروں غلاموں اور سونے، چاندی اور قیمتی جواہر سے لدے ہاتھی، اونٹ اور بیل گاڑیاں دلی لایا۔ سلطان نے خواجہ صاحبؒ کی اس بات پر کان نہیں دھرے کہ تلوار سے حاصل ہونے والی فتح عارضی ہوتی ہے۔

ماحول اتنا تبدیل ہو گیا کہ مسلمانوں والے طور اطوار اپنانے والے میرے جیسے ہندو کا جینا بھی دوبھر ہو گیا۔ میں اپنے کام سے کام رکھتا، تنخواہ لیتا اور اپنا منہ بند رکھتا۔ اگر بعض مسلمان مجھے زیادہ تنگ کرتے تو میں غیاث پور میں جا پناہ لیتا۔ سکندر ثانی کا خطاب اپنانے، دلی کو اپنا دارالخلافہ قرار دینے، ہزاروں کی تعداد میں حملہ آور ہونے والے منگولوں کو موت کے گھاٹ اتارنے، ایک نیا شہر بسانے اور حوضِ علائی کے پاس ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کرنے اور قطب مینار سے دگنا اونچا مینار تعمیر کروانے کا منصوبہ بنانے والا سلطان علاؤ الدین خلجی بھی ہمارے خواجہ صاحبؒ کے سامنے آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے غیاث پور کا دورہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو خواجہ صاحب نے فرمایا: ”بادشاہوں سے ہمیں کیا سروکار؟ اگر سلطان ہماری درگاہ میں ایک دروازے سے داخل ہو گا تو ہم دوسرے دروازے سے نکل جائیں گے۔“

میں ایک روز کوتوالی میں اپنے خواجہ صاحبؒ کی ستائش کر رہا تھا کہ ایک بدگوشی نے اونچی آواز میں کہا: ”اجی! آپ کے بھی کیا کہنے، ایک طرف آپ مسدی لال

کائستھ ہیں، دوسری طرف شیخ عبداللہ۔ کچھ لوگوں کو آپ رام رام کہتے ہیں اور کچھ کو سلام کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ آپ کعبہ کی طرف جھکتے ہیں اور ہندو کے ساتھ شیو کے لنگم کو چومتے ہیں۔ کوتوال میں درباری ہیں، خانقاہ میں درویش۔ ایک پاؤں خانقاہ میں ہے اور دوسرا بیوی کی چارپائی پر۔ آپ دونوں دنیاؤں کے مزے لوٹتے ہیں۔ ہاں بھئی! آپ کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔"

میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کوتوالی واپس نہیں گیا۔ میں صحن میں چارپائی پر لیٹ کر خاکستری آسمان کو تکتے ہوئے منشی کی باتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اس شخص کو بازار میں لے جا کر ننگا کر دیتا اور ہر شہری کو اس کے مقعد میں تھوکنے کا حکم دیتا۔

رام دلاری نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"آپ کے چہرے پر لکھا ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ کیا آپ مجھے بھی نہیں بتا سکتے؟"

میں نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ میں واقعہ سنا چکا تو وہ دیوار کو تکنے لگی، میں آسمان کو تکنے لگا۔ میں نے اسے بتایا: "ہمارے جیسے لوگ اور بہت سے ہیں۔ شاعر ابوالحسن ہے، جو خود کو سلطانی اور امیر خسرو کہلاتا ہے۔ اس کا باپ مسلمان تھا اور ماں ہندو۔ وہ ہندوؤں کے لئے ہندی میں لکھتا ہے، مسلمانوں کے لئے فارسی میں۔ وہ سلطان اور خواجہ صاحبؒ دونوں کا قصیدہ گو ہے اور دونوں ہی کا پسندیدہ شخص ہے۔ کوئی اسے برا نہیں کہتا۔ فقط ہم بیچاروں پر ہندو مسلمان دونوں تھوکتے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتے ہیں، جیسے ہم ہیجڑے ہوں۔"

"ہیجڑے ہوں ہمارے دشمن!" رام دلاری نے غصے سے کہا: "آپ امیر خسرو سے مشورہ کیجئے نا!"

''میں اسے پسند نہیں کرتا۔''

''اگر آپ اُس سے اچھے انداز میں بات کریں گے تو ممکن ہے وہ آپ کا دوست بن جائے۔''

''اری! تم تو بہت سادہ ہو۔ تم دنیا کو نہیں جانتی ہو۔ امیر صرف امیروں کو دوست بناتے ہیں۔ چالاک لوگ صرف خوشامدیوں کو پسند کرتے ہیں۔ خسرو امیر بھی ہے، چالاک بھی۔ میں اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے پاس اس کی خوشامد کرنے کا وقت نہیں ہے۔''

تاہم اگلے دن میں غیاث پور گیا تو سیدھا امیر خسرو کے پاس چلا گیا۔ وہ معمول کے مطابق اپنے مداحوں میں گھرا ہوا تھا اور معمول کے مطابق صرف وہی بول رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی چھڑی میری طرف اٹھاتے ہوئے کہا: ''مسدی لال عرف عبداللہ نے یہاں تشریف لا کر آج ہمیں عزت بخشی ہے۔''

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر دوسروں کو سلام کیا۔ اس کا دوست، شاعر میر حسن دہلوی زیادہ ملن سار شخص تھا۔ وہ مجھ سے بولا: ''کہو بھائی عبداللہ! تمہارے حال کیسے ہیں؟ کیسی گزر رہی ہے؟'' میں نے ''الحمدللہ'' کہا اور بیٹھ گیا۔

خسرو نے جان لیا کہ میں نے بُرا محسوس کیا ہے، پس اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کی، ''بھائی عبداللہ! میں نے تمہارے لئے ہندی میں ایک نئی پہیلی کہی ہے، ذرا اسے بوجھ کر تو دکھاؤ:

''میں نے بیس کے سر قلم کئے
کسی کی جان گئی نا خون بہا''

واضح تھا کہ وہ میرے آنے سے پہلے یہ پہیلی دوسروں سے پوچھ چکا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ میں پہیلی نہیں بُوجھ سکتا۔ خسرو نے کہا: ''احمق! جواب تو پہیلی ہی میں ہے۔ جواب ہے ناخن۔ ناخن کا مطلب ناخن بھی ہے اور نا خو'

خسرو کی پہیلیاں بوجھنے کو دماغ چاہئے دماغ۔"

"اللہ نے تمہیں ذہانت دی ہے اور مجھے تمیز۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ تیر نشانے پر لگا۔ خسرو نے اپنا لہجہ بدلا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ کبھی گرم، کبھی سرد۔ اس نے کہا: "بھائی! برا مت مانو۔ ہم تو دھرم بھائی ہیں۔ لو دوسری پہیلی بوجھو:

وہ ساری رات میرے ساتھ رہا،
صبح ہوئی تو چلا گیا،
اس کے جانے سے میرا دل ڈوب گیا،
اے سکھی! کیا وہ میرا محبوب تھا؟
نا سکھی! وہ......تھا۔"

خسرو میرے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے بولا: "بوجھو تو جانیں، بوجھو تو جانیں۔" خوش قسمتی سے کسی نے جواب دیا: "دیا۔"

خسرو پہیلیوں پر پہیلیاں پوچھتا رہا۔ اس کے ایک حاشیہ بردار نے کہا: "بھائی! یہ پیشگوئی پوری ہو چکی ہے کہ آپ خاقانی سے بڑے شاعر ہوں گے۔" خسرو نے اس سے انکار نہیں کیا اور بولا: "میں تو خواجہ صاحبؒ کے پاؤں کی خاک ہوں۔ اگر وہ مجھے طوطیٔ ہند اور ہندوستان کا شیخ سعدی کہتے ہیں تو کرۂ ارض کی کون سی طاقت ہے جو مجھے دنیا کا سب سے بڑا شاعر اور مغنی بننے سے روک سکتی ہے؟"

بھلا ایسی جھوٹی عاجزی اور شرمناک شیخی خوری کے حوالے سے کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص کامیابی حاصل کرتا ہے، لوگ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ خسرو کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ ایک شخص کہتا کہ خسرو ایک عظیم شاعر ہے تو دوسرا کہتا وہ ایک عظیم موسیقار ہے۔ اگر کوئی تیسرا شخص کہتا کہ خسرو ایک عظیم سیاست دان ہے تو چوتھا کہتا کہ وہ ایک عظیم شمشیر زن ہے۔ خسرو اپنے آپ کو مشہور کرنے کے فن سے واقف تھا۔ وہ سیاہ رو ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ترک

کہلواتا اور ترکی کو اپنا ''وطن'' قرار دیتا تھا۔ اس نے اپنے لئے جو شاعرانہ نام چنے تھے، ان سے خاندانی شرف، دولت اور قوت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کا پہلا شاعرانہ نام سلطانی تھا۔ (آخر والی ہٹا دو تو سلطان بچتا ہے)۔ جب وہ خسرو بنا تو اس نے لفظ امیر (دولت مند) کا اضافہ کر لیا۔ خدا نے اسے ذہانت اور تخلیقی جوہر تو عطا کیا تھا لیکن شائستگی عطا نہیں کی تھی۔ شیخ سعدی سے اپنا موازنہ کرنے والے خسرو کو معلوم نہیں تھا کہ ایک شاعر نے اپنی تعریفیں خود کرنے والوں کے بارے میں کیا کہہ رکھا ہے:

اپنی تعریفیں خود کرنا داناؤں کا شیوہ نہیں
جو عورت اپنی چھاتیاں خود سہلاتی ہے، اسے
کیا لطف مل سکتا ہے؟

جب خواجہ صاحبؒ تشریف لائے تو خسرو یکسر تبدیل ہو گیا۔ خواجہ صاحبؒ بھی ہزاروں لوگوں میں سے صرف اس کو خصوصی توجہ دیتے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور پوچھتے: ''ابوالحسن سب خیریت ہے نا؟''

میں مہرولی واپس جاتے ہوئے خسرو کے بارے میں غصے سے سوچ رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا کہ لوگ اس کا دہرا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھے؟ وہ لاتعداد آقاؤں کا بندہ تھا۔ اگر کوئی شخص جانتا تھا کہ کب غروب ہوتے ہوئے سورج سے رخ پھیرنا ہے اور نئے ابھرتے ہوئے سورج کی پوجا کرنی ہے، تو وہ خسرو تھا! وہ پہلے سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کے ساتھ تھا۔ پھر اس نے چھجو کو چھوڑ دیا اور سلطان کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ولی عہد کا دم بھرنے لگا۔ جب حکمران خاندان نصف ہندو تھا، تو اس نے اپنی رگوں میں ہندو خون ہونے کا اعلان کر دیا اور ہندوستان کی عظمت کے گن گانے لگا۔ اس نے ہندوستان کے پانوں، کیلوں، شطرنج کھیلنے والوں اور موسیقاروں کی تعریف کی۔ جب حکمران متعصب تھا تو اسی خسرو نے اعلان کیا: ''ہندوؤں کو انسان مت سمجھو کیونکہ وہ گائے کی پوجا کرتے ہیں اور کوے کو طوطے سے برتر تصور کرتے

ہیں۔" خسرو کے بقول ہندوستان دنیا کا عظیم ترین ملک اس وجہ سے تھا کہ وہ (یعنی خسرو) ہندوستانی ہے! میں نے اپنے آپ سے کہا: مجھے خسرو جیسے شخص کے لئے وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

رام دلاری نے میرے قدموں کی آہٹ سنتے ہی دروازے کی کنڈی کھول دی۔ کمل سویا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دودھ گرم کر کے دیا اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ غیاث پور میں جو کچھ بیتی تھی، میں نے اسے سنائی۔ میں نے اس سے ناخنوں والی پہیلی پوچھی۔ اس نے پہیلی بُوجھ لی۔ میں نے "ساری رات گزار کر صبح چلے جاتے" والی پہیلی پوچھی۔ اس نے مجھے ٹھوکا مارتے ہوئے کہا: "آپ کے اور کیا ارادے ہیں؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قضیب پر رکھ دیا: "پہیلی کا جواب یہ نہیں ہے پگلی! اس کا جواب ہے دیا۔"

اس نے اٹھ کر دیا بجھا دیا۔

☆☆☆

کئی سال گزر گئے۔ ہم نے ہزاروں مرتبہ ہم بستری کی، میں نے اس کے اندر مادۂ منویہ کے دریائے جمنا جیسا سیلاب داخل کیا، لیکن ان میں سے کوئی کوشش رام دلاری کی کوکھ ہری نہ کر سکی۔ میرے سر کے بال گرتے رہے، یہاں تک کہ میں گنجا ہو گیا۔ میری دائیں آنکھ کی بینائی ختم ہونے لگی۔ حکیموں کے تجویز کردہ سرمے موتیا بند کو ختم نہ کر سکے، جس کے نتیجے میں جلد ہی میں دائیں آنکھ کی بینائی سے محروم ہو گیا۔ رام دلاری کے بال بھی خاکستری ہو گئے۔ حیض کا سلسلہ رک گیا تو وہ موٹی ہونے لگی۔ اب وہ جب بھی چارپائی سے اٹھتی، گھٹنے پکڑ لیتی اور رام جی کو مدد کے لئے پکارتی۔ ہم اکثر ایک ہی چارپائی پر سوتے لیکن ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیر کر سوئے رہتے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایشور ہمیں کافی کچھ دے چکا ہے اور ہمیں باقی زندگی پوجا پاٹھ میں گزارنی چاہئے۔

کمل جوان ہو گیا۔ اس نے حوضِ علائی کے مدرسے سے ترکی اور فارسی کا علم حاصل کیا۔ میں نے کوتوال صاحب کو گیارہ سونے کے سکے دے کر کمل کو اپنی جگہ کوتوالی میں محرر لگوا دیا۔ رام دلاری نے جوگ مایا کے مندر اور غیاث پور میں حاضری دینے والے ایک کایستھ خاندان میں کمل کے لئے بیوی ڈھونڈ لی۔ کمل اور اس کی بیوی کے رویے نے ہمیں یقین دلا دیا کہ کایستھوں کی ہماری والی شاخ ہمارے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گی۔

ہم اپنے مہرولی والے گھر کی نسبت زیادہ وقت خواجہ صاحبؒ کی غیاث پور والی خانقاہ میں گزارنے لگے۔ پھر ہم نے غیاث پور میں کمرے کرائے پر لے کر وہیں رہنا شروع کر دیا۔ ہم مہینے میں ایک مرتبہ اپنے بیٹے اور بہو سے ملنے مہرولی جاتے تھے۔ کمل ہر جمعرات اپنی بیوی کے ساتھ ہمیں ملنے آتا تھا۔

ہم خواجہ صاحبؒ کو روز دیکھتے تھے۔ خسرو اب وہاں پہلے سے زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔ وقت نے اس سے اس کا طنطنہ چھین لیا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا اور رام دلاری کو بھابھی کہنے لگا۔ ہم ایک دوسرے کے گھر اکثر آنے جانے لگے۔

انسان بڑھاپے میں اور کیا مانگ سکتا ہے؟ شانتی، عبادت، تحفظ، دوست...... سب کچھ ایک برگد کے گھنے درخت کے سائے تلے موجود تھا...... اور ہمارے خواجہ صاحبؒ محبوب الٰہی و محبوبِ آدم! ہم دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے الگ تھے۔ ہم ایسے لوگوں جیسے تھے، جو کچھ خریدنے کی خواہش کئے بغیر بازار میں گھومتے پھرتے ہیں۔

دنیا ہمارے محدود جہان میں شاذ ہی داخل ہوتی تھی۔ ایسا ایک موقعہ علاؤ الدین خلجی کی موت تھی۔ پہلے پہل ہم نے سنا کہ وہ نیند میں ہی موت کی آغوش میں چلا گیا ہے اور امرا کی جانب سے اس کے جانشین کے چناؤ تک ملک کافور حکمرانی کرے گا۔ ملک کافور غلام تھا، جسے مرحوم سلطان نے سپہ سالار کے عہدے پر ترقی دے دی تھی۔ پھر ہم نے سنا کہ ملک کافور نے اپنے آقا کی بیوہ سے شادی کر لی ہے، دو شہزادوں کی

آنکھیں نکلوا دی ہیں اور باقی کو قتل کروا دیا ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے، جو کہ سلطانوں کے آنے جانے کی شاذ ہی پروا کرتے تھے، کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''توبہ!'' حد تو یہ ہے کہ امیر خسرو نے بھی ملک کافور کی ہجو لکھی اور غیاث پور میں ایک اجتماع میں سنائی۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے خواجہ صاحبؒ جس شخص کے خلاف کچھ کہتے ہیں، اسے سزا یقیناً ملتی ہے۔ پس ایسا ہی ہوا۔ محل کے خدام ملک کافور کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنے خنجروں کی پیاس اس کے گندے خون سے بجھائی۔

نیا سلطان قطب الدین مبارک شاہ تھا۔ وہ ہمارے خواجہ صاحب کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے حاشیہ برداروں نے اس کے سینے میں سلگتے نفرت کے شعلوں کو ہوا دے کر الاؤ بنا دیا۔ انھوں نے کہا: ''نظام الدینؒ کہتا ہے آپ کسی کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیتے۔ وہ رعایا کی نگاہوں میں آپ کی شان کم کرنے کے لئے شاہی احکامات کی تعمیل سے روگردانی کرتا ہے۔ (ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ خواجہ صاحبؒ مسجد قوت الاسلام میں جمعے کی نماز نہیں پڑھتے تھے)۔ وہ حضور والا اور خسرو خان کے بارے میں افواہیں پھیلاتا ہے۔''

یہ خسرو خان کون تھا؟ وہ ایک ہندو پوار لڑکا تھا، جسے گجرات سے ایک مہم کے دوران پکڑا گیا تھا۔ گجرات کے مرد نسوانی حسن رکھتے تھے، اور گجراتیوں میں پوار انتہائی خوب صورت اور انتہائی نسائیت کے حامل ہوتے تھے۔ میں نے کبھی اسے دیکھا نہیں تھا لیکن سنا تھا کہ اس کا رنگ صاف، آنکھیں ہرنی جیسی، ابرو کمانوں جیسے اور کولھے عورتوں کی طرح بڑے بڑے ہیں۔ سلطان جو عورت پرستی کے حوالے سے مشہور تھا، اپنے حرم میں موجود ہندوستان، ایران اور ترکستان کی حسیناؤں سے نفور ہو کر گجرات کے اس لڑکے کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ لڑکا ہونٹوں کو رنگین کئے اور سیاہ آنکھوں میں سرمہ لگائے اس کے پاس رہتا۔ وہ ایک ہی ساغر سے شراب پیتے۔ شاہی حکیم سے کہا گیا کہ لڑکے کے کولھوں پر ملنے کے لئے خوشبودار تیل تیار کیا جائے۔ پھر سلطان میں ایک اور تبدیلی

آئی۔ اس نے اپنے ہونٹ رنگنے، کولھوں پر خوشبودار تیل ملنا اور لڑکے سے وہی کچھ کروانا شروع کر دیا، جو وہ پہلے اس کے ساتھ کرتا تھا۔ لوگ مرچ مسالہ لگا کر اس معاملے کی باتیں کرنے لگے۔

مسلمان اس معاملے پر ہندوؤں سے زیادہ مضطرب تھے۔ وہ کہتے کہ یہ بڑی ذلت کی بات ہے کہ ایک کافر ایک ترک پر یوں چڑھے جیسے گھوڑا گھوڑی پر چڑھتا ہے۔ سلطان نے سوچا کہ مسلمان شاید اس لئے ناخوش ہیں کہ اس کا محبوب ہندو ہے۔ اس نے لڑکے کو مسلمان ہونے کا حکم دیا اور اس کا نام خسرو خان رکھ دیا۔ بازاروں میں گجراتی گھوڑے اور ترکی گھوڑی کے قصے عام سنے جاسکتے تھے۔ یہ قصے سلطان کے کانوں تک بھی پہنچ گئے۔ خواجہ صاحبؒ سے نفرت کرنے والے علما نے سلطان سے کہا کہ اس کے اور خسرو خان کے حوالے سے سارے گندے قصے غیاث پور کی خانقاہ سے پھیلائے جا رہے ہیں۔

سلطان نے ان کی بات پر یقین کر لیا۔ اس نے خانقاہ کو اشیائے ضرورت کی فراہمی روک دی۔ لوگوں کی آمدورفت پر نظر رکھنے کے لئے غیاث پور میں ایک پولیس چوکی بنا دی گئی۔ خدا کے کام نرالے ہوتے ہیں! ہمارے خواجہ صاحبؒ نے، جو کہ سلطانوں کے سلطان تھے، کاغذ کی ایک پرچی پر صرف اللہ کا نام لکھ کر اسے خانقاہ کے داخلی دروازے پر لگا دیا۔ انھوں نے لنگر خانے میں پکائے جانے والے لنگر کی مقدار دگنی کرنے کا حکم دے دیا۔ اللہ گواہ ہے کہ ہمیں آٹے، دالوں، نمک اور گھی کی قلت کبھی نہیں ہوئی۔ اگرچہ امرا خانقاہ سے دور رہے، تاہم غریبوں کی آمد میں اضافہ ہو گیا۔

سلطان کے غصے کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔ اس نے خانقاہ کو بند کرنے کا حکم دیا۔ تاہم اللہ کے کام نرالے ہوتے ہیں! اس نے اپنے محبوب دوست کو مصیبت میں دیکھا تو سلطان کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ سلطان اور اس کے معشوق لڑکے کی گناہگارانہ ہم بستری کے ہولناک نتائج نکلے۔ سلطان کے قضیب پر پھوڑے نکل آئے

اور اس کے لئے پیشاب کرنا بھی ناممکن ہوگیا۔ طبیبوں کی تمامتر کوششوں کے باوجود نہ تو پھوڑے ٹھیک ہوئے، نہ پیشاب کا ایک قطرہ نکلا۔ خدا کے نازل کردہ عذاب کا علاج بھلا کون کرسکتا ہے! اور انسان پیشاب کیے بغیر کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہے؟ چند گھنٹوں میں سلطان درد سے تڑپنے اور اللہ سے رحم کی التجائیں کرنے لگا۔ اس کی ماں اپنے بال نوچتے، روتے اور سر میں خاک ڈالتے ہوئے غیاث پور آئی۔ اس نے خواجہ صاحبؒ کے پاؤں پکڑ لئے اور اس وقت تک نہیں چھوڑے جب تک انھوں نے اس کے بیٹے کو معاف نہیں کر دیا۔ خواجہ صاحبؒ نے کہا: ''اپنے بیٹے سے کہو تخت چھوڑ دے اور اپنی سلطنت ہمیں دے دے۔'' ہم جانتے تھے کہ محبوبِ الٰہیؒ کچھ دوسری کرامات دکھانا چاہتے ہیں۔

سلطان کی ماں فوراً محل واپس گئی۔ سلطان شدید اذیت میں تھا۔ اس نے کہا کہ جونہی وہ پیشاب کرنے کے قابل ہوگا، اپنی سلطنت کو چھوڑ دے گا۔

''نہیں۔'' ہمارے خواجہ صاحبؒ نے قاصد سے کہا: ''پہلے وہ تخت چھوڑے گا، پھر اس کا پیشاب کھلے گا۔ اپنے ہاتھ سے تخت چھوڑنے کی دستاویز لکھو اور اس پر شاہی مہر لگاؤ۔''

سلطان نے جس وقت تخت چھوڑنے کی دستاویز پر دستخط کیے، وہ اس وقت حقیقتاً لبِ مرگ تھا۔ جونہی اس نے مہر لگائی، اس کے مثانے نے، جو کہ پھٹنے کے قریب ہو رہا تھا، زہریلا مواد خارج کر دیا۔ سلطان کی ماں اپنے بیٹے کے پیشاب سے بھرا مرتبان اپنے سر پر اٹھائے ننگے پاؤں غیاث پور پہنچی۔ شاہی حرم کی عورتیں، خواجہ سرا اور محافظ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ خواجہ صاحبؒ کے سامنے جھکی اور دستاویز ان کے قدموں میں رکھ دی۔ خواجہ صاحبؒ نے مہر کھولی اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی طرف سے سلطنت ہندوستان غیاث پور کے درویش حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے حوالے کیے جانے کا بیان بآوازِ بلند پڑھا۔ پھر انھوں نے اس دستاویز کے پرزے پرزے کر کے

اسے پیشاب کے مرتبان میں ڈال دیا۔ "ہم درویش لوگ دنیاوی سلطنتوں کو بس اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر عبادت کرنے کے لئے اپنے حجرے میں چلے گئے۔

جو انسان فطرتاً برا ہوتا ہے، وہ وقتی طور پر نادم ہوا کرتا ہے اور اپنے ساتھ بھلائی کرنے والوں کے احسانات جلد فراموش کر دیتا ہے۔ جونہی سلطان صحت یاب ہوا، اس نے پہلے والی حرکتیں دوبارہ شروع کر دیں۔ چونکہ ہندوستان کی بادشاہی کو پیشاب کے مرتبان میں ڈالنے جانے کی کہانی عام ہو چکی تھی، اس لئے سلطان کا غصہ اس کی ممنونیت پر غالب آ گیا۔ اس نے مسلمانوں کے لئے حکم جاری کیا کہ وہ چاند کی پہلی تاریخ کو مسجد قوت الاسلام میں جمع ہو کر اس کی اطاعت کا اظہار کریں۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارے خواجہ صاحبؒ نے مہینے کا وہ دن اپنی مرحومہ والدہ کی مقدس یاد کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے یہ حکم سنا تو ہدایت کے لئے اپنی والدہ کے مزار پر تشریف لے گئے۔ فاتحہ خوانی کے بعد وہ وہیں لیٹ کر سو گئے۔ جب وہ جاگے تو انھوں نے ہمیں بتایا کہ انھوں نے خواب میں ایک دیوقامت بیل کو خود پر حملہ آور ہوتے دیکھا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے بیل کو سینگوں سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔ ہمیں خواب کی تعبیر جاننے کے لئے کسی سے رجوع کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

وہ منحوس دن آ پہنچا اور عصر کی نماز کے بعد بے شمار لوگ خواجہ صاحبؒ کے حضور جمع ہو گئے۔ جب مغربی دیوار کا سایہ مسجد کے صحن میں پھیل گیا تو خواجہ صاحبؒ نیا چاند دیکھنے کے لئے ہم میں سے کچھ لوگوں کے ساتھ چھت پر چلے گئے۔ جونہی سورج کا نچلا سرا شہر نو کی فصیل کے پرے غروب ہوا، ہمیں پیلا، نقرئی ہلال دکھائی دیا۔ خواجہ صاحبؒ نے مختصر سی دعا کی، اپنے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں اور ڈاڑھی پر پھیرا اور فارسی کا ایک شعر پڑھا، جس کا مفہوم کچھ یوں تھا:

اے لومڑی! تو اپنے غار میں کیوں نہیں رہی؟
تم نے شیر سے جھگڑا کیوں مول لیا اور اپنے انجام کو پہنچی؟

ہم شام کو تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چھت پر ہی ٹہلتے رہے۔ سورج اور چاند دونوں غائب ہو گئے۔ مختصر سی شام تاریک رات میں بدل گئی۔ اچانک مغربی افق پر شعلے سے بھڑکنے لگے۔ ہم نے گھوڑوں کے سُموں کی آوازیں سنیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی فوج مشعلیں اٹھائے ہماری طرف بڑھی چلی آرہی ہو۔ کیا یہ خواجہ صاحبؒ کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجی گئی شاہی فوج ہے؟ کوتوال خود آیا تھا۔ وہ محبوبِ الٰہی کو گرفتار کرنے نہیں بلکہ یہ خبر سنانے آیا تھا کہ سلطان کو قتل کر دیا گیا ہے اور شہر میں افراتفری مچی ہوئی ہے۔

اگلے روز ہم تفصیلات سے آگاہ ہوئے۔ سلطان اور اس کے پوار دوست نے طے کیا ہوا تھا کہ وہ باری باری ایک ایک دن عورت اور مرد کے کردار ادا کیا کریں گے۔ وہ اپنی لذت کو بڑھانے کے لئے باقاعدہ شادی کی تقریب منعقد کرتے تھے۔ ایک رات سلطان ترک دولہا بن کر آتا، پوار کے ساتھ شادی کی دستاویز پر دستخط کرتا اور اسے شاہی بگھی میں اپنے محل لے جاتا۔ اس کے بعد دعوتِ ولیمہ ہوتی۔ اگلے دن کردار بدل جاتے۔ واردات والے دن عورت بننے کی باری سلطان کی تھی۔ سلطان ترک دلہن کی طرح ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس پہنے اور منہ پر جالی دار نقاب ڈالے ہوئے تھا۔ پوار راجپوت دولہے کی طرح گھوڑے پر سوار ہو کر محل پہنچا۔ موسیقاروں کا دستہ اس کے ساتھ تھا۔ ان کی شادی ہندووانہ رسوم کے مطابق ادا کی گئی۔ منتر پڑھتے ہوئے پوترا اگنی کے گرد پھیرے لگائے گئے۔ پھر پوار اپنی ترک "دلہن" کو اپنی بگھی میں بٹھا کر اسے بے لباس کرنے کے لئے لے گیا۔ جب پوار ترک پر چڑھا تو موخر الذکر نے کنواری دلہن کی طرح احتجاج کیا۔ جب پوار مکمل طور پر موج میں آگیا تو اس نے سلطان کے صحت یاب قضیب سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ایسے معاملات کو جاننے والے کہتے ہیں کہ مردوں کے ساتھ ہم بستری کرنے والے مردوں میں ایسا معمول ہوا کرتا ہے۔ جب پوار کلائمیکس پر پہنچا تو اس نے اپنا قضیب باہر نکالا اور پوری قوت سے سلطان کے مقعد میں گھسایا۔

سلطان چیخ اٹھا۔ پوار پر وحشت غالب آگئی اور اس نے سلطان کے خصیے اپنے ہاتھوں سے بھینچ دئے۔ جب وہ اپنی وحشیانہ شہوت سے آزاد ہوا تو اس کی آنکھوں پر آیا ہوا پردہ ہٹ گیا۔ اس نے جرأت سے کام لیا اور سلطان کا سر قلم کر ڈالا اور سلطان کی لاش کو فصیل سے نیچے پھینک دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ چونکہ رعایا ایک کجرو کو اپنا حکمران دیکھنا نہیں چاہتی تھی' اس لئے اس نے سلطان کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یوں لوطی سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی حکومت ختم ہوئی۔ یہ 1320ء کا واقعہ ہے۔

اب دلی کا نیا بادشاہ تھا! ایک کی جگہ دوسرے لوطی نے لے لی۔ خسرو خان کا نام پانے والے گجرات کے ہندو پوار راجپوت نے سلطان نصیر الدین محمد کے خطاب کے ساتھ اپنے آپ کو ہندوستان کا شہنشاہ قرار دے دیا۔ ہم سوچتے تھے کہ کیا خواجہ صاحب'' قاتل اور لوطی خسرو خان کو اس کے گناہوں کی سزا نہیں دیں گے۔ نصیر الدین نے امرا کی وفاداری جیتنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے دور افتادہ صوبوں کے گورنروں کو خلعتیں بھیجیں۔ بیشتر نے انھیں قبول کر کے جوابی تحائف بھیجے۔ تاہم منگولوں کے خلاف مغربی سرحدوں کا تحفظ کرنے والے غیاث الدین تغلق نے خلعتوں کے طشت ٹھکرا دیئے۔ اس نے کہا کہ کوئی ترک کسی دہرے چہرے والے ہیجڑے کو بادشاہ تسلیم نہیں کر سکتا۔

ہندوستان کے مسلمان نصیر الدین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے مدد کے لئے راجپوتوں اور جاٹوں سے رابطہ کیا۔ اس نے انھیں شہر نو کے دفاع کے لئے بلایا۔ جنگ شہر کے مضافات میں لڑی گئی۔ جب ترکوں کو شکست ہونے لگی تو شہر کے مسلمان جاٹوں اور راجپوتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور جنگ کا پانسہ اپنے ہم مذہبوں کے حق میں پلٹ دیا۔ غیاث الدین تغلق نے نصیر الدین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کی لاش کو فصیل سے نیچے پھنکوا دیا۔ ہزاروں شہریوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ رام دلاری اور میں اپنے بیٹے اور بہو کی حفاظت کے لئے ساری رات دعائیں کرتے رہے۔

(تاہم انھوں نے ذہین کائستھوں کی طرح خود کو ایک کمرے میں مقفل کر لیا اور دروازے پر 786 لکھوا دیا، تاکہ اسے مسلمانوں کا گھر سمجھا جائے۔ یوں وہ خون کے پیاسے ترکوں سے بچ گئے۔

کسی دانا نے کہا ہے کہ رعایا کو اپنے حکمران کی خامیاں نہیں بلکہ اس کی خوبیاں ہی دیکھنی چاہئیں۔ غیاث الدین تغلق خاندانی شخص تھا۔ اس نے ایک ہندو عورت سے شادی کی تھی اور اپنے بیٹے شہزادہ جونا کی شادی ایک ہندو عورت سے کی تھی۔ ہندو ملکہ اور ہندو بہو کی موجودگی میں ہمیں سلطان سے توقع تھی کہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بہتر سلوک کرے گا۔ ہماری امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ سلطان غیاث الدین تغلق ایک جابر حکمران نکلا۔ اس کے خوشامدیوں نے اس کے اور خواجہ صاحبؒ کے درمیان غلط فہمی پیدا کر دی۔ انھوں نے کہا: ''کیا یہ درست ہے کہ یہ بوڑھا درویش وہ عزت حاصل کرے، جو کہ زمین پر خدا کے نائب کی حیثیت سے صرف جہاں پناہ کا حق ہے؟''

غیاث الدین نے مہرولی اور غیاث پور کے درمیان سنہری اینٹوں سے ایک نیا شہر تعمیر کروایا اور اس کے گرد اونچی فصیل بنوائی۔ اس شہر کا نام تغلق آباد رکھا گیا۔ وہ توقع کرتا تھا کہ ہر شخص آ کر اس سے عقیدت کا اظہار کرے اور اس کے کارنامے کی تعریف کرے۔ ہمارے خواجہ صاحبؒ کے علاوہ ہر شخص نے ایسا ہی کیا۔ جب غیاث الدین نے ہمارے خواجہ صاحبؒ سے وضاحت طلب کی تو آپ نے پیشگوئی کی کہ نیا شہر ویرانہ بن جائے گا اور اس میں گجر ڈاکو رہا کریں گے۔

جب سلطان کو اس پیشگوئی کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ خواجہ صاحبؒ کو ضرور سبق سکھائے گا۔ وہ احمق شخص نہیں جانتا تھا کہ خدا اپنے محبوب ولی نظام الدینؒ کے وسیلے سے بات کرتا ہے۔ خدا نے سلطان کو کسی پاگل ہاتھی جیسی حرکتیں کرنے پر مائل کیا۔ اس نے اسے مشرقی علاقوں میں فتح دلوائی اور اس میں اپنے ناقابل تسخیر ہونے کے گمان پیدا کیے۔ باقی کام درباریوں نے کیا۔ انھوں نے کہا: ''اے عظیم

سلطان! آپ نے تو اپنے ہزاروں دشمنوں کے سر ایسے قلم کر دئیے ہیں، جیسے کسان گندم کاٹتا ہے، کیا آپ اس معمولی سے درویش کو فنا نہیں کر سکتے؟" غیاث الدین تغلق نے، جو کہ دلی سے تھوڑے فاصلے پر تھا، حکم دیا کہ اس کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے غیاث پور والی خانقاہ کو مسمار کر دیا جائے۔

کوتوال آنکھوں میں آنسو لئے آیا۔ اس نے شاہی حکم نامہ خواجہ صاحبؒ کے پیروں میں رکھ دیا۔ خواجہ صاحبؒ نے اسے تسلی دی: "بیٹا، میں نے بہت سے سلطانوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ جب میں پہلی بار دلی آیا تھا تو غیاث الدین بلبن سلطان تھا۔ اس کے بعد کیقباد اور جلال الدین فیروز آئے، پھر علاء الدین اور قطب الدین خلجی اور نصیر الدین آئے۔ اب غیاث الدین تغلق آیا ہے۔ کُل ہوئے سات سلطان۔ بادشاہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اللہ کی مرضی ابد تک رہتی ہے۔"

کوتوال خواجہ صاحبؒ کے الفاظ میں پوشیدہ مفاہیم نہیں سمجھا۔ اُس نے پوچھا: "محبوبِ الٰہی! آپ میرے لئے میرے ماں باپ سے زیادہ ہیں۔ سلطان دلی سے صرف تین کوس دور ہے۔ میں کیا کروں؟"

خواجہ صاحب نے کہا: "سکون سے گھر جاؤ۔ ہنوز دلی دور است۔"

جونہی کوتوال شہر نو پہنچا اسے خبر ملی کہ سلطان کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ اگلی صبح ہرکارے خبر لائے کہ سلطان ایک محراب کے نیچے سے گزر رہا تھا کہ محراب اس پر گر گئی اور سلطان مر گیا۔ یہ 1325ء کا واقعہ ہے۔ بے شک اللہ کمزوروں کی طاقت ہے۔ جیسا کہ خواجہ صاحبؒ نے پیش گوئی کی تھی، غیاث الدین کا بنوایا ہوا عظیم قلعہ جلد ہی ویران ہو گیا، دریائے جمنا اس کی فصیل سے پرے ہٹ گیا اور سارے کنوئیں سوکھ گئے۔ اس میں گیدڑ، الو، چمگادڑ اور گجر رہنے لگے۔ اس کی شہری فصیل گرنے لگی۔ صرف غیاث الدین تغلق کا مزار باقی رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اللہ اسے دکھانا چاہتا ہو کہ اس کے شان و شوکت کے خوابوں کے ساتھ کیا گزری۔

خدا قسمت کی کتاب کا لکھنے والا ہے۔ اس کتاب میں ماضی، حال اور مستقبل لکھے ہوئے ہیں۔ خدا نے ہمارے خواجہ صاحبؒ کو رونما ہونے والے واقعات پڑھنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ ایک روز خواجہ صاحبؒ نے اپنے وعظ میں کہا کہ کسی کو موت سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ محبت کرنے والے کا اپنے محبوب سے وصال ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا: "میں نوے برس اللہ سے دور رہا ہوں، لیکن میں ان نوے برسوں کے ہر دن اور ہر پل میں اس سے وصال کا آرزومند رہا ہوں۔"

ان کے الفاظ نے غیاث پور کو ملول کر دیا۔ میں نے خواجہ صاحبؒ سے ملنے کی درخواست کی۔ میں ان کے سامنے پہنچ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انھوں نے کہا: "اگر تم ہمارے لئے رو رہے ہو تو یقین رکھو کہ تم جلد ہمارے پیچھے آنے والے ہو۔ تمہاری بیوی تمہارے بعد اس کاروان سرائے میں زیادہ عرصہ نہیں رہے گی۔"

میں نے روتے ہوئے کہا: "اے محبوبِ الٰہی! ہمیں اپنے ساتھ ہی لے جایئے تاکہ ہم جنت میں آپ کی خدمت کریں۔"

میں بہت اداس رہنے لگا۔ میں خود کو بہت کہتا کہ میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ بمشکل دیکھ اور چل سکتا ہوں سو اب تو میرے لئے موت بڑھاپے سے رہائی کا پروانہ ہوگی، اس کے باوجود میں موت سے ڈرتا تھا۔ میں یم کی خوفناک سلطنت میں جانے کی بجائے بیمار اور دکھی رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ مجھے محبوب سے وصال کی آرزو نہیں تھی، میرے لئے تو میری بغیر دانتوں والی بوڑھی رام دلاری ہی کافی تھی۔

725 ہجری بمطابق 1324ء ربیع الثانی کے مہینے میں خواجہ صاحبؒ نے ہمیں بتایا کہ وہ فرشتوں کے خیر مقدمی گیت گانے کی آواز سن رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے اپنے دنیاوی کھوٹ والے جسم کو چالیس دن روزے رکھ کر پاک صاف کریں گے۔ ہم نے ان سے التجا کی: "اے محبوب الٰہی! حکیموں کا کہنا ہے کہ آپ کے جسم کو غذا کی ضرورت ہے اور ایک ہفتے کے روزے بھی آپ کے جسم کے لئے بہت

نقصان دہ ثابت ہوں گے۔"

انھوں نے ہمیں جھڑکتے ہوئے کہا: "کیا تم نے مجھ سے یہی کچھ سیکھا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ عبادت اور روزے زمینی زندگی سے بہتر زندگی کے لئے غذا ہوتے ہیں؟"

غیاث پور کو دکھ نے گھیرے میں لے لیا۔ خواجہ صاحبؒ نے ہماری پریشانی بھانپ لی۔ انھوں نے ہمیں بتایا: "میں جمعرات تک تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے اس صحن میں دفنانا۔ خسرو کو میری قبر پر مت آنے دینا (وہ اس وقت لکھنوتی میں تھا) کہیں ایسا نہ ہو کہ میں فطرت کے قوانین کو توڑنے پر مائل ہوؤں اور اٹھ کر اسے گلے لگا لوں۔ اللہ اور اس کے پیغمبرؐ کا پیغام میرے خلیفہ مخدوم نصیر الدین کے ذریعے تم تک پہنچتا رہے گا۔ وہ اس تاریک دنیا میں تمہارے رہنما ہوں گے، کیونکہ وہ روشن چراغ دلی ہیں۔"

خواجہ صاحبؒ کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ 18 ربیع الثانی 725ھ (3 اپریل 1324ء) بروز جمعہ بوقت صبح خواجہ صاحبؒ کی روح جنت کو روانہ ہوگئی۔ لوگوں نے آہ وزاری شروع کر دی۔ نوحہ گری کی صدائیں آسمان تک جا رہی تھیں۔ قریبی شہروں سے سینکڑوں ہزاروں لوگ غیاث پور آگئے۔ عورتیں یا اللہ! یا اللہ! کہتی ہوئیں چھاتیاں پیٹ رہی تھیں۔ حضرت روشن چراغ نے، جنھیں خواجہ صاحبؒ نے اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا، باہر آکر اشک آلود آواز میں کہا کہ غم کا ایسا اظہار شریعت کی رو سے منع ہے۔ انھوں نے غمگساروں کو الگ الگ ٹولیوں میں بانٹ کر انھیں قرآن کی تلاوت کرنے بٹھا دیا۔

خواجہ صاحبؒ کی نعش کو غسل دیا گیا۔ نماز جنازہ مسجد کے صحن میں پڑھائی گئی۔ پھر جنازہ غیاث پور سے باہر لے جایا گیا۔ قوال ساتھ ساتھ قوالیاں گاتے جا رہے تھے۔

کسی نے چیخ کر کہا کہ خواجہ صاحبؒ نے ہاتھ کفن سے باہر نکالا تھا۔ جنازہ زمین پر رکھ دیا گیا اور لوگ اس کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ نظم بحال ہوتے ہوتے وقت لگ گیا۔ جنازہ برداروں نے کہا کہ انھوں نے خواجہ صاحبؒ کو قوالوں کی قوالی کا جواب

دیتے سنا ہے۔ حضرت روشن چراغ نے خواجہ صاحبؒ کے کان میں کہا: ''اے محبوب الٰہی! کیا آپ کا فقیر آپ کو یاد دلائے کہ موت کے بعد بولنا اللہ کے قانون کے خلاف ہے؟ اپنی ملاقات کے لئے سکون سے جایئے۔'' انھوں نے خواجہ صاحبؒ کا ہاتھ دوبارہ کفن کے اندر کیا اور جنازہ آگے روانہ ہوا۔

خواجہ صاحبؒ کی معطر خاک کو مسجد کے صحن کے وسط میں دفنایا گیا۔ کچھ لوگوں نے قبر پر چراغ رکھے۔ لوگ قبر سے کان لگائے اندر سے آنے والی آوازیں سننے کے لئے کوشاں تھے۔ خسرو لکھنوتی سے واپس آچکا تھا۔ ایک بہت بڑا ہجوم یہ دیکھنے کے لئے اکٹھا ہوگیا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح سنبھالتا ہے اور یہ کہ خواجہ صاحبؒ اسے گلے سے لگانے کے لئے اپنی قبر سے اٹھتے ہیں کہ نہیں۔ خسرو کسی ایسی عورت کی طرح روتا اور چھاتی پیٹتا خانقاہ میں آیا، جس کا خاوند مر گیا ہو۔

حضرت روشن چراغ نے اسے گلے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔ جب وہ رو رو کر دل کا بوجھ ہلکا کر چکا تو حضرت روشن چراغ نے اسے بتایا کہ خواجہ صاحبؒ نے اسے اپنی قبر پر آنے سے روک دیا ہے۔ خسرو نے خواجہ صاحبؒ کی قبر سے چند گز دور کیوڑے کے ایک پودے کے پاس کھڑے ہو کر نظریں اس جگہ پر گاڑ دیں جہاں اس کا مرحوم دوست سویا ہوا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر ڈاڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ ماں کے لئے رونے والے بچے کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے روتی ہوئی آواز میں دوہا پڑھا:

گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے، شام بھئی چوندیس

خسرو نے اپنا سر اسی طرح منڈوالیا جس طرح ہندو اپنے والدین کی وفات پر منڈواتے ہیں۔ اس نے اپنی املاک خیرات کر دیں۔ اس نے صوفیوں والا سیاہ اونی کھردرا لبادہ پہننا شروع کر دیا۔ جیسا کہ اس نے اپنے متعلق پیشگوئی کی تھی، وہ چند

ہفتوں بعد گھر کو روانہ ہو گیا۔ ہم نے اسے کیوڑے کے پودے کے پاس دفنا دیا۔

☆☆☆

میں اپنی زندگی کی کتاب کے آخری باب تک پہنچ چکا ہوں۔ میں اپنی دائیں آنکھ کے بے نور ہونے سے پہلے ان سطور کو قلم بند کر دینا چاہتا ہوں۔ میری دائیں آنکھ میں بھی موتیا اتر آیا ہے۔

کمل کئی دنوں کی غیر حاضری کے بعد اپنی بیوی اور دو بچوں کو ہماری حفاظت میں چھوڑنے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلطان محمد تغلق پاگل ہو چکا ہے۔ ہم کئی برس سے اس کی عجیب عادات کے بارے میں سن رہے تھے۔ وہ فیاضی کے دوروں کے دوران لاکھوں روپے بانٹ دیتا اور پاگل پن کے دوروں میں لاکھوں سر کٹوا دیتا۔ اس نے سونے چاندی کی جگہ تانبے کے سکے جاری کیے۔ چالاک لوگوں نے تانبے کے سکے بنا کر ان کے بدلے سونا اور چاندی حاصل کر لیا، یہاں تک کہ خزانے میں کچھ نہ بچا۔ کمل کہتا ہے کہ سلطان چین اور باقی ماندہ ایشیا کو فتح کرنے کی باتیں کرتا تھا۔ اب اس نے اپنا دارالحکومت دہلی سے 700 میل دور دولت آباد میں منتقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے ہر مرد، عورت اور بچے کو تغلق آباد سے نکل کر اپنے ساتھ جنوب کو جانے کا حکم دیا۔ بلاشبہ یہ پاگل پن تھا! دلی کا نام خواہ کوئی بھی ہو......لال کوٹ، مہرولی، شہرنو یا تغلق آباد......ہندوستان کے بادشاہ ہمیشہ وہیں رہے تھے۔ دلی والے دنیا کے کسی دوسرے شہر میں رہنے کی بجائے مرنے کو ترجیح دیتے۔ حکومتی ملازم ہونے کی وجہ سے بیچارے کمل کو اس حکم پر عمل کرنا تھا، لیکن کسی سلطان کا حکم حضرت خواجہ نظام الدین ؒ کے مزار کے مقدس احاطے پر کبھی لاگو نہیں ہوا تھا۔

❀❀❀

بھاگ متی

مئی کا مہینہ ہے۔ جہنم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ شدید گرمی پڑ رہی ہے۔ آندھیاں چل رہی ہیں' دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی ہے، سڑکوں کا تارکول پارے کی طرح چمک رہا ہے۔ زندگی کا کہیں نام ونشان نہیں۔ پاگل کتے تک دکھائی نہیں دیتے۔ صرف دوپہر کا سورج آگ بکھیر رہا ہے۔

کار کی سیٹیں جل رہی ہیں۔ "ہائے رام!" بھاگ متی کراہتی ہے اور سیٹ کے ٹھنڈا ہونے کے لئے اپنے کولھوں کو اوپر کر لیتی ہے۔ "آؤچ!" میں بھونڈے انداز سے چلاتا کہتا: "ذرا اسٹیئرنگ ویل کو تو ہاتھ لگاؤ۔" میں اس کا ہاتھ پکڑ کر سٹیئرنگ وہیل پر رکھ دیتا ہوں۔ وہ جلدی سے ہاتھ پرے ہٹا لیتی ہے۔ "کیا ہمیں کسی حکیم نے باہر نکلنے اور گرمی سے بیمار پڑنے کا کہا ہے؟"

ہم قطب روڈ پر جا نکلتے ہیں۔ صفدر جنگ کے مقبرے کے پاس سے گزر کر بنگلوں والے علاقے سے گزرتے ہیں۔ یہ بنگلے یوسف سرائے اور خلیجوں سے مغلوں تک تمام حکمرانوں کی یادگاروں کو مٹا کر بنائے گئے ہیں۔ قطب مینار سے بائیں کو مڑ کر ہم بستی لاڈو سرائے سے گزرتے ہیں۔ کنویں پر بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ جاٹ عورتیں بالٹیاں بھر بھر کر پانی کنویں کی منڈیر پر رکھے گھڑوں میں ڈال رہی ہوتی ہیں۔ دو نوجوان عورتیں نہا رہی ہوتی ہیں۔ وہ الف ننگی ہوتی ہیں۔ ہماری کار دیکھ کر وہ اپنی

رانوں کے درمیان ہاتھ رکھ لیتی ہیں اور اپنے بڑے بڑے کولھے ہماری طرف کر دیتی ہیں۔ میں اچھی طرح نظارہ کرنے کے لئے کار کی رفتار کم کر دیتا ہوں۔ ایک عورت کیچڑ اٹھا کر ہماری طرف اچھال دیتی ہے۔ میں ہنس پڑتا ہوں۔ وہ بھی ہنس پڑتی ہیں۔ یہ جاٹ عورتیں لمبے قد، بھرپور چھاتیوں، پتلی کمر والی اور خوب صحت مند ہوتی ہیں۔ وہ گھڑے سر پر اٹھائے اپنے لہنگوں کو چٹکی سے پکڑ کر اوپر اٹھائے کسی کی ملکہ کی طرح چلتی ہیں۔ میں بھاگ متی سے کہتا ہوں: ”تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ جاٹ عورتیں ہندوستان میں سب سے زیادہ ہم بستری کے قابل نہیں؟“

”دوسروں کی بیویاں اور بہنیں ہمیشہ اپنی بیوی اور بہنوں سے زیادہ ہم بستری کے قابل ہوتی ہیں۔ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔“

ہم لاڈو سرائے سے باہر آجاتے ہیں۔ ایک بار پھر چمکتا ہوا تارکول اور ہلکے بھورے رنگ کے وسیع میدان ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ کار کا سایہ ہمارے آگے آگے بھاگ رہا ہوتا ہے۔ ہماری بائیں طرف ایک پتھریلی دیوار ہوتی ہے، جو رفتہ رفتہ خاکستری اور سرخ رنگ کے پتھروں کا ایک وسیع و عریض قلعہ بن جاتی ہے، جو زمین سے 60 فٹ بلند ہوتا ہے۔ ہم جس سڑک پر جا رہے ہوتے ہیں، اس کے کناروں پر برگد کے بہت پرانے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ میں کار کو چھاؤں میں روک دیتا ہوں۔ میری بائیں طرف ایک محرابی پھاٹک ہے، جس میں سے گزر کر تغلق آباد کے قلعے میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ میری دائیں طرف ایک پل ہے، جو کہ اس قلعے کو تعمیر کروانے والے غیاث الدین تغلق کے مقبرے تک جاتا ہے۔ اس کی ڈھلوانی دیواریں سرخ پتھر سے اور گنبد سفید سنگِ مرمر سے بنائے گئے ہیں۔

وہاں گرمی کی وجہ سے نہ سیاح ہوتے ہیں اور نہ آوارہ بچے۔ ہم موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

”یہ کیا ہے؟“ اچانک بھاگ متی ونڈ سکرین کے رم کو پکڑنے والے بال دار سیاہ

ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخی۔ وہ ایک بندر ہوتا ہے۔ جو ہم سے کھانے کو کچھ مانگ رہا ہوتا ہے......خو، خو، خو، خو۔ بھاگ متی چیخ مار کر مجھ سے چمٹ جاتی ہے۔ بندر اپنا چمکدار سرخ پچھلا حصہ دکھاتے ہوئے سڑک کے پار بھاگ جاتا ہے۔ بھاگ متی میرے سینے سے چمٹی رہتی ہے۔ میں اسے پرے دھکیل دیتا ہوں۔ دروازے پر ایک شخص نمودار ہوتا ہے: ''صاحب! میں آپ کی کار کا دھیان رکھوں گا۔''

اس سے پہلے کہ میں ''اوکے'' کہوں، ایک لڑکا آجاتا ہے: ''صاحب! یہ میری باری ہے۔ یہ پچھلی کار کی حفاظت کر چکا ہے۔ کیوں بے؟''

وہ جھگڑنے لگتے ہیں۔ ''صاحب! کیا میں نے پہلے نہیں کہا تھا آپ کو؟ صاحب! یہ اس کی باری نہیں...... آپ فیصلہ کریں۔'' مزید لڑکے وہاں آجاتے ہیں اور میری کار کی حفاظت کے لئے جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ میں کار سے اتر کر ایک لڑکے کو گدی سے پکڑ لیتا ہوں: ''یہ لڑکا میری کار کی حفاظت کرے گا اور میں صرف اسی کو پیسے دوں گا۔'' یوں جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ ہم تغلق آباد قلعے کے پھاٹک کی طرف بڑھتے ہیں۔ چار لڑکے ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگتے ہیں۔

''صاحب! ہم آپ کو تغلق آباد کے کھنڈرات کی سیر کروائیں گے۔''

میں کہتا ہوں، ''مجھے سب پتا ہے۔ ہمیں گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔''

''صاحب! یہ قلعے کا صدر دروازہ ہے''

''مجھے پتا ہے۔ تمہیں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ۔''

''یہ بائیں طرف والا گڑھا تالاب ہوتا تھا، جہاں سے پینے کا پانی تغلق آباد کو فراہم کیا جاتا تھا۔''

''میں نے تمہیں کہا ہے نا، مجھے گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ۔''

''صاحب! یہ مینا بازار کے کھنڈرات ہیں۔''

میں ان کی طرف پلٹتا ہوں اور غصے سے کہتا ہوں: ''دفع ہو جاؤ، حرامزادو!''

وہ دوڑ کر مجھ سے تھوڑی دور چلے جاتے ہیں اور گندی گالی نکالتے ہیں۔ بھاگ متی اور میں کھنڈرات میں سے گزرنے والے پختہ راستے سے ہو کر آگے جاتے ہیں۔ ہم اونچائی پر پہنچ کر منظر کا جائزہ لیتے ہیں۔ مغربی سمت میں قطب مینار، جنوبی سمت میں غیاث الدین تغلق کا مقبرہ، مشرق میں قصرِ ہزار ستون اور شہرِ نو کے کھنڈرات ہوتے ہیں۔ ہم واپس ہوتے ہیں۔ اب ہم فصیل کے سرے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہم سے سوفٹ نیچے موجود جوہڑ بھینسوں سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ جوہڑ اس خندق کی باقیات ہے، جو کبھی تغلق آباد قلعے کے گرد موجود تھی۔ آج کل تغلق آباد ہموار چھت والے پکی اینٹوں کے مکانوں اور جھونپڑوں کا نام ہے۔ بھاگ متی میرا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔

"ارے! اس نے سردار کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔" حرامی اب بھی وہاں موجود ہوتے ہیں۔ اب بھاگ متی جواب دیتی ہے۔ "تم یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ تمہاری...... میں ڈنڈا گھسیڑ دوں گی۔" وہ ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہتی ہے۔ لڑکے تیزی سے بھاگ پڑتے ہیں۔ بکریاں ممیاتی ہوئیں ان کے پیچھے بھاگنے لگتی ہیں۔ بھاگ متی فاتحانہ انداز میں میرے پاس آجاتی ہے۔ ہم فصیل پر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ میرے سینے پر سر رکھ لیتی ہے۔ "بندروں کے خصیے اور پچھلا حصہ سرخ کیوں ہوتا ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔ میں نے سنا ہے، جب وہ مستی میں ہوتے ہیں تو ان کے پچھلے حصے سرخ ہو جاتے ہیں۔"

"کیا تمہارے خصیے اس وقت سرخ ہو جاتے ہیں، جب چھوٹے میاں بڑے میاں بن جاتے ہیں؟"

مجھے اس کی بات سمجھنے میں چند لمحے لگ جاتے ہیں۔ "میں نے کبھی دیکھا نہیں ہے۔ دوسرے میں بندر نہیں ہوں۔"

وہ بڑے دانشورانہ انداز میں کہتی ہے: "ہمارے آباؤ اجداد تو تھے۔ میں اگلی دفعہ ضرور دیکھوں گی۔ میں اپنے ساتھ ایک فلیش لائٹ لے کر آؤں گی۔"

ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے اور نیچے دنیا کا نظارہ کرتے رہے۔ بھاگ متی میرے کانوں کی لویں چومتی اور رانوں کے درمیان میں ہاتھ لگا کر محسوس کرتی رہتی ہے کہ "چھوٹے میاں" ہنوز وہیں ہیں نا! دھوپ کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔ سورج ایک بڑا سا مالٹئی رنگ کا غبارہ بن جاتا ہے۔ خاکستری آسمان پر بے شمار طوطے اڑ رہے ہوتے ہیں۔ تغلق آباد بستی سے لاکھوں چڑیاں اڑتی ہیں، کیکر کے درختوں کے اوپر چکر لگاتی ہیں اور پھر درختوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگتی ہیں۔

مالٹئی رنگ کا سورج دھند میں اتر جاتا ہے۔ بستی کے رہنے والے لڑکے بالے بھینسوں کو جوہڑ سے نکالتے ہیں۔ ان کی اونچی آوازیں چڑیوں کی چہچہاہٹ اور دور بھونکتے کتوں کی بھونکار میں گھل مل جاتی ہیں۔ پھر کھنڈروں پر ایک بھیانک سناٹا چھا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بھاگ متی بھی کوئی بات نہیں کرتی اور بالکل خاموش ہو جاتی ہے۔ میں اسے خاموشی کے حوالے سے ایک نظم سناتا ہوں' حالانکہ مجھے پتا ہوتا ہے کہ وہ اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ خاکستری آسمان پر شام کے ستارے چمکنے لگتے ہیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگتی ہے۔ گرم ہوا کے بعد یہ بہت ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے۔ میری پلکیں نیند سے بھاری ہونے لگتی ہیں۔ میں بھاگ متی کے بال بکھیر دیتا ہوں۔ وہ سو چکی ہوتی ہے۔ میں بھی آنکھیں بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔

میری آنکھ کسی کے دیکھنے کے احساس سے کھل جاتی ہے۔ وہ چودھویں کا چاند ہوتا ہے، جو میرے سامنے چمک رہا ہوتا ہے۔ آسمان پر ایک پپیہا چاند کی طرف رُخ کر کے "پی ہوں' پی ہوں" کرنے لگتا ہے۔ سارا منظر اس کی صدا سے لبریز ہو جاتا ہے۔

"ستو یوجینیا!" مگر وہ یوجینیا نہیں بھاگ متی ہوتی ہے اور پرندہ بلبل نہیں' پپیہا ہوتا ہے۔ تاہم چاندنی میں اس کی پکار ازلی جذبے سے، ازلی درد سے معمور محسوس ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرا واسطہ شہد کی مکھیوں سے پڑتا ہے۔

دلی میں شہد کی مکھیوں کی بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں۔ اے پس ہسٹوری کس

ڈیلیانا ماضی سے اپنے تعلق کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہ پرانی شاہی عمارات کی محرابوں میں رہتی ہے۔ اس نوع کی شہد کی مکھیوں کے چھتے کا سائز شہد کی مکھیوں کی دنیا میں سب سے بڑا ہوتا ہے۔ ان کے دشمنوں میں دلی کے آوارہ لڑکے شامل ہیں، جو پتھروں، اینٹوں اور چیتھڑوں اور اُپلوں کے دھوئیں سے ان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان مکھیوں کا شکار بننے والوں میں ایسے غیر حاضر دماغ بوڑھے ہوتے ہیں، جو دن میں خواب دیکھتے ہوئے تاریخی یادگاروں کی سیر کرتے ہوں۔

ایک سہ پہر کا ذکر ہے، میں حوض خاص میں موجود ہوتا ہوں۔ اپریل کے آخری ایام ہوتے ہیں اور گرمی بہت سخت ہوتی ہے۔ اس پرانے مدرسے کو اس انداز سے تعمیر کیا گیا ہے کہ گرم ہوا اس کی پیچ و خم کھاتی ہوئی قدیم دیواروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ میں برآمدے میں ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوتا ہوں۔ میری بائیں طرف ایک سرسبز لان ہوتا ہے، جس میں ایک فوارہ قوسِ قزح کے رنگ بکھیر رہا ہوتا ہے۔ لان کی گھاس تازہ تازہ تراشی گئی ہوتی ہے۔ مالی اور اس کے بیلوں کی جوڑی نیم کے ایک درخت کے سائے تلے آرام کر رہی ہوتی ہے۔ میرے سامنے سلطان فیروز شاہ تغلق کا مقبرہ ہوتا ہے، جس کا گنبد امتدادِ زمانہ سے سیاہ پڑ چکا ہے۔ میری دائیں طرف پچاس فٹ نیچے ایک تالاب ہوتا ہے، جس میں بہت ساری بھینسیں نہا رہی ہوتی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑے تالاب کی باقیات ہے، جس کا نام حوضِ علائی تھا۔ یہ تالاب سلطان علاؤالدین خلجی نے اپنے بسائے ہوئے نئے شہر کو پانی فراہم کرنے کے لئے کھدوایا تھا۔ اب اس شہر کی واحد نشانی ٹوٹی ہوئی فصیل اور ایک پھاٹک رہ گیا ہے۔

ٹھنڈی ہو جانے والی ہوا میرے کانوں میں گنگنا رہی ہوتی ہے۔ میرے سر کے اوپر ابابیلیں اپنے گھونسلوں میں چہچہا رہی ہوتی ہیں۔ نچلی منزل سے ہندی فلمی گانے اور تاش کھیلنے والے لوگوں کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں۔ قدیم مدرسے کے پھیلتے ہوئے

سائے میں بستی کے بچے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ بھاگ متی میرے قریب نہیں ہوتی اور گردوپیش کے سکون سے مجھے اونگھ آجاتی ہے۔

اس مدرسے میں فلکیات، ریاضی، کیمیا اور قرآن کی تعلیم دی جایا کرتی تھی۔ بچے صفوں پر بیٹھے سبق یاد کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس شہر پر کیا گزری تھی؟ کیا یہ اس وقت موجود تھا، جب تیمور نے دلی کو تاخت وتاراج کرکے اس کے 50000 باسیوں کو موت کے گھاٹ اتروادیا تھا؟ شہر کو دوبارہ آباد ہونے میں کتنا عرصہ لگا تھا؟

مجھے خواب میں وہ ہولناک مناظر دکھائی دیتے ہیں، جو اس قتلِ عام کے دوران حوضِ خاص کے اردگرد رونما ہوئے ہوں گے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ اکڑوں بیٹھے ہیں، ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ تلواریں چمکتی ہیں اور کٹے ہوئے سر لڑھکنے لگتے ہیں۔ خون کے فوارے چھوٹتے ہیں۔ ریڑھ کی ہڈیوں کے اوپری سرے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مقتولوں کی مائیں، بیویاں اور بہنیں روتی چلاتی ہیں۔ دہشت سے بچوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ جہاں میں بیٹھا ہوتا ہوں، وہاں کہیں قریب ہی سے منگول بادشاہ اس منظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اگر میں ایک جدید رائفل سے مسلح وہاں موجود ہوتا تو لنگڑے حرامی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ میں اس کے جرنیلوں کو بھی ایک ایک کرکے جہنم رسید کردیتا۔ میں نے منگولوں، ترکوں، تاتاریوں اور وسطی ایشیا کے دوسرے تمام وحشیوں میں افراتفری پھیلا دی ہوتی۔ پھر دلی والے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرڈالتے۔

ایک پتھر میرے سر کے قریب سے گزرتا ہوا فرش پر گر جاتا ہے۔ میں آوارہ لڑکوں کی ایک ٹولی کو فیروز شاہ کے مقبرے میں جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ "اوئے، اوئے" پکار رہے ہوتے ہیں۔ میں دہاڑ کر کہتا ہوں: "حرامی......" اس سے پہلے کہ میں انہیں بتاؤں کہ میں ان کی ماؤں اور بہنوں کے ساتھ کیا کروں گا، بے شمار شہد کی مکھیاں مجھ پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ میں بازو لہراتا ہوا یوں بھاگتا ہوں، جیسے شیطان میرے

پیچھے لگا ہوا ہو۔ شہد کی مکھیاں میرے چہرے، گردن اور بازوؤں پر کاٹ رہی ہوتی ہیں۔ میں اپنی پگڑی اتار کر اپنے چہرے اور بازوؤں کو ڈھانپ کر زمین پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میں پناہ کے لئے بھاگتے تاش کے کھلاڑیوں اور مالی کے بستی واپس جاتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیوں کی آوازیں سن سکتا ہوں۔ مکھیوں کا حملہ پانچ چھ منٹوں تک جاری رہتا ہے۔ میں مردہ مکھیوں کو اپنے جسم سے نوچ کر الگ کرتا ہوں۔ میں اپنی ڈاڑھی میں پھنسی دو مکھیوں کو نکالتا ہوں، وہ میری انگلیوں کے سروں پر کاٹ لیتی ہیں۔ میرا جسم سوجنے لگتا ہے۔ انگلیاں سوج کر بے کار ہو جاتی ہیں۔ میرے سارے بدن میں ٹیسیں اٹھ رہی ہوتی ہیں۔ میں بھاگ کر کار میں بیٹھتا ہوں اور تیزی سے رام منوہر لوہیا ہسپتال کی طرف روانہ ہو جاتا ہوں۔

ایمرجنسی وارڈ میں پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں تقریباً بند ہونے لگتی ہیں اور اعضا سن ہو چکے ہوتے ہیں۔ میں مریضوں کے ہجوم سے بزور راستہ بناتا ہوا گزرتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں دلی ریلوے اسٹیشن کے تھرڈ کلاس پسینجرز ویٹنگ روم میں آ گیا ہوں۔ فرش پر ہر طرف مرد، عورتیں اور بچے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک بوڑھا سٹریچر پر لیٹا پاؤں سے دیوار پر نقوش بنا رہا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کی میز کے گرد ہجوم لگا ہوتا ہے۔ میں لوگوں کو دھکیل کر آگے جاتا ہوں۔ مجھے ان میں سے بیشتر سے زیادہ ایمرجنسی ہوتی ہے۔ گردن اور کانوں پر مکھیاں کاٹ لیں اور فوری طبی امداد نہ ملے تو انسان مر بھی سکتا ہے۔ ڈاکٹر فون پر باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ریسیور اور دائیں ہاتھ میں ایک سرنج پکڑی ہوتی ہے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے سرنج کو دبا کر سوئی سے بلبلے نکال رہا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ایک چودہ سالہ لڑکی بیٹھی ہوتی ہے، جس کی قمیض اس کے شانوں تک اٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ میری آدھی بند آنکھیں اس کی جوان چھاتیوں پر جم جاتی ہیں۔ اس کی ماں غصے سے مجھے گھورتی ہے اور ڈاکٹر سے کہتی ہے: ''کیا آپ میری بچی کو دنیا کے سامنے ننگا کرنا چاہتے ہیں؟'' ڈاکٹر کہتا ہے: ''ذرا ٹھہرو۔'' اور ریسیور میز پر رکھ کر

سوئی لڑکی کے پیٹ میں چبھو دیتا ہے۔ وہ اسے کل دوبارہ آنے کا کہتا ہے۔ وہ فون پھر اٹھالیتا ہے۔

میں کہتا ہوں: "ڈاکٹر! مجھے شہد کی مکھیوں نے کاٹ لیا ہے۔ پلیز......"

ڈاکٹر فون پر انگریزی میں کہتا ہے: "ایکسکیوز می۔" پھر پنجابی میں مجھے کہتا ہے: "تم مر تو نہیں رہے، اپنی باری پر آنا۔"

وہ فون پر معذرت کر کے اپنے پسندیدہ ریستورانوں کے نام بیان کرتا ہے: موتی محل، کیلرڈ، لیگونا۔ وہ دوسری طرف موجود مرد یا عورت کو بتاتا ہے کہ مرغی کی جگہ کووں کا گوشت سرو کیا جاتا ہے اور قلفی میں سیاہی چوس کاغذ کے گولے شامل ہوتے ہیں۔ وہ ہنسنے لگتا ہے۔ میں اپنے سن ہاتھوں سے میز تھپتھپاتا ہوں اور چیختا ہوں۔ ڈاکٹر فون پر کہتا ہے، "سوری، مریض بہت زیادہ ہیں۔ میں بعد میں فون کروں گا۔ ٹاٹا۔" پھر وہ غصے میں میری طرف رخ کر کے کہتا ہے: "تمہیں نظر نہیں آرہا کہ میں مصروف ہوں؟" یہ بات وہ پنجابی میں کہتا ہے۔

میں برطانوی لہجے میں انگریزی میں جواب دیتا ہو: "مصروف! ......تم کسی......سے فون پر ریستورانوں اور کھانوں کی باتیں کر رہے ہو اور یہاں مریض درد سے مرے جا رہے ہیں۔ میں وزیرِ صحت سے تمہاری رپورٹ کروں گا اور سب اخباروں میں تمہارے خلاف شکایتی خط چھپواؤں گا۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟"

آزاد ہندوستان میں انگریزی جادو کا سا کام کرتی ہے۔ وہ حرامی میرا تفصیلی معائنہ کرتا ہے۔ مجھے دوا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں خوش قسمت ہوں کہ زندہ بچ گیا ہوں۔ پھر وہ میری منت کرتا ہے: "پلیز مجھے معاف کر دو میں یہاں عارضی طور پر کام کر رہا ہوں۔"

دوائی سے میری بینائی بہتر نہیں ہوتی۔ میں قریب ترین دروازے سے گزرتا ہوں۔ وہ ایک کمرہ ہوتا ہے، جس میں سنگِ مرمر کی ایک سل پر ایک لاش پڑی ہوتی ہے

اور ایک پولیس والا لاش کے زخم گن رہا ہوتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے: ''کیا تم اس کے رشتہ دار ہو؟''

''نہیں، میں تو خود ایک لاش ہوں۔ میرے مردہ بدن پر مکھیوں کے ڈنگ گنو۔''

پھر اس کے ردعمل سے پہلے ہی میں تیزی سے اپنی کار کی طرف چلا جاتا ہوں۔

بدھ سنگھ میری حالت دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ یہ سب کیسے اور کہاں ہوا ہے؟ میں اسے سارا واقعہ سناتا ہوں۔ وہ انگلی میری طرف اٹھا کر تنبیہی لہجے میں کہتا ہے: ''میں نے آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ قبرستانوں کے قریب مت جایا کریں۔ قبرستان آسیبوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ جن جگہوں پر ہزاروں لوگوں کو قتل کیا گیا ہو، وہاں ہزاروں بھوت ہوتے ہیں۔ آپ پر شہد کی مکھیوں نے نہیں بلکہ تیمور لنگ کے حکم پر قتل ہونے والوں کی روحوں نے حملہ کیا تھا۔'' وہ اپنی ہتھیلی پر تھوکتا ہے۔

میں بدھ سنگھ سے بحث نہیں کر سکتا۔ میں اسے کہتا ہوں کہ وہ اپنی چارپائی دروازے کے قریب بچھائے تاکہ میں مدد کے لئے پکاروں تو وہ سن سکے۔ میں اپنا درجۂ حرات ماپتا ہوں، جو 103 درجے ہوتا ہے۔ میری عمر کے انسان کو اتنے درجۂ حرارت پر غشی آسکتی ہے۔

مجھے نیند کم آتی ہے اور ساری رات کراہتے ہوئے گزرتی ہے۔ مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میں موت کے اتنے قریب کیسے چلا گیا؟ ماضی کے مناظر مجھے واضح دکھائی دیتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ تیمور کتنا وحشی تھا کہ معصوم لوگوں کے قتل پر خوش ہوتا تھا! میرے پاس اس کی تزک موجود ہے۔ میں اس کے الفاظ ہی کو درج کر رہا ہوں۔

❀❀❀

خاندانِ تیمور

ہم نے باسٹھ برس کی عمر میں بیل کے سال کے موسم بہار میں ایک رات ایک عجیب خواب دیکھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہم ایک باغ میں موجود ہیں۔ باغ کے سارے درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ درختوں میں پرندوں نے گھونسلے بھی بنائے ہوئے تھے۔ پرندے پھلوں کو ٹھونگیں مار رہے تھے۔ باغبان پرندوں کو اڑانے کے لئے شور مچا رہے تھے۔ ہمارے پاس ایک غلیل اور کنکریوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا تھا۔ ہم نے غلیل سے پرندوں کو اُڑا دیا اور ان کے گھونسلوں کو برباد کر دیا۔ باغبان ہمارے سامنے جھک گئے۔ انھوں نے پھلوں کو نقصان پہنچانے والے پرندوں سے انھیں نجات دلانے پر ہمارا شکریہ ادا کیا۔

جب ہمارے ذہن پر سوچیں غلبہ پا لیتی تھیں، تو ہم ان کے بارے میں خواب دیکھنے لگتے تھے۔ ہم نے صوفی بزرگ شیخ ضیاءُ الدین سے کہا کہ وہ ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیں۔ شیخ ضیاءُ الدین نے' جو کہ انتہائی ممتاز دینی شخصیت تھے، اس خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ ہم ایک ایسے دور افتادہ ملک پر لشکر کشی کریں گے، جو طوائف الملوکی سے تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ خواب سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہم اس ملک پر حکمرانی کرنے والے بے شمار لوگوں کو اسی طرح بھگا دیں گے، جس طرح خواب میں پرندوں کو اُڑا دیا تھا۔ ہم ان کی ریاستوں کو فتح کر لیں گے اور وہاں کی رعایا ہماری قدم

بوسی کرے گی۔ اس وقت ہم پر یہ واضح نہیں تھا کہ وہ ملک کون سا ہو سکتا ہے؟ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ چین ہے یا ہندوستان۔ ہم نے اپنے پیر و مرشد سید محمد گیسو دراز سے مشورہ مانگا۔ انھوں نے میرے خواب کی تعبیر یوں کی: ''آپ کو ہندوستان کی فتح کرنے کی نوید دی گئی ہے۔''

یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب ہم ایشیا کے بیشتر ملکوں کو فتح کر چکے تھے۔ اب انتشار کے شکار ہندوستان کے دروازے ہم پر کھل گئے تھے۔ اس دنیا میں کوئی کام بھی اللہ کی رضا کے بغیر نہیں ہوتا۔ جب ہم چوہے کے سال کے موسمِ بہار میں پیدا ہوئے تھے، تو ہماری والدہ کی کوکھ سے شعلے نکلے تھے جبکہ ہمارے ہاتھ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ داناؤں نے پیش گوئی کی تھی کہ ہماری تلوار کی چمک لوہار کی اہرن سے نکلنے والے شعلوں جیسی ہو گی اور ہم خون کے دریاؤں سے گزریں گے۔ ہمارے والدین ہمارے لئے دعا کروانے کے واسطے ہمیں شیخ شمس الدین کے پاس لے گئے۔ انھوں نے ہمارا نام تیمور رکھا۔

ہمارا زائچہ بنوایا گیا تو نجومیوں نے بتایا کہ ہم اپنے زمانے کے تمام بادشاہوں سے برتر ہوں گے۔ ستائیس برس کی عمر میں ایک حادثے میں ہماری ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی، جس کی وجہ سے ہمارا زیادہ وقت گھوڑے کی پشت پر گزرنے لگا۔ ہم جانتے تھے کہ عام لوگ ہماری پیٹھ پیچھے ہمیں تیمور لنگ (یعنی تیمور لنگڑا) کہتے ہیں۔ تاہم ہمارے سامنے وہ ہمیں جہاں پناہ اور شہنشاہِ عالم جیسے خطابات سے مخاطب کرتے تھے۔

ہم نے اپنے جرنیلوں کو بلایا اور انہیں خواب سنایا۔ ہم نے انھیں بزرگوں کی بیان کردہ اس خواب کی تعبیریں بھی سنائیں۔ ہم نے انھیں کہا کہ ہم ہندوستان کو کفر و شرک سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھیں یہ بھی بتایا کہ ہندوستان بہت دولت مند ملک ہے۔ ہم نے انھیں تغلقوں کے سونے کی اینٹوں سے تعمیر کروائے ہوئے شہر اور قلعے میں موجود خزانے کے بارے میں بتایا، جو کہ سونے کی اینٹوں سے بھرا ہوا ہے۔

ترکوں کا ذہن ان کی آنکھوں کی طرح چھوٹا ہوتا ہے۔ ان کی مدد حاصل کرنے اور ان کی زبان بندی کے لئے ضروری تھا کہ ہم انھیں سونے کا لالچ دیتے۔ ہم نے انھیں کہا کہ ہم ماضی کی طرح فتح کے بعد اپنے قبضے میں آنے والا سارا مال وزر، سونا، چاندی، ہیرے جواہرات، مال مویشی اور غلام ان میں بانٹ دیں گے اور اپنے لئے کچھ نہیں رکھیں گے۔ سارے جرنیل ہماری باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ ان سب نے ہم سے اتفاق کا اظہار تلواریں نیاموں سے نکال کر لہراتے ہوئے کیا۔

ہم نے اپنے پوتے شہزادہ پیر محمد جہانگیر کی قیادت میں ہراول فوج بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ شہزادے کی عمر صرف تیس سال تھی، لیکن وہ کئی مہمات پر ہمارے ساتھ جا چکا تھا اور ہم نے بھانپ لیا تھا کہ اس کا ستارہ عروج پر ہے۔ ہم نے اسے اس کی ذمہ داری سے آگاہ کرنے کے لئے اپنے خیمے میں بلایا۔

ہم نے اسے کہا: "جو شخص بادشاہت کی دلہن کو آغوش میں لینے کا آرزومند ہو، اسے تلوار کی دھار پر سے اس کا بوسہ لینا پڑتا ہے۔ ہم تمہیں غزنی کی حکومت سونپتے ہیں۔ وہاں سے تم ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرو اور ملتان کو فتح کرو۔"

پھر میں نے اسے دلی کے حالات سے آگاہ کیا۔ سلطان فیروز تغلق نے اپنی رعایا پر اپنا دبدبہ جمانے کی بجائے اپنا زیادہ تر وقت مسجدیں، کاروان سرائیں، مدارس اور نہریں تعمیر کروانے میں صرف کیا تھا۔ سلطان فیروز نے کافروں کو سر اٹھانے کا موقع دے دیا تھا۔ اس نے ہمارے غیض وغضب سے بچ کر فرار ہو جانے والے بہت سے غداروں کو پناہ دے کر ہمارے ساتھ غیر برادرانہ سلوک کیا تھا۔ سلطان فیروز کو مرے ہوئے دس سال گزر گئے تھے لیکن اس نے ہماری جو بے عزتی کی تھی، اس کا احساس ہمیں اب بھی ناخوش رکھتا تھا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ اس وقت خاندانِ تغلق کا سلطان محمود تخت نشیں تھا۔ تاہم اس زمانے میں ہندوستان پر سلطان

محمود کی بادشاہت نہیں تھی بلکہ دو دوسرے اشخاص حکومت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تھا سارنگ خان، جو ملتان پر اپنی حکومت قائم کر چکا تھا۔ دوسرا شخص سارنگ خان کا بھائی ملّو خان اقبال تھا، جو تغلق آباد اور قصرِ ہزار ستون میں اقتدار کی قربت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ دونوں بھائی غرور و تکبر کا شکار تھے۔ جلد ہی شہزادہ محمد جہانگیر نے دریائے سندھ پار کر کے ملتان میں سارنگ خان کا محاصرہ کر لیا۔

شیر کا سال شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے اپنی پوری سلطنت میں اعلان کروا دیا کہ ہم دلی پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے لشکر میں ان گنت لوگ شامل ہو گئے۔ اس لشکر میں سب سے زیادہ افراد ہمارے قبیلے کے تھے۔ چغتائی ترکوں کے برلاس قبیلے کے یہ افراد پہلے بھی متعدد مہمات میں ہمارے ساتھ تکلیفیں برداشت کر چکے تھے اور راحتوں کے مزے لوٹ چکے تھے۔ بادام کے درختوں پر شگوفے پھوٹنے تک ہمارے جھنڈے تلے 90000 شہسوار اور تیر انداز جمع ہو چکے تھے۔ ہم ایک چھوٹا سا لشکر لے کر کافرستان کے پہاڑوں پر چلے گئے۔ ہم نے ان کافروں کے قبائل میں زبردست قتل و غارت کی، جو سکندرِ اعظم جیسے جرنیل کے لشکر کا بھی بھرپور مقابلہ کر چکے تھے۔

ہم پرندوں سے زیادہ رفتار سے پیش قدمی کرتے ہوئے دریائے سندھ تک پہنچ گئے۔ دریا پار کر کے ہم تغلقوں کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت تک ہمارا پوتا ملتان کو فتح کر چکا تھا۔ ہم اپنی پیش قدمی کو روکنے کی کوششیں کرنے والوں پر غلبہ پاتے ہوئے پنجاب سے گزر گئے۔ پاک پتن میں ہم نے فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر حاضری دی۔ ہم اپنے ساتھ آنے والے نجومیوں کے مشوروں کے مطابق پیش قدمی کر رہے تھے۔ جب ہم پنجاب سے گزرے تو اس کے میدان حال ہی میں ہونے والی موسم گرما کی موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ جب ہم دریائے جمنا کے کنارے پہنچے تو سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ آسمان اتنا نیلا تھا، جتنی ہمارے محل کی چھت کی ٹائلیں اور ہوا سمرقند کی موسمِ بہار کی ہوا جیسی فرحت بخش تھی۔

دریائے جمنا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ ہم اس کے کنارے کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر سلطان فیروز تغلق کے بسائے ہوئے شہر فیروز آباد یا کوٹلہ فیروز شاہ کا نظارہ کرتے رہے۔ سلطان فیروز نے اپنے محل کی پیشانی پر اشوک کی انتہائی نفیس لاٹھ نصب کروائی تھی۔ اشوک 1500 سال پہلے ہندوستان کا حکمران تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس لاٹھ پر اشوک کے گورو گوتم بدھ کے اقوال کندہ تھے۔ فیروز آباد کے شہریوں نے ہمارے سامنے مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ بہت سے مسلمان ہمیں اپنی خدمات پیش کرنے آئے۔ 19/دسمبر 1398ء کو محمود تغلق، اپنے وزیر ملو خان اقبال کے غلط مشورے پر ایک زبردست لشکر اور دھوم دھڑ کے کے ساتھ ہمارا مقابلہ کرنے کے لئے شہر سے باہر نکل آیا۔ اس کے جرنیلوں نے اولین صفوں میں لوہے سے ڈھانپے ہوئے ہاتھیوں کو کھڑا کر دیا تھا۔ ان ہاتھیوں پر تیر انداز سوار تھے۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کرنے والے قلعوں کی طرح تھے۔ ہم ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ ہم نے اپنے گھوڑ سواروں کی پہلی صف کے پیچھے زمین میں نوکیلی لکڑیاں گڑوائی ہوئی تھیں۔ پہلے تو ہمارے شہسواروں اور تیر اندازوں نے زوردار حملہ کیا اور تغلقوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ پھر جب ان کے ہاتھی آگے بڑھے تو ہمارے شہسوار پسپا ہو گئے۔ ہاتھیوں کے پیروں میں نوکیلی لکڑیاں چبھیں تو وہ رک گئے۔ ان کے پیچھے والے ہاتھی بھی آگے بڑھنے سے قاصر ہو گئے۔ ہم نے سنا تھا کہ ہاتھی اونٹوں سے ڈرتے ہیں لہٰذا ہم نے حکم دیا کہ اطراف دونوں سے اونٹوں کو بھیجا جائے۔ ہم نے اونٹوں پر خشک گھاس لدوائی ہوئی تھی۔ اس گھاس کو آگ لگا دی گئی۔ ہاتھی خوفزدہ ہو کر پیچھے بھاگے۔ اس طرح محمود تغلق کے شہسوار اور پیادہ فوجی ہمارے نشانے پر آ گئے۔

ہمارے ترک جنگجو شیروں کی طرح شکار پر حملہ آور ہو گئے۔ تغلق فوج میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ دو دن بعد یعنی 21/دسمبر کو ہم حوضِ علائی کے ساتھ واقع مدرسے میں موجود تھے۔ ہم نے سلطان فیروز تغلق کے مقبرے پر فاتحہ پڑھی۔ ظہر کی نماز کے بعد

ہزاروں شہریوں نے اپنی اطاعت کے اظہار کے لئے ہمیں نذرانے پیش کیے، اپنی پگڑیاں اور ٹوپیاں ہمارے پیروں میں رکھ دیں اور جان بخشی کے خواستگار ہوئے۔ علما کی ایک جماعت نے ہمیں قرآن پاک کے کئی نسخے پیش کیے اور ہم سے التجا کی کہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے مسلمان بھائیوں کا مزید خون نہ بہائیں۔ انھوں نے شہر کی چابیاں ہمیں پیش کیں اور ہمارا شایانِ شان خیر مقدم کرنے کی اجازت مانگی۔ ہم نے ان کی درخواست منظور کر لی اور کہا کہ وہ تاوان کی تفصیلات ہمارے جرنیلوں کے ساتھ طے کرلیں۔

اگلے دن جمعہ تھا۔ ہم نے مسجدِ قوت الاسلام میں جمعے کی نماز ادا کی۔ آج ہمارے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ نماز کے بعد ہم نے سلطان علاءُ الدین خلجی اور سلطان التمش کے مقبروں پر فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد قطب مینار اور شاہی مسجد دیکھنے گئے۔ ہم ان عمارتوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ہندوی معماروں سے ثمرقند میں ایک مسجد تعمیر کروائیں گے۔ اس کے بعد ہم مہرولی میں قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دینے اور اولیا مسجد دیکھنے گئے، جہاں آپؒ عبادت کیا کرتے تھے۔ شہریوں نے ہمارا شاندار خیر مقدم کیا۔ ہماری تفریحِ طبع کے لئے مسجد کے ساتھ شمسی تالاب میں پیراکی کے مقابلے ہوئے۔ ہمیں ہر جگہ خوشحالی کے آثار دکھائی دیئے۔

ہمارے حرم کی خواتین قصرِ ہزارستون دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھیں۔ ہم نے انھیں وہاں جانے کی اجازت دی اور خود اپنے عہد کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دینے کے لئے غیاث پور چلے گئے۔

ہندوستان کے لوگ خوشامد کرتے کرتے شدید نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کی سوچ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہم نے ان پر جو تاوان عائد کیا تھا، انھوں نے اسے ادا کرنے میں لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ رات کی تاریکی میں اپنا سازوسامان سمیٹ کر غائب ہو گئے۔ شہر کے دروازوں پر ہمارے متعین

کردہ محافظوں کو قتل کر دیا گیا۔ میں نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ وہ یلغار کریں اور ہر مرد کو ہلاک کر دیں اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیں۔ اگلے دس روز تک ہمارے جوانوں کی تلواریں خون سے اپنی پیاس بجھاتی رہیں۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد کا علم نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ 50000 افراد کو قتل کیا گیا، کچھ کا کہنا ہے 500000 کو۔ ہمارے بہادر جوانوں کے ہاتھ اتنا سونا، چاندی اور ہیرے جواہرات آئے کہ جن کی مقدار کا تعین نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارے عام سے پیادہ جوانوں کو بھی دو دو درجن غلام ملے۔ ہمارے جوانوں کو دلی سے جتنی دولت ہاتھ لگی، وہ ان کی کئی نسلوں کے لئے کافی تھی۔

دلی سے حاصل ہونے والے خزانے ان گنت ہاتھیوں اور اونٹوں پر لدوا کر ہزاروں غلاموں کے ساتھ ہم نے وطن واپسی کا سفر شروع کیا۔ دریائے جمنا عبور کر کے ہم پہاڑیوں میں اپنے سفر پر گامزن ہو گئے۔ ہم اور ہمارا فتح مند لشکر ایک ماہ بعد ثمرقند پہنچ گیا۔ جب ہم دلی سے روانہ ہوئے تھے تو لاشوں کو دفنانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ سڑتی ہوئی لاشوں کی وجہ سے وبائیں پھیل گئیں اور جو چند لوگ بچ گئے تھے، وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ کئی ماہ تک برباد شدہ دلی شہر دن کے وقت کوؤں اور گدھوں اور رات کے وقت الوؤں، گیدڑوں اور چمگادڑوں کا مسکن بنا رہا۔

ہم نے اپنی زندگی کا مقصد پورا کر لیا تھا۔ ہمیں اپنی کم عمری ہی میں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ زمین پر صرف ایک ہی بادشاہ کا ہونا ممکن ہے۔ ہم نے اپنی ساری زندگی دنیا کے لوگوں کو اپنے زیرِ حکومت لانے میں گزار دی۔ ہم نے اپنی بادشاہت کی بقا کے لئے ہمیشہ عدل و انصاف اور مساوات سے کام لیا۔ ان دو شمعوں کی روشنی سے ہمارا محل سدا جگمگاتا رہا۔

اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے۔

بھاگ متی

رات کو بارش ہونے کی وجہ سے فضا میں مرطوب سی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ میں جاگتا ہوں تو یہ سیلی سیلی مہک مجھے خواب گاہ میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ میرے پیروں میں رکھی گرم پانی کی بوتل ٹھنڈی ہو چکی ہوتی ہے اور میں لحاف میں کپکپا رہا ہوتا ہوں۔ میرے اپارٹمنٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں۔ میں ٹیبل لیمپ جلاتا ہوں۔ 4:30 بجے ہوتے ہیں۔ میں بتی بجھا کر ہاتھ رانوں کے درمیان رکھ کر سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ باہر سے آوازیں مسلسل آ رہی ہوتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر سردی کی اس صبح ان لوگوں کو کیا مصیبت پڑی ہے؟

میرا خانساماں بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لاتا ہے تو میری آنکھ کھلتی ہے۔ وہ بجلی کا ریڈی ایٹر آن کر دیتا ہے۔ خواب گاہ میں ہلکی ہلکی حرارت پھیل جاتی ہے۔ میں اسے کہتا ہوں: ''بہت سردی ہے۔''

وہ کہتا ہے، ''جی ہاں۔ ساری رات بارش برستی رہی ہے۔ کیا میں آپ کا ناشتہ جلدی لگا دوں؟ آج مجھے جلدی جانا ہے۔''

''کیا کام ہے تمہیں؟''

''میں پریڈ دیکھنے جاؤں گا۔ آج یوم جمہوریہ ہے۔ لوگ اگلی صف میں جگہ پانے

کے لئے صبح سویرے ہی گھروں سے نکل گئے تھے۔ بدھ سنگھ بھی آج چھٹی لینا چاہتا ہے۔"

ان دونوں کے چلے جانے سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا؟ کاش احمق بھاگ متی کو علم ہو کہ آج چھٹی ہے اور وہ پریڈ کے لئے پولیس کے راستے بند کرنے سے پہلے پہلے یہاں آجائے اور ہم آتش دان کے پاس قالین پر یوم جمہوریہ منائیں۔ وہ نہ تو اخبار پڑھتی ہے اور نہ میرے دیئے ہوئے ریڈیو سے خبریں سنتی ہے۔ وہ تو ریڈیو پر صرف وودھ بھارتی سے فلمی موسیقی سنتی ہے۔ تاہم امید پر دنیا قائم ہے۔ میں نے کئی ہفتوں سے جنسی عمل نہیں کیا ہوتا اور پھٹنے والا ہو رہا ہوتا ہوں۔ میں خانساماں سے کہتا ہوں کہ ناشتہ میز پر لگا دے اور نشست گاہ کے آتش دان میں آگ جلا دے۔

جب میں نشست گاہ میں پہنچتا ہوں تو آتش دان میں خوب آگ بھڑک رہی ہوتی ہے۔ آسمان صاف ہوتا ہے۔ کھڑکیوں سے دھوپ کمرے میں آ رہی ہوتی ہے۔ معمول کے مطابق مرد، عورتیں اور بچے شالیں اوڑھے اور مفلر لپیٹے راج پتھ اور کناٹ سرکس کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنی خلوت میں خود کو سب سے برتر تصور کرنے لگتا ہوں۔ میں پریڈ کے بارے میں اخبار میں پڑھ سکتا ہوں یا ریڈیو پر کمنٹری سن سکتا ہوں اور اگر بھاگ متی کو تھوڑی عقل آجائے تو میں اس کے ساتھ ہم بستری کرتے ہوئے قومی ترانے گا اور ترنگا لہرا سکتا ہوں۔ اس کے آنے کی کافی امید تھی کیونکہ وہ چھٹی کا دن بھی کبھار ہی ضائع کرتی تھی۔

لوگوں کی آمد و رفت ختم ہو جاتی ہے۔ اپارٹمنٹوں کے بلاک میں اجنبی سی ویرانی چھا جاتی ہے۔ ہر شخص سجے ہوئے ہاتھیوں، اونٹوں اور لوک رقاصوں کو دیکھنے جا چکا ہوتا ہے۔ صدر، وزیراعظم اور دلی کے سب مقتدر لوگ وہاں موجود ہوں گے۔ میرے اپارٹمنٹ کی کھڑکیاں بجنے لگتی ہیں۔ راشٹر پتی کو اکیس توپوں کی سلامی دی جا رہی ہے۔ وہ بری، بحری اور فضائی افواج سے سلامی لے گا اور پھر اپنے خطاب میں دنیا تک گاندھی

کا عدم تشدد اور امن کا پیغام پہنچائے گا۔ نہرو ہوگا جو بچوں کو چومے گا اور وہ اسے چاچا کہیں گے۔

توپیں اکیس مرتبہ گرجتی ہیں۔ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ بھاگ متی نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں اپنی خوشی چھپاتا نہیں ہوں اور کہتا ہوں: ''میں تو سمجھا تھا کہ تم بھول گئی ہو۔ تم نے ٹریفک کی رکاوٹیں کیسے پار کی ہیں؟''

وہ جواب دیتی ہے: ''آپ کی داسی کو روکنے والا جائے اس جگہ جہاں سے اس نے جنم لیا ہے۔'' وہ ہاتھ سینکتی ہے: ''ٹھنڈک میری ہڈیوں تک اتر گئی ہے۔ یہ دلی والے بھی کیسے پوچے ہیں۔ وہ برسوں سے ایک ہی جیسی پریڈ دیکھنے سردیوں میں بھی جاتے ہیں!''

میں اس کے لئے کافی کا ایک کپ بناتا ہوں اور اس میں رم شراب ڈال دیتا ہوں۔ وہ باتوں میں اتنی مگن ہوتی ہے کہ شراب کی بُو یا کافی کے بدلے ہوئے ذائقے پر توجہ نہیں دیتی ہے۔ کپ ختم ہونے تک وہ اندر سے بھی اتنی ہی گرم ہو چکی ہوتی ہے، جتنی کہ باہر سے۔ ادھر مجھ پر ''یوم جمہوریہ منانے'' کی خواہش بری طرح غلبہ پا چکی ہوتی ہے۔ میں عنفوانِ شباب والے جوش اور شوق کے ساتھ جنسی عمل کرتا ہوں۔ ایک منٹ بعد میں سرور و کیف کے عالم میں نعرہ لگاتا ہوں: ''جے ہند۔'' ہزاروں دلی والے ریڈیو پر نعرہ لگاتے ہیں: ''جے ہند۔'' سارا کام ساٹھ سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا ہے۔

میں بھاگ متی کو لال کنواں چھوڑنے جانا چاہتا ہوں لیکن وہ مجھے یہ اعزاز بخشنا نہیں چاہتی۔ وہ میری کارکردگی سے مایوس ہوتی ہے اور وہ ایسی عورت نہیں ہے کہ جو میرے احساسات کا لحاظ کرے۔ وہ کہتی ہے، ''میں نے آپ کو اتنے سبق پڑھائے لیکن آپ ہیں کہ پہلا سبق یعنی صبر کرنا ہی بھول جاتے ہیں۔ میں دوسرے سبق پر کس طرح آسکتی ہوں یعنی معشوقہ کا خیال کرنا؟ سبق بہت اہم ہے جب آپ آگ جلاتے ہیں تو جانے سے پہلے اُسے بجھاتے ضرور ہیں۔ آپ کی معشوقہ یوں جل رہی ہے، جیسے

دسہرے کو سری لنکا جلا تھا، اور آپ فائر بریگیڈ کا ایسا پائپ ہیں، جس میں پانی ہی نہیں ہے، ہیں؟''

کتیا! وہ مجھے تب تک چین سے بیٹھنے نہیں دے گی، جب تک میں اس کے جسم میں اپنی بھڑکائی ہوئی آگ نہیں بجھاؤں گا۔ اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے مجھے اپنے آپ کو دوبارہ لازماً گرم کرنا ہوگا۔ میں اس سے معذرت کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہزاروں لوگوں کے گھر واپس روانہ ہونے سے پہلے ہمیں نکل جانا چاہئے۔ وہ اداس و آزردہ ہوتی ہے۔ وہ ہاتھ جھٹکتی اور آہ بھرتی ہے۔

ہوا ٹھنڈی لیکن دھوپ تیز ہوتی ہے۔ دنیا دھلی دھلی، صاف ستھری اور ہری دکھائی دیتی ہے۔ دلی جوبن پر ہے اور پھولوں کے ذریعے اظہار کر رہی ہے۔ ہر طرف گلاب، بوگن ویلیا اور موتیے کے پھول خوشبوئیں بکھیر رہے ہوتے ہیں۔ میں اسے سفید چیتے دکھانے کے لئے چڑیا گھر کا رُخ کرتا ہوں۔ چڑیا گھر کے داخلی دروازے پر بہت ہجوم ہوتا ہے، اس لئے ہم چڑیا گھر کے شمالی سرے کے نزدیک واقع پُرانے قلعے کو چلے جاتے ہیں۔ قلعہ ویران پڑا ہوتا ہے۔ میں اسے ساتھ لے کر باؤلی کی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا جاتا ہوں اور ٹھنڈے یخ پانی کو چھوتا ہوں۔ پھر ہم واپس دھوپ میں شیر سنگھ کی مسجد میں چلے جاتے ہیں۔ وہ سکارف سے سر ڈھانپ لیتی ہے۔ کئی برس گزرنے کے بعد بھی مجھے یقینی طور پر علم نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ وہ کہتی ہے کہ وہ مسلمان بھی ہے اور ہندو بھی..... اور اب تو وہ سکھ بھی ہے۔

ہم دھوپ میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ میں بتاتا ہوں کہ یہ اندر پرستھ کا مقام ہے۔ دلی کو سب سے پہلے پانڈوؤں نے بسایا تھا۔ اسے دروپدی اور اس کے پانچ شوہروں کے بارے میں سب پتا ہوتا ہے۔ وہ طنزیہ لہجے میں کہتی ہے: ''آج کے مردوں کو دیکھو کیسے ہیں یہ! آج کل ہر عورت کے پانچ شوہر ہونے چاہئیں۔''

ہندوستانی فضائیہ کے جیٹ طیارے اپنے پیچھے سفید لکیریں چھوڑتے ہوئے

نیلے آسمان پر سے گزرتے ہیں۔ ان کے بعد ہیلی کاپٹر گلاب اور گیندے کی پتیاں برساتے ہوئے گزرتے ہیں۔ یومِ جمہوریہ کی پریڈ ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ ہم بہتر نظارے کے لئے شیر منڈل ٹاور پر چلے جاتے ہیں۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ یہ ایک لائبریری تھی، جسے شیر شاہ سوری نے تعمیر کروایا تھا۔

"لیکن یہاں تو کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔" وہ خالی ہشت پہلو بالائی کمرے کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے کہتی ہے۔ میں اُسے بتاتا ہوں کہ یہ لائبریری ساڑھے چار سو سال سے زیادہ عرصے پہلے ہوتی تھی۔ وہ میری بات سمجھ جاتی ہے۔

ہم متھرا روڈ پر سے گزرتی شور مچاتی ہوئی بسوں، کاروں اور سکوٹروں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ مغربی سرے پر ٹھنڈک بڑھ جاتی ہے اور یہاں ہوا بھی چل رہی ہوتی ہے، لہٰذا ہم دھوپ والے مشرقی سرے پر چلے جاتے ہیں۔

"مجھے پتا ہے کہ وہ کیا ہے۔" وہ کوئی نصف میل کے فاصلے پر موجود گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "وہ ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ ہے۔ اسے اس کی بیگم نے تعمیر کروایا تھا۔ جب میں مروں گی تو کیا آپ میرا مقبرہ بنوائیں گے؟"

اس کی ناراضی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ ہم تنگ و تاریک زینے سے اکٹھے اترتے ہیں۔ میرا قدم ایک زینہ چھوڑ کر نچلے زینے پر پڑتا ہے اور میں کولھوں کے بل دھپ سے گر جاتا ہوں۔

"یا اللہ! ان قاتل سیڑھیوں پر بہت احتیاط سے کام لیجئے۔ اگر آپ منہ کے بل گرتے تو آپ کا سر پھٹ جاتا۔"

میں اسے بتاتا ہوں: "آج سے چار سو تیس سال پہلے بادشاہ ہمایوں کے ساتھ انھی سیڑھیوں پر ایسا ہی ہوا تھا...... ٹھیک آج کے دن، 26 جنوری 1530ء کو۔"

اب بھاگ متی میرے علم سے متاثر ہو جاتی ہے۔ تاہم وہ حاضر جوابی کا مظاہرہ ضرور کرتی ہے اور کہتی ہے: "وہ ضرور اپنی بیگم سے ملنے کے لئے سیڑھیاں دوڑ کر اتر رہا

ہوگا۔ بے صبرا عاشق ہمیشہ مصیبت سے دوچار ہوتا ہے۔"

"نہیں، وہ اپنی بیگم کے ساتھ ہم بستری کے لئے بے صبرا نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اذان سنی تھی اور وہ بروقت نماز ادا کرنا چاہتا تھا۔"

بھاگ متی دونوں ہاتھ اٹھا کر مرحوم بادشاہ کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہے۔ ہم گھر واپس آکر شہوت کے بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دے کر آگ بھڑکاتے ہیں۔ یہ ایک خراب دن ہوتا ہے۔ آغاز بہت برا ہوتا ہے اور بھاگ متی جتنی کوشش کرتی ہے، مجھے ابھار نہیں سکتی ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور اب میرا گرم ہونا کسی طور پر ممکن نہیں۔ وہ دوبارہ طنزیہ لہجے میں مجھے کہتی ہے کہ میں بوڑھا نہیں ہوا بلکہ بے اعتنائی برت رہا ہوں اور مجھے دوبارہ فعال کرنے کے لئے کسی میم صاحب کی ضرورت ہے۔

بھاگ متی میری زندگی میں آنے والی دوسری عورتوں کے حوالے سے چھٹی حس کی مالک ہے۔ میں اس کے سوالوں کا جواب دینے اور اس سے نظریں ملانے سے گریز کرتا ہوں۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھتے ہوئے شام گزار دیتے ہیں۔ میں اسے راضی کرنے کے لئے پیشکش کرتا ہوں کہ ہم چل کر یوم جمہوریہ پر ہونے والا چراغاں دیکھتے ہیں۔ وہ ایک بار پھر اپنے کندھے جھٹکتی ہے اور آہیں بھرتی ہے۔ اسے سیکریٹریٹ اور راشٹر پتی بھون کی عظیم سجاوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہجوم کی وجہ سے کار آہستہ چلانی پڑتی ہے۔ پارلیمنٹ سٹریٹ اور کناٹ سرکس سے اجمیری گیٹ پہنچتے پہنچتے 9 بج جاتے ہیں۔ میں اس کے لئے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے دس روپے کے دو نوٹ اس کو دیتا ہوں۔ وہ حقارت سے انہیں دیکھتی ہے اور سیٹ پر پھینک دیتی ہے۔ پھر وہ ہجوم میں گم ہو جاتی ہے۔

بھاگ متی کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔ وہ حاسد اور ملکیت پسند بنتی جا رہی ہے۔ وہ ایک موقع پر یہ کہتی ہے: "میں جانتی ہوں، آپ پوچھیں گے کہ میں کسی چیز یا شخص پر

نیلے آسمان پر سے گزرتے ہیں۔ ان کے بعد ہیلی کاپٹر گلاب اور گیندے کی پتیاں برساتے ہوئے گزرتے ہیں۔ یومِ جمہوریہ کی پریڈ ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ ہم بہتر نظارے کے لئے شیر منڈل ٹاور پر چلے جاتے ہیں۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ یہ ایک لائبریری تھی، جسے شیر شاہ سوری نے تعمیر کروایا تھا۔

''لیکن یہاں تو کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔'' وہ خالی ہشت پہلو بالائی کمرے کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے کہتی ہے۔ میں اُسے بتاتا ہوں کہ یہ لائبریری ساڑھے چار سو سال سے زیادہ عرصے پہلے ہوتی تھی۔ وہ میری بات سمجھ جاتی ہے۔

ہم متھرا روڈ پر سے گزرتی شور مچاتی ہوئی بسوں، کاروں اور سکوٹروں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ مغربی سرے پر ٹھنڈک بڑھ جاتی ہے اور یہاں ہوا بھی چل رہی ہوتی ہے، لہٰذا ہم دھوپ والے مشرقی سرے پر چلے جاتے ہیں۔

''مجھے پتا ہے کہ وہ کیا ہے۔'' وہ کوئی نصف میل کے فاصلے پر موجود گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: ''وہ ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ ہے۔ اسے اس کی بیگم نے تعمیر کروایا تھا۔ جب میں مروں گی تو کیا آپ میرا مقبرہ بنوائیں گے؟''

اس کی ناراضی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ ہم تنگ و تاریک زینے سے اکٹھے اترتے ہیں۔ میرا قدم ایک زینہ چھوڑ کر نچلے زینے پر پڑتا ہے اور میں کولھوں کے بل دھپ سے گر جاتا ہوں۔

''یا اللہ! ان قاتل سیڑھیوں پر بہت احتیاط سے کام لیجئے۔ اگر آپ منہ کے بل گرتے تو آپ کا سر پھٹ جاتا۔''

میں اسے بتاتا ہوں: ''آج سے چار سو تیس سال پہلے بادشاہ ہمایوں کے ساتھ انہی سیڑھیوں پر ایسا ہی ہوا تھا...... ٹھیک آج کے دن، 26 جنوری 1530ء کو۔''

اب بھاگ متی میرے علم سے متاثر ہو جاتی ہے۔ تاہم وہ حاضر جوابی کا مظاہرہ ضرور کرتی ہے اور کہتی ہے: ''وہ ضرور اپنی بیگم سے ملنے کے لئے سیڑھیاں دوڑ کر اتر رہا

ہوگا۔ بے صبرا عاشق ہمیشہ مصیبت سے دوچار ہوتا ہے۔"

"نہیں، وہ اپنی بیگم کے ساتھ ہم بستری کے لئے بے صبرا نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اذان سنی تھی اور وہ بروقت نماز ادا کرنا چاہتا تھا۔"

بھاگ متی دونوں ہاتھ اٹھا کر مرحوم بادشاہ کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہے۔ہم گھر واپس آ کر شہوت کے بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دے کر آگ بھڑکاتے ہیں۔ یہ ایک خراب دن ہوتا ہے۔ آغاز بہت برا ہوتا ہے اور بھاگ متی جتنی کوشش کرتی ہے، مجھے ابھار نہیں سکتی ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور اب میرا گرم ہونا کسی طور پر ممکن نہیں۔ وہ دوبارہ طنزیہ لہجے میں مجھے کہتی ہے کہ میں بوڑھا نہیں ہوا بلکہ بے اعتنائی برت رہا ہوں اور مجھے دوبارہ فعال کرنے کے لئے کسی میم صاحب کی ضرورت ہے۔

بھاگ متی میری زندگی میں آنے والی دوسری عورتوں کے حوالے سے چھٹی حس کی مالک ہے۔ میں اس کے سوالوں کا جواب دینے اور اس سے نظریں ملانے سے گریز کرتا ہوں۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھتے ہوئے شام گزار دیتے ہیں۔ میں اسے راضی کرنے کے لئے پیشکش کرتا ہوں کہ ہم چل کر یوم جمہوریہ پر ہونے والا چراغاں دیکھتے ہیں۔ وہ ایک بار پھر اپنے کندھے جھٹکتی ہے اور آہیں بھرتی ہے۔ اسے سیکریٹریٹ اور راشٹرپتی بھون کی عظیم سجاوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہجوم کی وجہ سے کار آہستہ چلانی پڑتی ہے۔ پارلیمنٹ سٹریٹ اور کناٹ سرکس سے اجمیری گیٹ پہنچتے پہنچتے 9 بج جاتے ہیں۔ میں اس کے لئے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے دس روپے کے دو نوٹ اس کو دیتا ہوں۔ وہ حقارت سے انھیں دیکھتی ہے اور سیٹ پر پھینک دیتی ہے۔ پھر وہ ہجوم میں گم ہو جاتی ہے۔

بھاگ متی کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔ وہ حاسد اور ملکیت پسند بنتی جا رہی ہے۔ وہ ایک موقع پر یہ کہتی ہے: "میں جانتی ہوں، آپ پوچھیں گے کہ میں کسی چیز یا شخص پر

اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہوں۔" وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھنے کا دکھاوا کرتی ہے اور کہتی ہے: "میں آپ کا مفتوحہ پرانا قلعہ ہوں، اب آپ لال قلعہ اور سنگِ مرمر کے محل چاہتے ہیں۔"

طنز بھاگ متی کے منہ پر بجتا نہیں ہے۔ وہ مجھے غصہ دلانے لگتی ہے۔ تاہم میں جتنا اس سے گریز کرتا ہوں، وہ اتنا مجھے دق کرتی ہے۔ وہ ہر رات میرے اپارٹمنٹ آ کر دیکھتی ہے کہ میں موجود ہوں یا نہیں۔ میں نہیں ہوتا تو وہ بدھ سنگھ سے میرے بارے میں پوچھتی ہے۔ بدھ سنگھ فتنہ پرداز ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے: "وہ اس امریکی می بابا کے ساتھ باہر گئے ہیں۔"

☆☆☆

امریکی می بابا سولہ سالہ جارجین ہے۔ میں سمجھ نہیں پاتا ہوں کہ بھاگ متی کو ایک بے ڈھنگی، مہاسوں بھرے چہرے اور سرخ بالوں والی لڑکی کے حوالے سے فکر کیوں ہے۔ اس کو دوسری عورت کے حوالے سے تو کبھی فکر نہیں ہوئی۔ بہر صورت ایک عام سی طوائف کو اپنے بہت سے گاہکوں میں سے کسی ایک پر اس کی عدم موجودگی میں کیے ہوئے کاموں پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ تاہم بھاگ متی کو جارجین کے حوالے سے خبط سا ہوتا جا رہا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جارجین میرے لیے بھی ایک خبط سا بنتی جا رہی ہوتی ہے۔ میں ہر وقت اسی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا ہوں۔ میں نے ہی بھاگ متی کو اس کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ سال میرے لیے برا رہا تھا۔ مجھے تحریر و تصنیف کا کام تھوڑا ملا اور جو مضامین میں نے ہندوستانی اخبارات کو بیچے، ان سے اتنی یافت نہیں ہوئی کہ میں اپنا معمول کا طرزِ زندگی برقرار رکھ سکتا۔ چنانچہ میں نے خود کو حکومت ہند کے محکمۂ سیاحت میں گائیڈ کے طور پر رجسٹر کروا دیا اور اپنے کارڈ غیر ملکی سفارت خانوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے سیاحتی دفتروں میں بھیج دیے۔ موسم میں میں نے فارن ایکسچینج میں کافی رقم کمائی جسے

سرکاری شرح سے زیادہ تر ہندوستانی روپوں میں تبدیل کروانا پڑا۔ میں نے ہوٹلوں، نوادرات فروشوں اور نجومیوں کے لئے گاہک لے جا کر ان سے کمیشن وصول کیا۔ لوگ اپنی سکاچ کی بچی کھچی بوتلیں میرے پاس چھوڑ جاتے تھے۔ بعض اوقات ادھیڑ عمر عورتیں مجھے اپنے کمروں میں بلا لیتیں اور میری خدمات کے عوض مجھے تحفے دیتیں۔

یہ کام زیادہ محنت طلب نہیں تھا۔ میں نے چند حکمران خاندانوں اور بادشاہوں کے نام اور ان کی حکمرانی کے برسوں کو یاد کرلیا۔ اس کے علاوہ میں نے ان کے بارے میں کچھ گرما گرم کہانیاں بھی یاد کرلیں۔ قطب مینار پر میں سیاحوں کو وہاں ہونے والی خودکشیوں کی تعداد بتایا کرتا تھا۔ میں انھیں بتاتا کہ بادشاہ ہمایوں کے باپ بابر نے اس کی بیماری کے دنوں میں اس کی چارپائی کے گرد چکر کاٹتے ہوئے اللہ سے دعا کی تھی کہ اس کے بیٹے کو صحت دے اور اس کی بیماری اسے دے دی جائے۔ میں انھیں بتاتا کہ دعا مانگنے کے چند دن بعد ہمایوں صحت یاب اور بابر فوت ہوگیا تھا۔ میں انھیں شاہ جہاں کے تعمیر کروائے ہوئے لال قلعے اور اس کے محلات کے حوالے سے دلچسپ کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ میں انھیں بتاتا کہ تختِ طاؤس پر بیٹھنے والے بادشاہ یا قتل کردیے گئے یا انھیں اندھا کردیا گیا تھا۔ 1857ء کی بغاوت کے بعد انگریز تختِ طاؤس کو برطانیہ لے گئے تھے۔ اتنی چیزیں بیان کرنے کے بعد سیاحوں پر میرے علم کی دھاک بیٹھ جاتی تھی۔

کچھ عرصے بعد مجھے اپنے کام میں لطف آنے لگا۔ اگرچہ کسی نے مجھے دنیا کا سفر کرنے کا ٹکٹ مفت نہیں دیا تھا تاہم دنیا میرے پاس آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ برطانیہ میں کام کرنے والے میرے ایک کزن نے مجھے ان سفید فام لڑکیوں کی تعداد بتائی جنھیں وہ "قتل" کرچکا تھا۔ وہ انگریز لڑکیاں اسی فیکٹری میں کام کرتی تھیں، جہاں وہ کام کرتا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں دلی ہی میں رہتے ہوئے بغیر کوئی پیسہ خرچ کیے بے شمار یورپی، امریکی، جاپانی، عرب اور افریقی لڑکیوں کو "قتل" کرچکا ہوں۔ میرے کزن کا منہ اتر گیا اور وہ حسد سے اپنے خصیے کھجانے لگا۔

مجھے صرف ایک بات پریشان کرتی تھی کہ مجھے کسی کو دوست بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سب یورپی، امریکی، فرانسیسی لڑکیاں دو ایک دن میرے ساتھ رہتیں اور پھر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتیں۔ چند ہفتوں بعد مجھے ان کے نام اور چہرے بھی یاد نہ رہتے۔ مجھے صرف ان کے ساتھ ہم بستری کے دوران ان کا رویہ یاد رہتا۔ کچھ لڑکیاں اس بستر کی طرح بے جان ہوتی تھیں، جس پر ہم لیٹے ہوتے تھے۔ کچھ لڑکیاں کلائمیکس پر پہنچ کر خوب چیختی تھیں۔ کچھ لڑکیاں ہمبستری کے دوران مجھے گالیاں دیتیں اور تھپڑ مارتی تھیں۔ تاہم امریکی می بابا جارجین کا معاملہ مختلف تھا۔

امریکی سفارت خانے میں میرا واسطہ جس شخص سے تھا، اس کا نام کارلائل تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرتا تھا۔ مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ اپنے بقول "وزٹنگ فائر مین" کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے بہت سے دوسرے گائیڈوں کو آزمایا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں سیاحوں کے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں کرتا تو اُس نے مجھے بہت سے گاہک مہیا کئے۔ امریکی میرے بہترین گاہک ہوتے تھے۔ اپنے بھدے پن کے باوجود وہ دوسرے غیر ملکیوں سے زیادہ ذہین ہوتے تھے۔ میں کارلائل کے "وزٹنگ فائر مین" کے ساتھ خصوصی احتیاط برتتا تھا۔ میں سیاحوں کا احترام کرتا، ان سے شائستگی سے بات کرتا اور ایک فاصلے تک رہتا تھا۔ میں ان کے لئے کار کے دروازے کھولتا، ان سے بخشش کا تقاضا نہیں کرتا اور ان کے ٹیپ ریکارڈروں، کیمروں اور بال پنوں کو حرص کے ساتھ نہیں دیکھتا تھا۔ (مجھے پتا ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی یادگار دے کر ہی جائیں گے)۔ میں کمیشن کمانے کے لئے انھیں مہنگے سٹوروں پر نہیں لے جاتا تھا بلکہ بہترین اور سستے سٹوروں پر لے جاتا تھا۔ میں کارلائل کے دیئے ہوئے گاہکوں سے جنسی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا تھا اور دوسرے سیاحوں میں سے بھی صرف انھی کے ساتھ ایسا کرتا جو میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

میرا برطانوی لہجہ دوسروں کی نسبت امریکیوں کو زیادہ متاثر کرتا تھا۔ وہ مجھے ایک

شریف گائیڈ اور برے حالات کا شکار ہونے والا ایک خوش حال شخص تصور کرتے تھے، جو کہ سچ تھا۔ کارلائل نے مجھے جارجین سے متعارف کروایا تھا۔ جاجین مسز کارلائل کی بھتیجی تھی اور دلی میں کرسمس کی چھٹیاں گزارنے آئی تھی۔

"یہ جارجین ہے۔" کارلائل نے اس کا دوسرا نام لئے بغیر تعارف کروایا تھا: "اور یہ ہے تمہارا گائیڈ۔" اس نے میرا ابھی نام نہیں بتایا تھا۔

میں اس کے سامنے جھک گیا تھا۔ اس نے کہا تھا: "ہائی۔"

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ کم عمر، بے ڈھنگی، کیل مہاسوں والی لڑکی تھی؛ تاہم اس کی چھاتیاں بڑی بڑی تھیں اور کولھے تو بہت ہی بڑے تھے۔

اس نے تنگ سویٹر پہنا ہوتا تھا، جس پر عین چھاتیوں پر لکھا تھا "ایریزونا۔" اس نے جینز بھی بہت تنگ پہنی ہوتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے اشخاص سے دلچسپی ہے یا تاریخی یادگاروں سے۔ اس نے کندھے ہلا کر کہا تھا: "مجھے دونوں کے بارے میں زیادہ نہیں پتا۔"

اس نے کارلائل اور اس کی بیوی، ان کے گھر اور کار کی تصویریں اتاریں اور پھر کیمرا مجھے دیا تاکہ میں ان کے ساتھ اس کی تصویریں اتاروں۔ وہ بہت تیز بولتی تھی اور اکثر لفظوں کے آخر میں آنے والا g ادا نہیں کرتی تھی، مثلاً seein,goin,comin,gettin وغیرہ۔ وہ بات کرتے ہوئے اپنی آنکھوں اور ہاتھوں سے خوب اشارے کرتی تھی۔ گفتگو کے دوران وہ بہت سے بے معنی الفاظ کثرت سے بولتی تھی...... اور اپنی لال لال زبان بار بار باہر نکالتی تھی۔ پہلے دن فوٹو سیشن ختم ہونے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا: "ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں؟"

میں نے اس کے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا اور اگلی سیٹ پر شوفر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے بات شروع کی: "مس......"

وہ جلدی سے بولی: ''میرا نام جارجین ہے۔''

''مس جارجین، کیا تم......''

''مس جارجین نہیں، صرف اور صرف جارجین۔ محسوس مت کرنا۔''

''کیا آپ نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے۔ ہم آج سیر کریں گے......''

''ایک امریکی سکول کی طالبہ سے ایسے سوال کرنا حماقت ہے کہ کیا اس نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے؟''

میں نے ٹھنڈا رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہم دہلی گیٹ سے گزر کر فیض بازار میں داخل ہو گئے۔

''یہ جلّین کیا کر رہے ہیں؟''

''یہ جلّین نہیں ہیں، یہ سبزی فروش ہیں۔ یہ......''

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے یقین کر رہی ہو کہ میں انسان ہی ہوں نا۔ ''تمہیں جلّین کا نہیں پتا؟ یہ سب سے بڑا عدد ہے...... کروڑوں اربوں سے بھی بڑا۔ امریکی بچے بھی اس عدد سے واقف ہیں۔''

میں تحمل سے کہتا ہوں: ''اچھا، اب میں سمجھا۔ دلی کی آبادی گزشتہ بیس برسوں میں بہت بڑھ گئی ہے۔ اب یہ 40 لاکھ سے زیادہ ہے۔''

اس نے مجھے روک دیا: ''میں یہ باتیں نہیں جاننا چاہتی۔''

ہم فیض بازار سے باہر نکلے۔ ہماری بائیں طرف شاہی مسجد اور جامع مسجد اور دائیں طرف قلعے کی سرخ فصیل تھی۔ اس نے شوفر کو حکم دیا کہ کار روک لے اور تصویریں اتارنے لگی۔ ہم لال قلعے کے داخلی دروازے پر پہنچے۔ جب میں قطار میں لگ کر ٹکٹیں خرید رہا تھا، تو وہ مزید تصویریں اتارتی رہی۔ اس نے چاندنی چوک، تانگے والوں، ریڑھی والوں اور فقیروں، وغیرہ کی تصویریں اتاریں۔ قلعے کے داخلی دروازے پر رک کر اس نے محافظوں کی تصویریں اتاریں۔ بلند فصیل کو دیکھ کر اس نے نعرہ لگایا: ''بی!''

ہم جونہی اندر داخل ہوئے وہ نوادرات کی دکانیں دیکھ کر رک گئی۔ اس نے بانہیں پھیلائیں اور بولی: "میں اس بازار کی ہر شے خریدنا چاہتی ہوں۔ کیا قیمت ہے؟"

وہ ہر دکان پر جا کر چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھتی رہی۔ وہ بہت چالاک تھی۔ اس نے دکانداروں کی کوششوں کے باوجود کوئی چیز نہیں خریدی۔ ہم نقار خانہ گیٹ پر پہنچے۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اس نے "مرے کی گائیڈ" نکالی اور بولی: "مجھے مت بتاؤ۔ یہاں ڈھول بجائے جاتے تھے نا؟ اور وہاں سامنے بادشاہ اپنی رعایا سے ملاقاتیں کرتا تھا، ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک، وہ دیوانِ عام ہے۔ تمہیں گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں تو سب پتا ہے۔"

"نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔"

وہ مجھ سے شاہ جہان بادشاہ کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"بادشاہ تختِ طاؤس پر بیٹھ کر امرا سے ملاقاتیں کہاں کرتا تھا؟"

"دیوانِ خاص میں۔"

"گڈی! یہ موتیوں والی مسجد بادشاہ کے اس بیٹے نے تعمیر کروائی تھی نا، جو اپنے باپ کو قید کر کے خود بادشاہ بن گیا تھا...... بادشاہ اورنگیڈ۔"

"اورنگ زیب۔"

"کیا میں ذہین نہیں ہوں؟"

"تم بہت ذہین ہو۔ تم ایک پروفیشنل گائیڈ بن کر ٹھیک ٹھاک کمائی کر سکتی ہو۔"

"مجھے پیاس لگی ہے۔ کیا کہیں سے دودھ کا پیکٹ یا کوک مل سکتی ہے؟"

ہم ایک کولڈ ڈرنک شاپ پر گئے۔ اس نے کوک کی دو بوتلیں پی کر اپنا پیٹ دبایا اور ڈکار مارا۔ مجھے سیاحوں کو لال قلعے کی سیر کروانے میں عموماً ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے۔ جارجین نے صرف بیس منٹ لگائے۔ میں نے شیشے کے کیس میں بند تاج محل اٹھایا اور دکاندار کو سر

سے اشارہ کیا۔ اس نے بھی اشارے سے کہا کہ میں اسے مفت لے سکتا ہوں۔

''جارجین! یہ تمہارے لئے ہے۔''

''میرے لئے؟ مگر کیوں؟'' اس نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

اس نے تاج محل مجھ سے لے کر اپنی بڑی بڑی چھاتیوں سے لگا لیا۔ ''یہ بہت خوب صورت ہے۔ تمہارا شکریہ۔'' یہ کہہ کر اس نے میری ناک پر چٹکی بھر لی۔

اس مرتبہ وہ پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھی۔ جب میں نے شوفر سے شاہی مسجد چلنے کا کہا تو وہ بولی: ''نوپ، ایک دن میں ایک عمارت، او کے؟''

''یوں تو دلی دیکھنے میں ہمیں پورا ایک مہینہ لگ جائے گا۔''

''گڈی۔ تم ہر صبح میرے ساتھ گزار سکتے ہو۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے؟''

ہم چاندنی چوک، کھاری باؤلی اور صدر بازار سے گزرے۔ جارجین تصویریں اتارتی اور نا قابلِ فہم آوازیں نکالتی رہی۔ پھر اچانک وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔

''تمہاری وضع قطع بڑی دلچسپ ہے۔ اگر پچھلے ہفتے مجھے کوئی بتاتا کہ مجھے ایک پگڑی اور ڈاڑھی والے کالے شخص کے ساتھ سیر کرنی ہے تو میں مر ہی جاتی۔''

میں چپ رہا۔ اس نے میری آزردگی کو بھانپ لیا۔

''میری باتوں کا برا مت منانا۔ میں تو ہمیشہ احمقانہ باتیں کرتی رہتی ہوں۔ خیر یہ تو بتاؤ پگڑی کے نیچے کیا ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اونہہ کی آواز نکالی اور کارلائل کے گھر پہنچنے تک مزید کچھ نہیں بولی۔ کار سے اترتے ہی اس نے پوچھا: ''کیا میں تمہاری ڈاڑھی کھینچ سکتی ہوں؟''

پھر میرے روکنے سے پہلے اس نے میری ڈاڑھی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

اس نے دس روپے کے تین نوٹ سیٹ پر پھینکے اور تاج محل کو بانہوں میں چھپائے کولہے مٹکاتی دوڑ کر گھر کے اندر جاتے ہوئے بولی: ''بائی! کل ملیں گے۔''

"کتیا۔" میں بڑبڑایا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کو گھٹنوں کے نیچے دبا کر اس کی جینز پھاڑ دی جائے اور اس کے تربوزوں جتنے بڑے بڑے کولھوں پر زور دار ضربیں لگائی جائیں۔ اور اس کے بعد اس کے ساتھ لواطت کی جائے۔

کافی ہاؤس پہنچ کر میں نے اپنے دوستوں کو جارجین کے بارے میں بتایا۔ میرے سکھ صحافی دوست نے کہا: "تم نے ایک اور شکار پھانس لیا ہے۔" مجھے اس کی بات پسند نہیں آئی۔ میں کافی ہاؤس سے نکلا تو شام ہو چکی تھی۔ جامن کے درختوں پر طوطوں نے شور مچایا ہوا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اتنی زور سے "جارجین" کا نام پکاروں کہ سارا کناٹ سرکس گونج اٹھے، ٹریفک رک جائے، طوطے چیخنا بند کر دیں اور صرف ایک ہی آواز ہر طرف گونجنے لگے: جارجین، جارجین، جارجین۔

اس شام میں نے بھاگ متی کو جارجین کے بارے میں بتایا۔ وہ معمول کے مطابق اس بات پر ناخوش تھی کہ میں اس کے علاوہ کسی اور کے لئے پرجوش ہو رہا ہوں۔ میں نے اسے یہ بتا کر ہنسانے کی کوشش کی کہ جارجین مجھ سے چالیس سال چھوٹی ہے۔ اسے اس سے بھی تسلی نہیں ہوئی۔ جب میں نے معمول سے زیادہ جوش کے ساتھ جنسی عمل کیا تو وہ بولی: "آج کیا بات ہے؟" اس کے اس سوال کا مطلب تھا کہ تم میرے ساتھ نہیں بلکہ بڑے بڑے کولھوں والی سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ جنسی عمل کر رہے ہو۔ اس کا خیال درست تھا۔ صبح اٹھ کر میں نے اپنے سرد، مرطوب غسل خانے میں بیس منٹ لگا کر اپنی ڈاڑھی رنگی اور کارلائل کے گھر پہنچ گیا۔ جارجین دھوپ تاپ رہی تھی۔ وہ عمر میں کچھ بڑی لگ رہی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے اپنا سر ادھر ادھر گھماتے ہوئے پوچھا۔ اس نے بالوں کو اکٹھا کر کے سر کے اوپر جوڑا باندھا ہوا تھا، جس سے اس کی گردن زیادہ لمبی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے گلابی گلابی کان بھی دکھائی دے رہے تھے۔

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

''شکریہ۔''

کار میں اس نے پوچھا کہ کیا میں پگڑی باندھے سوتا ہوں؟ میں نے جواب دیا: ''اگر تمہاری عمر تھوڑی زیادہ ہوتی تو میں کہتا کہ آؤ، خود آ کر دیکھ لو۔''

اس کا چہرا سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا: ''تم بڑے خراب آدمی ہو۔ تم مجھ پر فقرے کس رہے ہو۔''

اب شرمندہ ہونے کی میری باری تھی۔ میں نے کہا: ''میرا مطلب یہ تھا کہ تم عمر میں کافی بڑی ہوتیں۔ میں ضرور تمہارے باپ کا ہم عمر ہوں گا۔''

''میں ایسی باتیں پسند نہیں کرتی۔''

☆☆☆

میں نے اُسے کافی مکھن لگایا۔ سفید فام لوگ خوشامد کے عادی نہیں ہوتے اور بہت آسانی سے پھنس جاتے ہیں۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر اور معافی مانگ کر مجھے کھلا موقع دے دیا۔

''جھوٹ۔''

''نہیں، یہ سچ ہے۔ میں نے آج تک تم جتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔''

''اونہہ، میں تو نہیں ہوں حسین وجمیل۔''

تاہم واضح دکھائی دے رہا تھا کہ وہ میری تعریفوں سے خوش ہوئی ہے۔ اس کا چہرا خوشی سے گلابی ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑے وقفے کے بعد بولی: ''تم ایک اچھے آدمی ہو۔''

سولہ سالہ لڑکیوں کو پھنسانا آسان ہوتا ہے۔ سولہ سالہ لڑکی کی شکل وصورت یا ذہانت کی تعریف کرو تو وہ آپ کی باتوں پر یقین کر لیتی ہے۔ جارجین بھی آسانی سے پھنس گئی۔ میں اسے کافی ہاؤس لے گیا۔ میں نے اسے کہا: ''میں تمہیں اپنے دوستوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔''

وہ شرما گئی اور بولی: ''تم بڑے شریر ہو، بہر حال میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔''

کافی ہاؤس میں ہم اس سیکشن میں بیٹھ گئے جس پر لکھا تھا ''صرف فیملیز کے لئے۔'' میں نے اس کے لئے کوک کا آرڈر دیا اور اپنے دوستوں سے سلام دعا کرنے چلا گیا۔ میرے دوستوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا۔ میرا سکھ صحافی دوست بولا: تم نے اس کی جتنی تعریفیں کی تھیں، میں سمجھا تھا وہ مالن منرو جیسی ہوگی۔ بہر حال اس کی چھاتیاں اور کولہے زبردست ہیں۔''

''یہ نور جہاں نہیں ہے،'' سیاست کا ماہر بولا: ''عام سی امریکی سکول گرل ہے۔ تاہم تم ہماری سوچ سے زیادہ پاگل ہو۔ اگر تم نے اس کے ساتھ کچھ کیا تو سات سال کے لئے جیل بھگتو گے۔''

میں انھیں چھوڑ کر جارجین کے پاس چلا گیا۔ اس نے پوچھا کہ میرے دوست اس کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا وہ کہہ رہے تھے کہ یہ لڑکی بہت خوب صورت ہے۔

''جھوٹ۔ میں سو ڈالر کی شرط لگاتی ہوں کہ انھوں نے کہا ہے تم اس ننھی سی لڑکی کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ سترہ سال سے کم عمر لڑکی کے ساتھ معاشقہ تمھیں جیل بھجوا سکتا ہے۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

''غلط، غلط، بالکل غلط۔'' میں نے پرزور احتجاج کیا۔

وہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔

اس مرتبہ اس نے میرا معاوضہ ایک لفافے میں بند کر کے دیا اور بولی: ''بہت بہت شکریہ۔''

اس شام میں خوش بھی تھا اور میرا ضمیر مجھے کچوکے بھی لگا رہا تھا۔ میں نے ذہنی الجھن کی کیفیت میں اسے فون کر ڈالا۔ فون اس کے انکل نے اٹھایا: ''تم نے جارجین کے لیے کافی وقت صرف کیا ہے۔ تم اپنے معاوضے کا بل مجھے دے دینا۔'' اس نے میری بات سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ جارجین اپنے انکل کو بتائے بغیر

مجھے رقم دے رہی تھی۔ میں نے اس بات کو کسی موزوں وقت پر استعمال کرنے کے لئے محفوظ کرلیا۔ اس کے بعد میں کھل کر اس کی تعریفیں کرنے لگا۔ چونکہ وہ روز اپنا ہیر سٹائل تبدیل کر لیتی تھی اس لئے مجھے ہر روز ایسی باتیں کرنے کا موقع مل جاتا کہ وہ خوش ہو جاتی۔ ایک روز اس نے شوخ سرخ رنگ کی ساڑھی باندھی۔ وہ اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے ساڑھی پہن کر چلنا بھی نہیں آتا تھا۔ تاہم میں نے اس کی بہت تعریف کی۔ اس نے کہا: ''شکریہ، میرا خیال تھا کہ تم مجھے مقامی لباس میں دیکھ کر خوش ہو گے۔''

میں نے اسے بتایا کہ ساڑھی پنجاب کا مقامی لباس نہیں ہے اور اگر وہ شلوار قمیض پہنے تو زیادہ اچھی لگے گی۔

اس نے کہا: ''اوہ گریٹ! میں ضرور یہ لباس پہنوں گی۔''

میں اسے ایک درزی کے پاس لے گیا۔ جب وہ کپڑا منتخب کر رہی تھی تو میں نے پنجابی میں درزی سے کہا کہ وہ کپڑے تیار کر کے بل سمیت میرے گھر پہنچا دے۔ جارجین کو جو کپڑا پسند آیا، اس کے خیال میں وہ اس کی استطاعت سے زیادہ مہنگا تھا۔ میں نے درزی سے (پنجابی میں) کہا کہ وہ مہنگا کپڑا ہی استعمال کرے۔

جب ہم کار میں بیٹھے تھے تو اس نے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے، میں ان کپڑوں میں اچھی لگوں گی؟''

''یقیناً تم بہت اچھی لگو گی۔ ہماری زبان کا ایک لفظ ہے: '' جامہ زیبی۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ پہننے والے پر ہر لباس سجتا ہے۔ تم پر بھی ہر لباس سجتا ہے۔'' (جامہ زیبی) تو دور کی بات ہے بھاری چھاتیوں اور موٹے کولھوں کی وجہ سے اسے ریڈی میڈ کپڑے بھی مشکل سے پورے آتے تھے)۔

وہ بولی: ''مجھے پتا ہے تم میری جھوٹی تعریفیں کرتے ہو۔ تاہم مجھے تمہاری باتیں اچھی لگتی ہیں، لہٰذا بولتے رہا کرو۔ او کے؟''

اسے اپنے اپارٹمنٹ لے جانا آسان نکلا۔ درزی کو ناپ دینے کے دو دن بعد

میں نے اسے پیشکش کی کہ وہ میری کار میں گھومنے چلے۔ جب میں اسے لینے گیا تو میں نے بڑے عام سے لہجے میں اسے بتایا: ''تمہاری چیزیں میرے اپارٹمنٹ پہنچا دی گئی ہیں۔ کیا تم سیر سے پہلے انھیں لینا پسند کرو گی؟''

''اوکے۔''

اس نے میری کتابوں اور تصویروں کو تعریفی نگاہوں سے دیکھا اور بولی: ''بہت اچھا ذوق ہے تمہارا۔''

''شکریہ، بیٹھو۔''

اس نے جوتے اتارے اور صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے غالب کا شعر پڑھا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پھر میں نے اس شعر کا انگریزی ترجمہ اسے سنایا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں میرے یہاں آنے سے خوشی ہوئی ہے۔ میری چیزیں کہاں ہیں؟''

میں نے بنڈل لا کر کھول دیا۔ کپڑے دیکھ کر وہ بولی: ''میں نے اس کا آرڈر نہیں دیا تھا۔ یہ تو بہت مہنگا ہے۔ وہ بوڑھا درزی مجھے لوٹنا چاہتا ہے۔ تم سارے ہندوستانی ہم امریکیوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہو۔''

پھر وہ ایک دوپٹے کو اٹھاتے ہوئے بولی: ''یہ کیا ہے؟ یہ بہت خوب صورت ہے لیکن میں نے تو اس کا نہیں کہا تھا۔''

''یہ اس لباس کا حصہ ہے، یہ اضافی نہیں ہے۔''

اس نے دوپٹہ اوڑھا اور آئینے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ بنڈل اٹھاتے

ہوئے بولی: ''میں انھیں کہاں جا کر پہنوں؟''

میں اسے اپنی خواب گاہ میں چھوڑ آیا۔ میں تھوڑی دیر اکیلا بیٹھا رہا۔ میں نے وسکی کا ایک جام بنایا اور سوڈے کے بغیر پی گیا۔ میں کرسی سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

جارجین پنجابی کپڑوں میں اندر آئی۔ دوپٹہ اس کے سر، چہرے اور شانوں کے گرد یوں ہالہ بنائے ہوئے تھا جیسے ستاروں سے مزین سفید بادل نے ہالہ بنایا ہوا ہو۔ کپڑے اس کے ناپ کے مطابق سلے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے پنجابی لباس پہننے کے لئے ہی بنایا گیا ہو۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' وہ پنجوں کے بل گھومتے ہوئے بولی۔

''بہت اچھی۔ تم جو لباس پہنتی ہو، ان سب سے زیادہ یہ لباس تم پر جچ رہا ہے۔''

''تھینک یو۔ مجھے بھی یہ لباس بہت پسند آیا ہے۔''

وہ صوفے پر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور بولی: ''وہ اس کے کتنے پیسے مانگتا ہے؟''

میری آواز میرے گلے میں پھنس گئی۔ میں بولا: ''کچھ نہیں۔ اسے میری طرف سے تحفے کے طور پر قبول کرلو۔ پلیز!''

''تھینک یو۔ لیکن مجھے پتا ہے تم افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''نہیں، میں افورڈ کر سکتا ہوں اور اس سے مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''او کے۔'' اس نے مڑ کر میری ڈاڑھی کو چوم لیا۔ ''تھینک یو، پوپ۔''

بوسے نے میری زبان پر فالج سا گرا دیا۔ کچھ دیر بعد میں بولنے کے قابل ہوا:

''میں تو تمہارا مقروض ہوں۔ تم نے سیر کرانے کا معاوضہ اپنے پاس سے ادا کیا ہے نا؟''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میں نے تمہارے انکل کو فون کیا تھا۔''

وہ سرخ ہوگئی: "یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ انھوں نے کیا کہا؟"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا: "پریشان نہ ہو۔ میں نے انھیں نہیں بتایا کہ تم نے مجھے پیسے دے دیے ہیں اب میں دگنا معاوضہ لے سکتا ہوں۔"

"مشرقی! تم بڑے چالاک ہو۔" وہ ہنسی: "شکر ہے کہ انکل کو پتا نہیں چلا۔"

"تم نے انھیں کیوں نہیں بتایا؟"

"بس یونہی۔"

"شاید تم انھیں بتائے بغیر میرے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔"

"شاید۔" اس نے اپنے بال پیچھے کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

ہر تجربہ کار شخص جانتا ہے کہ کسی سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب اصل کام شروع ہوتا ہے تو یا تو وہ چپ ہو جاتی ہے یا صرف "نہیں" کہتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تمہارے ہاتھ اس کے جسم سے باتیں کریں۔ اس سے وہ بغیر کچھ بولے قبولیت کے مرحلے تک آجاتی ہے۔ میں نے اس کے بازو پر انگلیاں پھیریں۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر میں نے بازو اس کی کمر کے گرد ڈال کر اسے اپنے قریب کر لیا اور اس کے ہونٹوں، آنکھوں، ناک اور گردن کو چومنے لگا۔ وہ کراہنے لگی۔ میں نے ہاتھ اس کی قمیض کے اندر ڈالا اور اس کی تنی ہوئی چھاتیوں سے کھیلنے لگا۔ پھر میں نے اس کی شلوار کا ازار بند کھول دیا اور اس کی رانوں کے درمیان انگلیاں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر نرمی سے سہلانے کے بعد وہ کلائمیکس پر آگئی اور کراہنے لگی۔ "اوگاڈ! اوگاڈ!" وہ کسی گڑیا کی طرح بے حرکت لیٹ گئی۔ میں نے اس کی چھاتیوں پر ہاتھ رکھا۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اسے پرے ہٹا دیا۔ اس نے کپڑے اٹھائے اور خواب گاہ میں چلی گئی۔ وہ جینز پہنے باہر آئی، شلوار قمیض اور دوپٹے کا بنڈل صوفے پر پھینکا اور اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

اس کے بعد کار لائل نے مجھے کوئی گاہک نہیں دلوایا۔ میں مہا بھارت کے ان الفاظ پر کئی دن اور رات غور کرتا رہا: "جیسے سمندر میں بہتے ہوئے لکڑی کے دو ٹکڑے ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں اور پھر الگ الگ ہو جاتے ہیں، دنیا میں انسانوں کا ملاپ بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔"

☆☆☆

میں کئی برس بعد ٹرین کے ذریعے دلی آیا ہوں۔ ریلوے سٹیشن تبدیل ہو چکا ہے، تاہم پہچانا نہیں جا سکتا۔ پلیٹ فارموں پر پچاس سال پرانے نمبر موجود ہیں۔ گہری سرخ شرٹوں اور میلی سفید دھوتیوں والے قلی، جن کے بازوؤں پر ان کے شناختی نمبروں والی پیتل کی پلیٹیں بندھی ہیں، پلیٹ فارم پر صف میں بیٹھے ہیں۔ مینائیں چہک رہی ہیں اور گالیوں سے لڑ رہی ہیں۔ وہی ٹھیلے والے، وہی سریلی صدائیں: لیمن سوڈا برف، چائے گرم چائے۔ اور انسانی فضلے، پیشاب اور فینائل کی وہی بو ہر طرف چھائی ہوئی۔

یہ اکتوبر کی ایک صبح ہے۔ فضا میں خوشگوار ٹھنڈک اور قدرے رطوبت ہے، جو موسم سرما شروع ہونے کا اشارہ ہے۔ میں پلیٹ فارم پر سوئے ہوئے لوگوں کے پاس سے گزرتا ہوں سیڑھیاں چڑھتا ہوں اور پل سے گزر ہوا دوسرے طرف سیڑھیاں اتر جاتا ہوں۔ کوئی مجھ سے ٹکٹ نہیں مانگتا۔ میں سٹیشن سے باہر آتا ہوں۔ سامنے کمپنی باغ اور ہارڈنگ لائبریری ہے۔ ہوا صاف اور تازہ ہے۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے موٹریں' سکوٹر اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ڈرائیور سیٹوں پر لیٹے خراٹے بھر رہے ہوتے ہیں۔ میں قریب سے گزرتے تانگے کو روکتا ہوں۔ تانگے والا گندی شال لپیٹے ہوئے ہے۔ وہ مجھے شک بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ مسلمان ہے، میں سکھ ہوں۔

وہ پوچھتا ہے: "کہاں جانا ہے؟"

"رائے سینا! رائے سینا کا کرایہ کتنا ہے؟"

اس نے کئی سال سے نئی دلی کے لئے رائے سینا کا لفظ کسی سے نہیں سنا ہوتا اور

وہ درست اندازہ لگاتا ہے کہ میں کوئی پرانا دلی والا ہوں۔ راۓ سینا کوئی چار میل دور ہے۔"جو آپ کی مرضی ہو دے دیں۔ ٹیکسی والا دس روپے لے گا آپ میرے پہلے گاہک ہیں، لہٰذا یہ میری بوہنی ہو گی۔"

میں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اپنا بریف کیس اگلے حصے میں اس کے پاس رکھ دیتا ہوں۔ وہ شہر میں سے گزرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ راستہ مختصر ہے۔ اس پر اس وقت ہجوم بھی نہیں ہوتا اور یہ سنسان رنگ روڈ سے زیادہ محفوظ ہے۔ ہم کمپنی باغ سے فوارے کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں جو پچاس سال سے خشک پڑا ہے۔ روشن الدولہ کی مسجد میں لوگ نماز کے لئے صف باندھے کھڑے ہیں۔ ساتھ میں سیس گنج گردوارہ ہے، جو رنگین بلبوں سے سجا ہوا ہے۔ پوجا کرنے والے کافی تعداد میں آ جا رہے ہیں۔ داخلی دروازے پر نیلے اور پیلے لباسوں والے کرپانوں سے مسلح محافظ کھڑے ہیں۔

تانگا بائیں طرف مڑتا ہے۔ میں لال قلعے کی فصیل دیکھتا ہوں۔ تانگا دائیں طرف مڑتا ہے۔ سفید کپڑے پہنے بہت ساری ہندو عورتیں پھولوں اور ناریل سے بھری پیتل کی پلیٹیں اٹھائے دریائے جمنا کی طرف جا رہی ہوتی ہیں۔ ہم جامع مسجد کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ سورج اس کے مشرقی مینار کے اوپر چمک رہا ہے۔ سرمد کی قبر پر ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ قبر پر تازہ تازہ سبز رنگ کیا گیا ہے۔ چنبیلی اور موتیے کے مرجھائے ہوئے پھول اس پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم انتہائی متعفن اردو بازار، رضیہ سلطانہ کی قبر کو جانے والی گلی اور کالی مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے ترکمان گیٹ سے پرانے، فصیل والے شہر سے باہر آ جاتے ہیں۔ ہوا مزید صاف ہو گئی ہے۔ رام لیلا گراؤنڈ میں آر ایس ایس کے سینکڑوں نوجوان کارکن لاٹھیاں اٹھائے ڈرل کر رہے ہیں۔ ادھیڑ عمر پنجابی واکنگ سٹکس لئے تیز تیز واک کر رہے ہیں۔ ہم شیواجی کے شمشیر بردار مجسمے کے پاس سے گزرتے ہیں۔

"اسے کب نصب کیا گیا تھا؟" میں تانگے والے سے پوچھتا ہوں۔

"دو سال پہلے۔" وہ دھیمی آواز میں جواب دیتا ہے۔

ہم منٹو ریل برج کے نیچے سے گزر کر کناٹ سرکس میں داخل ہو جاتے ہیں۔

"مجھے دوسری طرف کافی ہاؤس کے پاس اتار دو۔" میں اسے کہتا ہوں۔

ہم بند دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کافی ہاؤس کے پاس پہنچ کر رک جاتے ہیں۔

"کتنے پیسے؟" وہ مجھے میرا بریف کیس دیتا ہے تو میں پوچھتا ہوں۔

"جو آپ کی خوشی۔ آپ میری بوہنی کرا رہے ہیں، اور ابھی میں نے اپنے بیٹے کو دانہ کھلانا ہے۔" وہ گھوڑے کو تھپتھپاتے ہوئے کہتا ہے۔ گھوڑا تارکول کی سڑک پر پیشاب کرنے لگتا ہے۔ میں تانگے والے کو دس روپے کا نوٹ دیتا ہوں۔ وہ بقایا کے لیے جیبیں ٹٹولتا ہے۔

"رکھ لو، اپنے بیٹے کو اچھا دانہ کھلا دینا۔"

وہ مجھے اور میرے بچوں کو دعائیں دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔

میں شہر میں شائع ہونے والے چھ انگریزی اخبارات خریدتا ہوں۔ یہ تین روپوں کا ضیاع ہے لیکن پرانی عادتیں مشکل سے ختم ہوتی ہیں۔ میں شہریوں کی فوتیدگی کے اعلانات پڑھتا ہوں۔ ایسے اعلانات بہت کم ہوتے ہیں۔ میں مرنے والوں کو نہیں جانتا۔ دلی ڈائری سے پتا چلتا ہے کہ آج گرو تیغ بہادر کی شہادت کا دن ہے اور سکھوں کی تعطیل ہے۔ خاص خاص علاقوں میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی ہے اور پانچ سے زیادہ افراد کا اکٹھا ہونا ممنوع ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے بیان دیا ہے کہ "غنڈوں، شرپسندوں اور سماج دشمن عناصر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔" گڑبڑ کا خدشہ واضح ہے۔

میرے اخبار پڑھتے پڑھتے کافی ہاؤس میں مستقل بیٹھنے والے لوگ اپنی اپنی مخصوص میزوں پر بیٹھ کر سیاست پر گفتگو شروع کر چکے ہیں۔ میرے مستقل بیٹھنے ہوئے دوست بچھڑ چکے ہیں۔ گنجا، چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا فوٹوگرافر پچھلے سال سورگ سدھار

گیا۔ وزارت دفاع کا پاد مارنے والا کلرک خود کو "پدوڑا" پکارنے پر ہم سے الگ ہو چکا ہے۔ باقی رہ گئے سکھ صحافی اور سیاست کا ماہر۔ سکھ صحافی پہلے آتا ہے۔ وہ اپنی چھدری ڈاڑھی سے ایک بال نوچتے ہوئے پوچھتا ہے: "تم کب آئے؟" اور کافی کا آرڈر دیتا ہے۔ پھر سیاست کا ماہر آجاتا ہے۔

وہ سلام کرتے ہوئے کہتا ہے: "میرا خیال تھا تمام غنڈوں کو گرفتار کیا جا چکا ہو گا۔"

حاضر جواب صحافی جواب دینے کے لیے لمحہ بھر تاخیر کر دیتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں: "یہ آج کیسی افراتفری ہے؟ ہمارے سینکڑوں گروؤں کے یوم شہادت دفعہ 144 اور پولیس بندوبست کے بغیر منائے جاتے ہیں۔"

سیاست دان، جو ہندو ہے، ہم پر ایک اور آتشیں تیر چلاتا ہے: "سکھوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔"

صحافی پھٹ پڑتا ہے: "تم ہندو ہم مسلمانوں اور سکھوں کی دوستی گوارا نہیں کر سکتے۔"

میں کشیدگی کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں: "اگر اورنگ زیب کی جگہ داراشکوہ ہندوستان کا بادشاہ بن جاتا تو تاریخ کتنی مختلف ہوتی!"

سیاست دان کہتا ہے، "اس نے تمہارے گرو کو ہلاک نہیں کروایا تھا، اور ہندوستان حقیقی ہندوستان یعنی ہندوؤں کا ملک بن چکا ہے، اور......"

"اور" سکھ صحافی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہتا ہے، "اگر سکھوں نے غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کیا ہوتا تو وہ ہندوؤں سے لواطت کرتے۔"

"بک بک مت کرو۔" سیاست دان گرم ہو جاتا ہے۔

"بکواس تم کر رہے ہو، میں نہیں۔"

ماضی حال پر اپنا منحوس سایہ اس طرح ڈالتا ہے۔ میں ان دونوں کو ماضی پر جھگڑا

کرتا چھوڑ کا اپنا بریف کیس اٹھائے کافی ہاؤس سے نکل جاتا ہوں۔

بھاگ متی بازو لہراتی، لفظوں کی بوچھاڑ کرتی کسی طوفان کی طرح آتی ہے۔
''سارے شہر میں سکھ کرپانیں تانے چاندنی چوک میں اپنے گردوارے کی طرف جارہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ تین سو سال پہلے کسی نے دلی میں ان کے گرو کو قتل کر دیا تھا، اس لئے وہ آج دلی والوں کو قتل کر دیں گے۔ کیا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے؟''

''تم یہ سوال اپنے دوست بدھ سنگھ سے کیوں نہیں پوچھتی ہو؟''

''ہائے رام! آپ کو پتا ہے وہ مجھے کن نظروں سے دیکھتا ہے؟ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں اورنگ زیب کی حامی ہوں یا گرو کی؟''

''کس کی حامی ہو تم؟''

''وہ تو پاگل ہے۔ میں نے اسے بڑی نرمی سے کہا کہ میں کسی کی طرف نہیں ہو۔ آپ کو پتا ہے اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا ''اچھا تو تم غیر جانبدار ہو، ہیں؟ اگر تم مرد یا عورت ہوتیں تو کسی نہ کسی کی حامی ہوتیں۔ تاہم میں نے ہمیشہ کے لئے اس کا منہ بند کر دیا ہے، وہ دوبارہ میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرے گا۔ میں نے اسے کہا، ''ارے! بدھ سنگھ کی اولاد! آسمانوں پر مقیم عظیم بھگوان معجزے دکھا سکتا ہے۔ وہ بھنگی کو برہمن بنا سکتا ہے، وہ ایک بزدل بنئے کو ایک کشتری (جنگجو) بنا سکتا ہے، وہ ایک بے چارے ہیجڑے کو مرد یا عورت بنا سکتا ہے۔ لیکن بھگوان بھی تم جیسے بدھو کی کھوپڑی میں دماغ نہیں ڈال سکتا۔''

بھاگ متی ایک فاتحانہ ''ہوں'' کہتے ہوئے صوفے پر ڈھیر ہو جاتی ہے۔ وہ ایک سگریٹ نکالتی ہے اور ماچس کی ڈبیا کمرے کے پار میری طرف پھینک دیتی ہے۔ میں اٹھ کر اس کے پاس جاتا ہوں اور اس کا سگریٹ سلگاتا ہوں۔

''تمہارا کیا خیال ہے، شہر میں کوئی گڑبڑ ہوگی؟ ہر طرف پولیس ہی پولیس ہے۔

چاندنی چوک، نئی سڑک، قاضی کا حوض، اجمیری گیٹ اور کناٹ پلیس' ہر جگہ پولیس والوں سے بھرے ٹرک موجود ہیں۔"

"ہو سکتا ہے!" میں جواب دیتا ہوں۔

میں کئی دنوں سے بھاگ متی کی طلب محسوس نہیں کر رہا۔ وہ اپنی باتوں سے مجھے ایک راستہ بجھا دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں:

"اس سہ پہر ادھر سے سکھوں کا جلوس گزرے گا۔ وہ اس اپارٹمنٹ کے پیچھے والے گردوارے میں بھی آئیں گے۔ تم لال کنواں میں اپنے خاوند کے پاس زیادہ محفوظ ہو گی۔ میں تمہیں وہاں پہنچا سکتا ہوں۔"

بھاگ متی بڑے مشکوک انداز میں مجھے دیکھتی ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ آج نویں گرو تیغ بہادر کی شہادت کا دن ہے۔ میں اسے کہتا ہوں آج ہم بستری نہیں عبادت کرنے کا دن ہے۔ بھاگ

متی مقدس ایام میں جنسی عمل کرنے کے حوالے سے بہت توہم پرست ہے۔ وہ اکثر کہتی ہے: "ہمارے پاس اس کام کے لئے 364 دن ہیں، ایک دن کے پرہیز سے ہم مر نہیں جائیں گے۔"

وہ سگریٹ ختم کرتی ہے۔ میں اسے بیس روپے دیتا ہوں۔

"یہ کس لئے؟" وہ نوٹ اپنی انگیا میں رکھتے ہوئے پوچھتی ہے۔

میں اسے کار میں بٹھا کر لال کنواں پہنچا آتا ہوں۔

❀❀❀

اچھوت

دیوالی میں چند دن باقی تھے کہ دلی میں بادشاہ جہانگیر کی وفات کی خبر سنی گئی۔ کچھ روز تک کسی کو بھی چراغ یا چولہے جلانے کی اجازت نہ دی گئی۔ ہمارے بڑوں نے بتایا تھا کہ اگلے چالیس روز تک جس شخص کو مسکراتے یا ہنستے ہوئے پایا گیا، اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ میری ماں نے مجھے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ اسے ڈر تھا کہ میں خوشی سے چیخنے یا ہنسنے نہ لگوں۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کی موت کے وقت کم عمر بچہ ہونے کے باوجود میں اسے کبھی بھول نہیں سکا۔

جب میں نے اپنے باپو سے مرنے والے بادشاہ کا نام پوچھا تو اس نے کہا، ''تمہیں بادشاہ کے نام سے کیا لینا؟''

رکاب گنج کے کسی خاکروب یا موچی کو اس کے نام کا علم نہیں تھا۔ صرف مسجد کے ساتھ والی سرائے میں رہنے والے مسلمان اور پختہ مکان میں اپنی بیویوں اور بیٹوں اور ان کی بیویوں کے ساتھ رہنے والے ٹھیکیدار لکھی رائے کا خاندان یوں اداس تھا، جیسے ان کی ماں مر گئی ہو۔ کچھ لوگ بڑے لوگوں کی موت پر گریہ وزاری کر کے خود کو بڑا محسوس کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے میرے باپو نے کہا تھا، ''ہم غریب اچھوتوں کا بادشاہوں سے کیا سروکار! ہمارے لئے سب ایک سے ہیں۔ ایک چلا جاتا ہے، دوسرا آجاتا ہے، ظلم جاری رہتا ہے۔''

مجھے پتا نہیں تھا کہ ظلم کون ہے۔ جب میں تھوڑا سا بڑا ہو گیا تو میرے باپو نے مجھے بتایا کہ ظلم کوئی آدمی نہیں ہے۔ امیر لوگ غریبوں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں، وہی ظلم ہوتا ہے۔ ہم اچھوت انتہائی غریب تھے۔ جب ہم کسی کے قریب جاتے تو وہ ہم سے فوراً دور ہو جاتا تھا۔ میرا باپو کہتا تھا کہ یہ بھی ظلم کی ایک قسم ہے۔ یہ ہمارے کرم میں لکھا تھا۔ ہم نے اپنے پچھلے جنموں میں برے کام کیے تھے، اسی لئے ہمیں سیاہ فام پیدا کیا گیا تھا اور ہمیں غلیظ کام انجام دینا تھے۔

میرا باپو ہر بادشاہ کو ظالم کہا کرتا تھا۔ میرے باپو نے کہا کہ مرنے والا بادشاہ بہت برا انسان تھا کیونکہ وہ بیشتر وقت شراب پینے والے چاچے رولو سے زیادہ شراب پیا کرتا تھا۔ چاچے رولو نے مجھے بتایا کہ بادشاہ روزانہ عرق کے بیس پیالے پی اور کئی تولے افیم کھا کر ملکہ اور اپنے حرم کی دوسری عورتوں کے ساتھ ہر رات ہم بستری کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی ملکہ پہلے سے شادی شدہ تھی لیکن اس نے بادشاہ کو اس کی شہزادگی میں دیکھتے ہی جان لیا کہ وہ بادشاہ بنے گا، چنانچہ اس نے شہزادے کے شراب کے پیالے میں جادوئی سفوف ملا دیا۔ اس طرح شہزادہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ شہزادے نے اس کے شوہر کو قتل کروا دیا اور جب بادشاہ بنا تو اسے اپنی ملکہ بنا لیا۔ چاچا رولو کہتا تھا کہ ہندوستان پر بادشاہ نہیں بلکہ ملکہ حکومت کرتی تھی۔

میرا باپ بادشاہ کی شراب نوشی یا عورت بازی کی وجہ سے اس سے ناراض نہیں تھا، اس کے غصے کا سبب تو یہ تھا کہ اس نے ہمارے گورو کے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔

میرا باپ کہا کرتا تھا: ''اس کے زیادہ شراب پینے یا کسی کی ماں کو...... سے ہمیں کیا سروکار۔ بھگوان ہمارے گورو کے خلاف ہاتھ اٹھانے والے کو غارت کر دے۔''

رکاب گنج کے بیشتر اچھوت اپنے گورو کے اطاعت گزار بن گئے تھے اور نانک کے سکھ کہلانے لگے تھے۔ کسی نے نانک یا اس کے بعد ہمیں بچانے والے گوروؤں کو نہیں دیکھا تھا۔ حال ہی میں مرنے والے بادشاہ نے ہمارے پانچویں گورو ارجن کو قتل کروا دیا تھا اور ان کے بیٹے ہرگوبند کو زنداں میں ڈلوا دیا تھا۔ چنانچہ اس بادشاہ کی موت پر ہمارے ماتم کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

اگر ہمارے خاندان میں کوئی مر جاتا تو ہم ایک سال تک نہ تو دیوالی پر چراغ جلاتے تھے اور نہ ہی ہولی پر ایک دوسرے پر رنگ اچھالتے تھے۔ مسلمانوں کی رسوم عجیب تھیں۔ بادشاہ کی موت کے تین ماہ بعد شہر کی کوتوالی سے ایک شخص آیا اور مسجد کے سامنے نقارہ پیٹنے لگا۔ جب سب جمع ہو گئے تو اس نے اونچی آواز میں کہا: ''تمہیں نئے بادشاہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے۔'' اس نے نئے بادشاہ کا اتنا لمبا نام لیا تھا کہ جتنی لمبی رکاب گنج سے پہاڑ گنج کو جانے والی سڑک تھی۔ عالم پناہ عبدالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی، ظلِ الٰہی، شہنشاہِ شاہاں، بادشاہِ کائنات، شاہِ ہندوستان۔

اس نے کہا کہ ہمیں اپنے گھروں میں چراغاں اور اس کی طویل عمری کے لئے دعا کرنا چاہیے۔

ہم اچھوتوں کے پاس چراغ جلانے کو تیل نہیں تھا اور نہ ہی ہمارے مندر تھے کہ جہاں جا کر ہم دعا کرتے۔ چنانچہ ہم نے دوسرے لوگوں کو چراغاں کرتے اور نئے بادشاہ کی طویل عمری کے لئے دعائیں کرتے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

میری ماں نے مجھے صاف ستھری قمیض پہنائی۔ سب نے اپنے بہترین کپڑے پہنے۔ رکاب گنج کے خاکروبوں اور موچیوں نے ایک ٹولی بنالی۔ مرد آگے آگے ڈھول کی تال پر ناچنے لگے۔ عورتیں ان کے پیچھے پیچھے گانے لگیں اور وہ روانہ ہو گئے۔ میں نے چاچے رولو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ باپو کی نسبت اس کے ساتھ چلنے میں زیادہ مزہ آتا تھا۔ چاچی بھبو خوش تھی۔ اس نے کہا: ''تم اپنے چاچے کے ساتھ ساتھ رہنا اور اسے شراب نہ پینے

دینا۔"

ہم نے نوابوں کے محلات کے باہر مفت مہیا کیا جانے والا شربت ڈھیر سارا پیا اور امیر تاجروں کی مفت بانٹی ہوئی مٹھائی ڈھیروں کھائی۔ میرے باپو نے مجھے پیسے نہیں دیئے تھے لیکن جب ایک نواب نے ہاتھی پر سے سکے لٹائے تو میں نے بہت سارے سکے اٹھا لئے۔

نیا بادشاہ، جو اپنے آپ کو شاہ جہاں یعنی دنیا کا بادشاہ کہلواتا تھا، اپنے باپ جتنا ظالم نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے تخت نشیں ہوتے وقت اپنے بھائیوں کی آل اولاد کو قتل کروا دیا تھا، تاہم اس نے کسی اور کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ چاچا رولو نے بتایا کہ یہ بادشاہ بھی اپنے باپ، دادا اور پردادا کی طرح عورتوں کو پسند کرتا ہے۔ اس کی پسندیدہ ترین عورت اس کی ملکہ تھی، جسے اس نے شادی کے بعد مسلسل حاملہ کئے رکھا تھا۔ شادی کے چودہ برسوں میں اس نے چودہ لڑکے لڑکیوں کو جنم دیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکی اور چودھویں بچے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔ بادشاہ بہت اداس ہوا اور اس نے اس کے لئے بہت بڑا اور خوبصورت ترین مقبرہ تعمیر کروانے کا فیصلہ کیا۔ پہاڑ گنج کے مستریوں کے لئے یہ بہت اچھی خبر تھی۔ وہ آگرہ چلے گئے۔ مقبرے کی تعمیر میں بیس سال لگے۔ آگرہ سے آنے والے بتاتے تھے کہ وہ مقبرہ ہمارے قطب مینار سے اونچا اور عرب کی سرائے میں واقع بادشاہ ہمایوں کے مقبرے سے زیادہ خوب صورت ہے۔ ایک دن چاچی بھبو نے چاچے رولو سے کہا: "کیا تم میرے مرنے کے بعد میرے لئے تاج محل بنواؤ گے؟"

اس نے جواب دیا: "پہلے تو مرو تو سہی، ہم تیرے لئے تاج محل بنوانے کی بات بعد میں کریں گے۔"

شاہ جہاں بادشاہ بننے کے چند سال بعد دلی آیا۔ اسے ہمارا شہر بہت پسند آیا اور اس نے کہا: "میں یہیں رہوں گا۔"

اس نے اپنے معمارِ اعظم کو بلوا کر کہا: ''دریائے جمنا کے کنارے ایک بہت بڑا قلعہ اور قلعے کے اندر میرے اور میری ملکاؤں کے لئے محلات تعمیر کرواؤ۔ میں دنیا کی سب سے بڑی مسجد بھی تعمیر کروانا چاہتا ہوں۔''

مکرم خان نے بادشاہ کے سامنے تین بار جھک کر کہا، ''بادشاہ سلامت آپ پر اللہ کی رحمت ہو۔ میں انشاء اللہ آگرہ والے قلعے جتنا بڑا قلعہ تعمیر کرواؤں گا، جس میں بے شمار نہریں باغات اور فوارے ہوں گے۔ میں دنیا کی سب سے بڑی مسجد بھی تعمیر کرواؤں گا۔ میں اسے بھوجلا پہاڑی پر تعمیر کرواؤں گا تاکہ اسے پالم اور قطب سے بھی دیکھا جا سکے۔''

مکرم خان نے استاد احمد اور استاد ہیرا کو نقشے بنانے کا کہا۔ جب نقشے تیار ہو گئے تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ دلی آ کر اپنے ہاتھ سے بنیاد ڈالے تاکہ کام شروع کر دیا جائے۔

وہ بھی کیا زمانہ تھا! ہر کسی کو روزگار مل گیا تھا۔ ہم نے مردہ گایوں بھینسوں کی کھال اتارنا اور لوگوں کی غلاظت اٹھانا چھوڑ دیا۔ لکھی رائے کو مزدوروں کی فراہمی کا ٹھیکہ مل گیا۔ چونکہ میں کافی بڑا ہو گیا تھا، اس لئے اس نے مجھے پتھر اور گارا ڈھونے کا کام دلایا۔

دلی تبدیل ہونے لگا۔ ہر روز ایک نئی عمارت تعمیر ہوتی۔ ہر روز شہر کی فصیل مزید اونچی ہو جاتی۔ ہر روز نئے مینار اور گنبد بنتے۔ کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کام مکمل ہونے کے بعد ہم نے نو دن تماشا دیکھا۔ شہزادوں نے لوگوں کے ہجوم پر چاندی کے سکے پھینکے۔ بادشاہ اپنے سب سے بڑے ہاتھی پر سوار ہو کر شہر سے گزرا۔ اس نے مٹھیاں بھر بھر کر سونے کے سکے لٹائے۔ اس کے درباریوں نے کہا: ''اب ہم دلی کو دلی نہیں بلکہ شاہ جہاں آباد کہا کریں گے۔'' تاہم دلی دلی ہی ہے اور کوئی بادشاہ یا نواب اس کا نام نہیں بدل سکتا۔

جب کوئی شخص پیسہ کمانے میں مگن ہوتا ہے تو وہ اپنے بھگوان کو بھول جاتا ہے۔ جب وہ ننانوے کما لیتا ہے، تو سو بنانا چاہتا ہے۔ شہر میں کام کے دوران میں نے مشکل ہی سے کبھی گورو کو یاد کیا ہوگا۔ جب میرا باپ مرا اور مجھے خاندان کا سربراہ بنایا گیا تو گورو کے نمائندے نے مجھے بلایا۔ میں قاصد کے ساتھ گورو کے نمائندے کے پاس گیا۔ وہ ایک بڑی چارپائی پر بڑے سے تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں سمجھا کہ وہی گورو ہے، اس لئے میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔

اس نے پوچھا: ''تم کون ہو؟''

میں نے جواب دیا: ''میں رکاب گنج کا جیتا رنگریتا ہوں۔''

اس نے پوچھا: ''کیا تم گورونانک کے سکھ ہو؟''

میں نے کہا کہ میں وہی ہوں جو میرا باپو تھا۔

اس نے کہا: ''تم نے نہ تو اپنے باپ کی روح کے لئے اور نہ ہی نئے گورو کے لئے نذرانہ دیا ہے۔''

میں نے کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں کیونکہ مجھے اپنے باپو کی موت پر سارے رکاب گنج کو کھانا کھلانا پڑا تھا۔ اس کے نوکر نے میری گدی پر تھپڑ مارا اور غصے سے کہا، ''تم گورو کے نمائندے کے ساتھ بحث کرتے ہو!''

مجھے نذرانہ دینے کے لئے لکھی رائے سے قرض لینا پڑا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، ''کم از کم میں گرونانک کا سکھ تو ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا مطلب کیا ہے تاہم یہ رنگریتا اچھوت ہونے سے تو بہتر ہے۔''

اس کے بعد مجھے ہر سال اس نمائندے کی دلی آمد پر کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ اگرچہ اس نے مجھے کبھی خود کو چھونے نہیں دیا، نہ میرے پیسوں کو ہاتھ لگایا (اس کا نوکر ہم سے پیسے لیتا تھا) تاہم میں اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف محسوس کرتا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ نیا گرو یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اپنے سر اور ڈاڑھی کے بال کٹوائیں۔ چنانچہ

میں نے اپنے سر کے بال بڑھنے دیئے اور سر پر پگڑی باندھنے لگا۔ میری ڈاڑھی بھی کافی بڑھ گئی تھی۔ ہم ڈاڑھی والے رنگریتا دوسرے اچھوتوں سے مختلف دکھائی دینے لگے۔ اگرچہ دلی میں تعمیرات کا کام مکمل ہو جانے کے بعد میں دوبارہ خاکروب بن گیا تھا، تاہم جب کوئی پوچھتا کہ میں کون ہوں تو میں جواب دیتا: ''میں گرونانک کا سکھ ہوں۔''

شاہ جہان آباد تعمیر ہونے کے کچھ سال بعد تک بادشاہ نے دلی کو آگرے سے زیادہ پسند کیا لیکن پھر اسے آگرہ دلی سے زیادہ اچھا لگنے لگا۔ ہمارے شہر میں اس کی آمد کم سے کم ہونے لگی۔ دستکار اور تاجر دوبارہ آگرہ جانے لگے۔ لوگ کہنے لگے کہ شاہ جہان آباد جلد ہی دلی کے دوسرے پرانے شہروں مہرولی، سری، چراغ، تغلق آباد، کوٹلہ فیروز شاہ اور کلوکھیری کی طرح گجروں، گیدڑوں، چمگادڑوں اور الوؤں کا بسیرا بن جائے گا۔

میں نالیاں اور بیت الخلا صاف کر کے زیادہ نہیں کماتا تھا۔ مجھے بنئے اور لکھی رائے سے پیسہ قرض لینا پڑتا تھا۔ مجھے انھیں سود ادا کرنا پڑتا تھا اور جب میں سود ادا کرنے سے قاصر ہو گیا تو انھوں نے مجھے مزید قرض دینے سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے مجھے مجبوراً چاندنی چوک میں واقع کوتوالی سے ملحق جلاد کے احاطے میں ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ یہ حقیقتاً ایک غلیظ کام تھا۔ پہلے تو مجھے لوگوں کے سر، بازو اور ٹانگیں کٹتے دیکھنے کا عادی ہونا پڑا۔ میرا کام یہ تھا کہ کٹے ہوئے اعضا کو اٹھا کر باہر نمائش کے لئے رکھتا تھا۔ لوگ مجھ سے یوں کام کرانے لگے جیسے میں قاتل ہوں۔ ہر شام کم از کم تین چار لاوارث لاشوں کو ریڑھے پر لاد کر دریا میں یا کوڑے کے ڈھیر پر ڈالنا پڑتا تھا۔ انسان کو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے!

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں مجھے یہ کام پسند نہیں تھا۔ مجھے پسند نہیں تھا کہ جب میں لاشوں سے لدا ریڑھا لے کر گزروں تو لوگ مجھے ڈوم کہہ کر پکاریں۔ مجھے پسند نہیں تھا کہ لوگ اپنے بچوں کی آنکھیں ڈھانپ کر مجھے دیکھنے نہ دیں اور متعفن لاشوں کی وجہ

سے اپنی ناک بند کر لیں۔ حد تو یہ ہے کہ شہر کے دروازوں پر متعین محافظ بھی میرے گزرنے پر دور ہٹ جاتے تھے۔ میں اپنے باپو کے الفاظ یاد کر کے خود کو تسلی دیتا تھا، "بیٹے! شاہ جہان آباد کے دروازوں سے صرف دو لوگ بغیر سوال جواب کے گزر سکتے ہیں: بادشاہ اور اچھوت!"

ایک مرتبہ شاہ جہان بادشاہ دلی آیا تو بیمار ہو گیا۔ اس خبر کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن بادشاہ کے حکیمی معالج کی وجہ سے چند گھنٹوں میں ہر کسی کو پتا چل گیا۔ رات کے وقت بادشاہ جاگ پڑا۔ اس نے پیٹ میں درد کی شکایت کی۔ ملکہ نے بلی ماراں میں رہنے والے حکیم کو بلوا لیا۔ بادشاہ کی بیماری کی خبریں پھیلی کہ حکیم نے لوگوں سے کہا وہ ساری رات ایک ایسے مریض کی وجہ سے سو نہیں سکا، جس کا نام وہ بتا نہیں سکتا۔

جب میں کام پر پہنچا تو ایک ڈوم نے پکار کر کہا: "چھٹی۔" محل سے حکم آیا تھا کہ اُس روز کسی کو موت کی سزا نہیں دی جائے گی۔ جب کوئی مذہبی تعطیل ہوتی تھی اور بادشاہ یا ملکہ میں سے کوئی بیمار ہوتا تھا تو ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ دن چڑھا تو لوگ جگہ جگہ اکٹھے ہو کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ قصابوں کو جانور ذبح کرنے سے روک دیا گیا، مولویوں کو بادشاہ کی صحت یابی کی دعائیں کرنے کا حکم دیا گیا، پنڈتوں کو مندروں کی گھنٹیاں بجانے کا حکم دیا گیا۔ دکانیں بند کر دی گئیں۔ لوگ جلدی جلدی گھروں کو چلے گئے اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ رات کو انھوں نے چولھوں کے نیچے گڑھے کھود کر سونا چاندی چھپا دیا۔

معلوم ہوا کہ بادشاہ کو قبض ہو گئی ہے۔ حکیم نے اسے جلاب دیا۔ بادشاہ دو دن اور دو رات اپنی آنتیں خالی کرتا رہا، یہاں تک کہ ان میں کچھ نہ بچا اور خون آنے لگا۔ پہلے کہا گیا کہ وہ قبض سے مر رہا ہے، پھر کہا گیا کہ وہ دستوں سے مر رہا ہے۔

میرا باپو کہا کرتا تھا کہ جب باپ مرتا ہے تو اس کے بیٹے اس کی دولت پر لپکتے ہیں۔ بادشاہ کے چار بیٹوں پر یہ بات صادق آئی تھی۔ جونہی انھوں نے اپنے بوڑھے

باپ کی بیماری کا سنا، ان کے ہاتھ اپنی تلواروں کے دستوں پر پہنچ گئے۔ تاہم تلواریں کھینچنے سے پہلے یہ یقین کر لینا چاہتے تھے کہ وہ واقعی مر رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قاصدوں کو اپنے باپ کے لئے تحائف دے کر دلی بھیجا۔ بوڑھا بادشاہ ان چالوں کو سمجھتا تھا کیونکہ اپنے زمانے میں ایسی چالیں چل چکا تھا۔ اس نے محل کی کھڑکی سے رعایا کو اپنا درشن دیا۔ اس نے مساجد میں شکرانے کے نفل ادا کروائے۔ تاہم اس کے بیٹے بیوقوف نہیں بنے اور انھوں نے آگرہ اور دلی پر چڑھائی کرنے کے لئے لشکر اکٹھا کرنے شروع کر دیئے۔ بادشاہ نے آگرہ جا کر تخت پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا تا کہ اس کا کوئی بیٹا تخت نشیں نہ ہو جائے۔ اس کے باوجود اس کے بیٹوں نے یکے بعد دیگرے اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ قرار دے دیا اورنگ زیب مراد سے جا کر ملا اور اسے کہا، ”آؤ مل کر اپنے بھائیوں کو شکست دیں۔ پھر ہم اپنے بوڑھے باپ کو قید کر دیں گے، جواب اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ حکومت کرنے سے قاصر ہے۔ تم بادشاہ بن جانا، میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔“ داراشکوہ، جو بادشاہ کا سب سے بڑا اور چہیتا بیٹا تھا، اپنے بھائیوں کے رویے سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اس نے کہا: ”میرا باپ ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ اس کے بعد میں ہندوستان کا بادشاہ بنوں گا، کیونکہ میں اس کا سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ میں شجاع، مراد اور اورنگ زیب کو قتل کر دوں گا۔“

ہم نہیں جانتے تھے کہ کون سا بیٹا اچھا بادشاہ ہوگا۔ لکھی رائے دارا کے حق میں تھا۔ اس نے کہا: ”وہ سب سے بڑا بیٹا ہے اور ہمیشہ سب سے بڑا بیٹا ہی اپنے باپ کا جانشیں ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ خدا سے ڈرتا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں سے یکساں سلوک کرتا ہے۔“

اس زمانے میں سرمد نام کا ایک فقیر ہوتا تھا۔ وہ ناگ سادھو کی طرح عریاں رہتا تھا۔ وہ بازاروں میں جا کر لوگوں سے کہنے لگا کہ دارا جیت جائے گا۔

فقیر سرمد غلطی پر تھا۔ بادشاہ کے بیٹوں میں خونریز جنگیں ہوئیں۔ دارا کے بیٹے

سلیمان شکوہ نے شجاع کو شکست دی۔ اسی دوران مراد اور اورنگ زیب نے دارا کو شکست دے دی اور آگرہ پر قبضہ کر کے اپنے بوڑھے باپ کو زنداں میں ڈلوا دیا۔ بعد ازاں اورنگ زیب نے مراد کو قتل کروا دیا۔ پھر اس نے شجاع، دارا اور دارا کے بیٹوں کو بھی قتل کروا دیا۔

اب ہمارا بادشاہ اورنگ زیب تھا جبکہ بوڑھا بادشاہ شاہ جہاں ہنوز زندہ تھا۔ مسلمان خوش تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نیا بادشاہ ایک نیک آدمی ہے۔ وہ شراب نہیں پیتا، اس نے کنیزیں نہیں رکھیں، وہ محل میں ناچ گانا نہیں کرواتا، وہ تھوڑا کھاتا، تھوڑا سوتا اور زیادہ عبادت کرتا ہے۔ وہ قرآن پاک لکھ کر بیچتا ہے اور اس آمدنی سے گزارا کرتا ہے۔ وہ اورنگ زیب کو عالمگیر کہتے تھے۔ وہ کہتے، ''عالمگیر زندہ پیر۔''

لکھی رائے خوش نہیں تھا۔ نئے بادشاہ نے اسے کوئی ٹھیکہ نہیں دیا۔ کئی سال بعد ایک دن میں اس کے صحن میں اس کا جھوٹا کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلمان کہتے ہیں اورنگ زیب نیک آدمی ہے کیونکہ وہ شراب نوشی اور عورت بازی نہیں کرتا۔

لکھی رائے غصے میں آ گیا اور بولا: ''یہ ہیرا بائی کون ہے؟''

پھر وہ ڈر گیا۔ اس نے مجھ سے سوگند لی کہ میں کسی سے یہ بات نہیں کہوں گا۔ تاہم میں ہیرا بائی کا نام اپنے ذہن سے نکال نہیں سکا۔ بنیا بھی کبھی کبھار مجھے اپنا جھوٹا کھانا دے دیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے ہیرا بائی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھا ملا کر دائرہ بنایا اور دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی دائرے میں اندر باہر کرنے لگا۔ پھر بولا: ''لیکن ہیرا بائی مر چکی ہے۔''

بنیا اورنگ زیب کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا: ''کسی کو بتانا نہیں۔ مرہٹے اس کا خاتمہ کرنے والے ہیں۔ ان کا سالار شیوا جی انھیں تباہ کر دے گا۔ تم کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہنا، ورنہ وہ میرا گلا کاٹ دیں گے۔''

میں راز کو راز نہ رکھ سکا۔ میں نے ایک روز سرائے کے مسلمان باورچی سے

پوچھا کہ کیا اس نے شیواجی کا نام سنا ہے۔ باورچی ناراض ہو گیا۔ اس نے کہا: ''اس غلیظ انسان نے دوستی کے دھوکے میں بہادر جرنیل افضل خان کو قتل کر دیا تھا۔''

چند ماہ بعد مسلمان باورچی نے مجھے بہت سارا جھوٹا کھانا دیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا: ''کیا تم نے اپنے شیواجی کے بارے میں سنا ہے۔ اسے گرفتار کر کے آگرہ لے آیا گیا ہے۔''

میں نے بنئے کو بتایا تو اس نے کہا: یہ جھوٹ ہے، شیواجی تو بادشاہ سے مذاکرات کرنے کے لئے خود آیا ہے۔

کئی دنوں تک دلی میں ہر شخص شیواجی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ ہم نے سنا کہ وہ فرار ہو کر دکن میں اپنی پہاڑی مملکت میں چلا گیا ہے۔ بنئے نے مجھے کہا: ''دیکھا! میں نہ کہتا تھا؟ رام جی اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔''

بادشاہ بہت غصے میں تھا۔ اس نے ہندوؤں کے لئے سخت قوانین نافذ کر دیئے۔ لکھی رائے اور بنیا کہتے تھے کہ بھگوان ضرور اپنا اوتار بھیجے گا، جو ہمیں اس کل یگ میں بچا لے گا۔ برس گزر گئے مگر اوتار نہ آیا۔ میں گورو پر اعتقاد کھونے لگا۔

☆☆☆

گورو کو گرفتار کر کے سزائے موت دے دی جاتی ہے۔ اس روز شدید آندھی آتی ہے۔ میں گورو کی لاش اٹھا کر لے جاتا ہوں اور پہاڑی میں دفنا دیتا ہوں۔ مجھے فخر ہوتا ہے کہ ایک اچھوت کو یہ اعزاز ملا ہے کہ اس نے اپنے گورو کا لاشہ اپنے بازوؤں میں اٹھایا ہے۔ آج میں جیتا رنگریٹا یعنی گورو کا سچا فرزند بن گیا ہوں۔

بھاگ متی

میں کئی ہفتوں سے بھاگ متی سے نہیں ملا۔ اس سے بری بات یہ ہے کہ مجھے اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دوردرشن کے لئے ایک سیریز بنانے میں مصروف ہوتا ہوں، جس کا موضوع دلی شہر ہے۔ دوردرشن پر آنے سے مجھے ایک غیر متوقع بونس ملتا ہے۔ مجھے ایک عورت کا خط ملتا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ اس نے میرا پروگرام دیکھا ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کا نام کملا ہے۔ اس نے یہ نہیں لکھا کہ وہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔ اس نے اپنی عمر اور پیشہ بھی نہیں لکھا ہوتا۔ پتے کی جگہ ایک آرمی میس کا روم نمبر دیا گیا ہوتا ہے۔ عموماً ایسی عورتیں، جو اجنبی مردوں کو خط لکھتی ہیں، اکتا دینے والی نکلتی ہیں۔ تاہم کوئی شے مجھے مجبور کرتی ہے کہ اسے جواب لکھوں کہ مجھے اس سے مل کر خوشی ہوگی۔ اس موقع پر مجھے بھاگ متی کے بارے میں سوچ کر احساسِ جرم ہوتا ہے۔

میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی لائبریری میں کافی وقت کام گزارتا ہوں۔ میں نے کملا کو یہیں ملنے کا لکھا تھا۔ چونکہ وہ میری شکل سے واقف ہے لہٰذا وہ مجھے بآسانی ڈھونڈ سکتی ہے۔

اگرچہ مجھے رسالوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنے کا شوق ہے لیکن اس روز میں

پوری توجہ سے مطالعہ نہیں کر سکتا ہوں اور ہر عورت کو سر اٹھا کر تکنے لگتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ کس عمر کی ہوگی؟ وہ موٹی ہوگی یا دبلی پتلی؟ اس کا رنگ صاف ہوگا یا وہ کالی ہوگی؟ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟

آخر وہ آجاتی ہے۔ وہ سیدھی میری طرف آتی ہے اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہتی ہے: ''میں کملا ہوں۔''

میں اٹھ کر مصافحہ کرتا ہوں اور جواب دیتا ہوں: ''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آیئے باغ میں چل کر کافی پیتے ہیں۔''

اس کا قد چھوٹا اور رنگ کالا ہوتا ہے۔ وہ چہرے مہرے سے تیس کے پیٹے میں دکھائی دیتی ہے۔ ہم ایک میز پر بیٹھ کر کافی کا آرڈر دیتے ہیں۔ میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہتا ہوں، ''آپ کا پورا نام کیا ہے؟''

''آپ بڑے متجسس ہیں۔ اوکے، میرا پورا نام کملا گپتا ہے۔''

''میں بریگیڈیئر گپتا کی بیوی ہوں۔ ہمارے تین بچے ہیں — ایک لڑکی، دو لڑکے۔''

میں حیرت سے کہتا ہوں ''تین بچے! آپ تو عمر سے کالج کی طالبہ لگتی ہیں۔''

وہ خوشی سے کھل اٹھتی ہے: ''اب اتنی بھی کم عمر نہیں ہوں۔ میں چالیس سے زیادہ کی ہوں۔ میری شادی کو بیس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ لوگ غلطی سے میری بیٹی کو میری چھوٹی بہن سمجھ لیتے ہیں۔''

''کیا آپ دلی کی رہنے والی ہیں؟''

''نہیں۔ میں تامل ہوں۔ میرے خاوند دلی کے ہیں۔''

''آپ نے تعلیم کہاں سے حاصل کی؟''

''ماڈرن سکول اور سینٹ سٹیفن کالج، جہاں میں اپنے خاوند سے ملی تھی اور ہم نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ بعد میں ہمارے گھر والوں نے ہمیں معاف کر دیا

تھا۔"

"کیا اب آپ اکٹھے رہتے ہیں؟"

"میرے خاوند ایسی جگہ متعین ہیں' جہاں فیملی نہیں رکھی جا سکتی۔ بچے مسوری میں بورڈنگ سکول میں ہیں۔ مجھے آرمی میس میں رہنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ہم چھٹیوں کے دنوں میں اکٹھے ہوتے ہیں۔"

"آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟"

"مجھے کافی فرصت ہوتی ہے۔ فوجیوں کی بیویوں کے ساتھ میری نہیں بنتی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ میں کوئی کتاب وغیرہ لکھتی ہوں۔ ٹی وی پر آپ کے پروگرام نے مجھے ایک خیال سجھایا کہ کیوں نہ دلی اور اس کی یادگاروں پر کچھ لکھا جائے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بازار میں اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں دستیاب ہیں۔"

"ممکن ہے۔ ایسا ہو' لیکن وہ سب کتابیں ایک سی ہیں۔ ان میں سے کسی میں وہ چیزیں نہیں ہیں' جو آپ اپنے پروگرام میں دکھا رہے ہیں۔ مجھے ایسی بہت سی پرانی حویلیوں کا پتا ہے' جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ میرے خاوند پراٹھے والی گلی میں پیدا ہوئے تھے۔ کیا آپ نے کبھی اس گلی کا سنا ہے؟"

"سنا تو ہے' دیکھی کبھی نہیں۔"

"کیا آپ نے گلی نمک حراماں کا سنا ہے کبھی؟ میں شرط لگا سکتی ہوں کہ نہیں سنا۔ آپ مجھے ایسی جگہیں دکھائیں' جو میں نے نہ دیکھی ہوں۔ میں آپ کو ایسی جگہیں دکھاؤں گی' جو آپ نے نہ دیکھی ہوں۔ ہم دونوں مل کر کتابیں لکھتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ ہاتھ میری طرف بڑھاتی ہے۔ میں اسے تھام لیتا ہوں۔ میں اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہتا ہوں: "ٹھیک ہے۔"

اس کا ہاتھ مضبوط مگر نرم ہے۔

ہم ایک گھنٹہ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں اس سے زیادہ بے تکلف ہو سکتا ہوں۔

میں اسے آرمی میس کی پرانی سی عمارت کے باہر تک چھوڑ آتا ہوں۔ ہمارے درمیان طے ہو جاتا ہے کہ میں اگلے اتوار اسے ان جگہوں کی سیر کراؤں گا' جنہیں میں نے ٹی وی پروگرام میں دکھایا تھا۔

☆☆☆

اتوار کے دن وہ مجھے گیٹ پر ہی کھڑی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری ہوتی ہے' جس میں دو تھرموس فلاسک اور ایک سینڈوچز کا بکس ہوتا ہے۔

''پرہجوم کیفے ٹیریا یا ڈھابوں میں جانے سے بہتر ہے کہ ہم اپنا کھانا ساتھ لے چلیں۔''

میں اسے نیلم کا بنا ہوا چھوٹا سا گن پتی تحفتاً پیش کرتا ہوں۔

''یہ میرا خوش قسمتی کا نشان ہے۔ میں ہمیشہ ایک اپنے پرس میں رکھتا ہوں۔ یہ میں تمہیں اس لیے دے رہا ہوں تاکہ ہماری دوستی کامیاب رہے۔''

وہ میرے تحفے کو دونوں ہاتھوں سے تھام چوم لیتی ہے: ''تھینک یو۔ مجھے یقین ہے' یہ میری خوش قسمتی کا بھی باعث ہوگا۔''

جب ہم قطب مینار کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ کہتی ہے: ''مجھے یقین ہے' جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے' کہ یہ ہندوؤں کی یادگار ہے۔'' میں طنزیہ لہجے میں کہتا ہوں: ''لال قلعے اور تاج محل کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' پھر اس سے پوچھتا ہوں: ''تم نے یہ احمقانہ تحقیق کہاں سے سنی۔ ان سب عمارتوں پر ان کے معماروں کے نام اور تعمیر کی تاریخیں عربی میں کندہ ہیں۔ تم ہندو فاشسٹوں کا پروپیگنڈا لٹریچر پڑھتی

رہی ہو!"

ہم صبح کا وقت مہرولی میں گزارتے ہیں۔ میں کار کو اولیا مسجد کے پاس کھڑی کر دیتا ہوں۔ ہم شمسی تالاب کے پاس سے گزرتے ہوئے جہاز محل پہنچتے ہیں اور پھر اس سے بھی آگے پُر ہجوم گلیوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ میں اسے قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر لے جاتا ہوں اور ساتھ واقع قبرستان میں موجود مغل بادشاہوں کی قبریں دکھاتا ہوں۔

میں اسے جمالی کمالی مسجد لے جاتا ہوں۔ وہ مجھے کافی اور ایک سینڈوچ دیتی ہے۔ وہ ایک نوٹ بک اور بال پوائنٹ پین نکالتی ہے۔ "مجھے آج صبح دیکھی جانے والی جگہوں کے بارے میں بتاؤ۔ اگر میں لکھوں گی نہیں تو ہر شے کو بھول جاؤں گی۔"

میں اسے ساری تفصیلات لکھوا دیتا ہوں۔ وہ کافی کی چسکیاں بھرتے ہوئے لکھتی رہتی ہے۔ جب میں بندہ بیراگی اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کا واقعہ بیان کرتا ہوں تو وہ تبصرہ کرتی ہے:

"ایسا لگتا ہے کہ تم مسلمانوں سے نفرت کرتے ہو۔"

میں احتجاج کرتے ہوئے کہتا ہوں: "ایسا بالکل نہیں ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں سے زیادہ میرے دوست مسلمان ہیں۔"

"لیکن تم اورنگ زیب کو تو پسند نہیں کرتے ہو گے' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مندر منہدم کروا دیئے تھے اور تمہارے ایک گرو کو قتل کروا دیا تھا۔"

"مائی ڈیئرینگ لیڈی! آپ کی باقاعدہ برین واشنگ کی جا چکی ہے۔ آپ کو بالکل نہیں بتایا گیا کہ اورنگ زیب تو ہندوؤں اور سکھوں کو اپنی اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کے لیے مالی امداد دیا کرتا تھا۔"

"میں نے تو کبھی ایسا پڑھا سنا نہیں ہے۔ تمہی بتا رہے ہو۔"

واپسی میں وہ کہتی ہے کہ میں اسے آرمی میس کے نزدیک سڑک کے موڑ پر

اتار دوں۔ ہم نے اگلا دورہ اندرون شہر کا کرنا تھا۔ اگلی مرتبہ وہ میری گائیڈ ہوتی۔

میں نے اس مرتبہ اسے کانچ کا بنا ہوا چھوٹا سا گن پتی دیا۔ میں نے کہا: ''اس سے تمہاری خوش قسمتی میں دگنا اضافہ ہو جائے گا۔'' اس مرتبہ تحفہ قبول کرتے ہوئے اس نے میری ڈاڑھی کو چوم لیا۔

ہم لال قلعے تک کار میں گئے۔ کار لال قلعہ کے پاس ٹھہرا دی گئی اور وہ مجھے چاندنی چوک لے گئی۔

''میں تمہیں پراٹھے والی گلی میں نہیں لے جا سکتی کیونکہ وہاں میرے بہت سے سسرالی رشتے دار رہتے ہیں۔ وہ پوچھیں گے کہ میں ایک سردار جی کے ساتھ کیا کر رہی ہوں؟ اور میں لال کنواں کے قریب تمہارے ساتھ دیکھا جانا نہیں چاہتا۔ وہاں میرے دوست رہتے ہیں۔''

''لال کنواں میں تمہارے کون سے دوست رہتے ہیں؟'' وہ شک بھرے لہجے میں پوچھتی ہے: ''بہت معزز، بہت پیارے دوست۔ میں بعد میں تمہیں ان کے بارے میں بتاؤں گا۔''

ہم نئی سڑک سے ایک تنگ گلی میں چلے جاتے ہیں۔ وہ پیپل کے درخت کے نیچے بہت سی پرانی حویلیاں اور مزار دکھاتی ہے۔ گلی میں کھلی بدرو سے اٹھنے والی بو بھری ہوتی ہے۔ گائیوں، ریڑھی والوں، سکوٹروں اور پیدل چلنے والوں کی وجہ سے چلنا دشوار ہوتا ہے۔ ہجوم کی وجہ سے مجھے کئی بار اس کا ہاتھ پکڑنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جب میں اس کا ہاتھ دباتا ہوں تو وہ بھی میرا ہاتھ دباتی ہے۔

کوئی آدھا گھنٹہ بل کھاتی گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم جامع مسجد کے عقب میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہم میدان کو پار کر کے لال قلعے کے باہر والے پارکنگ لاٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔

وہ کہتی ہے: ''مجھے کناٹ سرکس اتار دینا۔ مجھے شاپنگ کرنی ہے۔''

مجھے پتا ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ میس کے لوگ اسے میرے ساتھ دیکھیں۔ میں اس کے اس رویے سے تھوڑی الجھن کا شکار ہو جاتا ہوں۔ جب میں اسے اپنے اپارٹمنٹ آنے کی دعوت دیتا ہوں تو وہ سختی سے انکار کر دیتی ہے۔ حالانکہ مجھ سے گفتگو کے دوران اس نے یہ بات راز نہیں رکھی تھی کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہے۔

''ایک فوجی کی بیوی کی زندگی کیسی گزرتی ہے؟ شوہر کئی کئی ہفتے بلکہ مہینوں اس سے دور رہتا ہے۔ جب وہ چند دنوں کے لیے گھر آتا ہے تو سوائے جنس کے اسے کچھ اور سوجھتا ہی نہیں ہے۔ پھر وہ دوبارہ چلا جاتا ہے جبکہ بیوی ویسے کی ویسی ہی تشنہ رہ جاتی ہے۔''

اگر وہ میرے اپارٹمنٹ میں نہیں آتی یا مجھے اپنے کمرے تک نہیں لے جاتی تو پھر دلی میں ایسی جگہ کونسی ہو سکتی ہے کہ جہاں ہم وہ کچھ کر سکیں' جو کرنا چاہتے ہیں؟ اب پہل کی باری میری نہیں اس کی ہے۔ تاہم میں معاملات کو کسی انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اگر وہ انکار کرے گی تو میں بھی اسے چھوڑ دوں گا۔

ہماری تیسری ملاقات اکتوبر کی ایک گرم سہ پہر کو سنٹر میں ہوتی ہے۔ میں اسے ایک اور گن پتی تحفے میں دیتا ہوں ـــ یہ ہاتھی دانت کا بنا ہوتا ہے۔

''تم مجھے کتنے گن پتی دو گے؟'' وہ میرے ہونٹ چومتے ہوئے کہتی ہے۔

ہم پرانے قلعے چلے جاتے ہیں۔ میں کار میں اس سے کہتا ہوں: ''تم جانتی ہی ہو کہ میں اصل میں تمہیں کیا دینا چاہتا ہوں۔''

''میں تو نہیں جانتی' تم بتاؤ نا!''

''میں اصل میں تمہیں بچہ دینا چاہتا ہوں۔''

وہ مجھے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد وہ جواب دیتی ہے: ''اس کے لیے کچھ کرنا پڑے گا' کیونکہ میں نے تیسرے بچے کے جنم لینے کے بعد نس بندی کروا دی

تھی۔ تاہم کوشش کر لینے میں کیا ہرج ہے؟"

ایسی عورت سے بھلا کوئی کب تک نبرد آزما ہو سکتا ہے؟ میں شرم سے سرخ ہو جاتا ہوں۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیتا ہوں۔ ہم اس ساری سہ پہر یادگاروں کی سیر کے دوران اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کرتے۔ واپسی میں وہ کہتی ہے کہ میں اسے پھل اور سبزیاں وغیرہ خریدنے کے لیے آئی این اے مارکیٹ لے چلوں۔

"تم کار میں ہی ٹھہرو۔" وہ حکم دیتی ہے۔ "میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔"

میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ مارکیٹ میں میرے ساتھ نظر نہیں آنا چاہتی کہ یہاں حکومتی افسران اور فوجی کثرت سے آتے جاتے ہیں۔ وہ چند منٹ بعد آ جاتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک قلی پھلوں، بسکٹوں اور پنیر سے بھری ٹوکری اٹھائے آ رہا ہوتا ہے۔ وہ ٹوکری کو پچھلی سیٹ پر رکھ دیتا ہے۔ اس مرتبہ وہ مجھے میس تک جانے کا کہتی ہے۔ "تم میرے ساتھ ایک جام پی سکتے ہو۔"

میں ٹوکری اٹھائے اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک برآمدے میں پہنچتا ہوں۔ وہ دروازے کا قفل کھولتی ہے اور بتی جلاتی ہے۔ میں نے بھانپ لیا کہ وہ اس بات پر مطمئن تھی کہ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا "میں اپنے ہمسایوں سے گھلتی ملتی نہیں ہوں۔" وہ کہتی ہے۔

میں ٹوکری اس کے چھوٹے سے باورچی خانے میں رکھ دیتا ہوں۔ وہ کچھ چیزیں فریج میں اور کچھ چیزیں شیلف پر رکھ دیتی ہے۔

"معذرت خواہ ہوں میں تمہیں صرف فوج والی رم ہی پیش کر سکتی ہوں۔ تم سوڈے کے ساتھ پیو گے یا پانی کے ساتھ؟"

وہ ایک کم فرنیچر والی خواب گاہ و نشست گاہ تھی۔ وہ بستر پر بیٹھ جاتی ہے اور میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میں میٹھی رم کی ایک چسکی لیتا ہوں۔ شراب بہت سخت ہوتی ہے۔ مجھے کوئی بات نہیں سوجھتی۔ جونہی مجھے ایک بات سوجھی میں بول پڑا: "کل تم

نے کہا تھا کہ اورنگ زیب متعصب تھا۔"

وہ ہنستے ہوئے کہتی ہے: "کیا کسی عورت کے ساتھ بات کرنے کے لیے تمہارے پاس ایک مردہ بادشاہ سے زیادہ دلچسپ موضوع کوئی نہیں ہے؟"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایک دلکش عورت کی صحبت میسر ہے لیکن اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا؟"

"تم میرے بارے میں بہت کم جانتے ہو۔ اتنا بھی نہیں کہ میں کتنی دلکش ہو سکتی ہوں۔ تم نے تو جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی ساڑھی کا پلو ہٹا کر بلاؤز کے بند کھول کر چھاتیاں ننگی کر دیتی ہے۔

"کیا تم نے پہلے کبھی ایسی چیز دیکھی ہے؟ اور وہ بھی ایسی عورت کی جو تین بچوں کی ماں ہو؟"

بلاشبہ میں نے ایسی چھاتیاں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ ان کا رنگ آبنوسی تھا' سانچے میں ڈھلی ہوئیں اور سولہ سالہ لڑکی کی چھاتیوں کی طرح کسی ہوئی تھیں۔ کالی بھٹنیاں تنی ہوئی تھیں۔

"میں نے تمہاری جیسی چھاتیاں پہلے کبھی نہیں دیکھیں' ننگی تصویروں میں بھی نہیں۔"

میرے اندر شدید خواہش جنم لیتی ہے کہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھوں۔ وہ میری کیفیت کو بھانپ لیتی ہے: "آؤ انہیں چھو کر دیکھو۔"

میں اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ میں اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ میں نے آج تک جتنی چھاتیوں کو دیکھا ہوتا ہے وہ ان سے زیادہ کسی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں اسے لٹا کر زبان اس کی بھٹنیوں کے گرد پھیرتا ہوں۔

"یہ تمہارے راستے میں آ رہی ہے۔" وہ میری پگڑی اتارتے ہوئے کہتی ہے۔ میرے لمبے لمبے بال میرے چہرے پر بکھر جاتے ہیں۔ وہ بال پکڑ کر میرا سر نیچے

کرتی ہے تو سر اس کی چھاتیوں کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ میں سانس لینے کے لیے رکتا ہوں اور اس کے چہرے کو تکتا ہوں۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھاری بھاری سانس لے رہی ہوتی ہے۔ جب میں اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں کو دباتا ہوں تو وہ منہ کھول کر میری زبان سے اپنی زبان ملانے لگتی ہے۔ میں اس کے کولہوں اور رانوں کے درمیان ہاتھ پھیرتا ہوں۔

وہ سرگوشی کرتی ہے: ''میرے اندر آ جاؤ اور جس بچے کا وعدہ کیا تھا' وہ مجھے دو۔''

میں اس کی بات پر عمل کرتا ہوں۔ وہ بہت جلد فارغ ہو جاتی ہے۔ سارا معاملہ سیکنڈوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ میں دوبارہ شراب کی چسکیاں لینے لگتا ہوں۔ وہ اٹھ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ اٹھا کر سلگا لیتی ہے۔

''اب ہم اسے اپنے ذہنوں سے جھٹک دیتے ہیں۔ تم مجھے اورنگ زیب کے بارے میں بتاؤ۔''

شہنشاہِ ہندوستان: اورنگ زیب عالمگیر

بنام خداوند بخشندہ و مہربان۔ میں یعنی عبدالمظفر محی الدین محمدؐ جسے خدا نے سلطنت ہندوستان کا بادشاہ بنایا' اپنی زندگی کے ننانوے اور بادشاہی کے اڑتالیس برسوں کا مختصر احوال قلمبند کر رہا ہوں۔ میں اپنی زندگی اور بادشاہت کا قصہ اس لیے رقم کر رہا ہوں تاکہ اللہ' جو کہ عادل و منصف ہے' میرے حوالے سے حقائق کو مسخ کرنے والے لوگوں کو سزا دے۔ دعا ہے کہ اللہ اپنے اس حقیر بندے کو اپنی داستان اپنے الفاظ میں بیان کرنے میں اس کی مدد کرے۔

یہ حقیر فقیر پر تقصیر گجرات کے چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ ایک شاعر نے ہمیں ''آفتاب عالم تاب'' کا خطاب دیا۔ دوسرے شاعر نے ہمیں ''گوہر تاج ملوک اورنگ زیب'' کا خطاب دیا۔ ان دونوں خطابات سے ہماری تاریخ پیدائش یعنی 1027ھ بمطابق 1618ء نکلتی ہے۔ ہم 15 ذیقعد (3 نومبر) کو پیدا ہوئے تھے۔ میزان اور عقرب ہمارے شمسی برج ہیں۔ نجومیوں نے پیش گوئی کی کہ ہم میں دونوں بروج کی صفات موجود ہوں گی یعنی میزان کے تحت انصاف اور رحم جبکہ عقرب' جس کی دم میں

زہر پوشیدہ ہوتا ہے کہ تحت ہم اپنے حقوق کو پامال کرنے والوں کو تباہ کر دیں گے۔

ہماری پیدائش کے وقت ہمارے والد' جو اس وقت شہزادہ خرم کے نام سے معروف تھے' دکن کے حاکم تھے اور ان کے والد جہانگیر ہندوستان کے بادشاہ تھے۔ ہماری والدۂ محترمہ نے جو کہ اب آگرہ میں تاج محل کہلانے والے اپنے مقبرے میں آسودۂ خاک ہیں' اپنی ازدواجی زندگی کے چودہ برسوں میں چودہ بچوں کو جنم دیا تھا۔ ان میں سے سات بچے اللہ کی رضا سے جنت الفردوس کو سدھار گئے تھے۔ باقی سات میں سے سب سے بڑی بیٹی جہاں آرا تھیں' ان کے بعد دارا شکوہ' شجاع اور روشن آرا بیگم تھیں۔ میں بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر تھا۔ ہمارے بعد مراد پیدا ہوا۔ گوہر آرا نے جس دن اس دنیا میں آنکھیں کھولیں' اسی دن یعنی 7 جون 1631ء کو ہماری والدۂ محترمہ اس فانی جہان سے رخصت ہو گئیں۔

چونکہ انسان کا حافظہ چھ سات سال کی عمر سے کام شروع کرتا ہے' اس لیے ہمیں اپنے بچپن کے حوالے سے بہت کم یاد ہے۔ ہمیں بعد میں بتایا گیا تھا کہ ہمارے دادا شہنشاہ جہانگیر نے کسی وجہ سے ہمارے والد سے ناراض ہو کر ہمارے بڑے بھائی دارا شکوہ کو اور ہمیں لاہور میں یرغمال بنا لیا تھا۔ اس وقت ہماری عمر آٹھ برس تھی۔

شہنشاہ نے دانا اور نیکوکار افراد کو ہمیں تعلیم دینے کا فریضہ سونپا۔ میر محمد ہاشم گیلانی اور اعتماد خان نے ہمیں قرآن اور حدیث کی تعلیم دی۔ ہمیں فارسی' ترکی' ہندی اور خطاطی بھی سکھائی گئیں۔ دارا شکوہ نے کافروں کی کتابیں پڑھنے اور ان کے ساتھ بحث مباحثوں کو ترجیح دی۔ اس نے نماز ادا کرنا اور روزے رکھنا چھوڑ دیا۔ وہ ایک ایسی انگوٹھی پہننے لگا جس پر دیوناگری رسم الخط میں "پربھو" کندہ تھا۔ وہ مصوروں' گلوکاروں' رقاصاؤں اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس نے اپنی عقل کو' جو کہ عطیۂ خداوندی ہوتی ہے' غلط انداز میں استعمال کیا۔ وہ خود پسند اور مغرور ہو گیا۔ سچ کہا گیا ہے: "اگر کسی کی قسمت کا کمبل سیاہ بُنا گیا ہو تو زم زم اور کوثر کا پانی بھی اسے سفید نہیں

کر سکتا۔"

جیسا کہ عموماً خاندانوں میں ہوا کرتا ہے کہ کچھ افراد بعض افراد کی نسبت دوسروں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ہمارے والد کو اپنے دو بڑے بچوں جہاں آرا بیگم اور داراشکوہ سے بہت پیار تھا۔ وہ دونوں بھی دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھے۔ اگرچہ ہم اپنے سب بہن بھائیوں سے مساوی طور پر محبت کرتے تھے' تاہم روشن آرا دوسرے بھائیوں کی نسبت ہماری صحبت کو ترجیح دیا کرتی تھی۔ اسی طرح سب سے چھوٹی بہن گوہر آرا مراد سے زیادہ پیار کرتی تھی۔

جب ہمارے والد شاہ جہان اکتوبر 1627ء میں ہندوستان کے بادشاہ بنے تو انہوں نے اپنے چار بیٹوں کے حوالے سے یوں اظہار رائے کیا: "داراشکوہ نے خود کو اچھے لوگوں کا دشمن بنا لیا ہے' مراد مے نوشی کا عادی ہو چکا ہے' شجاع میں قناعت کے علاوہ اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ اورنگ زیب کا عزم اور ذہانت اس امر کا ثبوت ہیں کہ صرف وہی ہندوستان کی حکمرانی کا بار اٹھا سکتا ہے۔ تاہم وہ جسمانی اعتبار سے کمزور ہے۔"

ہم نے اس وقت صرف 15 موسم گرما دیکھے تھے کہ جب ہم نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ جس طرح ہمارے دل میں عزم کی کمی نہیں ہے' اسی طرح ہمارے بازوؤں میں بھی قوت کی ہرگز کمی نہیں ہے۔ ایک دن صبح سویرے کہ جب سورج کی دھوپ صرف بادشاہی مسجد کے میناروں پر ہی پڑ رہی تھی' دریا کے ریتلے کنارے پر بے شمار لوگ دو ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک ہاتھی کا نام سدھاکر تھا جس کے نیزوں کے جیسے دانت تھے جبکہ دوسرے کا نام صورت سندر تھا' جس کے دانت تو نکلوا دیئے گئے تھے' تاہم وہ اپنے حریف جتنا ہی جسیم تھا۔ دونوں ہاتھیوں کو حشیش پلائی گئی تھی۔ لڑائی شروع ہوئی۔ دونوں ہاتھیوں نے ایک دوسرے کی سونڈ میں سونڈ پھنسا کر زور آزمائی شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ سدھاکر نے اپنے مہاوت کی

مسلسل ضربوں اور تماشائیوں کے شور کی وجہ سے مشتعل ہو کر اپنی سونڈ آزاد کروائی اور ہجوم میں گھس گیا۔ کئی لوگ اس کے وزنی پیروں تلے آ کر کچلے گئے۔ ہمارے علاوہ باقی ہر شخص دہشت زدہ ہو کر بھاگنے لگا۔ ہمیں اکیلا دیکھ کر سدھاکر نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم اپنے گھوڑے پر مستعد ہو گئے۔ جونہی سدھاکر نزدیک آ کر ہم پر حملہ آور ہوا ہم نے اپنا نیزہ اس کے سر میں اتنی قوت سے مارا کہ وہ اسی جگہ رک گیا۔ تاہم اس نے اپنی سونڈ کی زوردار ضرب سے ہمارے گھوڑے کو گرا دیا۔ ہم نے تیزی سے اٹھ کر اپنی تلوار کھینچی اور سونڈ کو کاٹ ڈالا۔ اتنی دیر میں شجاع اور راجہ رائے سنگھ سمیت کئی لوگ ہاتھی پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرا ہاتھی صورت سندر بھی سدھاکر پر حملہ آور ہو گیا۔ اب سدھاکر آگے آگے تھا اور صورت سندر اس کے پیچھے۔ آخر صورت سندر نے اسے میدان سے نکال کر دم لیا۔

شہنشاہِ معظم نے ہماری لاپروائی پر ہماری سرزنش کی۔ ہم نے کہا: ''موت بادشاہوں کو بھی نہیں چھوڑتی' اس میں کوئی بے عزتی نہیں ہے۔ شرم ناک کام تو ہمارے بھائی نے کیا ہے۔'' چونکہ شجاع سے جو کچھ ہو سکتا تھا' اس نے کیا تھا اس لیے سب پر واضح ہو گیا کہ ہمارا اشارہ داراشکوہ کی طرف ہے کیونکہ اس نے بزدلوں جیسا رویہ اپنایا تھا۔ شہنشاہِ معظم نے یوں ظاہر کیا جیسے انہوں نے ہماری بات نہ سنی ہو۔ انہوں نے ہمیں ہمارے وزن کے برابر سونے کے سکے عطا کیے نیز ''بہادر'' کا خطاب بھی دیا۔ چند ماہ بعد انہوں نے ہمیں دکن کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے بعد داراشکوہ کا دل حسد سے جلنے لگا۔

سترہ برس کی عمر میں ہماری شادی دل رس بانو بیگم سے ہوئی۔ وہ شاہ نواز صفوی کی بیٹی تھیں۔ اگلے برس مراد کی شادی دل رس بانو کی چھوٹی بہن سے ہو گئی۔ مراد کی عمر اس وقت صرف چودہ برس تھی۔ اب مراد نہ صرف ہمارا بھائی بلکہ ہمارا سالا بھی بن گیا۔ اگرچہ ہم اپنے عہدِ شباب میں تھے اور شباب کے اپنے ہی تقاضے ہوتے ہیں' تاہم ہم اپنا بہت کم وقت بیوی کے ساتھ بستر پر ضائع کرتے تھے۔ ہمیں حرم کی عورتوں کی نسبت اپنے فوجیوں کے ساتھ کیمپ میں وقت گزارنا زیادہ پسند تھا۔ ہمارے اتالیق

گیلانی صاحب نے ہمیں تاکید کی تھی کہ ایک حکمران کو ہمیشہ حرکت میں رہنا چاہیے۔ ایک ہی جگہ پر ٹھہرے رہنے سے سستی کا تاثر ملتا ہے' جبکہ سستی ہزار طرح کے مسائل پیدا کرتی ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ بادشاہوں کے لیے ایک ہی جگہ رہنا درست نہیں ہوتا۔ پانی ایک ہی جگہ کھڑا رہے تو جوہڑ بن جاتا ہے۔ اگر بادشاہ غیر متحرک رہے تو اس کا اقتدار اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے بادشاہوں اور اس دور کے امرا کے برعکس ہم نے پانچ سے زیادہ عورتوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ ان کے بطن سے ہمارے دس بچے پیدا ہوئے۔ ہمیں ان میں سے صرف ایک عورت کے ساتھ سچی محبت تھی لیکن اس کا قیام مختصر عرصے رہا اور اس نے ہمارے کسی بچے کو جنم نہیں دیا۔

☆☆☆

ہماری عمر 35 برس ہو چکی تھی۔ گرمیوں کا اذیت دہ موسم جا رہا تھا اور سیاہ بادلوں' ٹھنڈی ہواؤں اور بارشوں والا موسم آ رہا تھا۔ ہم اپنی خالہ سے ملنے برہان پور گئے ہوئے تھے اور وہاں دریائے تاپتی کے کنارے اپنی خالہ کے ہرن باغ میں سیر کر رہے تھے۔ ہم نے نوجوان لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز سنی۔ ہم اس خیال سے وہیں رک گئے کہ وہ بے پردہ ہوں گی اور ہمیں سامنے دیکھ کر انہیں شرمندگی ہوگی۔ ان لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا۔ ان کے گانے کے کچھ الفاظ ہمارے کان پڑے۔ یہ گانا ایک نوجوان دلہن کے بارے میں تھا۔ جو اپنے دلہا کے لیے تڑپ رہی تھی۔ وہ راگ میگھ ملہار میں گا رہی تھیں' جو کہ اس وقت اور موسم کے اعتبار سے موزوں راگ تھا۔ ایک آواز دوسری آوازوں پر حاوی تھی۔

وہ ایک مدھر اور صاف و واضح آواز تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آواز سبزے پر گرے شبنم کے ان قطروں جیسی ہے' جو صبح کی دھوپ میں چمک رہے ہوں۔ ہم اس آواز کی طرف کھنچے چلے گئے۔ ہماری آمد پر لڑکیاں تو بھاگ گئیں لیکن آواز وہیں رہی۔

اس وقت تک تو صرف ہماری سماعت مسحور تھی' جو ہم نے دیکھا اس نے ہماری آنکھوں پر بھی جادو کر دیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی' جس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا' اس کے گھرے سیاہ بال اس کی کمر تک لمبے تھے۔ اس نے ہاتھوں میں آموں سے بھری ایک شاخ پکڑی ہوئی تھی' جس کی وجہ سے اس کی شمیض باہر کو ابھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے دیکھا اور گانا جاری رکھا۔ ہم اس حسن بے مثال سے چند قدموں کی دوری پر یوں کھڑے تھے' جیسے ہمارے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہوں۔ لڑکی نے اچھل کر ایک آم شاخ سے توڑا اور ہماری طرف اچھال دیا۔ پھر وہ محل کی طرف بھاگ گئی۔ ''سبحان اللہ!'' ہم نے کہا: ''یہ کوئی انسان تھی یا حور؟''

ہمارا ایک ساتھی اس دوران وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے کہا: ''میرا خیال ہے یہ آپ کی خالہ کی کنیز ہیرا بائی ہے۔ سارا دکن اس کے حسن اور دلکش آواز کی تعریفیں کرتا ہے۔'' ہم نے کچھ دن حوصلہ مجتمع کرنے میں گزار دیئے اور پھر اپنی خالہ صالحہ بانو سے اپنے دل کی خواہش بیان کر دی۔ میں نے کہا: ''آپ ہمارے حرم کی ساری عورتیں لے لیجئے اور بدلے میں ہیرا بائی ہمیں دے دیجئے۔''

صالحہ بانو نے کہا کہ وہ ہمارے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہیں لیکن ان کا خاوند برہان پور کا گورنر سیف خان (جو اپنے غصیلے مزاج کی وجہ سے بڑا بدنام تھا) کیا کہے گا۔ ہمارے ساتھی مرشد قلی خان نے کہا کہ وہ سیف خان کو قتل کر دے گا۔ تاہم ہم نے اسے شریعت کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے سے منع کر دیا۔ اس کے بجائے مرشد نے جا کر سیف خان کو ہماری مراد سے صاف صاف آگاہ کر دیا۔ سیف خان نے معاملے پر تھوڑا غور کرنے کے بعد ہماری خالہ سے کہا کہ وہ ہمیں ہماری کنیز چترابائی کے بدلے ہیرا بائی دینے پر تیار ہے۔

ہیرا بائی کو پالکی میں بٹھا کر ہمارے حرم لایا گیا۔ کئی ماہ تک ہم نے اس کے علاوہ نہ تو کسی عورت کے ساتھ صحبت کی اور نہ ہی کسی دوسری عورت کے بارے میں

سوچا۔ ہم نے اس کے ہاتھ سے شراب کا ایک جام بھی لے کر پی لیا' حالانکہ اس سے پہلے ہم نے شراب کبھی نہیں پی تھی۔ اگر وہ ہمیں زہر بھی پلاتی تو ہم خوشی خوشی پی جاتے۔ تاہم اس نے ہمیں شراب پینے سے روک دیا۔

خادموں کے ذریعے ہماری وارفتگی کی کہانیاں دارا تک پہنچ گئیں۔ اس نے باپ کے کانوں میں ہمارے خلاف مزید زہر انڈیلا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس نے شہنشاہِ معظم سے کہا: "اس منافق کی پاک دامنی اور نیکوکاری ملاحظہ کیجیے! وہ اپنی خالہ کی کنیز کے لیے انتہائی پستی میں اتر چکا ہے۔"

اللہ نے اپنی لامحدود حکمت سے جان لیا کہ ہم فرض کے راستے سے بھٹک رہے ہیں' چنانچہ اس نے ہم سے ہیرابائی کو لے لیا۔ ہم نے اسے اورنگ آباد میں اپنے آنسوؤں سے بھرے ایک تالاب کے نزدیک دفنایا۔

ہمارے والدِ محترم عیب جوئی اور غیبت کرنے والوں کی باتوں میں آ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایک دغاباز اور فریبی شخص نے' کہ جس نے مذہبی انسان کا بہروپ دھار رکھا تھا' ہمارے والدِ محترم کو دو سیب دیے اور کہا کہ جب تک ان کی خوشبو ان کے ہاتھوں میں رہے گی' انہیں لاحق ہونے والی کوئی بیماری بھی ان کے لیے مہلک ثابت نہیں ہو سکے گی۔ جب اس بہروپیے سے پوچھا گیا کہ ان کا کون سا بیٹا ان کی حکمرانی کے لیے خطرہ ہے تو اس عیار شخص نے جواب میں کہا: "اورنگ زیب۔"

میں نے اپنے والدِ محترم کے ہاتھوں کو کئی مرتبہ چوما تھا' لیکن مجھے تو کبھی ان سے سیبوں کی خوشبو نہیں آئی۔ جہاں تک ان کی حکمرانی کو ختم کرنے کا سوال تھا' تو ہم نے ان کی سلطنت کو اتنی وسعت دی تھی کہ جو ہمارے آباؤاجداد کے تصور سے بھی ماورا تھی۔ اس سب کے باوجود ہمارے والدِ محترم کا ذہن ہماری جانب سے مسموم کر دیا گیا۔ ہمیں اطلاع دی گئی کہ وہ ہماری صاف رنگت کی رعایت سے ہمارے کردار کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے تھے: "سفید سانپ۔"

ایک حادثہ ایسا رونما ہوا کہ جس نے ہمارے شبہات کی تصدیق کردی۔ ایک رات جہاں آرا بیگم شمع اٹھائے اپنی خواب گاہ کی طرف جارہی تھیں کہ اچانک انہیں ٹھوکر لگی۔ وہ گر گئیں اور ان کے آب رواں کے لباس کو آگ لگ گئی۔ وہ بری طرح جل گئیں۔ دو کنیزوں نے ان سے لپٹ کر آگ بجھا دی تھی۔ وہ دونوں بھی بری طرح جل گئیں اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسیں۔ داراشکوہ نے ہمیں دیر سے اطلاع بھیجی۔ اس وجہ سے ہم اس حادثے کے ایک ماہ بعد آگرہ پہنچے۔ شہنشاہِ معظم ہم سے سخت ناراض تھے۔ انہوں نے ہمیں گورنری سے ہٹا دیا۔ انہوں نے ہماری تمام وضاحتوں کو رد کر دیا۔ ہم نے کرب کے عالم میں لکھا: ''اگر شہنشاہِ معظم کی یہ خواہش ہے کہ ان تمام خادموں میں سے صرف میں ہی ذلت و تحقیر کی زندگی بسر کروں اور اسی حال میں فنا ہو جاؤں تو میں سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا— میں نے تو دس سال پہلے ہی اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ میری زندگی نشانے پر ہے۔''

اسی سال داراشکوہ نے ہمیں دریائے جمنا کے کنارے واقع اپنے محل میں دعوت دی۔ ہم نے اس کے ہاتھوں کئی مرتبہ خفت اٹھانے کی وجہ سے اس امر کو ترجیح دی کہ اس سے اپنے فاصلے کو برقرار رکھا جائے۔ پس میں اس کے محل کے داخلی دروازے سے زیادہ آگے نہیں گیا۔ اس کے بعد اس نے شہنشاہ کو اکسایا کہ وہ ہماری سرزنش کریں۔ ہمارے دربار میں حاضر ہونے پر سات ماہ تک کے لیے پابندی لگا دی گئی۔

اس کے علاوہ بھی مزید ایسے کئی واقعات و حادثات رونما ہوئے۔ شہنشاہ نے ہمیں اس طرح خود سے دور کر دیا تھا جیسے ہم ان کی اولاد نہ ہوں۔ وہ ہمارے بھائیوں اور ان کے بیٹوں کی پیدائش کے ایام کی تقریبات پر سونے اور ہیرے جواہرات کے تحائف بھیجتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہماری یا ہمارے کسی بچے کی سالگرہ پر تحفہ نہیں بھیجا۔ شاہی ملازمین کی ترقی کے حوالے سے دی گئیں ہماری تجاویز کو مسترد کر دیا گیا۔ ہم پر الزامات لگائے گئے کہ ہم نے گولکنڈہ کے خزانے کو غلط استعمال کیا نیز شہنشاہ کے لیے

بھیجے گئے دکنی آم خود کھالیے۔ ہمیں اطلاع دی گئی کہ شہنشاہ نے دلی کے دورے کے دوران دارا کے ہندوستان کا اگلا بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ وہ شہنشاہ کی عطا کردہ خلعت اعزاز پہن کر دربار میں آیا اور تخت طاؤس کے نزدیک رکھی سونے کی کرسی پر بیٹھا۔ اگر دارا سچ بول رہا تھا' جو کہ شاذ ہی بولتا تھا' تو شہنشاہِ معظم نے اسے کہا تھا: ''میرے بچے! میں نے طے کیا ہے کہ آج کے بعد کوئی بھی اہم کام یا اہم فیصلہ تمہیں اطلاع دیے اور تم سے مشورہ لیے بغیر نہیں کروں گا۔ میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے ہمیں تمہارے جیسا بیٹا عطا کیا۔''

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' اور سو مرتبہ آئندہ بھی کہیں گے' کہ ہمیں بادشاہت یا اقتدار کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ تاہم جیسا کہ ہمارے اساتذہ ہمیں کئی بار یاد دلا چکے تھے کہ اللہ نے ہمیں بادشاہوں کے خاندان میں پیدا فرمایا ہے لہٰذا یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم نوع انسان کی خدمت کریں اور اسلام کو پھیلائیں۔ گیلانی صاحب کہا کرتے تھے کہ ہندوستان ایک روٹی ہے' جو بخشندۂ مہربان نے ہمارے آباؤاجداد تیمور' بابر' ہمایوں' اکبر' جہاں گیر اور شاہ جہاں کو عطا کی تھی۔ ہم ان کی اس بات سے بہت متاثر تھے کہ اللہ بڑا مہربان ہے' اس نے جن بندوں پر مہربانی کی ہے' ان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی سلطنت کو وسعت دیں۔ وہ کہتے تھے: ''زندگی کو بہترین انداز میں گزارو' لیکن یہ فراموش مت کرو کہ یہ عارضی ہوتی ہے۔ صرف اللہ کا نام لافانی ہے۔''

تم اپنے باغ مسرت میں لحہ لحہ
خوشی مناتے ہو'
موسم بہار چلا جاتا ہے اور موسم گرما آجاتا ہے'
موسم گرما چلا جاتا ہے اور موسم خزاں آجاتا ہے'
اور حنا کے پھول مرجھا جاتے ہیں۔

جس عرصے میں دارا شکوہ دلی اور آگرہ میں اپنے والد کے دامن سے چمٹا ہوا

تھا' اس عرصے میں ہم نے بلخ' بدخشاں' قندھار اور ملتان میں امن و امان بحال کیا۔ ہم نے گمراہ ایرانیوں سے جنگ کی۔ ہم مسلسل ایک میدانِ جنگ سے دوسرے میدانِ جنگ کی طرف سفر کرتے رہے۔ ہم نے زندگی بھر مذہبی معمولات کو کبھی تبدیل نہیں کیا۔ اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہوتی تھی کہ ہم کہاں ہیں یا جنگ کتنی شدید ہے' جونہی نماز کا وقت آتا' ہم اپنے ہتھیار الگ رکھ کر اپنے خالق کے حضور جھک جاتے تھے۔

گمراہ مؤرخین نے اپنے محترم شاہ جہاں کی زندگی میں ہی ہمارے ہندوستان کی حکمرانی حاصل کرنے کے اندازے کو غلط بیان کیا ہے۔ انہوں نے ہمیں سازشی قرار دیا ہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ مقدس کتاب کہتی ہے: ''اللہ بہترین منصوبے بنانے والا ہے۔'' ہم تو صرف اللہ کے منصوبوں کی تکمیل کا ایک وسیلہ تھے۔

ستارے اور اللہ کے نیک بندے پیش گوئی کر چکے تھے کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ہمارے والد محترم کے دربار میں موجود ہمارے مخبر نے ہمیں اطلاع دی کہ ایک مرتبہ شہنشاہ نے ایک ایسے نیک انسان سے' جو کہ مستقبل کے واقعات کے بارے میں پیش گوئی کر سکتا تھا' دریافت کیا کہ ان کا کون سا بیٹا تختِ طاؤس پر بیٹھے گا؟ نیک انسان نے ان سے ان کے بیٹوں کے نام پوچھے۔ شہنشاہ نے بتایا ''سب سے بڑا دارا شکوہ ہے۔''

''اس کی تقدیر بھی سکندر کے ہاتھوں مارے جانے والے اپنے ہم نام دارشکوہ جیسی ہوگی۔''

''دوسرا شجاع ہے۔''

''اگرچہ اس کے نام کا مطلب ہے' بے خوف' تاہم وہ بے خوف نہیں ہے۔''

''مراد سب سے چھوٹا ہے۔'' (شہنشاہ نے ہمارے وجود کو نظرانداز کر دیا تھا۔)

''وہ اس نام کے باوجود کوئی مراد حاصل نہ کر پائے گا۔''

''پھر اورنگ زیب ہے۔''

"اس کا یہ نام درست رکھا گیا ہے کیونکہ صرف وہی تخت پر بیٹھنے کے لیے موزوں ہے۔ عقل اور قسمت کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جو شخص عقل سے محروم ہوتا ہے' وہ بدقسمت ہوتا ہے۔"

ہمیں برہان پور میں اطلاع ملی کہ شہنشاہ معظم 6 ستمبر 1657ء سے بیمار پڑے ہیں۔ شاہ جہاں آباد میں موجود ہمارے مخبر نے خفیہ زبان میں ہمیں پیغام بھیجا کہ کئی دنوں سے شہنشاہ معظم کا پیشاب اور پاخانہ رک گیا ہے اور ان کا علاج کرنے والے حکیم ہندوستان پر ان کی حکمرانی جاری رہنے کے حوالے سے مایوس ہو چکے ہیں۔

ہم نے اس مخبر کو ہدایت کی کہ وہ شہنشاہ معظم کی صحت کے بارے میں ہمیں برابر اطلاعات بھیجتا رہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنے بھائیوں کے درباروں میں موجود اپنے مخبروں کو بھی ہدایت کی کہ وہ ان کی ہر حرکت کے بارے میں ہمیں آگاہ رکھیں۔ ہم نے شہنشاہ معظم کو خط لکھا' جس میں ان کی جلد صحت یابی کی دعا کے ساتھ استدعا کی کہ وہ ہمیں دلی میں ملاقات کا موقع عطا کریں۔

شہنشاہ معظم نے ہمیں مختصر سا جوابی خط لکھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور افواہ سازوں نے معدے کی معمولی سے تکلیف کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ آگرہ جا رہے ہیں۔ اسی اثنا میں دلی میں موجود ہمارے مخبر نے اطلاع دی کہ اس نے شاہی حکیم کو مٹھی بھر سونے کی مہریں دے کر پتا چلایا ہے کہ اس کی رائے میں اگر اللہ کوئی معجزہ نہیں دکھاتا تو اس دنیا میں شہنشاہ معظم کا قیام مزید ممکن نہیں ہے۔ شہنشاہ معظم کی خدمت میں حاضر ہماری چہیتی بہن روشن آرا نے بھی ہمیں خفیہ زبان میں پیغام بھجوایا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہمارے بھائی کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ روشن آرا نے ہماری کامیابی کی دعا کی تھی۔

ہم نے اپنے بھائیوں شجاع اور مراد کو مشورہ دیا کہ وہ تیمور اور بابر کے فرزندوں کے شایان شان رویہ اپنائیں۔ انہوں نے ہمارے مشورے کو نظرانداز کر دیا۔

پہلے شجاع نے' جو کہ بنگال میں تھا' بادشاہ ہونے کا اعلان کروا دیا۔ اس نے اپنا خطاب ابوالفوز نصیرالدین محمد تیمور سوم' سکندر ثانی شاہ شجاع غازی رکھا۔ چند ہفتے بعد مراد نے' جو کہ گجرات میں تھا' ہندوستان کا بادشاہ ہونے کا اعلان کروا دیا۔ اس نے اپنا خطاب معراج الدین رکھا تھا۔ اس نے ہمیں کہا کہ ہم اس کے ساتھ مل کر آگرہ پر چڑھائی کریں۔ اس نے اپنی گرم مزاجی کی وجہ سے اپنے وزیر علی نقوی کو داراشکوہ کے ساتھ مل کر سازش کرنے کے شبے میں قتل کروا دیا۔ آگرہ میں موجود ہمارے مخبر نے ہمیں اطلاع دی کہ داراشکوہ نے لال قلعے کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ شہنشاہ معظم لال قلعے ہی میں بیمار پڑے تھے۔ داراشکوہ نے کافر راجپوتوں سے مذاکرات شروع کر دیے تھے کہ وہ اسے ہندوستان کا بادشاہ بننے میں مدد دیں۔

وہ اس معاملے پر کئی دن تک غور وفکر کرتے رہے۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے بھائی اس طرح کا رویہ بھی اپنا سکتے ہیں۔ داراشکوہ کے ارادوں نے تو ہمیں سب سے زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ اگر وہ ہندوستان کا بادشاہ بن جاتا تو ہندوستان دارالاسلام نہ رہتا اور اس حوالے سے ہمارے مغل آباؤ اجداد اور ان سے پہلے کے افغان اور ترک بادشاہوں کی ساری کوششیں ملیامیٹ ہو جاتیں۔

ایک اور معاملہ بھی ایسا تھا جو ہمارے ذہن کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ یہ معاملہ تھا بھائیوں کی رقابت۔ ہم جانتے تھے کہ بادشاہت کسی رشتے کو خاطر میں نہیں لاتی۔ جو اتھاہ خلیج ایک بادشاہ اور اس کے بیٹوں میں حائل ہوتی ہے' اس پر محبت کا کوئی پل نہیں ہوتا۔ بیٹوں میں بھی محبت کا کوئی تعلق موجود نہیں ہوتا۔ ایک ہی باپ کی اولاد ہونے اور ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے کے باوجود جونہی وہ دنیا کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں' وہ جان لیتے ہیں کہ انہیں یا تو اپنے بھائیوں کو فنا کرنا ہوگا' یا وہ انہیں فنا کر دیں گے۔

چونکہ مغلوں کی سلطنت دنیا کے ہر دوسرے بادشاہ کی سلطنت سے زیادہ بڑی تھی اس لیے انہوں نے جانشینی کی جدوجہد میں شاہی خون بھی سب سے زیادہ بہایا۔

ہمارے عظیم جدامجد ظہیرالدین بابر نے 1526ء میں ہندوستان میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے دو بیٹے ہمایوں اور کامران ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اللہ نے تخت ہمایوں کو عطا کر دیا۔ اس نے اپنے بھائی کو اندھا کروا کے کہ بھجوا دیا۔ جب اکبر ہمایوں کے بعد تخت نشین ہوا تو اس نے کامران کے اکلوتے بیٹے کو قتل کروا دیا۔ اکبر کے اپنے بیٹے سلیم جہاں گیر نے باپ کے خلاف بغاوت کی۔ اسی طرح جہانگیر کا بیٹا خسرو اپنے باپ کا باغی تھا۔ جہانگیر نے اسے زندان میں ڈلوا دیا۔ ہمارے والد کو بھی اسی نوع کی مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔ جہانگیر نے داراشکوہ کو اور ہمیں یرغمال بنائے رکھا۔ جب اللہ نے ہندوستان کی سلطنت ہمارے والد محترم کو عطا فرمائی تو انہیں اپنے سگے بھائیوں داور بخش اور شہریار کو ان کی بیویوں بچوں سمیت قتل کروانا پڑا۔ یرمیاہ نبی نے درست کہا تھا: ''باپ ترش انگور کھا چکے ہیں جبکہ اولاد کے دانت تیز ہیں۔''

ہم چاروں میں سے صرف ایک بھائی تخت طاؤس پر بیٹھ سکتا تھا' باقی تین کے لیے اسے موت کا تختہ بننا تھا۔ ہندوی میں اس کے لیے ایک جملہ استعمال ہوتا ہے: تاج یا تختۂ سلطنت ایک نیام کی طرح ہوتی ہے' جس میں ایک وقت میں صرف ایک تلوار ہی رہ سکتی ہے۔

ہندوستان کا بادشاہ بننے کا خبط داراشکوہ کے ذہن پر بری طرح چھا چکا تھا۔ اس کے خبط کو بڑھاوا دیا تھا سرمد نامی ایک ڈھونگی نے' جو کہ صرف ململ کی لنگی سے ستر ڈھانپے دلی کی گلیوں میں نیم عریاں پھرتا رہتا تھا۔ سرمد نے اعلان کیا تھا کہ دارا ہندوستان کا بادشاہ بنے گا۔

اللہ' جو کہ ہمارے دلوں کے سب رازوں سے آگاہ ہے' جانتا تھا کہ جب ہم نے آگرہ پر چڑھائی میں مدد دینے کی مراد کی درخواست کا جواب دیا تو ہمیں بادشاہ بننے کا خیال تک نہیں تھا۔ ہمارا واحد مقصد سلطنت کو داراشکوہ جیسے اسلام دشمن کے ہاتھوں میں جانے سے بچانا تھا۔

جلد ہی ہمارے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ کافر راجپوت داراشکوہ کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے۔ اس کے بیٹے سلیمان شکوہ اور راجپوت جے سنگھ نے بنارس کے قریب شجاع کو شکست دے دی۔ اس نے جودھ پور کے راجپوت جسونت سنگھ کو ہمارے اور مراد کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجا۔ ہم نے اس کی فوج کو شکست دے دی اور اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ داراشکوہ سے ہماری مڈبھیڑ ساموگڑھ میں ہوئی' جو کہ آگرہ سے دس میل دور ہے۔ ہمیں دوبارہ فتح نصیب ہوئی۔ ہماری تلوار نے فتح کا تاج پھر پہنا۔ ہم نے فتوحات عطا کرنے والے اللہ کا شکر ادا کیا جبکہ مراد اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق انگور کی بیٹی کو بستر میں لے گیا اور کئی روز تک دھت رہا۔

فتح حاصل کرنے کے باوجود ہم نے اپنے والد محترم کو نہایت مؤدبانہ الفاظ میں خط لکھا: ''جب تک اقتدار آپ کے ہاتھ میں ہے' آپ کی اطاعت میرا فرض ہے اور میں ہمیشہ اپنی اوقات میں رہوں گا۔ اللہ' جو کہ سب جانتا ہے' میرا گواہ ہے۔ تاہم شہنشاہِ معظم کی علالت کے باعث شہزادہ داراشکوہ نے اقتدار ہتھیا لیا اور ہندوؤں اور بت پرستوں کے مذہب کو ترویج دینے لگا۔ اس نے سلطنت میں انتشار اور افراط و تفریط پھیلا دی۔ چنانچہ میں برہان پور سے اس لیے نکلا کہ اس بدنظمی کو دور نہ کرنے پر اگلے جہان میں ذمہ دار نہ ٹھہرا لیا جاؤں۔''

ہماری فاتح افواج آگرہ پہنچیں۔ دارا فرار ہو گیا۔ تب جہاں آرا بیگم نے ہمیں ایک احتجاجی مراسلہ بھیجا۔ اس نے لکھا تھا: ''آپ کی فوجی پیش قدمی اپنے والد محترم کے خلاف جنگی اقدام ہے۔ اگرچہ یہ پیش قدمی دارا کے خلاف کی گئی ہے' تاہم یہ بھی گناہ سے کم نہیں ہے' کیونکہ بڑا بھائی قانون اور روایات' ہر دو اعتبار سے' باپ کی جگہ ہوتا ہے۔''

ہم نے سوچا کہ جھوٹ کے سانپ کا سر سچ کی لاٹھی سے کچلنے کے لیے موزوں وقت ہے۔ ہم نے جوابی خط میں لکھا: ''دارا اپنے چھوٹے بھائیوں کو برباد کرنے کے

لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ تم دیکھو کہ اس نے شجاع کو کس طرح کچل دیا ہے۔ وہ ہمارے خلاف شہنشاہ کے کانوں میں زہر انڈیلتا رہا ہے۔"

شہنشاہِ معظم بوڑھے اور بیمار ہونے کے باوجود ہمارے خلاف سازش کا جال بنتے رہے۔ انہوں نے ہمیں تحائف بھیجے جن میں "عالمگیر" نامی مشہور تلوار بھی شامل تھی۔ انہوں نے ہمیں قلعے میں آ کر ملنے کی دعوت دی۔ انہوں نے ہماری نیکی و پرہیزگاری کو سراہا اور ہمیں نہایت اعلیٰ خطابات سے نوازا۔ دوسری طرف ہمارے مخبروں نے ہمیں خبردار کیا کہ اس امر کی تیاریاں ہو رہی ہیں کہ جونہی ہم محل میں قدم رکھیں حرم کی عورتیں ہمیں قتل کر دیں۔ ہم نے خود کو اس دام میں گرفتار نہیں ہونے دیا اور دریا سے قلعے کو جانے والی نہر کو بند کروا دیا۔

اگلے خط میں شہنشاہِ معظم نے ہم سے رحم کی درخواست کی: "اللہ کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا ہے' سو میں قسمت کی نامہربانی کا شکوہ کیوں کروں؟ ابھی کل کی بات ہے کہ میں نو لاکھ سپاہیوں پر مشتمل لشکر کا سالار تھا اور آج میں پانی کے ایک گھڑے کو ترس رہا ہوں! ہندوؤں کی تعریف کی جانی چاہیے کہ جو اپنے مرے ہوؤں کو بھی پانی پیش کرتے ہیں جبکہ میرے راسخ العقیدہ مسلمان بیٹے نے میرا پانی بند کر دیا ہے!"

ہم نے شہنشاہِ معظم کے لیے پانی کی فراہمی کا حکم صادر کیا لیکن اپنے تحفظ کی ضمانت کے بغیر ملاقات سے انکار کر دیا۔ 8 جون 1658ء کو لال قلعے کے دروازے ہم پر کھول دیے گئے۔ ہم نے شہنشاہِ معظم اور جہاں آرا باتو سے اپنے خدام سمیت محل میں منتقل ہو جانے کی درخواست کی اور اپنے بااعتماد خواجہ سرا اعتبار خان کو حکم دیا کہ وہ ہماری چہیتی بہن روشن آرا بیگم کے علاوہ کسی اور کو ہم سے ملنے نہ دے۔ روشن آرا بیگم کو کسی بھی وقت ہم سے ملاقات کی اجازت تھی۔

پھر ہم نے دارا شکوہ کے تعاقب میں نکلنے کی ٹھانی' جو کہ دلی کو فرار ہو چکا تھا' تاہم ہمیں پہلے مراد سے نمٹنا پڑا۔ اللہ کی طرف سے ہمیں فتوحات ملنے کے بعد اس کا

ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اس کے خیموں میں ہر وقت ناچ گانا اور پینا پلانا جاری تھا۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی کہ اگر سلطنت کی باگ ڈور مراد کے ہاتھوں میں چلی گئی تو سلطنت بہت جلد تباہ و برباد ہو جائے گی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ مراد کو کسی ایسی جگہ جانے کی اجازت دے دی جائے گی کہ جہاں وہ اپنا مے نوشی کا شغل جاری رکھے اور سلطنت کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر اپنی دلی خواہشات پوری کرتا رہے۔

ہمیں یہ اطلاعات بھی ملیں کہ مراد نشے میں نہ صرف یہ دعوے کر رہا ہے کہ اللہ نے جو فتوحات ہمیں عطا کی تھیں' وہ اس نے حاصل کی ہیں بلکہ اس نے اپنے شراب نوش ساتھیوں سے یہ بھی کہا ہے کہ دارا اور شجاع سے نمٹنے کے بعد وہ ہماری طرف توجہ دے گا۔ اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم آج کے بعد سے مراد کی محبت کے اظہار پر توجہ نہیں دیں گے اور اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے۔

ہم ہندوؤں کے مقدس شہر متھرا میں مراد کے منتظر تھے۔ جب وہ آیا تو ہم نے اسے اپنے خیمے میں بلایا۔ ہم نے اسے اپنے ہاتھ سے شراب کا جام پیش کیا حالانکہ ایک نیک مسلمان کی حیثیت سے شراب ہم پر حرام تھی۔ مراد نے کئی جام پیے۔ ہماری کنیزیں اس کے مخمور جسم کے اعضا کو دباتی رہیں۔ انہوں نے اس کے سارے ہتھیار الگ کر دیے۔ جب ہم نے اشارہ کیا تو کنیزوں نے اس کے ہاتھوں پیروں میں سنہری زنجیریں ڈال دیں۔ ہم نے حکم دیا کہ اسے تاحیات وافر شراب اور افیون فراہم کی جائے۔ اس کے بعد ہم لشکر سمیت آگے روانہ ہو گئے۔ ہم نے دلی پہنچ کر شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس سے پہلے کہ ہماری فاتح افواج سارے ملک کو ہمارے قدموں میں ڈال دیں' دارا فرار ہو گیا۔ اپنے والدِ محترم کے بہت بوڑھے اور بہت بیمار ہو جانے نیز اپنے بھائیوں کی نااہلی کی وجہ سے ہمیں مجبوراً اپنی گوشہ نشینی کی دلی خواہشات کے برعکس ملک کی حکومت سنبھالنا پڑی اور کانٹوں کا وہ تاج پہننے پر مجبور ہونا پڑا' جو کہ بادشاہوں کے

سروں پر سجا ہوتا ہے۔ ہم نے نجومیوں کے مشورے سے 21 جولائی 1658ء کو تاج پہنا۔ ہمیں ایران' بخارا' مکہ اور حبشہ جیسے دور دراز علاقوں کے بادشاہوں نے مبارک باد بھیجی۔

ہمیں اپنے پہلو سے دارا کا کانٹا نکالنے میں ایک سال اور لگ گیا۔ ہماری فوجیں پنجاب' راجستھان' گجرات اور سیورائے تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ وہاں معرکہ ہوا' جس میں دارا کو شکست فاش ہوئی۔ دارا افغانستان فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار ہوا۔ ہمیں ہندوستان کا بادشاہ بنے ہوئے سال بھی نہیں پورا ہوا تھا کہ دارا کو گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا گیا۔ ہمارا شاہی خدمت گار ملک جیون اسے ہمارے سامنے لے کر آیا۔ اس کے ہمراہ اس کے بیٹے اور خدام تھے۔ ان سب کو زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا۔ ہم نے علما سے مشورہ لیا۔ انہوں نے بیک زبان کہا: ازروئے شریعت کفر کی سزا موت ہے۔ ہماری چہیتی بہن روشن آرا نے بھی' جو کہ دارا کی بھی سگی بہن تھی' یہی مشورہ دیا۔ داراشکوہ نے ہم سے معافی کی استدعا کی۔

اس نے اپنی درخواست میں لکھا: "میرے بھائی اور میرے بادشاہ! آپ عظیم المرتبہ انسان ہیں۔ مجھے سزا دینا آپ کی کشادہ ظرفی کے منافی ہے۔ مجھے ایک گھر اور میری ضروریات پوری کرنے کے لیے میرے سابقہ خدام میں سے ایک کنیز دے دی جائے۔ میں اپنی باقی ساری عمر یاد الٰہی میں گزار دوں گا۔"

ہم داراشکوہ کے ساتھ تصادم نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے اس کی معافی کی درخواست کے آخر میں عربی میں ایک جملہ لکھا: "تم نے حکومت پر قبضہ کیا تھا' تم باغی ہو۔"

داراشکوہ کے انجام کی خبر ملنے پر دلی کے گمراہ شہری جذباتی ہو گئے۔ وہ اس سے ہمدردی کے اظہار میں گریہ و زاری کرنے لگے۔ انہوں نے اسے انصاف تک لانے والے ملک جیون پر پیشاب اور فضلہ پھینکا۔ اگرچہ ہمارا دل غم سے ایک بار پھر بھاری ہو رہا تھا لیکن ہم نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ بادشاہت کسی رشتہ داری کو خاطر میں نہیں لاتی اور سزائے موت کے حکم نامے پر دستخط ثبت کر دیئے۔ اسے اس کے بیٹے

سپہر شکوہ سے جدا کر کے 30 اگست 1659ء کی شام سزائے موت دے دی گئی۔ اس کا قطع شدہ سر ہمارے ملاحظے کے لیے لال قلعے میں لایا گیا۔ اس کا بے سر لاشہ ہمارے جدِ امجد ہمایوں کے مقبرے میں دفنانے سے پہلے دلی کی گلیوں میں پھرایا گیا۔

دارا کا بیٹا سلیمان شکوہ بھی' جو کہ پہاڑوں کی طرف فرار ہو گیا' پکڑا گیا۔ اسے بھی زنجیروں میں جکڑ کر دلی لایا گیا۔ 5 جنوری 1661ء کو اسے دیوانِ خاص میں ہماری خدمت میں پیش کیا گیا۔ ہم نے اسے کئی سال سے نہیں دیکھا۔ اس کی مردانہ وجاہت دیکھ کر ہم مبہوت ہو کر رہ گئے تھے۔ ہمیں اپنے آپ کو یاد دلانا پڑا کہ ممکن ہے سانپ کی کھال خوبصورت ہو' تاہم اس کے اندر مہلک زہر ہوتا ہے۔ ہم نے اسے بتایا کہ اس نے اور اس کے باپ نے کتنے بڑے جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ہم نے حکم دیا کہ اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔ بعد ازاں اسے وہیں سزائے موت دے دی گئی۔

اس کے بعد ہمیں دارا شکوہ کے بادشاہ بننے کی جھوٹی پیش گوئیاں کرنے والے فریبی سرمد سے نمٹنا پڑا۔ وہ نہ صرف عورتوں اور مردوں کے سامنے عریاں حالت میں پھرتا رہتا تھا بلکہ ایک ہندو لڑکے کے ساتھ اس کے عشق کی داستانیں بھی عام تھیں۔ اگرچہ وہ مسلمان تھا لیکن ہمیں بتایا گیا کہ وہ پیغمبرؐ اسلام کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ ہم نے اسے اپنے حضور بلایا اور اس سے اس کی پیش گوئی کے حوالے سے پوچھا۔ اس بدمعاش نے جواب دیا: ''خدا نے اسے ابدی بادشاہت عطا کر دی ہے!''

پھر ہم نے پوچھا: کیا یہ سچ ہے کہ وہ آدھا کلمہ پڑھتا ہے — لا الٰہ الا اللہ — اور محمد الرسول اللہ نہیں پڑھتا۔ اس نے مکاری کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا: ''میں نفی کی منزل پر ہوں اور ابھی تک اثبات کی منزل پر نہیں پہنچا۔''

جب اس سے اس کی عریانیت کے بارے میں پوچھا گیا تو اس ملعون نے کہا کہ پیغمبر عیسیٰؑ بھی عریاں رہا کرتے تھے۔

ہم نے حکم دیا کہ بادشاہی مسجد کے سامنے عوام کی موجودگی میں اس کا سر قلم

کر دیا جائے۔ ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ اس کے کٹے ہوئے سر نے پورا کلمہ پڑھا تھا۔

ہمارے والد آگرہ میں تھے' اس لیے ہم نے وہاں سے دور رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے دیوانِ خاص کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کروائی تا کہ ہم بادشاہوں کے لیے کھینچے جانے والے پردے کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کی نماز میں خلل ڈالنے سے بچ سکیں۔ اس مسجد کے مکمل ہونے میں پانچ سال کا عرصہ لگا۔ ہم نے اس کا نام ''موتی مسجد'' رکھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ کسی درخشاں موتی کے جیسے تھی۔ ہم اس مسجد میں گھنٹوں عبادت کیا اور تسبیح پڑھا کرتے تھے۔

ہماری لوحِ تقدیر پر اپنے والد کو دیکھنا نہیں لکھا تھا۔ وہ کئی ماہ تک ہمیں خط بھیجتے رہے' جن میں شکوہ کیا گیا ہوتا تھا کہ ہم ان کے ساتھ ایک بیٹے جیسا سلوک نہیں کر رہے اور یہ کہ ہم نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ہم نے سوچا کہ تلخ حقیقت بیان کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ ہمارے والد اپنی عمر رسیدگی کے باوجود شراب اور شباب سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہم نے انہیں لکھا: ''بادشاہت کا مطلب سلطنت کا تحفظ اور عوام کی سرپرستی ہے' جسمانی لذات کا حصول یا شہوت اور ہوس کی تسکین نہیں۔''

ہم نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ انہوں نے تخت نشینی کے وقت اپنے اعزا کے ساتھ کیا کیا تھا۔ ہم نے کہا کہ انہیں زیب نہیں دیتا کہ وہ ہم پر انگلی اٹھائیں اور ہمیں خدا کے غضب سے ڈرائیں۔ ہم نے اس بے مقصد مکالمے کو ختم کرنے کے ارادے سے خط کے آخر میں لکھا تھا: ''اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو میں یہ فتوحات کیوں حاصل کرتا' جو کہ خدا کے بخشے ہوئے تحفے ہیں۔''

جنوری 1666ء میں ہمارے والد بیمار ہو گئے۔ ان کی خواہش پر ان کا بستر ''یاسمین مینار'' میں لگا دیا گیا' جہاں سے وہ تاج محل کا نظارہ کر سکتے تھے۔ 2 جنوری 1666ء کی شام وہ خدا کو یاد کرتے ہوئے اس جہانِ فانی سے جنت کو چلے گئے۔

حکومت کے ضروری امور کی وجہ سے ہم دو ہفتے دلی ہی رہے۔ پھر جونہی ہمیں فراغت ملی ہم آگرہ پہنچے اور اپنے والدین کی مقدس قبروں پر جا کر روئے۔ ہم اپنے والد کے جنت مکانی ہو جانے کے دو سال بعد تختِ طاؤس پر بیٹھے۔ پھر ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں اس مشن کو پورا کرنا چاہیے جو اللہ نے ہمیں سونپا ہے۔ ہم نے اپنے کمان داروں میر جملہ' شائستہ خان اور دیگر کو حکم دیا کہ اسلامی سلطنت کی حدیں ہندوستان کے دورافتادہ گوشوں تک وسیع کر دی جائیں۔ ہماری فاتح افواج مشرق میں چٹ گاؤں' شمال میں تبت کے پہاڑوں' مغرب میں کابل کے پرے اور جنوب میں کرناٹک کے پرے تک پہنچ گئیں۔ خود ہم نے جاٹوں' راجپوتوں' ست نامیوں اور نانک پرستھوں کا قلع قمع کر دیا' جنہوں نے ہمارے خلاف سر اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ ہم نے شرپسند مرہٹوں کے علاقے تاخت و تاراج کیے اور ان کے سردار شیواجی کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ ہم نے بت پرستی کے مراکز کو منہدم کروا دیا۔

ہم نے نئی مساجد تعمیر کروائیں۔ ہم نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا' تاکہ وہ درست راستے پر گامزن رہیں۔ ہم نے ہر کام شریعت کی رہنمائی میں کیا۔ ہم نے شراب کشید کرنے پر پابندی لگا دی اور شراب پینے والوں کو کڑی سزائیں دیں۔ مشہور تھا کہ جب ہم تخت نشیں ہوئے تھے تب پورے ہندوستان میں صرف دو اشخاص شراب نہیں پیتے تھے۔

ایک ہم اور دوسرا قاضی القضاۃ۔ چونکہ شراب اور رقص و نغمہ لازم و ملزوم ہیں' اس لیے ہم نے ان پر بھی پابندی عائد کر دی۔ ہم نے طوائفوں اور ناچنے والیوں کو مجبور کیا کہ وہ یا تو شادیاں کر لیں یا پھر ہماری سلطنت سے نکل جائیں۔ ایک مرتبہ ہم جمعے کی نماز پڑھنے جا رہے تھے کہ موسیقاروں اور گلوکاروں نے ہمیں دکھانے کے لیے موسیقی اور رقص کا مصنوعی جنازہ نکالا۔ ہم نے انہیں کہا کہ ان لاشوں کو اتنا گہرا دفنانا کہ یہ دوبارہ کبھی نہ ابھر سکیں۔ ہماری مسلمان رعایا ہمارے احکامات سے خوش تھی۔ ہمیں "زندہ

پیر" کا خطاب دیا گیا۔

ہم نے کافروں کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی جنگ چھیڑی ہوئی تھی۔ جہاں کہیں کفر کے سانپ نے سر اٹھایا ہم نے اسے اپنے پیروں تلے کچل ڈالا۔ بعد کے بیشتر برس ہم دکن میں شیواجی کے چوہوں سے نبرد آزما رہے۔ ہم نے اس کے بیٹے سمبھا کو گرفتار کر کے سزائے موت دے دی۔ تاہم ہم نے جان لیا تھا کہ ہماری زندگی میں اس سرزمین سے کفر ختم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم نے اپنے بیٹوں کو ہدایت کی کہ وہ یہ مقدس ذمہ داری پوری کریں۔ دوسرے بادشاہ سلطنت کے خزانے کو ذاتی خزانہ سمجھ کر فضول خرچیوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ سلطنت کا خزانہ عورتوں' شراب' ہیرے جواہرات اور یادگاروں پر لٹا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم سمجھتے تھے کہ خدا نے ہمیں عوام کی بہبود کے لیے اس خزانے کا نگران مقرر کیا ہے۔

ہم اپنی گزر اوقات کے لیے نمازیوں کی ٹوپیاں سیا اور قرآن پاک کی کتابت کیا کرتے تھے۔ ہم انہیں فروخت کر کے اپنی نجی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ہماری سلطنت جتنی وسیع و عریض سلطنت پر حکومت کرنے والے کتنے بادشاہ ایسے ہیں جو ہماری طرح درویشوں جیسی زندگی گزارنے کا دعویٰ کر سکتے ہوں؟

دنیا میں صرف ہماری تین بہنیں رہ گئی تھیں۔ روشن آرا' جو کہ ہمیں سب سے زیادہ عزیز تھی' بعدازاں ہماری خواہشات سے اغماض برتنے لگی اور اجنبیوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے لگی۔ اس سے قبل کہ ہم اس کی بھرپور سرزنش کریں' اللہ نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی اپنے مقبرے کا نمونہ تیار کر لیا تھا۔ وہ اپنی شامیں زیادہ تر باغ میں گزارا کرتی تھی۔ اس نے باغ میں بہنے والی نہروں اور تالابوں کے اردگرد خوش بودار پھولوں والے بے شمار پودے لگوائے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے مقبرے کی چھت نہ ہو' بلکہ اوپر کھلا آسمان ہو' تاکہ شبنم اور بارش' جنہیں اللہ بھیجتا ہے' اس کی قبر کو تازگی عطا کریں۔ ہم نے اس کی خواہشات کو پورا کر دیا۔

ہم نے جہاں آرا بیگم سے استدعا کی کہ وہ لوگ جو ہمارے درمیان آ گئے تھے اب موجود نہیں رہے اس لیے اب وہ ہمارے لیے اسی محبت اور ہمدردی کا اظہار کرے جو کہ ایک بھائی کے لیے بڑی بہن پر فرض ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی تخت نشینی کے یادگاری جلسے میں اسے سونے کے ایک لاکھ سکے تحفے میں دیئے۔ ہم نے اس کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار روپے وظیفہ مقرر کیا اور ''بادشاہ بیگم'' کا خطاب دیا۔ وہ ہماری تنہائی دور کرنے پر راضی ہوگئی اور ہمیں مشوروں سے نوازنے لگی۔

جب اللہ نے اسے بلا لیا تو ہم نے حکم دیا کہ تمام تاریخی دستاویزات میں اس کا تذکرہ ''صاحبۃ الزمانی'' کے خطاب سے کیا جائے' کیونکہ وہ حقیقتاً زمانے کی حاکم تھی۔ ہم نے اس کی خواہشات کے مطابق اسے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے قریب دفنایا۔ ہم نے اس کی قبر کے کتبے پر اسی کا کہا ہوا فارسی شعر کندہ کرایا:

''میری قبر پر گھاس کو اگنے دو
کیونکہ گھاس ہی کمزوروں کا بہترین پردہ ہے۔''

1706ء کے موسم بہار میں' کہ جب ہمارے بہن بھائیوں میں سے زندہ رہنے والی ہماری آخری بہن گوہر آرا بیگم کو اللہ نے بلا لیا تھا' ہم نے جان لیا کہ اب ہمارا بھی اپنی جائے نماز تہہ کر لینے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم احمد نگر میں تھے کہ جب ہماری صحت بگڑنا شروع ہوئی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں احمد نگر ہی کو اپنا آخری مستقر بنانا چاہیے۔ ہماری چہیتی بیٹی زینت النساء' جسے اللہ نے پرہیزگار و متقی بنایا تھا (اور اس نے اس کا اظہار دلی میں ایک وسیع و عریض مسجد بنوا کر کیا تھا) اور ہماری بوڑھی بیوی اودے پوری بیگم ہماری ضروریات کا خیال رکھتی تھیں۔

ایک سو حکیم ہماری دیکھ بھال پر مامور تھے۔ وہ ہر روز ہماری نبض کا معائنہ کرتے تھے تاہم فانی انسان اور ادویات و علاج اللہ کی مرضی کے خلاف کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ہم اپنا وقت یوں گزارنے لگے کہ اپنی نناوے سالہ زندگی میں کیے گئے کاموں کا

جائزہ لیتے نیز یوم حشر خود کو ملنے والی جزا و سزا کا اندازہ لگاتے رہتے۔

ہمیں جو بات سب سے زیادہ دکھ دیتی تھی' وہ یہ تھی کہ ہمارا سگا بیٹا ہم سے غداری کی راہ پر گامزن ہو چلا تھا۔ پہلے محمد سلطان نے ہمارے خلاف اپنے چچا شجاع کا ساتھ دے کر اپنے چہرے پر کالک ملی تھی اور اب اکبر کافروں سے جا ملا تھا۔ اعظم' جس سے ہم نے دارا کی بیٹی کی شادی کروائی تھی' ایک فضول سا شیخی خورہ نکلا تھا۔ اسے شراب سے دور رکھنے اور غصے پر قابو پانا سکھانے کے لیے اسے ایک سال تک زنداں میں رکھنا پڑا تھا۔ ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا کام بخش تھا۔ اس میں تو حکمرانی کی خواہش تھی اور نہ ہی اہلیت۔ تاہم اپنی اولاد کی کسی تحقیر سے ہمیں اتنا اثر نہیں ہوا تھا جتنا کہ اپنی بیٹی زیب النساء کے رویے سے ہوا۔

اللہ نے زیب النساء کو شاعری کی نعمت عطا کی تھی۔ (وہ "مخفی" کے قلمی نام سے شعر کہا کرتی تھی)۔ اس نے اپنے بھائی اکبر کو شہہ دی کہ وہ ہمارے خلاف بغاوت کرے۔ ہم نے بھاری دل کے ساتھ حکم جاری کیا کہ اسے سالم گڑھ کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔ اس نے ہمیں اپنے آخری زہریلے تیر سے یوں نشانہ بنایا:

"میں نے اس سرزمین ہند پر ایسی سفاکی اور درشتی کا تجربہ کیا ہے
کہ میں کسی دوسرے ملک میں جا بسوں گی۔"

یہ شعر کہنے کے بعد وہ جہانِ مرگ میں چلی گئی۔

ہمیں اپنے سب سے بڑے بیٹے معظم پر بہت اعتماد تھا۔ لیکن اس نے بھی بیجاپور اور گولکنڈہ کی ہماری مہمات کے دوران ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اور دشمن سے سمجھوتہ کر لیا۔ ہم نے اپنی محبت کو انصاف کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا اور اسے زنداں میں ڈال دیا۔

ہم نے پابندی لگا دی کہ وہ نہ تو اپنے بال کاٹے گا اور نہ ہی ناخن نیز وہ پانی کے علاوہ کوئی شے نہیں پیئے گا۔ ہم نے اسے پورے سات سال تک قید میں رکھا۔

1705ء کا موسم گرما آ گیا۔ ہم دیوپور میں دریائے کرشنا کے کنارے خیمہ زن تھے کہ ہمیں شدید بخار ہو گیا۔ سرسام کی حالت میں ہم نے شیخ گنجا کی رباعی پڑھی:

"جب تم 80 یا اس سے زیادہ عمر کے ہو جاتے ہو تو
تمہارے لیے وقت اور قسمت خوب ہوتے ہیں۔
لیکن اگر تم سو سال تک جی لو تو تمہاری زندگی
سراسر موت بن جاتی ہے۔"

ہماری تیمارداری کرنے والے ایک نواب نے آخری مصرعے پر اضافہ کرتے ہوئے کہا:

"ایسی حالت میں دل کو سنبھالو، یاد رکھو! اللہ کی یاد
بجھتے شعلوں کو فروزاں کر دیتی ہے۔"

ہمارا دنیا میں زیادہ عرصہ رہنے کا ارادہ نہیں تھا جبکہ ہمیں نڈھال کر دینے والے مسلسل بخاروں نے تصدیق کر دی کہ اللہ کی طرف سے بلاوا آ چکا ہے۔ ہم نے بخار کی حالت میں ایک شعر کہا، جس کا مفہوم یوں تھا:

"دنیا کی حالت ایک لمحے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔"

ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے غلط کار بیٹوں کو نصیحت کی جائے۔ ہم نے اعظم کو لکھا، "میں اکیلا آیا تھا اور اجنبیوں کی طرح جا رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں، نہ ہی میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے۔ اقتدار کا ہر لمحہ اپنے پیچھے غم و اندوہ چھوڑ جاتا ہے۔ میں سلطنت کا محافظ اور سرپرست نہیں رہا ہوں۔ بیش قدر زندگی بے کار گزر گئی۔ خدا میرے دل میں رہتا تھا، لیکن میں اسے نہیں دیکھ سکا۔ زندگی عارضی ہے، ماضی جا چکا ہے اور مستقبل کی کوئی امید نہیں۔ مجھے اپنی نجات کی فکر ہے۔ میں اپنے کیے کی سزا سے ڈرتا ہوں۔ خدا کی رحمت پر میرا ایمان ہے لیکن میں اپنے اعمال کی وجہ سے ڈر رہا ہوں۔"

اور کام بخش کو میں نے لکھا: ''اے میری جان! میں تنہا جا رہا ہوں۔ مجھے تمہاری بے بسی کا غم کھائے جا رہا ہے' لیکن اس کا کیا فائدہ؟ میں نے جو گناہ کیے ان کا نتیجہ مجھے ملنے والا ہے۔ حیرت کی بات ہے' میں دنیا میں خالی ہاتھ آیا تھا اور خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ البتہ میں گناہوں کا بوجھ ساتھ لیے جا رہا ہوں! میں جدھر دیکھتا ہوں' مجھے خدا نظر آتا ہے۔ میں نے بہت خوفناک گناہ کیے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا سزا ملنے والی ہے۔''

یہ الفاظ ایک ایسے بوڑھے شخص کے نہیں ہیں جو اپنی موت کو نزدیک پا کر خوفزدہ ہو بلکہ وہ تو اس لیے خوفزدہ تھا کہ اس نے زندگی میں خود کو سونپا گیا مشن پورا نہیں کیا تھا۔ ہم نے سارے ہندوستان میں کافر مرہٹوں' راجپوتوں' جاٹوں اور سکھوں کو مسلح سرکشی کرتے دیکھا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ہماری اولاد ذہن اور مقاصد کے اعتبار سے کتنی کمزور ہے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے جانے کے بعد بابر کی قائم کردہ مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہو جائے گی اور صرف فساد باقی رہ جائے گا: از ما ہمہ فساد باقی۔

ہم اپنے لیے آخری آرام گاہ کا انتخاب کر چکے تھے۔ ہم نے وصیت کی کہ ہمیں قلعہ دولت آباد میں صوفی شیخ زین الدین کے مزار کے احاطے میں سادہ سی قبر میں دفنایا جائے۔

ہم جانتے تھے کہ ہمارا انجام قریب ہے۔ ہمارے رفقا بھی جانتے تھے کہ الوداع کہنے کا وقت آ چکا ہے۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہم اپنے آخری وقت کو سکون سے گزارنے کے لیے ہاتھیوں اور ہیروں کو خیرات میں دینا پسند کریں گے۔ ہم بولنے سے قاصر تھے۔ ہم نے کاغذ پر لکھا کہ ایسے کام غیر اسلامی ہوتے ہیں: ''تم جو کچھ چاہو خزانے سے لے کر غریبوں میں بانٹ دو۔ میرا مقبرہ نہ بنانا۔ میرا جنازہ فوراً اٹھانا اور میری لاش کو سادہ کفن پہنانا۔''

بھاگ متی

میں ساری زندگی بھوتوں سے دوچار رہا ہوں۔ چونکہ دلی میں دنیا کے ہر شہر سے زیادہ بھوت ہیں' اس لیے دلی میں زندگی بسر کرنا کسی ڈراؤنے خواب میں جینے کے مترادف ہے۔ میں نے نہ تو کبھی کوئی بھوت دیکھا تھا اور نہ ہی میں ان پر یقین رکھتا تھا۔ تاہم میں سمجھتا تھا کہ وہ حقیقتاً ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے اس خوف پر حاوی ہونے کی بہت کوششیں کی تھیں۔ اس کوشش میں مَیں مرنے والے لوگوں کے قریب رہا۔ میں شمشان گھاٹوں اور قبرستانوں میں چلا جایا کرتا تھا۔ تاہم اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ میرا خوف تھوڑی مدت کے لیے ختم ہوا کرتا تھا۔ پھر دروازے خود بخود کھلنے لگتے' پردے ہوا کے بغیر ہلنے لگتے اور میں محسوس کرتا کہ میرے گرد مرے ہوئے لوگ موجود ہیں۔ بھاگ متی وہ واحد ہستی تھی' جس کے سامنے میں نے اپنے اس خوف کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھوتوں پر یقین رکھتی تھی۔ اس نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے تو میرا مذاق اڑایا اور مجھے ''بچہ'' قرار دیا۔ وہ بولی: ''جب میں مروں گی تو تمہارے ساتھ لیٹ جاؤں گی۔ تب تم اس بچگانہ خوف سے آزاد ہو جاؤ گے۔

تاہم اگر میں نے تمہیں کسی کے ساتھ جنسی عمل کرتے ہوئے پکڑ لیا تو میں تمہیں ایک رات بھی سونے نہیں دوں گی۔" (اس نے بریگیڈیئر کی بیوی کملا کے ساتھ ہم بستری کرنے پر ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا تھا۔ تاہم کملا اب اپنے خاوند اور بچوں سمیت وہاں چلی گئی تھی؛ جہاں اس کا خاوند متعین تھا۔ پس بھاگ متی مجھ سے زیادہ ناراض نہیں تھی)۔

بھوتوں سے میرا کئی بار سامنا ہوا تھا لیکن ایک واقعہ ایسا ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے فون پر بتایا گیا کہ میرا چچا بہت بیمار ہے اور مجھے میرا کے مرنے سے پہلے اس کے پاس پہنچنا چاہیے۔ میرا چچا کئی سال سے بستر مرگ پر تھا۔ دے نے اسے بڑی بڑی سلگتی ہوئی آنکھوں اور لمبی ڈاڑھی والا ڈھانچہ بنا دیا تھا۔ وہ طویل عرصے سے ایک زندہ بھوت بن چکا تھا اور کوئی شے مجھے کہتی تھی کہ مجھے اس کے بستر سے دور ہی رہنا چاہیے۔ تاہم موت اور لاشوں پر ہونے والی نوحہ گری سے میری سحرزدگی نے مجھے مجبور کر دیا اور میں اپنے چچا کے گھر پہنچ گیا۔ سارے رشتہ دار چچا کے بستر کے گرد بیٹھے تھے۔ کچھ پرارتھنا کر رہے تھے' کچھ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ ایک گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے ہوئے تھا جبکہ اس نے اپنا سر دونوں گھٹنوں کے بیچ رکھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بلغم سے بھرا اگال دان پکڑے اس کے بستر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کو کھانسی آنے لگی۔ ایک طویل' ختم نہ ہونے والی کھانسی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ اس کی بیوی نے اگال دان اس کی ٹھوڑی سے لگا دیا اور پیلا' پیپ جیسا بلغم اس کی ڈاڑھی پر بہتا ہوا اگال دان میں گرنے لگا۔ بیوی نے تولیے سے اس کی ڈاڑھی صاف کی اور اسے بتایا کہ میں اسے ملنے آیا ہوا ہوں۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر ٹکا دیں۔ ان آنکھوں میں پہچان لینے کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنا سر گھٹنوں کے بیچ رکھ دیا۔ ایک منٹ بعد وہ پہلو کے بل گر گیا۔ اس کی آنکھیں اور منہ کھلے ہوئے تھے۔ وہ مر گیا تھا۔

میری چچی دونوں ہاتھوں سے ماتھا پیٹنے اور رونے لگی' وہ روتے روتے کہہ رہی تھی: "ہائے لوکو! میں مر گئی! میں بیوہ ہو گئی!" اس نے چارپائی سے ٹکرا کر اپنی چوڑیاں توڑ دیں۔ سب اسے تسلی دلاسا دینے کے لیے اس کے قریب آ گئے۔ کسی نے مرحوم کی آنکھیں اور منہ بند کیے' ٹھوڑی کے گرد پٹی باندھی اور نتھنوں میں روئی ٹھونس دی۔ گریہ وزاری کچھ دیر جاری رہی۔ اس کے بعد پرارتھنا ہونے لگی: "بھگوان ایک ہے۔ وہ مطلق سچ ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆

وہ مون سون کا زمانہ تھا اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں اپنے اپارٹمنٹ میں تنہا سونے سے ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ بھاگ متی کہاں ہو گی' وگرنہ اسے قائل کرتا کہ وہ رات کو میرے ساتھ رہے۔ میں نے بدھ سنگھ سے کہا کہ وہ میرا بستر اپارٹمنٹ کے عقب میں لان میں لگا دے کیونکہ ایئر کنڈیشنر خراب ہے۔ اس لان سے دوسرے اپارٹمنٹس دکھائی دیتے تھے اور سرونٹ کوارٹروں سے آنے والی روشنیاں اور آوازیں حوصلہ بندھاتی تھیں۔ میں نے مچھر دانی لگائی اور اس کے جالی دار تحفظ میں سونے لیٹ گیا۔

ان سب اقدامات کے باوجود میں اپنی آنکھیں بند نہ کر سکا۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی لیکن اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا کہ جیسے مرحوم چچا کی آنکھیں مجھے تک رہی ہوں۔ ساری بتیاں ایک ایک کر کے بجھ گئیں۔ انسانی آوازوں کی جگہ بھیانک خاموشی نے لے لی۔ آسمان پر خاکستری چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ مجھے صبح دیکھا ہوا موت کا منظر دوبارہ نظر آیا۔ پھر مردہ زندہ ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ لان کے دوسری طرف سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اس نے مچھر دانی ہٹائی اور اپنا چہرہ میرے قریب لے آیا۔ میں خوف سے پتھر بن چکا تھا۔ میں بولنے سے بھی قاصر تھا۔ پھر اچانک میرے منہ سے ایک بلند چیخ نکلی۔ مردے نے میرا کندھا پکڑ کر

ہلاتے ہوئے کہا: ''واہ گرو! واہ گرو! یہ میں ہوں' بدھ سنگھ۔ بارش ہورہی ہے۔ میں آپ کا بستر اندر لے جاتا ہوں۔''

میں ٹھنڈے پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمسایوں کے اپارٹمنٹس کی بتیاں جل رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟''

بدھ سنگھ نے جواب دیا: ''کچھ نہیں! صاحب نے ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔''

میں نے اندر جا کر سارے کمروں کی بتیاں جلا دیں اور بدھ سنگھ سے جانے کو کہا۔ میں آرم چیئر میں بیٹھ کر اپنے آپ سے خاموش مکالمہ کرنے لگا۔ میں اپنے آپ کو احمق محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو گدھا ثابت کر دیا تھا۔ اب بدھ سنگھ سب کو بتائے گا کہ اس کا ساٹھ سالہ آقا بچوں کی طرح ڈر گیا تھا۔

میں نے اس احمقانہ' غیر منطقی خوف سے نکلنے کا عزم کیا۔ رات کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میں ٹراؤزر پہنے باہر نکلا اور پھوار میں بھیگتا ہوا ٹہلنے لگا۔ میں مردے کو پکڑنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میں سنسان سڑک پر چلتا ہوا لودھی پارک تک چلا گیا۔ اس پارک میں کئی مقبرے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں وہاں قبروں کے درمیان بیٹھ کر مرحومین کو ''ہیلو'' کہوں گا۔

پہلے میں نے محمد شاہ کو پکارا۔ وہ خاندانِ سادات کا تیسرا حکمران تھا۔ وہ 1444ء میں فوت ہوا تھا۔ اس کا مقبرہ بڑا اور ہشت پہلو تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ پارک لودھیوں کا ہے۔ وہ تو کچھ نہیں بولا تاہم مقبرے میں موجود چمگادڑوں نے جواب دیا: ''وہ یہاں پہلے آیا تھا۔ لودھی بعد میں آئے تھے۔ سکندر لودھی کا یہاں ہونے کا حق کم ہے کیونکہ اس نے دلی کی نسبت زیادہ وقت آگرے میں گزارا تھا۔''

میں بوندا باندی میں سکندر لودھی کی تعمیر کروائی ہوئی ''بارہ گنبدوں والی مسجد'' کی طرف چلا گیا۔ اس کا گنبد بہت خوبصورت ہے۔ میں نے مسجد کے گرد چکر لگایا اور

ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر بیٹھ کر شیش گنبد کو دیکھنے لگا۔ وہ وہاں سے چند میٹر دور تھا۔ اس کے اردگرد لگی ہوئیں رنگین ٹائلیں' جو کہ دن کی روشنی میں دکھائی دیتی تھیں' خاکستری چاندنی میں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے مسجد سے سکندر لودھی کے مزار تک دیکھا۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ اس کا مقبرہ اونچی دیواروں والے ایک مربع نما باغ کے اندر ہے۔ مجھے خود پر یقین نہیں آیا کہ میں رات کے وقت وہاں آ سکتا ہوں۔ اگر کسی بھوت نے واپسی میں مجھے روک لیا تو کیا ہوگا؟

میں سیڑھیاں چڑھا اور پھر اتر آیا۔ میں نے دو مرتبہ کوشش کی لیکن داخلی دروازے سے آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ میں خود کو دلاسا دینے کی بڑی کوشش کرتا رہا۔

مشرقی افق پر اجالا دکھائی دینے لگا تھا اور پرندوں کی چہچہاہٹ طلوع صبح کا اعلان کر رہی تھی۔ صبح کی سیر کرنے والے "اٹھ پلا برج" پر سے گزرنے لگے تھے۔ بارہ گنبد کے سامنے گھاس پر کچھ لوگ یوگا کر رہے تھے۔ زندہ دنیا جاگ چکی تھی اور مرحومین کی دنیا دن بھر کے لیے سو گئی تھی۔

نادر شاہ

یہ بہت سال پہلے کی بات ہے کہ جب ہم اپنے باپ کے مویشی چرایا، سوکھی روٹی کھایا اور زمین پر سویا کرتے تھے، تب ہم نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہم مچھیرے ہیں اور ایک ایسی مچھلی ہمارے جال میں پھنس گئی ہے، جس کے چار سینگ ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ مچھلی بادشاہت کی علامت ہوتی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ خالی پیٹ کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ شان وشوکت کے خواب دکھاتا ہے۔ ایک غلام رات کو حسیناؤں سے بھرے محل کے خواب دیکھتا ہے جبکہ دن میں بادشاہت کرنے والا شخص رات کو بغاوت اور قاتلانہ حملے کے ڈراؤنے خواب دیکھتا ہے۔ اللہ اسی طرح انصاف کرتا ہے۔ وہ جس شخص کو دن میں خوشیاں عطا کرتا ہے، اسے رات کو دکھ دیتا ہے اور وہ جس شخص کو طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک تکلیفیں دیتا ہے، اسے غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک راحتیں ہی راحتیں عطا کرتا ہے۔

وہ خواب میرے حافظے میں ہمیشہ محفوظ رہا۔ جب ہم اصفہان کے حاکم بنے تو ہم نے خوابوں کی تعبیر کا علم جاننے والے ایک بزرگ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔ اس بزرگ نے تصدیق کی کہ بلاشبہ مچھلی حکومت کی علامت ہے اور اس کے چار سینگ

چار مملکتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اللہ نے چار ملکوں پر حکومت کرنا ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ ہم اصفہان کے حکمران تھے اور ایران کے بادشاہ بن چکے تھے۔ جلد ہی افغانستان پر ہماری حکومت قائم ہو جاتا تھی اور پھر چوتھی سلطنت ہندوستان کے علاوہ اور کون سی ہو سکتی تھی؟

ہم نے قندھار کے محاصرے کے دوران دوسرا خواب دیکھا کہ حضرت علی المرتضیٰؓ ہم سے ملنے آئے ہیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ سے سب پر فتح پانے والی تلوار ذوالفقار ہماری کمر سے باندھی ہے۔ ہم اس خواب پر غور کرتے رہے۔ ہمیں یاد آیا کہ کسی نے ان سے پوچھا: ''مغرب مشرق سے کتنی دور ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''سورج کا ایک دن کا سفر ہے۔''

ہم نے اپنے آپ سے کہا: ''طہماس قلی خان! دلی کو جانے والا راستہ تمہیں اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ چند دنوں بعد ہمیں دلی آنے کا دعوت نامہ ملا۔ یہ دعوت نامہ اس زمانے کے مغل بادشاہ نصیر الدین محمد شاہ نے نہیں بلکہ اس کے دربار کے دو امرا آصف جاہ نظام الملک اور سعادت خان نے بھیجا تھا۔ آصف جاہ دکن کا گورنر تھا جبکہ سعادت خان دلی کے مشرق میں واقع ایک دکن جتنے ہی اہم صوبے اودھ کا گورنر تھا۔ وہ دعوت نامہ جس خفیہ انداز میں ہم تک پہنچایا گیا اور جس انداز میں اسے لکھا گیا تھا اس سے ہمیں علم ہو گیا کہ اس کے لکھنے والے الفاظ کو ایک سے زیادہ مفاہیم میں استعمال کرنے کے ہنر سے آشنا ہیں۔ ہم نے اپنے آپ سے کہا: ''نادر شاہ! تم انسانوں پر اتنے عرصے سے حکومت کر رہے ہو کہ دشمن کے ہاتھوں سانپوں کے سروں پر ضرب لگوانے کے ہنر سے آگاہ ہو چکے ہو!''

ہم نے ''دشمن'' کا لفظ مغل بادشاہ کے لیے استعمال کیا تھا کیونکہ وہ ہماری بری طرح بے عزتی کر چکا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ تجارتی تعلقات رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہمارے خطوں کے جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے دلی جانے

والے ہمارے قاصدوں کو قید کروا دیا تھا۔ نظام الملک اور سعادت خان کے لیے سانپ سے زیادہ موزوں خطاب اور کون سا ہو سکتا تھا؟ وہ اپنے آقا کا نمک کھا رہے تھے اور اس کو تخت سے ہٹانے کی سازشیں بھی کر رہے تھے۔ وہ زمین پر رینگنے والے ایسے سانپ ہی تو تھے جو سامنے آ جانے والے انسان کو ڈسنے پر ہمیشہ تیار ہوتے ہیں۔

ہم اہم معاملات میں کم رتبہ افراد کا مشورہ نہیں لیا کرتے تھے۔ ہم نے اس دعوت نامے کا جواب خود لکھا۔ ہم نے ایسا انداز اپنایا کہ نہ تو دعوت کو مسترد کیا اور نہ ہی قبول۔ ہم نے صرف دلی کے راستے میں درپیش ہونے والی مشکلات گنوا دیں۔ ہم نے لکھا کہ دلی آنے کے لیے ہمیں کوہ سلیمان اور کوہ ہندوکش کی گہری کھائیوں کو پار کرنا پڑے گا' ہمیں پٹھان جنگجو قبائل سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جبکہ کابل اور لاہور کے صوبے دار ہمارے حوالے سے بری رائے کے حامل ہیں۔ آخر میں ہم نے مغل بادشاہ کی طاقتور فوج کا حوالہ دیا تھا۔ ہمارے اس خط کے جواب سے ہمیں پتا چلتا کہ ہمیں دعوت دینے والے ہمیں اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں یا اپنے بادشاہ کے غلط رویے نے ان کی وفاداری کے چشمے کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ وہ ہمارے ہتھیار بن جائیں گے۔

ہمیں اپنے خط کے جواب کے لیے زیادہ عرصہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے نہ صرف خود ہماری مدد کرنے کا وعدہ کیا بلکہ دوسرے امرا کو بھیجے گئے اپنے خطوط کی نقول بھی بھیجیں جن میں ہمیں اپنا نجات دہندہ بیان کیا گیا تھا۔ انہوں نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ ان کا بادشاہ "نصیرالدین محمد شاہ سارا وقت شراب و شباب کی نذر کر دیتا ہے۔ مغلوں کے عظیم ورثے کو برباد کیا جا رہا ہے اور خدشہ ہے کہ سلطنت پر جلد ہی کافر مرہٹوں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

ہمیں دوسرے ذرائع سے بھی محمد شاہ کی رنگ رلیوں کی اطلاعات موصول ہو چکی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمیشہ اس کے ہاتھ میں شراب کا جام اور پہلو میں کوئی نہ

کوئی حسینہ ہوتی ہے۔ وہ ''رنگیلا'' کے نام سے مشہور تھا۔ اگرچہ وہ فارسی جانتا تھا لیکن اس نے شیخ سعدی کی اس نصیحت کو نظر انداز کر دیا تھا:

''اس جذبے کو اپنا دشمن جانو' جو کہ تمہاری رانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ تم جس کی خواہشات پوری کرتے ہو' وہ تمہاری اطاعت کرتا ہے لیکن اگر تم جذبے کی اطاعت کرو گے تو وہ تم پر ہمیشہ حکومت کرے گا۔''

ہم نے پہلے قندھار اور غزنی کو اور ان کے بعد کابل کو فتح کر لیا۔ افغانستان' جو نام کی حد تک مغلیہ سلطنت کا حصہ تھا' مکمل طور پر ہمارے قبضے میں آ چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ کو ان الفاظ میں مخاطب کرنا بہتر تصور کیا: ''شہنشاہِ معظم پر واضح ہو کہ ہم نے کابل پر قبضہ صرف اور صرف اسلام کی محبت اور آپ کی دوستی کے لیے کیا ہے۔ ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دکن کے کافر مرہٹے مسلمانوں کے کسی علاقے پر قابض ہوں۔ اٹک کے اس طرف ہماری موجودگی کا مقصد یہ ہے کہ جب مرہٹے دلی کی طرف پیش قدمی کریں تو ہم اپنے فتح مند قزلباشوں کی فوج بھیج کر انہیں جہنم میں بھیج دیں ...... تاریخ شاہد ہے کہ ایران کے بادشاہوں اور آپ کے آباؤ اجداد کے درمیان دوستی رہی ہے۔ ہم حضرت علی المرتضیٰؓ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ دوستی اور مذہب کے تحفظ کے علاوہ ہمیں کچھ مطلوب نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اس کے برعکس بھی تصور کر سکتے ہیں۔ ہم آپ کے عظیم گھرانے کے دوست تھے اور دوست رہیں گے۔''

محمد شاہ نے ہمارے خط کا جواب نہیں دیا۔ ہم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور اپنے آپ سے کہا: ''لیکن ہم ایک اسلامی سلطنت کو صرف اس وجہ سے کافروں کے قبضے میں نہیں جانے دیں گے کہ اس پر ایک نااہل شخص حکمران ہے۔''

ہم نے محمد شاہ کو دوسرا خط لکھا۔ اس خط میں ہم نے زیادہ صاف الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تا کہ اس احمق کی کھوپڑی میں کچھ سما جائے۔ ہم نے کہا کہ ہم خاندانِ مغلیہ

کی اصلاح اور ہندوستان پر اسلامی حکمرانی بحال کرنے کے لیے جلد ہی دلی آرہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہمارے اس کام کی قیمت چار کروڑ چاندی کے روپے اور چار شمالی صوبوں کا ایران میں انضمام ہوگی۔ سابقہ تجربے کے پیش نظر ہم نے خبردار کیا: ''ہمیں توقع ہے کہ اس خط کا جواب چالیس دن کے اندر اندر دیا جائے گا۔''

چالیس دن گزر گئے۔ پھر پورا سال گزر گیا۔ ہمیں نہ صرف اپنے خط کا جواب نہ ملا بلکہ ہمارے قاصد کو بھی دلی سے روانہ ہونے سے روکے رکھا گیا۔ ہم نے لشکر اکٹھا کرنے کا اعلان کیا۔ لوگ پروانہ وار ہماری فتح مند فوج میں شامل ہونے لگے۔ وہ سب لوگ اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہمارے لشکر میں قزلباش' ترک' ازبک' افغان' پٹھان اور بلوچ شامل ہورہے تھے۔ ہم نے انگلستان' فرانس اور اٹلی کے انجینئروں اور توپچیوں کو بھرتی کیا۔ جلد ہی ایک لاکھ پچیس ہزار افراد ہمارے لشکر میں بھرتی ہوگئے۔ 6 نومبر 1738ء کو ہم دلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ موسم سرما شروع ہو چکا تھا۔ ہم سخت ترین سردی میں وادیوں سے گزرے۔ کابل اور پنجاب کے درمیان میدانوں میں آباد فطرتاً لٹیرے لوگ اکثر ہمارا مال اسباب لوٹ لیتے تھے۔ ممکن تھا کہ ہمیں انہیں سبق سکھاتے لیکن ہندوستان کے معاملات کا تقاضا یہ تھا کہ ہم تیزی سے پیش قدمی کرتے رہیں۔

ہم خیبر کے مغربی سمت پہنچ گئے۔ ہم بتایا گیا کہ یہ درہ ایک طرح کا دام ہے اور پہاڑوں پر لٹیروں کے گروہ ہمیں اپنا شکار بنانے کے لیے اکٹھے ہو چکے ہیں۔ ہم نے مختصر عرصے کے لیے پڑاؤ ڈال دیا اور اپنے جوانوں کو مغرب کی نماز کے لیے اکٹھا کیا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہم نے کوچ کا حکم دیا۔ جب ڈاکو اپنی رضائیوں میں سوئے ہوئے تھے ہم تاروں کی مدھم روشنی میں خاموشی سے پچاس میل کا وہ پرخطر علاقہ عبور کر گئے۔ صبح جب ڈاکو اٹھ کر اپنی آنکھیں مل رہے تھے' تب ہم پشاور کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ ہم نے بغیر کسی دشواری کے پشاور پر قبضہ کرلیا۔

ہم نے پیش قدمی جاری رکھی۔ ہم نے دریائے سندھ کو پار کیا اور پنجاب میں داخل ہو گئے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس علاقے سے پانچ دریا گزرتے ہیں۔ ایسے میدانی علاقے سے ہم پہلے کبھی نہیں گزرے تھے۔ تاہم سال کے اس حصے میں وہ آنکھوں کو ناخوش گوار نہیں لگتا تھا۔ دور بہت دور شمال اور مغرب میں برف پوش پہاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جب انسان ان سے گزر کر دور آ جاتا ہے تو وہ کتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں! آسمان گہرا نیلا تھا۔ دھوپ میں خوش گوار حرارت تھی۔ خاکی میدانوں میں گندم' جو اور گنے کے سرسبز کھیت جگہ جگہ موجود تھے۔ یہاں شکار کے قابل جانوروں اور پرندوں کی بھی بہتات تھی۔ ان پرندوں میں مور' تیتر اور ہرن شامل تھے۔ یہاں دریاؤں اور تالابوں پر کئی اقسام کے آبی پرندے پائے جاتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں شیر اور چیتے بھی کثرت سے موجود ہیں۔ خوشحالی کے ان جزیروں کے درمیان قلعہ نما دیواروں میں گھری بستیاں واقع تھیں۔ بیشتر لوگ — مسلمان ہونے کی وجہ سے — جانتے تھے کہ ہم ملک کو کافر ہندوں سے بچانے کے لیے آئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے ساتھ ان کا برتاؤ دوستانہ رہا۔ ہم نے بھی سونے اور چاندی کے سکوں کے عوض ان سے کھانے پینے کی اشیاء خریدیں۔ ہمیں اپنے جس فوجی کے بارے میں اطلاع ملتی کہ اس نے کسی سے کوئی شے زبردستی لے لی ہے تو ہم اس کا سر قلم کروا دیتے تھے۔ اگر ہمیں اطلاع ملتی کہ ہمارے کسی فوجی نے کسی ہندوستانی عورت سے زبردستی کی ہے تو ہم اسے آختہ کروا دیتے۔ ہم اس کی ماہانہ تنخواہ اور خصیے اس کا شکار بننے والی عورت کو دے دیتے۔

لاہور کے گورنر زکریا خان نے پہلے تو ہماری مزاحمت کی لیکن بعد ازاں اس نے ہماری اطاعت قبول کر لی۔ اس نے کہا کہ اسے ہمارے ہندوستان آنے کا مقصد سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تاہم ہمیں حضرت علی المرتضیٰؓ کا فرمان یاد آیا: "جو شخص تم سے معافی کا خواستگار ہو اسے معاف کر دیا کرو۔" زکریا خان نے ہماری اجازت سے ہمارے پیروں کو بوسہ دیا اور ہمارے لشکر کے

اخراجات کے لیے 25 لاکھ روپے دیئے۔

ہم نے شہر کے جنوب میں چند میل دور واقع شالامار باغ کی خوشگوار فضا میں 16 دن گزارے۔ دن لمبے ہوتا اور دھوپ میں گرمی بڑھنا شروع ہو چکی تھی۔ شالامار باغ میں لگے سنبل کے درختوں پر سرخ سرخ پھول کھلنے لگے تھے۔ باغبانوں نے ہمیں بتایا کہ سنبل کے پھولوں کے رنگ سے انسان موسم گرما کی آمد کی پیشگوئی کر سکتا ہے۔ پھول کا رنگ جتنا زیادہ سرخ ہوتا ہے' دھوپ میں اتنی ہی تیزی آ جاتی ہے۔

دلی میں موجود ہمارے مخبروں نے ہمیں اطلاع بھیجی کہ محمد شاہ نے ہماری پیش قدمی روکنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا ہے۔ ہم نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا' کیونکہ اگر لاہور میں ہمارا قیام اتنا طویل ہوتا کہ موسم بہار موسم گرما میں بدل جاتا تو گرمی ہمارے جنگجوؤں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ ہمارے ہراول دستوں نے تکوری میں خیمے ڈالے ہوئے تھے۔ ہم بھی لشکر لے کر وہاں پہنچ گئے۔ مغل فوج تھوڑے ہی فاصلہ پر خیمہ زن تھی۔ مغل فوج کرنال اور علی مردان خان کے نام سے موسوم نہر کے درمیان خیمہ زن تھی۔ اگلے روز ہم گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کی فوج کے تیور بھانپنے کے لیے نکلے۔ مغل فوجیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی۔ تاہم وہ فن حرب میں طفل مکتب لگتے تھے۔ ان کی تعداد ہم سے دوگنا زیادہ تھی' ان کے پاس 200 ہاتھی' ہزاروں اونٹ' بے شمار توپیں اور گھوڑ سوار تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایسی حکمت عملی اپنائی تھی کہ ہم پر حملہ کرنے کی قوت کھو بیٹھے تھے۔

ہم نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ مغلوں کی رسد بند کر دی جائے۔ عظیم سعدی نے کہا تھا: "جب کسی جنگجو کا پیٹ خوب بھرا ہوتا ہے تو وہ بہادری سے لڑتا ہے' لیکن اگر اس کا پیٹ خالی ہو تو وہ میدان سے فرار ہونے میں دیر نہیں لگاتا۔" ہم نے چند دنوں تک دشمن کو فاقوں کا شکار رہنے دیا۔ جب دشمنوں کا پیٹ خالی ہو گیا تو ہم نے بیک وقت کئی مقامات سے حملہ کر دیا تاکہ دشمن الجھن کا شکار ہو جائے۔ دشمن بغیر نشانے

باندھے ادھر ادھر گولے برساتا رہا۔

14 فروری 1739ء کی سہ پہر مغل فوج فاقوں سے تنگ آ کر خندقوں سے نکل آئی۔ انہوں نے پہلے ہماری طرف ہاتھی بھیجے۔ ہم نے اونٹوں کی پشت پر جلتا ہوا تیل رکھ کر انہیں ہاتھیوں کی طرف دوڑا دیا۔ ہاتھی خوفزدہ ہو کر واپس بھاگے۔ انہوں نے اپنے ہی فوجیوں کو روند ڈالا۔ اس سے پہلے کہ مغل اپنی صفیں درست کریں' ہم نے اپنے شہسواروں کو حملے کا حکم دیا۔ ہمارے شیروں کے شکاری جنگجوؤں نے دشمن کی صفوں میں ہلچل مچا دی۔ دو گھنٹوں کی جنگ میں دشمن کے بیس ہزار فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ تعداد میں دشمن کے فوجیوں کو قیدی بنایا گیا۔ مغل فوج کا ایک اہم ترین سالار صمصام الدولہ بھی مارا گیا۔ وہ بہادر فوجی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعروں کی سرپرستی کرنے کی بھی شہرت رکھتا تھا۔ ہمیں اس کی موت کا دلی رنج ہوا۔

شکستِ فاش کھانے کے بعد محمد شاہ نے ہم سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ اس سلسلے میں اس نے آصف جاہ نظام الملک کو ہمارے پاس بھیجا۔ یہ وہی آصف جاہ تھا' جس نے ہمیں ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی! اس شخص نے اپنے آقا سے بے وفائی کی تھی لیکن چونکہ وہ ہمارے منصوبوں کی تکمیل میں ایک وسیلہ بن چکا تھا' اس لیے ہم نے اسے خلعت عطا کی اور محمد شاہ کو ہمارے پیروں میں تلوار رکھ کر اطاعت کے اظہار کی اجازت دے دی۔

اگلے دن شہنشاہِ ہندوستان نصیر الدین محمد شاہ ہمارے سامنے حاضر ہوا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ہم اسے جان سے نہ مار دیں۔ وہ اسی خوف سے ہمارے خیمے کے باہر ہی ٹھہر گیا۔ اس نے ایک خواجہ سرا کو قرآن پاک کا ایک نسخہ دے کر اندر بھیجا۔ ہم سمجھ گئے کہ اس نے اپنی جان کے تحفظ کی ضمانت حاصل کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔ ہم نے قرآن پاک کو بوسہ دیا اور اپنے چہیتے بیٹے شہزادہ نصر اللہ خان سے کہا کہ وہ اس مغل کو اندر لے آئے۔ محمد شاہ ہمارے خیمے میں داخل ہو کر ہمارے سامنے جھکا اور اپنی تلوار

کو ہمارے پیروں میں رکھ دیا۔ ہم نے کھڑے ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ ہم نے کہا کہ وہ اپنے ذہن سے خوف نکال دے۔ ہم نے کہا: ''ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ کھلی جنگ کرتے ہیں' انہیں دھوکا دے کر قتل نہیں کرواتے۔''

اسے ہماری بات پر یقین نہ آیا۔ جب کھانا پیش کیا گیا تو ہم نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر شک وشبے کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ ہم نے اس کے سامنے رکھی پلیٹ خود لے لی اور اپنی پلیٹ اسے دے دی۔ اسی طرح شراب کے جام بھی بدل دیئے۔ اس کا شک دور کرنے کے لیے ہم نے اپنے ہاتھوں سے قہوہ پیالے میں ڈال کر اسے پیش کیا۔ چونکہ مہربانی والتفات اس کے دل میں دوستی کی شمع روشن نہیں کر سکے تھے' اس لیے ہم نے سوچا' بہتر یہی ہے کہ اسے صاف صاف الفاظ میں کچھ نصیحتیں کی جائیں۔

''حیرت کی بات ہے کہ تم اپنے معاملات میں اس قدر لاپروائی برتتے ہو کہ تم نے ہمارے متعدد خطوں اور ایک سفیر کے بھیجے جانے کے باوجود ہمارے خطوں کا اطمینان بخش جواب تک نہیں دیا!''

ہم خاموش ہو کر اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے لیکن محمد شاہ گونگوں کی طرح خاموش رہا۔ ہم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''تم نے اپنے معاملات میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ جب ہم تمہاری سلطنت میں داخل ہوئے تو تم نے قاصد بھیج کر یہ تک معلوم نہ کروایا کہ ہم کون ہیں یا یہ کہ ہمارے ارادے کیا ہیں! تمہارا کوئی آدمی کوئی سلام وپیام لے کر نہ آیا۔ حد تو یہ کہ تم نے ہمارے سلام کا بھی جواب نہ بھجوایا!''

ہم نے نشاندہی کی کہ جنگ میں اس سے کون کون سی غلطیاں ہوئی تھیں: ''تم نے اپنے فوجیوں کو خندقوں میں بند کر کے حماقت کی تھی۔ کیا تمہیں پتا نہیں تھا کہ پانی اور خوراک کے بغیر محصور رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ دیکھ لیا نا تم نے!''

مغل کا سر شرم سے جھکا رہا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمارے ہندوستان آنے کے حوالے سے بھی اس کی غلط فہمیوں کو دور کر دیں: ''ہمیں صرف تمہارے تکبر نے مجبور کیا

کہ ہم پیش قدمی کریں۔ ہم تمہاری سلطنت پر قبضہ نہیں کریں گے۔ تاہم ہمیں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنا پڑا ہے اور ہمارے فوجی طویل سفر کی وجہ سے تھکے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم دلی جا کر چند روز قیام کریں گے تاکہ ہمارے فوجی تازہ دم ہو جائیں' اس کے علاوہ وہ رقم وصول کریں گے جس کی ادائیگی کا وعدہ آصف جاہ نظام الملک نے کیا تھا۔ اس کے بعد ہم تمہیں اپنے معاملات دیکھنے کے لیے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

محمد شاہ ہمارے پیروں پر نظریں جمائے ہماری باتیں سنتا رہا۔ ہم نے اسے جانے کی اجازت دی۔ ہم نے اسے کہا کہ وہ اپنی بیوی ملکہ الزمانی اور اپنے بیٹے سلطان احمد کو یرغمالی کے طور پر ہمارے کیمپ میں بھیج دے۔ ہم دلی کی طرف روانہ ہوئے۔ مغل بادشاہ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب ہم دارالسلطنت کے نواح میں پہنچ گئے تو ہم نے مغل بادشاہ کو اپنے قزلباش شہسواروں کے ایک دستے کے ساتھ اس کے محل بھیج دیا تاکہ وہ شہر میں ہمارے استقبال کی تیاریاں کرے۔

ہم نے شالیمار نامی بستی میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہاں امرا کے عشرت کدے موجود تھے جن کے اردگرد برگد کے ہزاروں سرسبز درخت لگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ یہاں اس پھل کا باغ بھی تھا' جسے مقامی لوگ آم کہتے تھے اور اسے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اس زمانے میں آم کے درختوں پر بمشکل دکھائی دینے والی ہری امبیوں کے گچھے لگے ہوئے تھے' جن پر عام مکھیاں اور شہد کی مکھیاں منڈلا اور مکڑیاں پھر رہی تھیں۔ کوئل کہلانے والا ایک سیاہ رنگ کا پرندہ بھی آم کے درختوں میں رہتا ہے۔ کوئلیں سارا سارا دن چہچہاتی رہتی تھیں۔ اس باغ میں آموں کے علاوہ امرود کے درخت بھی تھے لیکن امرود پکنے کا ابھی موسم نہیں آیا تھا۔ ہمارے خراسان اور مشہد کے گلستانوں کی بہار کتنی مختلف ہوتی تھی! وہاں جب انگور کی بیلوں پر نئے پتے پھوٹتے تھے تو بلبلیں شب و روز نغمے الاپنے لگتی تھیں۔ ہم نے اپنے آپ سے کہا: ''ایران کا ایک دن ہندوستان میں قیام کے سو دنوں سے بیش قدر ہے!''

اگلے دن ہم لاہوری بازار کی طرف کھلنے والے شمالی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ ہم نے اپنی بیشتر فوج کو شہر کے باہر ہی چھوڑ دیا تھا تا کہ ہمارے فوجیوں اور شہریوں کے درمیان اتفاقاً کوئی لڑائی نہ ہو جائے' جس سے ہمارا مختصر قیام برباد ہو جائے۔ ہم پھولوں کی محرابوں سے گزرے۔ ان محرابوں پر گلاب' یاسمین اور گیندے کے پھولوں سے فارسی میں خوش آمدید لکھا گیا تھا۔ نقاب پوش عورتوں نے گھروں کی بالکونیوں سے ہم پر گلابوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ یہ ہندوی خوشامد کے ہنر میں نہایت طاق تھے! پھولوں کی خوش بوئیں لاہوری بازار میں چھائی ہوئی لہسن اور دیگر کی بوؤں میں ملی ہوئی تھیں۔ ہم ایک وسیع و عریض مسجد کے سامنے سے گزرے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ مسجد شاہ جہاں بادشاہ کی ایک ملکہ نے تعمیر کروائی تھی اور اس کا نام اسی کے نام پر مسجد فتح پوری ہے۔

پھر ہم چاندنی چوک میں پہنچ گئے۔ اس چوک کے درمیان سے ایک نہر گزر رہی تھی جس کے دونوں کناروں پر درخت لگے ہوئے تھے۔ جب ہم جوہری بازار سے گزرے تو ہمیں قیمتی جواہرات سے بھرا ہوا ایک طشت نذر کیا گیا۔ اس کے بعد ہم ایک نئی تعمیر شدہ مسجد کے سامنے سے گزرے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اسے محمد شاہ کے خزانچی روشن الدولہ نے تعمیر کروایا ہے۔ (ہمیں بعد میں پتا چلا کہ روشن الدولہ ایک بدنام رشوت خور ہے۔ ایران کی طرح ہندوستان کے رشوت خور بھی مسجدیں تعمیر کروایا کرتے تھے)۔

اس مسجد کے ساتھ ہی شہر کی کوتوالی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قید خانہ اور پھانسی گھاٹ تھا۔ کوتوالی کے بعد پھول بیچنے والوں کا بازار ''پھول کی منڈی'' واقع تھی۔ یہاں کئی اقسام کے ڈیزائنوں والے گلدستے رکھے تھے۔ بازار کی دونوں اطراف کی بالکونیوں کے بیچ پھولوں کی لڑیاں بندھی تھیں' جس سے بازار پھولوں کی سرنگ لگ رہا تھا۔ اگلے بازار کے دروازے پر سناروں نے ہمیں قیمتی جواہرات سے بھرے طشت نذر کیے۔ ان میں سے کچھ کو ہمارے گھوڑے کی رکابیں چھونے کی اجازت دی گئی۔ جس

کے بعد انہوں نے مٹھیاں بھر بھر کر سونے کے سکے ہمارے نام پر فقیروں میں لٹا دیئے۔ فقیر اس شہر میں کثرت سے موجود تھے۔ قلعے کے داخلی دروازے کے قریب اردو بازار یعنی فوجیوں کا پڑاؤ تھا۔ مغل بادشاہ نے اسے ہمارے قزلباش باڈی گارڈوں کے لیے خالی کروالیا تھا۔

جونہی ہم قلعے میں داخل ہوئے' توپوں کو داغ کر ہمیں سلامی دی گئی۔ ہم اپنے استقبال سے خوش ہوئے تھے۔ ہم نے منادی کروائی کہ شہر اب ہماری حفاظت میں ہے اور اگر شہری امن و سکون کو برقرار رکھیں تو اپنے کام کاج بلا خوف انجام دینے کی اجازت ہوگی۔ ہم نے دلی کے گورنر لطف اللہ اور کوتوال حاجی فولاد خان کو خلعتیں عطا کیں۔ ہم نے انہیں عمدہ انتظامات کرنے پر شاباش دی۔ ہمارے قیام کے لیے دیوانِ خاص کے اردگرد کئی جگہیں تیار کروائی گئی تھیں۔ مغل خاندان کے افراد نے یہیں ہماری خدمت میں حاضری دی اور نذرانے پیش کیے۔ ہم نے انہیں خلعتیں عطا کیں۔

شام کے وقت دریائے جمنا کے کنارے ہمارے لیے آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس کے بعد رقص و موسیقی کی محفل برپا ہوئی۔ اگرچہ ہم جانتے تھے کہ یہ جشن ہماری حالیہ فتح کی خوشی میں برپا ہوا ہے لیکن ہم نے اجنبیوں کے ساتھ صحبت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم اپنے میزبان محمد شاہ کو خوش کرنے کے لیے ہم نے اس کے ہاتھ سے شراب کا ایک جام اور ایک لڑکی قبول کی۔ بتایا گیا کہ وہ دلی کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔ ہم نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ وہ ہماری خواب گاہ میں جا کر ہمارا انتظار کرے۔

محمد شاہ نے اتنی شراب پی کہ خود کو اور اپنے مہمان کو بھول گیا۔ اس نے ٹخنوں پے گھنگھرو باندھے اور رقاصاؤں کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ وہ بالکل انہی کی طرح رقص کرسکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اشارے ویسے ہی تھے ہاتھوں اور پیروں کی جنبشیں بھی ویسی ہی تھیں۔ ایک درباری نے محمد شاہ کے رقص کی تعریف کی۔ اس نے کہا کہ

ہندوستان کی کوئی رقاصہ اس جیسا رقص نہیں کر سکتی۔

وہ بندر کی طرح ہنسنے لگا۔ پھر اچانک اس نے اپنا قضیب ستر سے باہر نکالا اور اسے ہلاتے ہوئے بولا: "کسی رقاصہ کے پاس یہ نہیں ہوتا۔ جو کوئی اس سے بڑا دکھا دے میں اسے سونے کے سو سکے دوں گا۔"

ہم اس احمقانہ نمائش پر مسکرانے لگے۔ ہماری مسکراہٹ سے شہ پا کر اس نے انعام کی رقم میں اضافہ کر دیا: "دو سو سکے۔ کوئی بھی ایرانی یا ترک جو اس کا بہتر استعمال کر سکے۔"

کسی نے اس کا چیلنج قبول نہیں کیا۔ اس احمق شخص نے ایک خاردار چھڑی ہماری طرف بڑھانے کی جسارت کرتے ہوئے سعدی کا شعر پڑھا:

"اے بڑھیا! تو نے اپنے بال تو چالاکی سے رنگ لیے ہیں
لیکن تیرا کبڑا پن تو چھپائے نہیں چھپتا۔"

وہ اپنے خوشامدیوں کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ "واہ واہ" کرنے لگے۔ ہم سمجھ گئے کہ اس کا اشارہ ہماری طرف تھا کیونکہ ہمارے پاس وقت نہیں تھا کہ اپنی ڈاڑھی کو رنگ کروا لیتے' اس وجہ سے ان کی جڑوں سے ہمارے سر کے بالوں جیسا خاکستری رنگ نمایاں ہو رہا تھا۔ منافق سعادت خان نے' جو صرف چند گھنٹے پہلے ہمارے سامنے سجدے میں گرا ہوا تھا' چند فحش اشعار پڑھے' جن کا مفہوم یہ تھا کہ ایک بوڑھے نے ایک خوبصورت دوشیزہ سے شادی کر لی لیکن شب عروسی اس کا قضیب ایستادہ ہی نہ ہو سکا۔ ہم اسی وقت سعادت خان کو طمانچہ رسید کرنا چاہتے تھے لیکن پھر ہم نے اگلے دن سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ تاہم ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ کمینے لوگ جان لیں کہ ہم ان کے زہریلے اشاروں کنایوں کو بھانپ چکے ہیں۔ پس جونہی ان کے قہقہے تھمے' ہم نے جواباً شعر پڑھا' جس کا مفہوم یہ تھا کہ عورتیں زرق برق لباس پہنتی اور بناؤ سنگھار کرتی ہیں' مرد کا حقیقی زیور تو اس کے خصیے ہوتے ہیں۔

وہ فلک شگاف آواز میں ہمیں داد دینے لگے۔

ہم نے محفل برخاست کی اور خواب گاہ میں چلے گئے۔ ہمارے بستر پر دراز ہوتے ہی کنیز آ گئی۔ اس نے جھک کر ہمیں سلام کیا' ہمارے جوتے اتارے اور پاؤں سہلانے لگی۔ کئی روز کے تھکا دینے والے سفر کے بعد اس کے سہلانے سے ہمارے پیروں کو بہت آرام ملا۔ ہم نے ٹانگیں اس کی گود میں رکھ دیں۔ وہ انہیں دبانے لگی۔ وہ بہت حسین اور کم عمر تھی۔ ہم نے پوچھا: ''لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟''

''آپ کی باندی کو نور بائی کہتے ہیں۔ کیا یہ باندی جناب والا کو شراب کا ایک جام پیش کر سکتی ہے؟''

اس نے ہماری طرف دیکھا۔ کیسی آنکھیں عطا کی تھیں خدا نے اس کو! کسی ایرانی غزال سے زیادہ بڑی' زیادہ سیاہ اور زیادہ روشن — اور وہ ان سے کس طرح باتیں کرتی تھی! اس نے چاندی کی صراحی سے شراب سونے کے جام میں بھر کر جام ہمیں پیش کیا۔ ہم نے جام لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ ہم نے کبھی کسی اجنبی کے ہاتھ سے شراب یا پانی نہیں پیا تھا اور نہ ہی کبھی کسی اجنبی کے ہاتھ سے کھانا کھایا تھا۔ نور بائی نے ہم سے شراب پینے کا اصرار نہیں کیا۔ اس نے اپنے گال کو شہادت کی انگلی سے دباتے اور سر کو ہلاتے ہوئے پوچھا: ''کیا آپ مجھ سے خوش ہیں جناب والا؟''

ہم نے کہا: ''تمہارا چہرہ تو ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے' باقی کا ہمیں علم ہی نہیں ہے۔''

وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے ہمارا پاؤں ایک قدم دان پر رکھا اور کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی شلوار کھول دی اور اسے پیروں میں گرنے دیا۔ پھر اس نے اپنی قمیض اتار کر قالین پر گرا دی۔ شرم سے اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس طرح اس کا سارا جسم ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو گیا۔ ہم نے اس جیسی خوش بدن لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی رنگت دار چینی جیسی تھی' چھاتیاں جوبن سے

پھٹی پڑتی تھیں' مگر اتنی نازک کہ ہم اسے اپنی ہتھیلیوں میں بھر سکتے تھے۔ وہ چھوٹے قد کی تھی لیکن اس کے کولھے ہرات کے تربوزوں جتنے بڑے تھے۔

ہم نے اس سے پوچھا: "نور بائی! تمہاری عمر کتنی ہے؟"

اس نے حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا: "کوئی آپ کو کسی دوسرے کی استعمال کی ہوئی کوئی شے پیش کرنے کی جرأت کیسے کرسکتا ہے؟ میں تو آپ کو خوشی دینے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ میرے جسم کو کسی مرد نے کبھی نہیں چھوا ہے نہ ہی آپ کے بعد کبھی کوئی دوسرا مرد میرے جسم کو چھوئے گا۔"

وہ عمر کے اعتبار سے تو بچی تھی لیکن گفتگو کے فن میں طاق تھی۔ ہم نے اس کے چہرے اور جسم پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا جسم مضبوط اور ہموار تھا۔ اس کے جسم کے کسی حصے پر' بغلوں کے اندر اور ناف کے نیچے بال نہیں تھے۔ اس نے اپنے جسم پر خوشبودار تیل ملا ہوا تھا' جس سے یاسمین کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ ہمیں خیال آیا کہ ہمارے میزبانوں نے کسی سازش کے تحت اتنی کم عمر اور چنچل لڑکی ہماری خواب گاہ میں بھیجی ہے۔ کسی مرد کی عمر کے پچاس سال مشکلات اور مصائب میں گزرے ہوں تو اس کی عورتوں کی طلب میں کمی آجاتی ہے۔ تاہم ہم نے عزم کیا تھا کہ اپنے میزبانوں پر ثابت کردیں گے کہ ایرانی مرد حرم میں بھی اتنے ہی طاقتور ہوتے ہیں' جتنے کہ میدانِ جنگ میں۔ ہم نے اپنے بستر پر ایک برف جیسی سفید چادر بچھادی تھی۔ ہم نے نور بائی کو حکم دیا کہ وہ اس وقت تک ہمارے جسم کو سہلائے جب تک ہمارے جذبات پوری طرح نہ ابھر آئیں۔

جب اس نے دیکھا کہ اسے پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا ہے تو اس کے چہرے سے بچگانہ تجسس کا تاثر ختم ہوگیا اور اس کی جگہ چوکنے پن نے لے لی۔ ہم نے اس کے ساتھ نرمی برتی۔ تاہم وہ درد سے رونے چلانے لگی اور بستر کی چادر پر اس کی دوشیزگی اور ہماری مردانگی کا واضح ثبوت نقش ہوگیا۔

جب ہم تمام ہوئے تو ہم نے اس کے جسم پر بیش قیمت موتیوں جڑے سونے کے زیورات ڈھیر کر دیئے۔ ہم نے اسے بتایا کہ وہ ہمارے بستر پر آنے والی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔ اس نے آنسو پونچھے اور مسکرانے لگی۔ تاہم جب ہم نے اسے اپنے حرم میں شامل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ دوبارہ رونے لگی۔ اس نے کہا: "اگر آپ دلی میں رہیں گے تو آپ کی باندی آخری سانس تک آپ کے ساتھ رہے گی لیکن اگر آپ مجھے دلی سے دور لے جائیں گے تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

میں نے سنا تھا کہ دلی کے باسی اپنے شہر سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں پھولوں سے۔ تاہم ہمیں یقین نہیں آیا کہ ایک کنیز کی بیٹی دلی کے چکلے میں رہنے کو ہمارے ایران میں واقع محل پر ترجیح دے گی!

بہرحال ہمیں اس لڑکی سے بات چیت کرنے کی خواہش نہیں تھی لیکن ہم نے اسے ناخوش نہیں کیا۔ ہم نے کہا کہ وہ دلی میں ہمارے مختصر قیام کے دوران ہماری خدمت میں رہے۔ شاید وہ اپنا خیال بدل لیتی یا شاید ہم۔

سہ پہر میں ہم نے سعادت خان کو بلوا بھیجا۔ وہ اپنے بیٹوں اور خدمت گاروں کے ہمراہ آیا۔ چونکہ اس نے آصف جاہ نظام الملک کے ساتھ ہمیں خط لکھ کر ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی اور ہمیں لال قلعے کے تہہ خانوں میں موجود بے حساب دولت کے بارے میں اطلاع دی تھی' اس لیے اسے ہم سے تھوڑی بہت شناسائی کا گمان تھا۔ وہ اپنے مصاحبوں پر بھی اپنی اہمیت کا رعب ڈالنا چاہتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ ہمیں اس کی خوش گمانیاں دور کرنی چاہئیں۔ میں نے اسے اس کے گزشتہ رات والے رویے کے حوالے سے کچھ نہیں کہا بلکہ اسے یاد دلایا کہ ہم اس کی اس یقین دہانی پر دلی آئے ہیں کہ اگر ہم نے سلطنت کو کافر مرہٹوں سے بچا لیا تو وہ اس مہم کے مصارف برداشت کریں گے۔ ہم نے اسے کہا کہ دلی میں ہماری آمد کے بعد اس کے رویے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی پاسداری سے گریزاں ہے۔

حضرت علی المرتضیٰؓ نے سچ کہا تھا: "اکثر اوقات ایک لفظ تلوار کی طرح گھاؤ لگاتا ہے اور زبان برچھی کی دھار سے بھی تیز ہوسکتی ہے۔" چنانچہ ہم نے اشتعال کی زبان میں اس کی فہمائش کی: "سعادت خان! اسلام کے محافظین کی فوج کو اس کی قربانیوں کا صلہ نہیں دیا گیا۔ جن چار کروڑ روپوں کی ادائگی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی ابھی تک ادا نہیں کی گئی۔ اگر کل سورج غروب ہونے تک یہ رقم ادا نہیں کی گئی تو دنیا ہمارے اشتعال کا نظارہ کرے گی۔"

ہمارے غصے کا سعادت خان پر بالکل اثر نہیں ہوا۔ اس نے عیاری سے کہا' "فاتح عالم کے لیے روپیہ کیا وقعت رکھتا ہے!" یہ جملہ بول کر اس نے داد کے لیے مڑ کر اپنے حواریوں کی طرف دیکھا۔ "روپیہ کیا وقعت رکھتا ہے!" اس نے دوبارہ کہا: "ہم عظیم نادر کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں گے۔"

اس کے حواری اسے داد وتحسین دینے لگے۔ ہمارا غصہ بڑھ گیا۔ ہم نے اسے حکم دیا' "سعادت خان! ادھر آؤ۔" اس کی احمقانہ مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ جب وہ ہمارے قریب آیا تو اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ وہ ہمارے سامنے جھکا تو ہم نے اس کا بایاں کان پکڑ کر اسے سیدھا کیا۔ "ہم ایسی مکارانہ باتیں پسند نہیں کرتے! ہم وعدہ شکن لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتے!"

سعادت خان کا چہرہ پہلے سرخ اور پھر پیلا پڑ گیا۔ وہ ہکلانے لگا۔ ہم نے اس کے چہرے پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔ تھپڑ کھا کر وہ پیچھے ہوا تو ہم نے اس کے پیٹ میں ٹھوکر ماری: "دفع ہو جاؤ ہمارے سامنے سے!" ہم نے دہاڑتے ہوئے کہا: "اگر ہمیں کل تک مطلوبہ رقم نہ ملی تو ہم تمہیں چاندنی چوک میں کوتوالی کے سامنے کوڑے لگوائیں گے۔"

سعادت خان کو اٹھا کر ہمارے سامنے سے لے جانا پڑا۔ یہ سزا اس کے لیے بہت کافی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اسی رات اپنے دل میں خنجر گھونپ کر اپنی مصیبت زدہ زندگی کا خاتمہ کرلیا۔

دلی کے لوگ احسان فراموش اور بزدل تھے۔ ہم انہیں کافروں سے بچانے کی خاطر سینکڑوں میل دور سے پہاڑوں' صحراؤں اور ویرانوں کا دشوار سفر کر کے وہاں آئے تھے۔ وہ اتنے احسان فراموش نکلے کہ انہوں نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم اسلام کی محبت میں نہیں بلکہ سونے کے لالچ میں ان کے ملک آئے تھے۔

ہمیں اطلاع دی گئی کہ جب شاہی مسجد کا امام ہمارے نام کا خطبہ پڑھ رہا تھا تو مقامی لوگوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ ہمارے افسر خبریں لائے کہ گلیوں سے گزرتے ہوئے ہمارے قزلباش محافظوں پر تھوکا جاتا ہے' جب وہ گھروں کے سامنے سے گزرتے ہیں تو عورتیں ان پر گند پھینکتی ہیں۔ سبزی فروش اور قصاب ہمارے ایرانی فوجیوں سے اپنے لوگوں کی نسبت زیادہ قیمتیں مانگتے ہیں۔ دلی کے باسیوں نے اس بات کی تعریف نہیں کی کہ ہم نے ان کے تحفظ کے لیے اپنی فوج کو شہر سے باہر ٹھہرایا تھا۔ شاہ جہان آباد میں چند سو ایرانی فوج دیکھ کر بزدل شہریوں کو اتنی ہمت ہو گئی تھی کہ وہ ہم پر ناک بھنوئیں چڑھا رہے تھے۔ اس طرح انہوں نے موت کے فرشتے کو شہر میں آنے کا بلاوا دیا تھا۔

ہفتہ **10** مارچ **1739**ء کو سورج برج حمل میں داخل ہوا۔ اس روز عیدالاضحیٰ بھی تھی۔ ہمارے محافظ گلیوں میں پھرنے والے کچھ بیل اور بچھڑے قربانی کے لیے پکڑ لائے۔ ہندو' جو کہ گائے بیل کو مقدس مانتے ہیں' مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے ہمارے آدمیوں کو چاول بیچنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ چاول کی بجائے مسلمان دکان داروں سے آٹا خرید لیا جائے۔ اس موقع پر ہمیں دلی کے مسلمانوں کی بے وفائی اور غداری کا احساس ہوا۔ انہوں نے گندم کے آٹے کی قیمت میں تین گنا اضافہ کر دیا۔ ہم نے اپنے غصے پر دوبارہ قابو پایا۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کا فرمان ہے: ''غصہ پاگل پن کی ایک قسم ہے۔'' ہم نے دس سیر گندم کی قیمت ایک چاندی کا روپیہ مقرر کر دی۔ ہم نے حکم دیا کہ غلے کے گوداموں کو کھول دیا جائے۔

سہ پہر کو ہمیں اطلاع ملی کہ ہمارے آدمی پہاڑ گنج کہلانے والے غلہ بازار میں خریداری کر رہے تھے کہ اجمیری گیٹ کے مغرب میں ان پر حملہ کر دیا گیا۔ افواہوں پر کان دھرنا ہماری عادت نہیں ہے۔ ہم نے اپنے سات ذاتی محافظوں کو حقائق کی تصدیق کے لیے بھیجا۔ ان سات میں سے صرف تین واپس آ سکے۔ وہ تینوں بھی زخمی تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ باغیوں کے سالار دو پٹھان نیاز خان اور شاہسوار خان تھے۔

ان ٹھگوں نے ہمارے فوجیوں کی ایک ٹولی کو گھیر لیا اور انہیں زندہ جلا دیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے فوجیوں کی ایک بڑی تعداد ہلاک ہو چکی ہے اور بدمعاش نیاز خان کی قیادت میں ایک مسلح ہجوم اپنے ناپاک ہاتھ ہم پر ڈالنے کے لیے لال قلعے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم لاہوری گیٹ کی برجی میں چلے گئے۔ وہاں سے اردو بازار اور چاندنی چوک کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں بندوقیں چلنے کی آواز آئی۔ ہم نے دیکھا کہ تلواروں، نیزوں، برچھیوں اور توڑے دار بندوقوں سے مسلح بے شمار لوگ قلعے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اردو بازار میں متعین ہمارے ذاتی محافظوں نے اپنی جان پر کھیل کر ان وحشیوں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ ہم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اردو بازار سے نکل کر قلعے کی مشرقی دیوار اور دریا کے درمیان ریتلے کنارے پر مورچہ زن ہو جائیں۔ ہم نے توپچیوں کو حکم دیا کہ لاہوری اور دہلی گیٹ پر نصب توپ سے باغیوں پر گولے داغے جائیں۔ ہم نے شالیمار میں موجود اپنی فوج کے کمان داروں کو کہلوایا کہ وہ فوراً کمک بھیجیں اور اگلی صبح شہر میں داخل ہونے کی تیاری کریں۔

ساری رات ہجوم نعرے لگاتا رہا اور توپ گرجتی رہی۔ ہمارا ذہنی سکون اس بات سے مزید برباد ہو گیا کہ محمد شاہ نے اپنی رعایا کے رویے پر ہم سے کوئی معذرت نہیں کی۔ ہمیں خبریں ملیں کہ بازاروں میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ ہمیں نور بائی نے

زہر دے دیا تھا اور ہم بستر مرگ پر پڑے ہیں۔ جب مغل بادشاہ ہمیں ملنے آیا تو ہمیں اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوگیا کہ وہ خود یہ دیکھنے آیا تھا کہ کیا واقعی ہمیں زہر دیا گیا ہے۔ اب ہم نے گزشتہ شام کی میٹھی یادوں کو اپنے ذہن پر غلبہ پانے والی تلخی کو کم کرنے نہیں دیا۔ ہم جلدی اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ ہم نے اپنے لیے بھیجی گئی شراب کی صراحی منگوائی اور نور بائی کو اپنے حضور پیش ہونے کا حکم دیا۔

نور بائی کولہے مٹکاتی اور گزشتہ رات کی طرح شہوت انگیز انداز میں مسکراتی ہوئی آئی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی غداری کا پتا نہیں چلتا تھا۔ تاہم وہ ہماری آنکھوں میں غصہ دیکھتے ہی خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے ہمارے پاؤں پکڑ لیے اور بولی: ''کیا آپ کی بندی سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے؟''

بلاشبہ سولہ وہ سال سے کم عمر دنیا کی سب سے بڑی جھوٹی تھی۔ ہم نے پوچھا: ''تمہیں شراب کی یہ صراحی کس نے دی تھی؟'' اس نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا: ''کسی نے نہیں۔ یہ تو یہیں موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ شیراز سے آئی ہوئی آپ کی پسندیدہ شراب ہو۔ کیا اس نے آپ پر برا اثر کیا ہے؟''

ہم نے صراحی اٹھائی' ایک جام بھرا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''پیو!''

اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ اس نے جام ہمارے ہاتھ سے لے لیا: ''میں نے شراب کبھی نہیں پی۔''

''پیو! ورنہ ہم زبردستی تمہیں پلائیں گے۔''

نور بائی نے ایک انگلی شراب میں ڈبوئی اور اسے اپنی زبان پر رکھا۔ شراب کی تلخی محسوس کرکے اس نے برا سا منہ بنایا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے نتھنے بند کیے اور دوسرے سے جام حلق میں انڈیل لیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ اس کا چہرہ گہرا سرخ ہوگیا۔ اس نے اپنا گلا یوں پکڑ لیا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس نے آنسو بہاتے

ہوئے کہا: "حضور اس زہر کو مزہ لینے کے لیے پیتے ہیں!"

ہمیں اس بات کا یقینی علم نہیں تھا کہ یہ وہی شراب ہے جو گزشتہ رات ہماری خواب گاہ میں موجود تھی۔ تاہم چونکہ اس کو پینے سے نہ تو نور بائی پر اور نہ ہی ہم پر کوئی برے اثرات پڑے اس لیے ہمیں اطمینان ہو گیا کہ اس میں زہر نہیں ملایا گیا تھا۔ ہم نے نور بائی کو اپنے قریب آنے کا کہا۔ ہم نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا اور اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

"نور بائی! اگر کوئی شخص تمہیں ہمارے حوالے سے کچھ کہے یا تمہیں ہمارے ساتھ کچھ کرنے کو کہے تو تم ہمیں بتا دینا۔ ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور تمہارے وزن کے برابر سونا تمہیں عطا کریں گے۔"

اس نے زمین پر بیٹھ کر ہمارے پاؤں چوم لیے۔ ہم نے موتیوں کا ایک ہار اس کے گلے میں ڈال کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ ہم نے کچھ دنوں تک اس کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے ایک جاسوس متعین کر دیا۔

اتوار کے روز ہم اپنے معمول کے خلاف جلد جاگ اٹھے۔ ہم نے فجر کی نماز اورنگ زیب کی موتی مسجد میں ادا کی اور ہلکا سا ناشتہ کیا۔ ہمارے لشکر کے کمان دار شہر میں آ چکے تھے اور ہمارے احکام کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے انہیں لاہوری دروازے کے سامنے مورچہ زن ہونے کا حکم دیا۔

جونہی سورج طلوع ہوا' دلی کے باغی گلیوں میں اکٹھے ہونے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ شر اور فساد کی ہواؤں نے رعایا کو اس طرح بھڑکا دیا تھا جیسے طوفانی ہوائیں سمندر میں تلاطم بپا کر دیتی ہیں۔ ہم نے سوچا کہ شاید ہمیں دیکھ کر وہ پرسکون ہو جائیں۔

جب سورج لال قلعے کی فصیل تک ابھر آیا' تب ہم گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے محافظوں کے ہمراہ چاندنی چوک میں چلے گئے۔ گلیوں میں اپنے کچھ وفادار ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کے اعضا کاٹ دیے گئے۔ منافق

لوگ' جو کہ صرف دو دن پہلے پھولوں اور ہیرے جواہرات کے نذرانوں سے ہمارا خیر مقدم کر رہے تھے' اب ہمیں گالیاں دے رہے تھے۔ پھول کی منڈی کے ان گل فروشوں نے' کہ جنہوں نے ہم پر گلابوں کی پتیاں نچھاور کی تھیں' اب ہم پر کیچڑ پھینکا اور ہم پر پتھر برسائے۔ ہم روشن الدولہ کی مسجد کے قریب گھوڑے سے اترے اور بالکونی میں بیٹھ گئے۔

قریبی گھروں کی بالکونیوں سے گند اور پتھر ہم پر پھینکے جانے لگے۔ پھر کسی نے بندوق سے گولی چلائی۔ گولی ہمارے قریب سے گزر کر ہمارے ایک خادم کو لگی۔ وہ بے چارہ ہم پر گر گیا' اس کا خون ہماری قمیض پر گرا۔ اس نے اذیت بھرے لہجے میں "یااللہ" کہا اور ہمارے بازوؤں میں جان دے دی۔

ہم نے اپنے وفادار خادم کو فرش پر لٹا دیا۔ ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ ہم نے تلوار کھینچی اور حکم دیا: "جب تک یہ تلوار نیام سے باہر ہے اس وقت تک اس منحوس شہر کے باسیوں کا قتل عام جاری رہے۔ کسی کو نہ بخشا جائے۔"

ہم نے ہندوستان کے لوگوں کے کردار کا ایک اور پہلو دیکھا۔ انہوں نے ہمیں اپنی مدد کے لیے بلایا تھا۔ یہ ان کی چالاکی تھی۔ وہ بیک وقت اپنے بادشاہ اور ہماری اطاعت کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ ان کی منافقت تھی۔ ہم دیکھ چکے تھے کہ وہ میدانِ جنگ میں انتہائی بزدل اور شکست کے وقت پست تھے۔ ہم ان کی مرصع باتیں سن چکے تھے' جن میں انہوں نے اپنے شرانگیز عزائم کو خوشامد کے پردے میں چھپا لیا تھا۔ ہم نے دیکھا تھا کہ وہ بڑی تعداد میں ہوں تو تھوڑی تعداد والے اور ان پر شک نہ کرنے والے فوجیوں کے لیے کتنے متشدد ہو سکتے ہیں۔ اب جبکہ موت کا فرشتہ ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا تو وہ بھیڑیں بن گئے تھے۔ ہمارے فوجیوں نے شہریوں کی اتنی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا کہ ان کے ہاتھ تھک گئے۔

ہم روشن الدولہ مسجد سے لال قلعے واپس روانہ ہو گئے۔ جب ہم دریبہ کے

دروازے سے گزرے تو ہم نے حکم دیا کہ کافروں کے اس علاقے کا ہر گھر منہدم کر دیا جائے۔ ہمارے فوجیوں نے اس علاقے کے ہر مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دیا اور پھر بازار کو آگ لگا دی۔ ہم نے شاہ جہان آباد میں صرف جامع مسجد اور دہلی دروازے کے گرد واقع بازاروں میں قتل و غارت نہ ہونے دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نواب سربلند خان نے ہمارے حضور آ کر معافی کی التجا کی تھی کیونکہ ان کے بقول ان علاقوں کا کوئی فرد باغیوں میں شامل نہیں تھا۔

سہ پہر کے وقت محمد شاہ نے ہم سے ملاقات کی درخواست کی۔ اس وقت تک ہمارے غصے کی آگ کو خون کے دریا نے دھیما کر دیا تھا۔ ہم نے اسے قدم بوسی کی اجازت دی۔ وہ لفظوں سے کھیلنا جانتا تھا۔

اس نے ماتمی لہجے میں کہا: ''آپ کی شمشیر انتقام سے کوئی نہیں بچا۔ اگر آپ غارت گری کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو مرنے والوں میں زندگی پھونکیں اور پھر سے قتل عام برپا کریں۔''

اسے اندازہ نہیں تھا کہ کتنے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہزاروں فوجی مسلسل چھ گھنٹے سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے علاوہ کچھ نہیں کر رہے تھے۔ ہم نے تلوار نیام میں ڈال لی اور حکم دیا کہ نقارے بجا کر ہماری خوشی کا اعلان کیا جائے۔

ہم اس قتل عام کے نتائج اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتے تھے' اس لیے ہم نے حکم دیا کہ گلیوں کو لاشوں اور خون سے صاف کر دیا جائے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی دن ہولی تھی۔ کافر ہندو موسم بہار کے آغاز پر ایک دوسرے پر سرخ رنگ — خون کا رنگ — پھینک کر خوشی مناتے ہیں! کافروں نے اپنے رواج کے مطابق اپنے مقتولین کو جلایا اور مسلمانوں نے اپنے رواج کے مطابق اپنے مقتولین کو دفنایا۔ جن لاشوں کو جلانے یا دفنانے والا کوئی نہیں تھا انہیں چیلوں' کووں' بلیوں' کتوں اور گیدڑوں نے کھا لیا' جو کہ شہر میں کثرت سے موجود تھے۔

اگرچہ ہم نے اپنے عفو کی ہوا کو اس منحوس شہر میں چلنے دیا تھا لیکن ہم چاہتے تھے کہ شہریوں کو یہ یقین نہ دلایا جائے کہ ان کے جرائم کو معاف کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ امرا اور دولت مند تاجروں کے گھروں میں داخل ہو کر جو شے ملے اسے لے آئیں۔

احتجاج کرنے والوں کو ہمارے سامنے لایا گیا۔ ہم نے ان کے رشتہ داروں کے سامنے انہیں کوڑے لگوائے۔ ان کے گھروں کے فرش کھود ڈالے گئے اور ان کی عورتوں کو الف ننگا کر دیا گیا۔ سزا پانے والے بہت سے لوگوں نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر لیا۔ سونا' چاندی اور ہیرے جواہرات ہمارے خزانے میں اس طرح شامل ہو رہے تھے' جس طرح دریا سمندر میں گرتا ہے۔ ہم نے یہ خوش خبری اس اعلان کے ساتھ ایران بھیجی کہ اگلے تین سال تک ہم اپنی ایرانی رعایا سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کریں گے۔

اس سب کے بعد ہمیں بے چینی اور اضطراب محسوس ہونے لگا۔ ہم نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ ہم خلوت چاہتے ہیں۔ ہم کئی گھنٹے تنہا بیٹھے رہے اور اپنے آپ سے مشورہ کرتے رہے۔ ہم نے ان چار سلطنتوں کو فتح کر لیا تھا' جن کے حوالے سے ہم نے خواب دیکھے تھے۔

ہم نے بہت ساری دولت اکٹھی کر لی تھی اور لاکھوں ایرانیوں کے گھروں میں خوشحالی کے چراغ روشن کر دیے تھے۔ ہم نے اپنی تلوار سے جو فصل کاٹی تھی' اگر ہماری اولاد اور ان کی سات پشتیں بیٹھ کر بھی کھائیں تو وہ ختم نہ ہوگی۔ ایشیا کے لوگ ہمارا نام سن کر مرعوبیت سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہم جہاں جانا چاہتے تھے' سب مرد ہمارے جھنڈے تلے جانے کے لیے تیار تھے۔ ہمارے حرم میں حسین ترین عورتیں موجود تھیں۔ ان میں کوہ قاف' ترکی' ایران' عرب' افغانستان اور ہندوستان کی عورتیں شامل تھیں۔ ہمارے کئی دلیر بیٹے اور بہت سی خوبصورت بیٹیاں تھیں۔ ہمارے پاس وہ سب کچھ تھا

جس کی کسی مرد کو خواہش ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہم پر ایک عجیب سی افسردگی طاری تھی۔

نور بائی ہمارے ذہن پر ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ ہم نے اس کے ساتھ گزاری ہوئی رات کو یاد کیا۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتی تھی یا کسی شر پسندانہ سازش میں شریک ہو سکتی تھی۔ ہمیں یہ بھی یقین نہیں تھا کہ کیا کوئی شر پسند واقعی ہمارے خلاف سازش کر رہا ہے۔ تاہم بہت سی ایسی مسموم افواہیں ہم نے سنی تھیں' جن میں نور بائی کا نام بھی آیا تھا۔ ہم نے تالی بجا کر اپنے خادم کو بلا کر حکم دیا کہ نور بائی کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔

نور بائی نے اپنے آنسوؤں سے ہمارے پیر بھگو دیے۔ وہ قالین پر گر گئی اور سسکتے ہوئے ہم سے پوچھنے لگی کہ ہم اس پر شک کیوں کرتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی جواز نہیں تھا' بس ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم اس کے حسین جسم کو تکتے رہے۔ کمان کی طرح خم دار کمر اور بھرپور کولہے جو لطف اندوز ہونے کے خواہش مند کو لذت مہیا کر سکتے تھے۔ اس کو تعریفی نظروں سے تکتے رہنے کے باوجود ہماری رانوں کے درمیان کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ اب تک ہمیں یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ ہم اس کے جسم پر تو حاوی ہو سکتے ہیں لیکن اس کے دل پر حکومت نہیں کر سکتے۔

ہم نے اسے ایک مرتبہ پھر سونے کے دو کنگن دیے اور رخصت کر دیا۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ہمارے گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی اور ہمارے چہرے کی طرف تکنے لگی۔ اس نے ہمارے مزاج کو بھانپ کر کہا: ''حضور دنیا سے خفا ہیں۔ جنہیں آپ نے ہلاک کروایا' وہ سب انسان تھے۔ یہ اچھا کام نہیں تھا۔''

ہمیں اس کی بے باکی نے حیران کر دیا۔ ہم نے سر پر ضرب لگائی اور اچانک ہمیں اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے چہرا دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا' لیکن ہم اپنے سینے سے

ابھرنے والی آہ کو نہ روک سکے۔ نور بائی کی ہمت اور بڑھ گئی۔ وہ ہم سے اجازت لیے بغیر ہماری گود میں بیٹھ گئی۔ نامردوں جیسی کمزوری کا مرحلہ گزر گیا۔ ہم نے نور بائی کو اپنی گود سے اتار دیا اور کہا کہ ہمیں خلوت چاہیے۔ اس نے جانے سے پہلے ہم سے وعدہ لیا کہ ہم بلی ماراں کے حکیم علوی خان کو بلوائیں گے۔ وہ بولی: وہ آپ کے جونکیں لگا کر آپ کے جسم میں دوڑنے والے غصیلے خون کو نکال لے گا۔"

اگلے روز ہم نے حکیم علوی خان کو بلا بھیجا۔ وہ مسیحا کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ بوڑھا تھا۔ وہ خمیدہ کمر تھا اور اس کی لمبی ڈاڑھی سفید تھی۔ وہ عصا کے سہارے چلتا تھا۔ وہ اس جرأت کا حامل تھا' جو ایسے بوڑھے افراد میں پیدا ہو جاتی ہے' جنہیں علم ہوتا ہے کہ اب انہیں زیادہ عرصہ نہیں جینا ہے۔ وہ ہمیں فہمائش کرنے لگا: "اگر آپ اپنے غصے پر قابو پانا نہیں سیکھیں گے تو آپ کا غصہ آپ پر قابو پا لے گا۔"

ہم نے مانا کہ ہمیں غصہ جلد آ جاتا ہے۔ حکیم نے کہا: "حضور! آپ کو نہ صرف غصہ جلد آتا ہے بلکہ بہت برا غصہ آتا ہے۔ غصہ پاگل پن کی ایک قسم ہے۔ اگر اس پر قابو نہ پایا جائے تو لاعلاج ہو جاتا ہے۔" اس کے الفاظ اس کی دواؤں سے زیادہ تلخ تھے۔ تاہم خوشامدیوں اور جی حضوروں کی چاپلوسی سنتے رہنے کے بعد اس بے باک انسان کی باتیں بربط کی موسیقی جیسی اچھی لگ رہی تھیں۔ ہمیں اس کی زبانی شہر میں برپا ہونے والی بربادی کا علم ہوا۔ ہم نے اسے بتایا کہ پہلے دلی کے شہریوں نے ہمارے فوجیوں کو قتل کیا تھا اور ہم پر حملہ کرنے کی جسارت کی تھی۔ ہم نے تو اپنے فوجیوں کو صرف جوابی حملہ کرنے کی آزادی دی تھی۔

بوڑھے حکیم نے کہا: "لاحول ولا قوۃ! عورتوں اور بچوں پر جوابی حملہ! معصوم لوگوں کا قتل! کیا آپ کے ملک میں انصاف یوں ہوتا ہے؟"

ہم مشتعل ہوئے بغیر اس کی باتیں سنتے رہے۔ اس کے بعد ہم حکیم علوی خان کی باتیں سننے کے لیے اسے اکثر بلا لیتے تھے۔ جہاں اس میں اتنی جرأت نہیں تھی

کہ ہمیں ہماری خامیوں سے آگاہ کرے۔ وہیں اس نے ہمیں اس پسے ہوئے موتیوں اور یمنی شہد سے تیار کی گئیں شہوت افروز ادویات بھی دیں۔ اگرچہ ہم بھرپور صحت کے حامل تھے تاہم اب ہم نے محسوس کیا کہ ہم اپنے حرم کی 33 عورتوں اور جوان اور پرجوش نور بائی کو زیادہ مطمئن کر سکتے ہیں۔

ہمیں یاد نہیں کہ ہمارا ذہن حکیم علوی کی باتوں سے تبدیل ہوا یا نور بائی کی صحبتوں سے۔ ہم نے پندرہ دن سے کسی کو موت کی سزا نہیں دی تھی۔ ہم اپنے مصاحبوں کے ساتھ ہنسنے لگے اور لطیفے سننے سنانے لگے۔ ہم نے مغل خزانے کے نگران قمرالدین خان سے پوچھا کہ کیا اس کے حرم میں واقعی ساڑھے آٹھ سو عورتیں موجود ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو ہم نے کہا: "تمہیں ڈیڑھ سو مزید عورتیں حرم میں شامل کر کے میم باشی (ایک ہزار فوجیوں کا کمان دار) بن جانا چاہیے۔" اس بات پر لوگ اتنے ہنسے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کئی خوشامدیوں نے یہ لطیفہ ہمیں کئی بار سنایا۔

ہم نے مغل بادشاہ سے اس امید میں کوئی بات نہیں کی کہ وہ عقل سے کام لے کر خود پیشکش کرے گا۔ تاہم محمد شاہ عقل مند نہیں بلکہ چالاک انسان تھا۔ اس نے ہمیں کہلوایا کہ ہم دونوں کے خاندانوں کو ایک عروسی رشتے میں بندھ جانا چاہیے۔ ہم نے اس یقین کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا کہ وہ جہیز کی صورت میں اپنے واجبات ادا کرنا چاہتا ہے۔ نتیجتاً ہمارے دوسرے بیٹے شہزادہ نصراللہ مرزا کی منگنی شہنشاہ اورنگ زیب کے بیٹے کام بخش کے بیٹے یزدان بخش کی بیٹی سے ہو گئی۔

ہندوستان کے لوگوں کا رواج ہے کہ وہ ایسے مواقع پر ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ اپنے نسب پر فخر کرنے والی مغل حرم کی عورتوں نے ہمارے بیٹے سے کہا کہ وہ سات پشتوں تک اپنے آبا کے نام بتائے۔ شہزادہ نصراللہ شرمندگی سے خاموش ہو گیا۔ وہ ان ایام سے واقف تھا کہ جب ہماری کل دنیاوی دولت ایک اونٹ اور بھیڑوں کے ایک

گلے پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تو خاموشی کی مہر ثبت ہو گئی۔ ہم نے کہا: ’’بیٹے! انہیں کہو کہ تم نادر شاہ بن شمشیر بن شمشیر بن شمشیر بن شمشیر ہو...... سات نہیں ستر پشتوں تک۔‘‘ عورتیں ’’اش اش‘‘ کر اٹھیں اور ’’مرحبا‘ مرحبا‘‘ کہنے لگیں۔

یہ دلی کے شہریوں کو دی گئی ہماری ہولناک سزا کے صرف پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ تاہم انہوں نے اسے بھلا دیا اور شادی کی تقریبات منانے میں محو ہو گئے۔ لال قلعے کی دیواروں پر چراغاں کیا گیا اور آتش بازی کا مظاہرہ ہوا۔ شراب دل کھول کر پی گئی اور خوب ناچ گانا ہوا۔ نکاح 26 مارچ 1739ء کو ہوا‘ جس کے بعد دعوت ولیمہ دی گئی۔ مغل بادشاہ نے ہمیں اور ہمارے افسروں کو تحائف پیش کیے۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے گھرانے کی ایک عورت ہمارے بیٹے سے بیاہ کر اس نے ہمارے ساتھ اپنا حساب بے باق کر دیا ہے۔ ہم نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔

ہمیں اطلاع دی گئی کہ مغل شاہی خاندان کے پاس دو انتہائی قیمتی اشیاء موجود ہیں۔ ایک تھا سونے کا بنا ہوا تختِ طاؤس‘ جس میں ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔ اس کی مالیت نو کروڑ روپے تھی۔ دوسرا تھا کوہ نور ہیرا‘ جو کہ کبوتر کے انڈے کے برابر تھا اور دنیا کی سات دن کی مجموعی آمدنی کے برابر مالیت کا تھا۔ ہم نے محل کے تہہ خانوں میں تلاش کروایا لیکن نہ تو تخت ملا اور نہ ہی ہیرا کہیں پایا جا سکا۔

ہم نے محمد شاہ سے پوچھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ تخت کو تو انیس سال پہلے توڑ دیا گیا تھا جبکہ کوہ نور ہیرا اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ تاہم سعادت خان ہمیں بتا چکا تھا کہ کوہ نور محمد شاہ کے پاس ہے۔ وہ اسے اپنے آباء کی روایت کے مطابق بازو پر نہیں باندھتا بلکہ اسے اپنی پگڑی میں چھپائے رکھتا ہے۔ ہم نے ہیرے کے حصول کا ایک منصوبہ سوچا۔

ہم نے دربار منعقد کیا‘ جس میں تمام ہندوستانی امراء اور ہمارے جرنیل موجود تھے۔ پہلے ہم نے محمد شاہ کو ایک بادشاہ کے فرائض سمجھائے۔ پھر ہم اسے اس کے

آبا کے ایک سنگِ مرمر کی نشست تک لے گئے۔ ہم نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ وہ اس موقع کے لیے تیار کیا گیا تاج لے کر آئے۔ ہم نے محمد شاہ کی پگڑی اتاری اور اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔

ہم نے کہا: ''اللہ تمہیں خوشحال اور لمبی زندگی عطا کرے!'' درباریوں نے آمین کہی۔ ہم نے دیکھا کہ محمد شاہ کی نظریں اس کے اور ہمارے درمیان پڑی پگڑی پر منڈلا رہی ہیں۔ اس نے جوابی تقریر میں کہا کہ وہ ہمیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہے۔ اس سے ہمارا کام آسان ہوگیا۔ جب وہ بیٹھا تو ہم نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہمیں ہندوستان کے اس رواج کا علم ہے کہ مرد برادرانہ دوستی قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے پگڑیاں بدلتے ہیں۔ ہم نے اس کے سر سے تاج اتار کر اپنی پگڑی اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا سر اس کی پگڑی کے لیے جھکا دیا۔ اس بے چارے کو ویسا ہی کرنا پڑا۔ اس نے ہمیں اپنے ہاتھوں کوہِ نور دے دیا تھا۔ ہم نے اسے گلے سے لگایا اور دربار برخاست کر دیا۔

ہیرا واقعی پگڑی میں موجود تھا۔ وہ شاہین کے انڈے جتنا تھا اور اتنا چمک دار تھا کہ لگتا تھا اس میں سورج چھپا ہوا ہو۔ ہم نے اسے چھپانے کی بجائے اپنے دائیں بازو پر باندھ لیا۔

اپریل کے اختتام تک سورج کی کرنیں جہنم کے شعلوں میں بدل گئیں۔ ہمارے بدن پر گرمی دانے نکل آئے اور حکیم علوی خان کے شربت پینے کے باوجود ہماری کھانا کھانے اور عورتوں سے صحبت کرنے کی اشتہا ختم ہوگئی۔ بوڑھے حکیم نے کہا: ''دلی آپ کے رہنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔'' ہم نے کہا: ''بے شک' اصفہان کا ایک دن تمہارے ملک میں پوری زندگی گزارنے سے زیادہ بہتر ہے۔''

ہم نے سچ کہا تھا۔ ہم نے دلی کی تعریفیں تو بہت سنی تھیں لیکن ہمیں اس کی بہت کم خصوصیات اچھی لگی تھیں۔ ہمیں دلی کے شہری اور ان کے اطوار پسند نہیں آئے۔ ہمیں ان کے پکوان اور شرابیں بھی پسند نہیں آئیں۔ ان کے تربوز خوشبو سے عاری تھے

اور انہیں کھا کر ہمارے معدے میں ریح پیدا ہو جاتی تھی۔ جن آموں کی اتنی زیادہ تعریفیں کی جاتی تھیں' میں نے ان کی مٹھاس کو اپنے ذوق سے بہت زیادہ پایا۔ اسے کھانے سے ہاتھ اور ڈاڑھی گندی ہو جاتی تھی۔ دلی کی آب و ہوا صرف سستی' گرمی دانے اور بدمزاجی کو جنم دیتی تھی۔

ہم نے حکم دیا کہ شہر سے حاصل کیے گئے مال و اسباب کو ہاتھیوں' اونٹوں اور گدھوں پر لاد کر ایران واپسی کی تیاریاں کی جائیں۔ ہم نے ملک کا انتظام و انصرام چلانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ ہم نے دریائے سندھ کے پار واقع چار صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا تاہم باقی صوبے محمد شاہ اور نظام الملک کے لیے چھوڑ دیے تھے۔ بادشاہ سادہ اور لذت پسند تھا۔ وزیر چالاک اور لالچی تھے۔ اگر ہمارا کیا گیا بندوبست کارگر نہ رہتا تو ہم ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا حق رکھتے تھے۔

ہفتہ 5 مئی 1739ء کو ہم مغلوں کے دارالسلطنت سے روانہ ہوئے۔ صرف دو افراد ایسے تھے کہ ہم جن کے پاس اپنا دل چھوڑے جا رہے تھے۔ ایک تھا صاف گو حکیم علوی خان اور دوسری تھی پری پیکر نور بائی۔ میں ایک وسیع و عریض سلطنت کا شہنشاہ تھا لیکن ایک دیانت دار آدمی اور عورت کے دل پر میری حکومت نہیں تھی۔ ہم دونوں کو زبردستی اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے لیکن ہم جانتے تھے کہ بوڑھا سفر کرنے کا اہل نہیں ہے جبکہ نور بائی ہر وقت روتی رہے گی۔ ہم جانتے تھے کہ ہم اس کا جسم تو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں لیکن اس کا دل دلی ہی میں رہ جائے گا۔ اگر کسی عورت کا دل ہی اس کے جسم میں نہ ہو تو ایسا جسم ہی کیا!

ہم نے حکیم کو تحفوں سے لاد دیا اور نور بائی کو اس کے وزن کے برابر سونا عطا کیا اور انہیں الوداع کہہ کر دلی سے روانہ ہو گئے۔

بھاگ متی

بھاگ متی ابھی ابھی گئی ہے۔ مجھے شک سا پڑتا ہے کہ وہ گزشتہ رات کی ہم بستری سے خوش نہیں ہوئی۔ تاہم سوال یہ ہے کہ میں کیا کروں؟ اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میں رنجیدہ سا ہو جاتا ہوں۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ فون تغلق روڈ کے تھانے سے آیا ہے۔ فون کرنے والا پوچھتا ہے' ''کیا میں بدھ سنگھ کے مالک سے بات کر رہا ہوں؟''

''ہاں' وہ سارے بلاک کا چوکیدار ہے' میں اسے اپنے فلیٹ کی چوکیداری کرنے کے لیے کچھ زیادہ معاوضہ دیتا ہوں۔ کیا بات ہے؟ کیا کوئی ایکسیڈنٹ ٹھیکسیڈنٹ ہوا ہے؟''

''نہیں' وہ ایک عورت سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔''

میں بدھ سنگھ کے حوالے سے ہر بات پر یقین کرسکتا تھا' سوائے عورتوں کو چھیڑنے کے۔ ضرور کوئی مغالطہ ہوا ہوگا۔ اگر اس بے چارے نے مجھے اپنا مالک بتایا ہے تو مجھے اس کا خیال ضرور کرنا چاہیے۔ میں کار میں سوار ہو کر تھانے چلا جاتا ہوں۔

بدھ سنگھ برآمدے کے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی' جس کا دوسرا سرا کرسی پر بیٹھے' پان چباتے سپاہی کی پیٹی سے بندھا ہوا تھا۔ دونوں نے میری طرف

بالکل توجہ نہیں دی۔ میں نے جھک کر بدھ سنگھ سے کہا کہ وہ مجھے بتائے کہ کیا ہوا ہے۔ وہ کچھ بولے بغیر مجھے تکتا رہتا ہے۔ میں اسے کہتا ہوں وہ مجھے بتائے تو سہی کہ کیا ہوا ہے تاکہ میں اس کی ضمانت کرواسکوں۔

سپاہی پان کی پیک فرش پر تھوکتے ہوئے کہتا ہے: "یہ پاگل ہے۔ اندر جاکر انسپکٹر صاحب سے بات کریں۔"

میں رپورٹنگ روم میں چلا جاتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ میں وہاں کس لیے آیا ہوں۔ سب انسپکٹر مجھے کرسی پیش کرتا ہے اور پھر بتاتا ہے کہ بدھ سنگھ کو عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کے جرم پر پکڑا گیا ہے۔

میں احتجاج کرتا ہوں۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ بدھ سنگھ صاف ستھرے کردار والا آدمی ہے اس نے کبھی عورتوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ تاہم کبھی کبھی اسے کچھ ہو جاتا ہے۔ میں اپنے سر کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

سب انسپکٹر سر ہلاتا ہے اور بدھ سنگھ کے جرم کی تفصیل بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بدھ سنگھ کناٹ سرکس کے کاریڈوروں میں بڑبڑاتا ہوا پھر رہا تھا۔ ("پرارتھنا" میں مداخلت کرتا ہوں۔ "وہ ہر وقت پرارتھنا کرتا رہتا ہے")۔ سب انسپکٹر بتاتا ہے کہ بدھ سنگھ نے اچانک ایک نوجوان لڑکی کی چھاتی پکڑ لی اور "پوں پوں" کرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ لڑکی کچھ کر سکے اس نے اس کی دوسری چھاتی پکڑ لی اور پھر "پوں پوں" کرنے لگا۔

"ہاں یاد آیا۔ وہ کبھی فوج میں ٹرک ڈرائیور تھا۔ وہ ضرور انہیں بلب ہارن سمجھا ہوگا۔" میں وضاحت کرتا ہوں۔

سب انسپکٹر کناٹ سرکس والی عورت سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بدھ سنگھ نے کئی دوسری عورتوں کے بلب ہارن بھی دبائے تھے۔ وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا اور کچھ طلبا نے اسے زدوکوب کیا۔ تاہم معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ وہاں ایک عورت

فٹ پاتھ پر کیلوں سے بھری ٹوکری لیے بیٹھی کیلے بیچ رہی تھی۔ بدھ سنگھ نے کیلے دیکھے اور ان کی قیمت پوچھی۔ عورت نے جو قیمت بتائی وہ اسے زیادہ محسوس ہوئی۔ اس نے اسے اپنا کیلا کم قیمت پر لینے کی پیشکش کی۔ اس نے اپنا کیلا اس کیلا فروش عورت کو دکھایا۔ اس عورت کو غصہ آ گیا اور اس نے کہا کہ وہ اسے اپنی ماں کو پیش کرے۔ بدھ سنگھ کیا کرسکتا تھا؟ اس نے کیلا فروش عورت کی چھاتیاں پکڑ لیں اور "یوں یوں" کرنے لگا۔ تب پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔

میں دوبارہ وضاحت کرتا ہوں: "اسے ضرور اپنا ٹرک ڈرائیوری کا زمانہ یاد آ رہا ہوگا۔ کبھی کبھی اس پر یہ کیفیت طاری ہو جایا کرتی ہے۔"

سب انسپکٹر بڑا مہربان شخص ہے۔

لوگ پہلے ہی بدھ سنگھ کی کافی پٹائی کر چکے تھے۔ سب انسپکٹر کہتا ہے: "چار چھاتیاں دبانے اور اپنا قضیب دکھانے کی اتنی سزا کافی ہے۔ اس نے کسی کی ماں سے زنا تو نہیں کیا؟ تاہم اسے آئندہ ایسا مت کرنے دیجئے گا۔"

❁❁❁

میر تقی میر

میں نہیں جانتا کہ میں بڑا شاعر ہوں کہ بڑا محبت کرنے والا۔ میں نے خود کو محبت اور شاعری دونوں کے لیے مٹا دیا۔ دل کے ایک معاملے نے مجھے بدنام کروایا جبکہ میری شاعری نے مجھے ہندوستان بھر میں شہرت دلوائی۔ محبت میرے لیے کرب و اذیت لے کر آئی' شاعری مسرت و سرمستی کا احساس۔ محبت اور شاعری دونوں ہی میرے لیے دولت نہیں لائیں۔

میں نے سوائے لفظوں کے ہاروں کے اور کچھ نہ کمایا۔ ایسے لوگوں میں رہتے ہوئے کہ جو عمدہ ترشے ہوئے ہیرے اور کانچ کی مالا میں تمیز کرنے سے قاصر تھے' یہ میرے فن سے زیادہ میرے سرپرستوں کا کمال تھا کہ جنہوں نے میرے پینے کھانے کا اہتمام کیا۔ میرے والد صوفی تھے۔ ان کا نام میر محمد علی تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے کہا تھا' ''بیٹے! مجھے تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔ تمہارے دل میں ایک آگ جل رہی ہے۔ میں خوفزدہ ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کیا کرے گی۔'' اس وقت میری عمر صرف نو سال تھی اور میں ان کی بات سن کر ہنسنے لگا تھا۔ وہ دانش مند انسان تھے۔ وہ رونے لگے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محبت کی آگ مجھے جلائے گی بھی اور جِلائے گی بھی۔

ایک شام نماز ادا کرنے کے بعد انہوں نے مجھے کہا ''بیٹا! دنیا بڑی تیزی سے بدلتی ہے اور اس کے ساتھ چلنے کی مہلت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ زندگی کی راہ بہت ناہموار بھی ہے۔ تمہیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ہوں گے۔ تمہیں جتنا وقت ملے' خود کو سمجھنے میں صرف کرنا۔'' اس وقت میری عمر صرف دس سال تھی اور اپنی مرضی کا ہر کام کرنے کے لیے بہت وقت ہوتا تھا میرے پاس۔ اس کے علاوہ میرا یہ بھی خیال تھا کہ مجھے اپنے بارے میں زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم اکبرآباد (آگرہ) کے نواح میں ایک حجرے میں رہتے تھے۔ میرے والد کی دو بیویوں کے بطن سے جنم لینے والے ان کے بچوں کے علاوہ چچا امان اللہ بھی ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بھی میرے والد کی طرح اپنا زیادہ وقت نماز اور ذکراذکار میں صرف کرتے تھے۔ جب وہ ان کاموں میں مصروف نہ ہوتے تو محبت کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے والد کہتے تھے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو تم خدا کی تخلیق کردہ ہر شے سے محبت کرتے ہو۔ چچا کہتے تھے: اگر تم خدا کی مخلوق سے محبت کرتے ہو تو تم خدا سے ہی محبت کرتے ہو۔ میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ دونوں بوڑھے ہر روز کئی کئی گھنٹے ایک ہی موضوع پر کس طرح باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بہت بعد میں مجھے اس قسم کی محبت کا پتا چلا' جیسی محبت کا چچا امان اللہ تصور کرتے تھے۔ میں بعض اوقات حیرانی سے سوچتا تھا کہ جب وہ خدا کی مخلوق سے محبت کرنے کے حوالے سے تو اتنی زیادہ گفتگو کرتے ہیں لیکن اس وقت زمین سے نظریں کیوں نہیں اٹھاتے جب کوئی عورت قریب سے گزر رہی ہو۔ پھر ایک روز آگرہ کے ایک بازار میں ایک خوبصورت لڑکے سے ان کی نگاہوں کا تبادلہ ہوا اور وہ اس کی محبت میں دیوانگی کی حد تک مبتلا ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد ان کی بھوک اور ذہنی سکون مٹ گئے۔ چند دن بعد وہ اس لڑکے کے فراق میں' اس سے دوری' اس کی محبت کی آگ میں سلگتے ہوئے وفات پا گئے۔

محبت کا مفہوم میرے والد کے نزدیک بالکل مختلف تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے

مجھے کہا: "بیٹے! اپنے واحد رفیق سے محبت کرو۔ یہی محبت کائنات کو چلا رہی ہے۔ تم کائنات میں جو کچھ دیکھتے ہو' وہ محبت ہی کا ظہور ہے۔ آگ محبت کی حرارت' زمین اس کی بنیاد' ہوا اس کی بے قراری' رات اس کا خواب اور دن اس کی بیداری ہے۔"

اس وقت مجھے ان کی بات بالکل سمجھ نہیں آئی تھی۔ تاہم بے جانے سمجھے محبت کی تڑپ طفلی ہی سے مجھ میں موجود تھی اور میری زندگی کا رہنما ستارہ بن گئی تھی۔ بدقسمتی سے یہ ویسی محبت نہیں تھی جیسی محبت میں میرے چچا امان اللہ جان سے چلے گئے تھے اور نہ ہی یہ ویسی محبت تھی جیسی محبت کی باتیں میرے والد کرتے تھے بلکہ یہ تو اُس قسم کی محبت تھی کہ جس میں انسان تب مبتلا ہوتا ہے جب وہ کسی عورت کو اپنا ذہن اور اپنا دل سونپ چکا ہوتا ہے۔

میرے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی دلی کے مشہور شاعر خان آرزو کی بہن تھیں۔ ان کے بطن سے حافظ محمد پیدا ہوا۔ میری ماں نے جو کہ میرے والد کی دوسری بیوی تھیں' تین بچوں کو جنم دیا۔ میں ان میں سے سب سے بڑا تھا۔ میرے سوتیلے بھائی کو اپنے والد' سوتیلی والدہ اور ان کے بچوں سے محبت بالکل نہیں تھی۔ وہ سب سے زیادہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ میرے والد کو اس بات کا پورا علم تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے اثاثے ہم میں تقسیم کر دیے۔ گرمیوں کی ایک سہ پہر کو جب سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا' وہ اپنے کسی بیمار مرید کی عیادت کے لیے آگرہ گئے۔ جب وہ واپس آئے تو انہیں لو لگ گئی۔ انہیں جنت کی خوشبو آنے لگی تھی۔ انہوں نے حافظ محمد اور مجھے بلا بھیجا۔ انہوں نے ہمیں کہا: "بیٹو! میں ایک فقیر ہوں۔ میرے پاس نہ دولت ہے اور نہ زمین جائیداد۔ میرا کل اثاثہ تین سو کتابیں ہیں۔ میں تین سو روپوں کا مقروض بھی ہوں۔ میں اپنی آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنی کتابیں اور قرض تم دونوں میں برابر برابر تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر میرا سوتیلا بھائی بولا "ابا جان! آپ جانتے ہیں کہ میں اس خاندان

کا عالم ہوں اور صرف میں ہی ہوں جو کہ کتابوں کے مطالعے سے فائدہ حاصل کر سکتا ہوں۔ تقی ان کے اوراق سے پتنگیں بنا کر انہیں اڑانے کے علاوہ اور کیا کرے گا؟"

میرے والد اس کی بات سن کر بڑے مضطرب ہوئے۔ تاہم چونکہ ان کی موت قریب تھی' اس لیے انہوں نے کمزور لہجے میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا'' حافظ محمد! میرے الفاظ یاد رکھنا! علم کی شمع تمہارے نہیں بلکہ تقی کے گھر میں روشن ہوگی۔'' اس کے بعد انہوں نے میری طرف رخ کیا اور بولے'' بیٹا! میرا قرض ادا کرنے سے پہلے مجھے مت دفنانا۔ فکر مت کرو۔ رقم تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔''

میرے والد اللہ کو یاد کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ جونہی ان کی وفات کی خبر آگرہ پہنچی' لوگ انہیں آخری مرتبہ نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہمارے ہاں اکٹھے ہونے لگے۔ انہی میں کچھ ہندو دکان دار بھی تھے' جنہوں نے مجھے رقم پیش کی۔ میں نے ان سے رقم لینے سے انکار کر دیا لیکن جب میرے والد کے ایک مسلمان مرید نے پانچ سو روپوں کی تھیلی میری جھولی میں ڈالی تو میں نے اسے قبول کر لیا۔ میں نے اپنے والد کا قرض ادا کیا اور چچا امان اللہ کی قبر کے ساتھ انہیں دفنا دیا۔ میں گیارہ سال کی عمر میں اس دنیا میں اپنی بیوہ ماں' چھوٹے بھائی اور بہن کی دیکھ بھال کرنے کے لیے اکیلا رہ گیا تھا۔ قرض کی ادائیگی اور تدفین کے مصارف کے بعد میرے پاس سو روپے رہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ میری واحد دولت دانش بھرے وہ الفاظ تھے جو میرے والد نے مجھے سونپے تھے۔

چچا امان اللہ نے مجھے فارسی اور اردو پڑھانے کے علاوہ شعر کہنے کی تیکنیک بھی سکھا دی تھی۔ میں اس محدود سے علم کے بل بوتے پر امیر گھرانوں کے بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ بعض شاموں کو میں مشاعروں میں چلا جاتا اور دلی اور آگرہ کے مشہور شاعروں کا کلام سنتا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ عام سے قافیہ پیما تھے اور ان کی غزلوں میں کوئی نیا خیال نہیں ہوتا تھا۔ میں ایسے شاعروں' خصوصاً مشاعروں کے ایک مقبول

شاعر مسعود کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ مسعود ایک خوبصورت شخص تھا اور نہایت دلکش آواز میں اپنا کلام ترنم سے پیش کیا کرتا تھا۔ مشاعرہ شروع ہوتے ہی لوگ "پروانہ پروانہ" پکارنے لگتے۔ (پروانہ مسعود کا تخلص تھا)۔ میں اکثر اسے "پتنگا" کہا کرتا تھا۔ عورتیں مسعود کو بہت پسند کرتی تھیں۔ میں نے ہر مشاعرے میں دیکھا کہ خادمائیں پردوں کے پیچھے بیٹھیں اپنی مالکاؤں کی طرف سے کسی خاص غزل کی فرمائش والی پرچیاں لے کر مسعود کے پاس آیا کرتی ہیں۔ ان غزلوں میں عموماً پروانے کی شعلے سے محبت کا تذکرہ ہوتا تھا' جس میں جل کر پروانہ اپنے آپ کو جلا لیتا ہے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانے جتنا پرانا یہ خیال لوگوں کے جذبات کو کیسے ابھار دیتا ہے۔ میں اس بات سے زیادہ مشتعل ہوتا تھا کہ پروانہ اس قدیم خیال کا کوئی نیا رخ بھی کبھی پیش نہیں کرسکتا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ پروانہ کے حسد ہی نے مجھے پہلی مرتبہ شعر کہنے پر مجبور کیا تھا۔

جب میرے گھر کے دوسرے افراد سو جاتے' تب میں تیل کا چراغ جلا کر شعر لکھا کرتا تھا۔ اشعار آبِ تسنیم کی طرح مجھ میں سے امنڈتے تھے۔ اگرچہ میں اپنے اشعار عوام میں سنانے سے تو شرماتا تھا' تاہم میں نے کچھ ایسے شاعروں کو اپنے شعر دکھائے' جنہیں میں بہتر درجے کے شاعر تصور کرتا تھا۔ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ اتنا کم عمر لڑکا ایسے شعر کیسے کہہ سکتا ہے۔ بعضوں نے اس شک کا ظہار کیا کہ میں نے ان شعروں کو کسی دوسرے شاعر کے دیوان سے چرایا ہے۔ ایک نے کہا: "اگر یہ اشعار واقعی تمہارے ہیں تو پروانہ کا زمانہ جلد ختم ہونے والا ہے۔" دوسرا بولا: "اسے جل مرنا پڑے گا۔ وہ ہیجڑوں جیسی آواز والا محض ایک تک بند ہے۔"

یہ قصہ عام ہوگیا کہ ایک بارہ سالہ چھوکرے نے آگرہ کی محفلوں پر حکومت کرنے والے شاعر کے لیے توہین آمیز الفاظ استعمال کرنے کی جسارت کی ہے۔ بات پروانہ تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے مشتعل ہوکر کہا: "کون ہے یہ میر تقی کا بچہ؟ میں اسے ایسا

سبق سکھاؤں گا کہ وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔'' اس کے کچھ شناسا گھرانوں نے مجھے اپنے بچوں کو پڑھانے سے روک دیا۔ وہ اس پر مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے مجھے عوام میں رسوا کرنے کا فیصلہ کیا۔

آگرہ کے امیر ترین شخص نواب رئیس میاں کی حویلی میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ (سننے میں آیا تھا کہ نواب کی بیگم پروانہ کی شیدا تھی)۔ کسی نے پروانہ کے کان میں سرگوشی کی کہ حاضرین میں میں بھی موجود ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نگاہیں حاضرین میں مجھے ڈھونڈ رہی ہیں۔ جبکہ اس کو اطلاع دینے والا میری نشاندہی کر رہا ہے۔ اس نے اتنی اونچی آواز میں' کہ سب سن لیں' کہا: ''اب دیکھنا تماشا!'' ایک شاعر اپنا کلام سنا چکا' تو اس کے حواریوں نے شور مچا دیا: ''پروانہ صاحب! پروانہ صاحب!'' اس نے لوگوں کو خاموش کرانے کے لیے دو ہاتھ اٹھائے اور بولا: ''معزز حاضرین! میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ مجھ حقیر کے فن کی ستائش کرتے ہیں۔ میں تو آپ کا غلام ہوں۔ میں ہر وقت آپ کے احکامات بجا لانے کو تیار ہوں۔ تاہم آج شام میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ آپ کا یہ حقیر خادم اپنے لب کھولے' میں ہندوستان کے ابھرتے ہوئے ستارے کے لیے خاموشی چاہتا ہوں۔ پروانہ تو اس کے سامنے محض پتنگا ہے۔ یہ آپ کا قصور نہیں ہے کہ آپ نے اس کا نام نہیں سنا' کیونکہ دنیا نے ہنوز اس کا کلام سننا ہے۔ ابھی اس نے زانوئے تلمذ بھی نہیں کھولے لیکن خود کو استاد الاساتذہ سمجھتا ہے۔''

اس کا لہجہ طنز سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے حواری ہنسنے لگے۔ اس نے ان میں سے ایک شخص سے پوچھا: ''تم نے کیا نام بتایا تھا اس لونڈے کا؟ ہاں' یاد آیا' میر۔ پورا نام ہے: میر تقی میر۔ ذرا اس جلیل القدر ہستی کے سامنے شمع رکھو۔''

میں دم بخود ہو گیا تھا۔ میں نے نہ تو کبھی محفل میں لب کھولے تھے اور نہ ہی میں اپنی کوئی غزل ساتھ لایا تھا۔ شمع میرے سامنے رکھ دی گئی۔ سینکڑوں آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میری پیشانی پر پسینہ پھوٹ آیا اور میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ میں

آنکھیں بند کر کے اپنے والد کو یاد کرنے لگا۔ میں نے دعا کی: "یا اللہ! تو ہی میرا مددگار ہے۔" مجھے سوائے ایک شعر کے اور کچھ یاد نہ آ سکا۔ اس شعر میں شمع پروانے کا مضمون باندھا گیا تھا' صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس مضمون کو میری تذلیل کی کوشش کرنے والے عطائی کے انداز سے مختلف انداز میں بھی باندھا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا: "پروانہ صاحب' غزل سے پہلے میں ایک شعر آپ کی نذر کروں گا۔ امید ہے آپ اسے پسند فرمائیں گے۔" پھر میں نے صاف آواز میں شعر پڑھا:

اس نے شعلے کو دیکھا' لیکن پھر شعلے کے سوا کچھ نہ تھا
کیونکہ شعلے کو دیکھتے ہی پروانہ جل گیا

ان میں سے کسی نے محبت کا یہ رخ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔ ایسی محبت جو اپنے محبوب کے لیے فنا ہو جانے کے سوا کچھ نہیں سوچتی۔ شعر سنتے ہی لوگ "مرحبا! سبحان اللہ! کیا خوبصورت شعر کہا ہے!" پکار اٹھے۔ داد سے حوصلہ پا کر میں نے ایک غزل پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ یہ غزل میں نے گزشتہ رات ہی کہی تھی اور مجھے یاد تھی۔ یہ غزل بھی محبت کے موضوع پر کہی گئی تھی۔

میں شعر پڑھتا گیا اور حاضرین داد دیتے گئے۔ وہ ہر مصرعے پر "واہ' واہ' مکرر' مکرر" کہہ رہے تھے۔ مجھے ایک ایک شعر کئی مرتبہ سنانا پڑا۔ بہت سے لوگوں نے آ کر مجھ پر چاندی کے سکے نچھاور کیے۔ ایک خادمہ نے سونے کی ایک اشرفی اور ایک رقعہ دیا' جس میں فرمائش کی گئی تھی کہ میں اگلی صبح حویلی آ کر اپنے ہاتھ سے یہ غزل لکھ کر دوں۔ وہ رقعہ نواب کی بیگم نے بھیجا تھا۔ یہ تھا آغاز شاعری اور محبت کرنے والے کی حیثیت سے میری زندگی کا۔

☆☆☆

رات کو مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے جو داد ملی تھی' اس کی صدا ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں بدمعاش پروانہ کو ذلیل کر چکا تھا اور اب میں جس محفل میں موجود

ہوتا' وہ اس میں اپنا منہ نہ دکھا سکتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری غزل مانگنے والی وہ خاتون کون تھی؟ میرا سر گھوم رہا تھا۔ رات کو نہ سونے کے باوجود میں اپنے آپ کو صبح کے وقت تازہ دم اور فتح مند محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنی والدہ کو رات کا سارا ماجرا سنایا اور سونے کی اشرفی اور چاندی کے سکے انہیں دیئے۔ انہوں نے کہا: "یہ سب تمہارے ابا کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھیں گے کہ تم ہندوستان کے سب سے مشہور شاعر ہو گے۔"

میں نے اپنی غزل ایک کاغذ پر صاف صاف لکھی اور جلدی جلدی نواب رئیس میاں کی حویلی پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کروائی۔ نواب رئیس اپنے گھوڑوں کو مشق کروانے باہر گئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازمہ مجھے زنان خانے میں لے جانے کے لیے آ گئی۔ وہ شوخی سے بولی: "تم تو چھوٹے سے لڑکے ہو۔ ابھی تو تمہاری مونچھیں بھی نہیں آئیں۔ تمہاری زنان خانے میں موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔" میں نے اپنے آپ کو ایک تاریک کمرے میں پایا' جس میں بھاری پردے لگے ہوئے تھے اور قالین پر دیوار کے ساتھ کئی گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ اندر آئیں۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور وہ کاغذ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر انہیں پیش کیا جس پر غزل لکھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا: "میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں کہ آپ نے میری حقیر کاوشوں کو سراہا۔" وہ بولی: "یہ تو ہماری عزت افزائی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ جب آپ ہندوستان کے سب سے مشہور شاعر بن جائیں گے تو شاید آپ کو یاد آئے کہ سب سے پہلے ہم نے آپ کی عظمت کو سراہا تھا۔"

اس کے لفظ ہماری سماعت کے لیے ملکوتی موسیقی تھے۔ میں نے ہمت کر کے اسے دیکھنے کے لیے نظریں اٹھائیں۔ وہ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھی تھی۔ چونکہ ان کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں' اس لیے میں اسے زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ وہ چھوٹے قد کی فربہ عورت تھی۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کا

رنگ صاف' چہرا گول اور بال لمبے اور گہرے سیاہ تھے۔ اس کی چھاتیاں کسی ہوئی تھیں اور گول بڑے بڑے کولہے تنگ پاجامے سے نکلے پڑتے تھے۔ اس کے مسلسل تکتے رہنے سے میں بدحواس سا ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ نظروں ہی نظروں میں مجھے کھا جائے گی۔ کافی دیر بعد اس نے مجھے بیٹھنے کا کہا۔ پھر اس نے اپنی خادماؤں سے کہا کہ ہماری خاطر تواضع کا بندوبست کیا جائے۔ حد تو یہ ہے کہ جب میں ناشتہ کر رہا تھا' تب بھی میں اس کی نظروں کو اپنے پر منڈلاتا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے چھوٹے بیٹے کی ''بسم اللہ'' کی رسم میں شرکت کی دعوت دی۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں اس کے کہے ہوئے اشعار کی اصلاح کرنا پسند کروں گا۔ اس نے مجھے پیشکش کی کہ میں اس کے بچوں کو پڑھانے آیا کروں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ایک پرندہ ہوں' جو ریشمی جال میں پھنسنے ہی والا ہو۔ میں خوش تھا اور کسی حد تک الجھن کا شکار تھا۔ میری تنگ دستی کا زمانہ ختم ہوگیا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ میری آزادی کا زمانہ بھی ختم ہونے والا ہے۔

جب میں نے اپنی والدہ کو اس ملاقات کا احوال سنایا تو وہ بھی میری طرح خوش بھی ہوئیں اور پریشان بھی: ''میں نے اس بیگم صاحبہ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے اور ان کی شادی نواب صاحب سے سولہ سال کی عمر میں ہوئی تھی جبکہ نواب صاحب کی عمر اس وقت پچاس سال سے زیادہ تھی اور وہ کئی بچوں کے باپ بھی تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا دوسرا بیٹا نواب صاحب کا نہیں بلکہ اس شاعر پروانہ کا ہے' جسے اس نے کچھ عرصہ اپنا استاد بنائے رکھا تھا۔ نواب رئیس بوڑھا ہوگیا ہے اور اکثر اوقات دلی میں رہتا ہے۔'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں: ''بیٹا! اب تمہاری عمر اتنی ہوگئی ہے تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ میں تمہارے لیے کوئی خوبصورت لڑکی ڈھونڈتی ہوں۔'' اگرچہ میری عمر صرف 15 سال تھی' تاہم میں سمجھ گیا کہ وہ کس بات سے پریشان ہیں۔ انہوں نے سوچا بہتر یہی ہے کہ وہ بیگم صاحبہ سے مل کر ان کا شکریہ ادا کریں اور ساتھ ہی میرے واسطے موزوں بیوی

ڈھونڈنے کے لیے مشورہ بھی لیں۔

بیگم صاحبہ نے میری والدہ صاحبہ کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ اس نے انہیں ایک ریشمی جوڑا دیا اور انہیں یہ کہہ کر خوش کر دیا کہ ان کا بیٹا بہت جلد مشہور ترین شاعر بننے والا ہے۔ جب میری والدہ نے میرے لیے بیوی ڈھونڈنے کا موضوع چھیڑا تو اس نے بلا توقف جواب دیا: ''یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میرے پاس اس کے لیے موزوں لڑکی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند کریں گی؟'' میری والدہ نے کہا ''بیگم صاحبہ! اگر وہ لڑکی آپ کو پسند ہے تو ہمیں اسے دیکھنے یا کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا آپ کا انتخاب مبارک کرے۔''

اگلے دن بیگم صاحبہ نے مجھے چھیڑنے کے لیے کہا کہ اس نے میرے لیے بیوی ڈھونڈ لی ہے۔ ''وہ کوئی حور نہیں ایک سادہ سی لڑکی ہے سنگ مرمر کی طرح بے داغ عصمت کی حامل۔ ایسی بیوی کے ہوتے ہوئے تمہارے گھر میں کبھی بدنامی کی تاریکی نہیں ہوگی۔ اس کے والدین امیر تو نہیں ہیں لیکن شادی کے اخراجات ہم برداشت کریں گے اور اسے مناسب جہیز دیں گے۔ تمہیں میرا انتخاب پسند آئے گا۔''

بیگم صاحبہ نے میرے لیے جو لڑکی منتخب کی تھی' اس کا باپ بیگم کا دور پار کا عزیز تھا اور نواب صاحب کے ایک باغ میں نگران کے طور پر ملازم تھا۔ لڑکی کا نام سلیمہ تھا۔ جب سلیمہ سے میری شادی ہو گئی' تب مجھے بیگم صاحبہ کے منصوبوں کا علم ہوا۔ بلاشبہ میری بیوی حور نہیں تھی۔ وہ بانس کی طرح دبلی پتلی تھی' میں اس کی کمر کو اپنی مٹھی میں جکڑ سکتا تھا۔ اس کی چھاتیاں بمشکل دکھائی دیتی تھیں۔ اس کے سامنے کے دانت منہ بند ہونے کے بعد بھی باہر کو نکلے رہتے تھے۔ وہ بات کرتی تو اس کے مسوڑے نظر آنے لگتے۔

اس کا کردار سنگ مرمر کی طرح بے داغ نہ ہوتا تو اور بھلا کیا ہوتا۔ تاہم وہ میری بیوی بنی تو اس کی وجہ سے میں گمراہی کی طرف مائل ہو گیا۔

بیگم صاحبہ بڑی چالاک عورت تھی اور اپنا کام کسی نہ کسی طرح نکال لیتی تھی۔

اس بوڑھے نواب رئیس کی صورت میں خاوند پالیا تھا اور شاعر کہلانے والا گلوکار قافیہ بند اس کا جزوقتی عاشق تھا۔ اس کا شعری ذوق بس اتنا تھا کہ جو شاعر زیادہ درد پاتا' وہ اس کو پسند کرنے لگتی تھی۔ چونکہ میرا ستارہ عروج پر تھا' اس لیے اس نے اس کی سرپرست اور محبوبہ بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے میرے لیے ایسی بیوی ڈھونڈی تھی' جسے میں نظر انداز کرسکتا تھا۔

میں بیگم صاحبہ کا نام پردۂ اخفا میں رکھوں گا۔ میرے نزدیک سب سے بڑا گناہ اس عورت سے بے وفائی کرنا ہے' جو رضامندی سے خود کو آپ کے حوالے کر دے۔ میں اس کا صرف وہ نام یہاں درج کروں گا' جو میں نے اس کی صاف رنگت اور گول چہرے کی وجہ سے اسے دیا تھا۔ وہ نام تھا قمر النساء۔ وہ اس نام سے بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ تریا چلتر سے خوب آگاہ تھی۔ وہ ورغلانا بھی جانتی تھی اور ورغلایا جانا بھی' وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کسی مرد کو اس مغالطے میں کیسے رکھنا ہے کہ اس کے سوا دنیا میں اسے کسی کی پروا نہیں۔ وہ اپنے عاشقوں کو جتنی رضامندی کے ساتھ اپنی روح سونپتی تھی۔ اتنی ہی رضامندی کے ساتھ اپنا جسم بھی سونپ دیتی تھی۔ وہ جتنا عرصہ میری محبوبہ رہی' اس نے میرے ہر شعر کو الہام کا درجہ دیا۔ وہ بیک وقت میری ماں' محبوبہ' آیا اور دوست بن گئی۔ وہ مجھ سے لمحہ بھر کی جدائی بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنی منظوری کے بغیر بننے والے میرے کسی دوست کو بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے جنم جنم وفاداری نبھانے کا عہد کیا۔ مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے مجھے قید کر رکھا ہو۔ میں ہر وقت اس سے آزادی پانے کا آرزومند رہتا تھا۔ میرے دلی جانے کے بعد قمر النسا آگرہ کی محفلوں میں مشہور ہو جانے والے ایک اور قافیہ پیمائی کرنے والے شخص کو توجہ دینے لگی تو میں بکھر کر رہ گیا۔ اس عورت نے مجھے بنایا تھا اور اسی نے مجھے برباد کر دیا تھا۔

☆☆☆

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مجھے کس طرح نواب رئیس کی حویلی میں مدعو کیا

گیا اور اس کے بیٹوں کا استاد مقرر کیا گیا۔ جب میں بچوں کو پڑھا رہا ہوتا تھا تو بیگم صاحبہ وہیں موجود رہتی تھی۔ اس دوران وہ مسلسل مجھے تکتی رہتی تھی۔ جب میں بچوں کو سبق پڑھا چکا ہوتا تو وہ مجھ سے اصرار کرتی کہ میں گذشتہ رات کہے گئے اشعار اسے سناؤں۔ وہ ہر مصرعے پر بے تحاشا داد دیتی اور جب میں مقطع سناتا تو وہ کہتی ''سبحان اللہ!'' پھر وہ اس کاغذ کو میرے ہاتھ سے لے لیتی جس پر غزل لکھی ہوتی تھی اور اسے اپنے سینے سے لگا لیتی۔ وہ مجھے اپنے اشعار بھی دیتی تھی۔ اس کے اشعار فنی اعتبار سے کمزور ہوتے تھے لیکن اس نے ان میں مجھے مخاطب کیا ہوتا تھا۔ میں شعروں کی تعریف کرتا اور مشورے دیتا کہ انہیں کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات میں بھی اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر اپنے ماتھے سے لگا لیا کرتا تھا جب میں شام کو گھر واپس آتا تو دیکھتا کہ اس نے میرے گھرانے کے لیے بریانی اور دوسرے لذیذ پکوان بھجوائے ہوتے تھے۔ اس طرح اس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میں مغلیہ سلطنت کا سب سے اہم شخص ہوں۔ رات کو جب میں اپنی بڈیوں کی مالا بیوی کے ساتھ لیٹتا تو تصور میں دیکھتا کہ بیگم اپنے بڑے بڑے کولہے ابھارے میری سیوا کو تیار پڑی ہے۔

جب بیگم کسی شے کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیتی تھی تو سازش کا ایسا جال بنتی تھی' جس میں ہر متعلقہ شخص پھنس جاتا تھا۔ وہ دوسروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچانے کی ماہر تھی۔ اشعار کے تبادلے سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ میں شکار بننے کو آمادہ ہوں۔ تب اس نے اپنے شوہر کا رخ کیا: اس نے اسے قائل کیا کہ اس کے مستقبل کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ دلی کا دورہ کرے اور ان افواہوں کی حقیقت سے آگاہ ہونے کی کوشش کرے کہ نادر شاہ ہندوستان پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ شاہی خزانچی صمصام الدولہ کو قائل کرے کہ وہ میر کو بادشاہ کے حضور پیش کرے۔ صمصام الدولہ دلی کا سب سے طاقتور شخص تھا۔ اس کی چال کو کون سمجھ سکتا تھا۔ اگر کسی کو شبہ بھی ہوتا تو وہ سوچتا کہ اگر وہ مجھ سے عشق کرتی ہے تو پھر مجھے آگرہ سے دور

کیوں بھیج رہی ہے؟ اس کے شوہر نے نہ صرف اس کی دونوں باتیں مان لیں بلکہ مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس کی غیر موجودگی میں حویلی میں رہوں کیونکہ کسی نہ کسی بھروسے کے آدمی کو گھربار اور اس کے بچوں کی تعلیم کا خیال رکھنے کے لیے حویلی میں رہنا چاہیے۔

جلد ہی نواب رئیس گھوڑ سواروں کا ایک دستہ لے کر دلی چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی حویلی میں بہت سی تبدیلیاں آ گئیں۔ لڑکوں کو ان کے باپ کی خواب گاہ میں منتقل کر دیا گیا اور ان کا کمرہ مجھے دے دیا گیا۔ دونوں کمروں کے درمیان بیگم صاحبہ کی اپنی خواب گاہ تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وقت بہت قیمتی ہے اور تیزی سے گزر رہا ہے' لہٰذا اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ اس کی چالاکی اور اداکاری کی کوئی مثال ہی نہیں تھی۔ صبح کے وقت اس نے آنسو بھری آنکھوں سے اپنے بوڑھے خاوند کو الوداع کیا اور سہ پہر کو اس نے اپنی ٹانگوں' بغلوں اور ناف کے نیچے کے بالوں کو صاف کیا اور جسم پر خوشبودار تیل ملا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم رات کے کھانے کے ایک گھنٹے بعد پتا چلا تھا' کہ جب بچے سونے اور ملازمین اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ وہ میرے پاس یوں آئی جیسے وہ اس کا انتظار کرنے والے خاوند کے بستر پر آئی ہو۔ پرانے شادی شدہ لوگوں کی طرح ہم نے محبت بھری گفتگو میں وقت ضائع نہیں کیا۔ (لوگ جنسی عمل کرنے سے پہلے محبت کی شاعری ہی سناتے ہیں اور ان کی نگاہیں آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔ سو یہ تو ہم کافی عرصہ سے کر رہے تھے۔) اس نے چراغ بجھانے کا تردد بھی نہیں کیا اور اپنے کپڑے اتار دیئے۔ پھر اس نے میرے کپڑے بھی اتارے اور مجھ سے لپٹ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہونٹوں سے شہد پیا' یہاں تک کہ تھک گئے۔ اس نے مجھے خاموشی سے بستر پر لٹا دیا اور خود میرے اوپر لیٹ گئی۔ اس کے اعضاء اس طرح نم ناک تھے جیسے گرمیوں کی صبح گلاب کی پتیوں پر اوس پڑی ہو۔ اس نے اتنی شدت سے میرے منہ سے منہ جوڑا

کہ میرا دانت دکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کراہنے لگی اور پھر اس نے ایسا جھٹکا مارا کہ اس کا سارا جسم ہل کر رہ گیا۔ وہ میرے اوپر ڈھے گئی۔ وہ پسینہ پسینہ ہو چکی تھی۔ میں ایسی لذت و مسرت سے کبھی ہمکنار نہیں ہوا تھا' نہ ہی میں اسے لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں۔ جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے اسے کولہوں سے پکڑ کر روک لیا۔ وہ عمر اور تجربے میں زیادہ تھی جبکہ میں کم عمر تھا اور اس سے زیادہ شہوت رکھتا تھا۔ وہ مسکرائی اور آمادگی کے اظہار کے لیے بستر پر لیٹ گئی۔ میں اس کے چہرے' گردن اور چھاتیوں پر دانتوں سے ہلکا ہلکا کاٹا اور کانوں میں زبان پھیری۔ اس مرتبہ وہ میرے کلائمیکس پر پہنچنے سے پہلے کئی مرتبہ کلائمیکس پر پہنچی۔ ہم نے آدھے گھنٹے بعد دوبارہ جنسی عمل کیا۔ ساری رات یہی کھیل جاری رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کھیل کب ختم ہوا اور وہ کب اپنی خواب گاہ میں گئی۔ جب میں جاگا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے پپوٹے گوند سے جڑے ہوئے ہوں۔ مجھے تھکن کی بجائے بہت زیادہ تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہ تھا کہ میں نے اس کے خاوند اور اپنی بیوی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ بلکہ میں تو ذہنوں اور جسموں کے اس ملاپ سے بہت خوش تھا۔

میں صحن میں نکلا تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ موڑھے پر بیٹھی ہے اور دو خادمائیں اس کے پیر دبا رہی ہیں۔ فرش پر نواب کے پابند کبوتر گنگناتے پھر رہے تھے۔ میں نے آداب کہا تو وہ مسکرائی اور بولی: ''ہمیں یقین ہے ہمارے شاعر دوست نے پرسکون رات گزاری ہوگی۔'' پھر اس نے ایک خادمہ کو حکم دیا کہ میرے لیے ناشتہ لگائے۔ اس نے سکندرہ سے آیا ہوا اپنے شوہر کا خط پڑھ کر سنایا اور مجھے بتایا کہ اس نے میری بیوی کے لیے خشک میوے کا طشت بھجوایا ہے۔

اس نے ہماری زندگیوں کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے بیٹوں کو پڑھانے کا جتنا معاوضہ دیتی تھی' اتنی رقم میری بیوی اور والدہ نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے میری بیوی سے کہا: ''کیا میرے بیٹے تمہارے بیٹے نہیں ہیں؟

تم اپنے خاوند کو انہیں پڑھانے کی اجازت دے کر ہمیں تاحیات اپنا احسان مند بنا لو گی۔ میں اس کے بدلے میں جو رقم ادا کر رہی ہوں اس سے تو بمشکل پاندان کا خرچ ہی پورا ہو سکتا ہے!'' اس نے روپوں اور تحائف کے ذریعے میری بیوی اور والدہ کو خوش رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے خاوند کو لکھا کہ اس نے مجھے اپنے بچوں کو پڑھانے کے علاوہ کوئی کام کرنے سے روک دیا ہے۔

وہ ساری دنیا سے جھوٹ بولتی تھی لیکن اس نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے مجھے کئی بچوں کے باپ رئیس میاں سے اپنی شادی کا احوال سنایا۔ اس نے بتایا کہ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کوئی اس کی اور اس کے معاملات کی دیکھ بھال کرے۔ اس نے اس کی یہ ضرورت پوری کر دی اور وہ اپنا وقت گھوڑوں اور کبوتروں میں گزارنے لگا۔ وہ مہینوں اور شراب پی کر تحریک پاتا تو اس کے ساتھ ہم بستری کرتا تھا۔ وہ اس کی انا کو گزند نہ پہنچنے کے خیال سے اس طرح ظاہر کرتی جیسے اس کے جذبوں کی شدت کے سامنے بے حال ہو گئی ہو۔ اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ پروانہ کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ اس نے بتایا کہ پروانہ نے اسے حاملہ کر دیا تھا اور اسے حمل ساقط کروانے میں بہت مشکل پڑی تھی۔ ہمارے درمیان کوئی بات راز نہ رہی۔ اس نے اپنے اور میرے درمیان ایسی قربت پیدا کر دی تھی کہ جب میں نے اپنی بیوی سے ہم بستری کی تو ندامت کا شکار ہو گیا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے سمجھایا کہ ہمارے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ میری بیوی تو مجھ سے محبت کا اظہار کرے لیکن مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ چونکہ میری بیوی بے چاری بڑی شرمیلی تھی۔ اس لیے اس نے مجھ سے کوئی تقاضا یا گلہ نہیں کیا۔ اسے یقین تھا کہ میری ساری توانائیاں شعر کہنے اور بچوں کو پڑھانے میں صرف ہو رہی ہیں۔

میں نے بیگم کی صحبت میں کئی راحت و لذت بھرے دن گزارے۔ اس کے جسم نے مجھے زندگی کا حقیقی مفہوم بتایا۔ ہم گھنٹوں اپنے دل اور جسم کی آرزوئیں پوری

کرنے میں محو رہتے۔ ہمیں امید ہوتی تھی کہ ہماری ایک دوسرے کے لیے اشتہا ہمیشہ کے لیے آسودہ ہو گئی ہے۔ تاہم ایسا نہ ہوا۔ ہم جب بھی ملتے یوں لگتا جیسے پہلی بار ملے ہوں۔ ہم ساری ساری رات ایک دوسرے سے ننگے لپٹے رہتے۔ جونہی صبح ہوتی وہ کسی نوبیاہتا لڑکی کی طرح اپنا چہرا شرم سے ڈھانپ لیتی۔ میں اس کے پردے کے پیچھے چھپے اسرار کو جاننے کا آرزومند تھا۔ میں نے جتنا زیادہ اس کا جسم دیکھا' اتنا ہی زیادہ میری شہوت میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا جسم موتیوں کی طرح تابدار تھا۔ اس کے جسم کے سامنے تو چاندنی بھی ماند پڑ جاتی تھی۔

میں دنیا جہان' اپنی والدہ' اپنی بیوی اور بچے سے غافل ہو گیا۔ اپنے گھرانے کو نظر انداز کرنے پر میرے رشتہ دار میرے خلاف ہو گئے۔ تاہم محبت میں اذیت سہنے سے زیادہ بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے!

نواب رئیس دلی سے ایک مہینے بعد واپس آیا۔ تاہم اس وقت میں جان چکا تھا کہ بیگم صاحبہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ جلد ہی اسے کسی دوسرے سفر پر بھیج دے گی۔ تاہم میں دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ اس نے نواب رئیس سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا اور اس کے سامنے میرے ساتھ رسمی سی گفتگو کی خاوند کے لیے اس نے اپنا بہترین ریشمی لباس پہنا تھا' آنکھوں میں سرمہ ڈالا تھا' ہونٹوں پر مسّی جمائی تھی۔ اس نے اس کے فراق میں اپنی بیقراری کا اظہار کیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے کہا: "اس پر صعوبت سفر کے بعد نواب صاحب کو آرام کی ضرورت ہے۔" وہ اپنے خاوند کے پیچھے اس کی خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں اپنا قلم پکڑے تنہا رہ گیا۔

میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اتنی قربتوں کے بعد میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے علاوہ کسی کا لمس تک گوارا نہیں کر سکیں گے۔ تاہم اس نے اپنے خاوند کی طلب کا جس بے شرمی سے اظہار کیا' اس کی مجھے سمجھ نہ آ سکی۔ جب وہ سہ پہر کے وقت خواب گاہ سے باہر آئی تو اس کا حلیہ زیادہ تکلیف دینے والا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے

تھے اور سرمہ رخساروں پر پھیلا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ سب کو دکھانا چاہتی ہو کہ وہ کیا کرتی رہی ہے۔ میں اداس بیٹھا تھا۔ وہ میرے آرام کے حوالے سے پوچھنے لگی۔ اپنے خاوند کی موجودگی میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے میری بیوی کو پیغام بھجوا دیا ہے کہ میں ضروری کام سے حویلی ہی میں رہوں گا۔ اس نے کہا تھا: ''میرے شوہر تمہیں بتائیں گے کہ صمصام الدولہ اور ان کے درمیان کیا طے پایا ہے۔'' اس کے خاوند نے کہا تھا: ''ہاں' میں نے دلی میں اپنے قیام کے دوران افواہیں سنی ہیں کہ ایرانی حملے کرنے والے ہیں۔ اگر وہ افواہیں درست ہیں تو ہمیں اپنی تلواریں کمر سے باندھ لینی چاہئیں۔ اگر وہ افواہیں درست ہیں تو پھر میں ایک مہینے کے اندر اندر گھر واپس آ جاؤں گا۔ اس دوران تم یہیں رہنا اور خواتین کی دیکھ بھال کرنا۔'' بیگم صاحبہ نے کہا تھا: ''اگر آپ نے میری درخواستوں کو نہ مانا تو آپ کے سر کی قسم میں آپ سے کبھی نہیں بولوں گی۔'' اگرچہ میں بہت غصے میں تھا' تاہم چونکہ میرے سامنے انکار کا راستہ نہیں تھا' اس لیے میں وہاں قیام کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس شام آگرہ کے بہت سے شہری نواب کی خیریت دریافت کرنے اور دلی کی خبریں سننے کے لیے آئے۔ نواب نے باتوں کا رخ جلدی تبدیل کر دیا۔ وہ بولا: ''دلی کی باتیں چھوڑو' جو دال ساگ حاضر ہے' کھاؤ اور تقی صاحب کے شعر سنو۔ اگر تم نے میر صاحب کا کلام نہیں سنا تو کچھ نہیں سنا۔''

شاندار کھانے کے بعد مشاعرہ برپا ہوا۔ میں دوسرے شاعروں کی تک بازی کو خاموشی سے سنتا رہا۔ ایک خادم نے مجھے ایک پرچی دی۔ میں نے بیگم صاحبہ کی تحریر پہچان لی۔ ''اپنی حقیر بندی کو اپنے کلام سے نوازیں۔'' شمع میرے سامنے رکھی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں پردے کے پیچھے سے مجھ پر جمی ہوئی ہیں اور کان میرے شعر سننے کے منتظر ہیں۔

میں نے اپنے شعر سنائے' مشاعرہ رات دیر گئے تک جاری رہا۔ لوگ بار بار فرمائش کر کے میرا کلام سنتے رہے۔ اختتام پر میں داد و ستائش کے نشے سے چور تھا لیکن

چھت پر اکیلا لیٹا تھا اور ستارے میری بے چارگی کا نظارہ کر رہے تھے۔ غصے میں میرا رواں رواں جلنے لگا۔ اسی چھت تلے خود کو میری ہستی کا جزو بنا دینے والی عورت ٹانگیں پھیلائے ایک دوسرے مرد کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اس نے اپنے خاوند سے تعلقات بدلے بغیر مجھے میری بیوی سے اجنبی بنا دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے۔

نواب رئیس دارالسلطنت واپس چلا گیا۔ میں دہلی گیٹ تک اس کے ساتھ گیا۔ اس روز میں حویلی کی بجائے اپنے گھر چلا گیا۔

سہ پہر کے وقت میں اپنی بیوی کو بستر میں لے گیا۔ میں نے اس کے ساتھ اتنی وحشت سے ہم بستری کی کہ سہاگ رات سے لے کر اس دن سے پہلے تک کبھی نہیں کی تھی۔ وہ بے چاری تشکر کے ساتھ میری وحشت کو سہتی رہی۔ وہ تو اسے میری محبت کا ثبوت تصور کر رہی تھی۔ اس سہ پہر کی ہم بستری کے نتیجے میں اسے حمل ٹھہرا اور نو ماہ بعد میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ شام کے وقت بیگم صاحبہ کے خادم پکوانوں اور پھلوں سے بھرے طشت لے کر آئے۔ بیگم صاحبہ کی رازدار خادمہ نسیمہ نے چپکے سے ایک رقعہ مجھے دیا۔ اس رقعے کے شروع میں میرا ایک شعر لکھا ہوا تھا' جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہمارے محبوب نے ایک مدت سے خط تک نہیں لکھا' ایسا لگتا ہے کہ وفا کا دستور مٹ گیا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ میرے بغیر بہت اداس ہے اور اگر ہم کل تک واپس نہ آئے تو وہ زہر کھا کر مر جائے گی اور اس کا خون میرے سر ہو گا۔ میرا غصہ غائب ہو گیا۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میں نے نسیمہ سے کہا کہ میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔

میں حویلی یوں گیا جیسے کوئی مجرم عدالت میں معافی مانگنے جاتا ہے۔ میری طرف دیکھے بغیر بیگم صاحبہ نے طنزیہ لہجے میں کہا: "میر صاحب ہمارے ساتھ فقیروں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ جب ان کا دل چاہتا ہے تو ہمارے کاسے میں توجہ کی بھیک ڈال دیتے ہیں۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کئی گھنٹے بچوں کو پڑھانے میں

گزارے۔ وہ کوئی بات کیے بغیر بیٹھی مجھے تکتی رہی۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں تکیے پر ایک پرچی پڑی تھی۔ اس پر میرا ایک شعر لکھا ہوا تھا' جس کا مفہوم یہ تھا کہ زندگی انتظار کا دوسرا نام ہے۔

میں سارا وقت اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آئی۔ شام کو میں نے اسے صحن میں اکیلا پایا تو روکھے لہجے میں پوچھا کہ کیا مجھے واپس جانے کی اجازت ہے۔ اس نے کہا: "میرے جنازے پر آنے کی زحمت بھی مت کیجیے گا۔" پھر وہ اپنا چہرا دوپٹے سے چھپا کر بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں طربیہ کھیل میں ولن کا کردار ادا کرنے کا عادی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کاش نواب رئیس مجھے اپنے ساتھ دہلی لے گیا ہوتا تو میں اس عورت کی گرفت سے آزاد رہتا' جس نے میری حالت ایسی کر دی ہے جیسی شہد میں پھنسی مکھی کی ہوتی ہے۔ ابھی بہت کچھ ہونا تھا۔ جب میں رات کو کھانا کھا کر اپنے کمرے میں گیا تو وہ وہاں آ گئی۔ اس نے برتن دھونے والے نوکروں کی پروا کیے بغیر اندر سے دروازے کی کنڈی لگا دی اور میری طرف بڑھی۔ میرے روکنے سے پہلے وہ میرے قدموں میں گر کر رونے لگی۔ آگرہ کے امیر ترین نواب کی بیوی ایک غریب استاد اور شاعر کے پیروں میں پڑی رو رہی تھی! اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا: "آپ مجھ سے خفا ہیں۔ مجھے جو چاہے سزا دے لیں۔ مجھے ماریں' میرے ساتھ کسی طوائف جیسا سلوک کریں' جو مرضی آئے کریں لیکن مجھ سے خفا مت ہوں۔"

میں نے اسے اٹھا کر اپنی چارپائی پر بٹھا دیا اور اس کے آنسو پونچھے۔ اس نے اپنی چھاتیاں نکالیں اور میرا سر ان کے ساتھ لگا دیا۔ "انہیں اتنے زور سے کاٹو کہ خون بہنے لگے۔" میں نے نرمی سے چوم لیا۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوما۔ جب میں نے دخول کیا تو وہ بولی: "چلو کہیں بھاگ چلیں۔ میں اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ دوبارہ کبھی مجھے چھوئے۔"

میں نے مسکرا کر اس سے پوچھا: ''تمہارے بچوں کا کیا بنے گا؟ بدنامی بھی بہت ہوگی۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: ''میں تمہارے ساتھ رہنے اور تمہاری خدمت کرنے کے لیے ہر شے اور ہر شخص کو چھوڑ دوں گی۔ وعدہ کرو کہ مجھ سے شادی کرو گے۔'' میں نے وعدہ کرلیا۔ جب میں کلائمیکس پر پہنچنے والا تھا تو میں نے واپسی کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے اپنی ٹانگوں سے جکڑ لیا اور چیخی: ''نہیں' نہیں! آج رات میں تمہاری ہوں!''

جب پہلا دور ختم ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا: ''کیا اس نے اپنے التفات کا رخ اپنے شوہر کی طرف پھیر دیا ہے۔'' اس نے کہا: ''تم مجھے کس قسم کی عورت سمجھتے ہو؟ مجھے پتا ہے تمہیں اس بوڑھے کے ساتھ میرے لگاؤ کا اظہار کرنا پسند نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کے سامنے بناوٹ کرنا پڑتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کیا؟ کیا تم اپنی بیوی کے لیے مجھ سے بے وفائی کر رہے ہو؟''

میں نے جواب میں الٹا اسی سے سوال پوچھا: ''تمہارا کیا خیال ہے ایسا ممکن ہے؟'' ہم دوبارہ محبت کے کھیل میں معروف ہو گئے۔ جنس کی کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو کچھ کہیں بھی نہیں لکھا گیا' ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ وہ سب کچھ کیا۔ ہم نے ایک اپنی نجی زبان وضع کر لی تھی۔ وہ میرے لیے ''قمر'' تھی اور میں اس کے لیے ''جان'' تھا۔ ہم نے اپنے اعضا کے بھی نام رکھ لیے تھے۔ میرے عضو کا نام راجہ بابو تھا اور اس کے عضو کا نام بھورانی تھا۔ اسے اپنی ایک باتونی سہیلی ناپسند تھی۔ جب اسے حیض آیا ہوتا تو کہتی کہ وہ سہیلی آئی ہوئی ہے۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہر ملاپ کو مکمل کامیاب ہونا چاہیے۔ اگر میں جلدی سے گزرتا تو وہ نرمی سے میری شہوت دوبارہ جگاتی۔ اگر وہ محسوس کرتی کہ سامنے والا حصہ تھکا ہوا ہے تو بڑی فیاضی سے میری لذت کے دوسرے راستے مہیا کر دیتی۔ کیا کوئی مرد اس سے بہتر عورت سے آشنا ہو سکتا تھا؟ یا کوئی عورت مجھ سے بہتر کسی مرد سے آشنا ہو سکتی تھی؟ میں نے ایک شعر کہا تھا' جس کا مفہوم ہے کہ

جذبوں نے ہی انسان کو انسان بنایا ہے۔ اگر جذبے نہ ہوتے تو ہر انسان دیوتا ہوتا۔

یوں دن گزرتے گئے۔۔۔اور راتیں بھی۔ ہم جب اکیلے ہوتے تو ایک دوسرے کو اپنے اپنے ماضی کے حالات سناتے۔ میرے پاس اپنے بارے میں بتانے کے لیے بہت کم تھا تاہم اس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ اس نے بتایا کہ اس فضول پتنگے کے ساتھ محبت کر کے اسے رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں ملا کیونکہ اس نے اس کی اور اپنی وصال کی کہانیاں جگہ جگہ سنانا شروع کر دی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ مرد تو بدنامی سے نبرد آزما ہو سکتا ہے لیکن عورت ایک مرتبہ بدنام ہو جائے تو ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتی ہے۔ میرے سامنے عریاں لیٹی ہوئی اس عورت نے مجھے یقین دلایا کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا مرد کبھی نہیں آئے گا۔ میں بھی کیا سادہ تھا!

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لوگوں نے باتیں بنانا شروع کر دیا۔ تاہم ایسا لگتا تھا کہ بیگم صاحبہ کو کسی بات کی فکر نہیں تاوقتیکہ بات اس کے شوہر تک نہ پہنچے۔ اس کے نوکر جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنی مالکہ کے حوالے سے تھوڑی سی بھی بات کی تو ان کے گھرانے برباد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ نواب رئیس کو بتاتے تھے کہ جب وہ گھر سے باہر ہوتا ہے تو بیگم صاحبہ کھانا بھی مشکل ہی سے کھاتی ہیں اور گھنٹوں ان کی واپسی کی دعائیں کرتی رہتی ہیں۔ بوڑھا ان کی باتوں میں آ جاتا۔ ایسی ہوتی ہے مرد کی مردانگی!

بہر حال حویلی آگرہ تو نہیں تھی۔ جب بھی میں بازار جاتا میرے شناسا مجھ سے ذومعنی باتیں کرتے: ''میر بھائی! آپ کا قلم بھی کیا طاقت رکھتا ہے' یہ دلوں کے ساتھ ساتھ پاجامے بھی پھاڑ سکتا ہے!'' یا وہ میری پشت پر ہاتھ مار کر کہتے: ''میر تقی! تم بڑی خوش نصیب ہو!'' ایک شام میں اپنے گھر گیا تو میری والدہ نے مجھے الگ لے جا کر تشویش بھری آواز میں کہا: ''بیٹا تقی! جتنے منہ اتنی باتیں۔ لوگوں کے منہ پر کوئی بھی قفل نہیں لگا سکتا۔ آگرہ کا ہر شخص تمہارے اور بیگم صاحبہ کے بارے میں باتیں بنا رہا ہے۔ مجھے کسی بات پر یقین نہیں ہے' تاہم اگر یہ باتیں اس کے خاوند تک پہنچ گئیں تو

تمہیں پتا ہے وہ ہم سب کو قتل کروا دے گا! میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ حویلی جانا چھوڑ دو۔ اس کا کوئی بھی جواز بنا لو۔ کہہ دو کہ تمہاری بوڑھی ماں مر رہی ہے یا ایسا ہی کوئی اور بہانہ بنا لو۔"

میں نے بیگم صاحب کو اپنی والدہ کی باتیں بتائیں۔ پہلے تو وہ فکر مند سی ہو گئی پھر کہنے لگی: "لوگوں کے ذہن گندے ہیں!" اس کے بعد سے ہمارے جذبوں کی شدت ماند پڑ گئی۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ میرے لیے مغل دربار میں پہنچنا کتنا ضروری ہے۔ ایک ماہ بعد اس نے اپنے خاوند کا ایک خط پڑھوایا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ اس نے میری بادشاہ کے حضور حاضری اور ایک سرپرست کا بندوبست کر لیا ہے' میں فوراً دلی پہنچ جاؤں۔ بیگم صاحب نے کہا: "میری زندگی ویران ہو جائے گی لیکن جب میں تمہارے ستارے کو ہندوستان پر دمکتا دیکھوں گی تو میں کہوں گی کہ یہ شخص میرا عاشق تھا' میں اس کی معشوقہ تھی۔ جب میری روانگی کا دن آیا تو اس نے بہت ساری سونے کی اشرفیاں ایک سبز ریشمی رومال میں باندھ کر مجھے دیں اور میرے کان میں سرگوشی کی: "اللہ سب سے بڑا محافظ ہے' وہ بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔" اس نے میرے بازو سے امام ضامن باندھا اور کہا: "تم جہاں بھی رہو' اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو' اللہ تمہیں ہر تکلیف سے بچائے اور تمہیں عزت و شہرت عطا کرے۔" تاہم اس نے یہ دعا نہیں کی تھی کہ "اللہ تمہیں میرے پاس واپس لائے۔"

☆☆☆

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میری آگرہ سے روانگی کے وقت بیگم صاحب اداس تھی یا خوش۔ میں تو اپنے احساسات کے حوالے سے بھی کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک پرندہ ہوں' جسے پنجرے سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ میں آزادی سے حاصل ہونے والی خوشی سے گانا چاہتا تھا۔ پھر مجھے اس سنہرے پنجرے کی یاد ستانے لگی' کہ جس میں اس نے ہمیں دو سے زیادہ برس تک قید

رکھا تھا' مجھے محبت کے گیت سنائے تھے' کھلایا پلایا تھا اور میری دیکھ بھال کی تھی۔ کیا مجھے اس سے محبت تھی؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ شاید یہ اس کی محبت تھی جس نے مجھے اپنی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور میں خود سے محبت کرنے لگا تھا۔ جو کچھ بھی تھا' جب میں نے اپنے سفر کے دوران تیسرا پڑاؤ متھرا میں ڈالا تو مجھے اپنی بوڑھی ماں' بھائی' بیوی اور دو سالہ بیٹے گلّو سے زیادہ قمرالنسا کی یاد ستانے لگی۔

وہ طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ پورے ملک میں جاٹوں' گجروں' مرہٹوں اور روہیلوں کے گروہ بے کس و بے بس مسافروں کو لوٹتے پھرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ آگرہ سے دلی جانے والی شاہی سڑک بھی ان کی شورشوں سے محفوظ نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: "اے میر! سفر کے شروع ہی میں کانٹوں کا رونا کیوں روتے ہو' ہنوز دلی دور است!" (دلی ابھی دور ہے)۔ میں ایک قافلے میں شامل ہو گیا' جس کے سامنے اور عقب میں مسلح گھوڑ سوار اور بندوقچی پہرے پر مامور تھے۔ ہم صرف دن میں سفر کرتے تھے اور رات کو سراؤں میں قیام کرتے تھے۔ ان سراؤں پر بھی محافظ مامور ہوتے تھے۔ قاصد غیاث پور پہنچا تو میں نے حضرت نظام الدینؒ اولیاء اور خواجہ امیر خسرو کے مزارات پر حاضری دینے کے لیے قافلے والوں سے رخصت لے لی۔ میں نے شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کے قریب واقع ایک عرب سرائے میں دو دن اور دو راتیں قیام کیا۔ میں نے ہمایوں کے مقبرے کے سنگ مرمر کے مینار سے مغلوں کے شہر کا پہلا نظارہ کیا' جسے آنے والے کئی برسوں کے لیے میرا گھر بننا تھا۔

میں دہلی دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ نواب رئیس نے دروازے کے حوالدار کو مجھے اندر آنے کی اجازت دینے کا کہہ دیا ہوا تھا۔ حوالدار نے ایک نگران کو میرے ساتھ بھیجا تا کہ وہ مجھے نواب رئیس کی قیام گاہ تک پہنچا آئے۔ نواب صاحب مجھ پر نہایت مہربان تھے — ایک ایسے شخص پر جس نے ان کا نمک بھی کھایا تھا اور ان کی بیوی سے عشق کر کے انہیں دھوکا بھی دیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ بیگم صاحبہ' بچے اور

دیگر اہل خانہ انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ قمرالنسا نے مجھے اور کچھ نہیں تو دھڑلے کے ساتھ جھوٹ بولنا سکھا دیا تھا۔

نواب رئیس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مجھے فتح پوری مسجد کے قریبی بازار میں دو کمرے کا مکان کرائے پر دلا دیا۔ یہ رہائش گاہ کھنڈر نما تھی تاہم میری مالی حیثیت اس سے بہتر مکان کرائے پر لینے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اسے ''شیخی خور کی قبر'' کہا کرتا تھا۔ میں نے اپنی بیاض میں اس کے حوالے سے لکھا: ''اس کی دیواروں میں درزیں ہیں' ہر طرف گرد اڑتی ہے' چوہے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ پھر مجھ پر ہر وقت بھنبھناتے رہتے ہیں۔ مکڑیوں نے جگہ جگہ جالے بن رکھے ہیں۔ چھتیں جھڑتی ہیں' دیواروں کے پتھر سرکتے گرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت جھینگر شور مچاتے ہیں۔ یہ ہے بے چارے میر کا مکان۔ یہاں وہ وقت گزارتا ہے۔''

چند دنوں بعد نواب رئیس نے مجھے محمد واسط کے حضور پیش کیا' جو کہ مغل بادشاہ کی حقیقی قوت نواب صمصام الدولہ کا بھانجا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر میں جلد منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں' کہ جس میں اسے مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہونا تھا' اپنی اہمیت منوالوں گا تو وہ میری مدد کرے گا۔

مشاعرہ دریا گنج میں ایک محل کی چھت پر منعقد ہوا۔ چودھویں کی رات تھی' جو کہ ہمیشہ مجھے میری قمر کی یاد دلا دیتی تھی۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ قالینوں پر سفید براق چادریں بچھی تھیں' جن پر یاسمین اور گلابوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں اور حاشیوں پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ گھڑونچیوں پر شربت کی صراحیاں رکھی تھیں۔ جمنا کے پار سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی' جس میں خس' گلاب اور یاسمین کی خوشبوئیں ملی ہوئی تھیں۔ اس مشاعرے میں صرف امراء و شرفاء کو مدعو کیا گیا تھا۔ درجن بھر معروف شعرا موجود تھے' جن میں سب سے مشہور و معروف شاعر سراج الدین علی خان آرزو بھی شامل تھے۔ وہ میری سوتیلی والدہ کے بھائی یعنی میرے سوتیلے ماموں تھے۔ بیشتر لوگوں نے میرا نام سنا

ہوا تھا لیکن دیکھا ہوا کسی نے نہیں تھا یا میری آواز کسی نے نہیں سنی تھی۔ میں بہت گھبرایا ہوا سا تھا۔ میں ہتھیلیاں قمیض سے بار بار رگڑ کر پسینہ خشک کر رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسے عظیم الشان اجتماع کے سامنے مجھے کون سی غزل پڑھنی چاہیے۔

نواب تشریف لانے لگے۔ جب ان کی آمد کا اعلان ہوتا تو ہم انہیں سلامی دینے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ نواب صمصام الدولہ سب سے آخر میں آئے۔ ہر کسی نے جھک کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے ہمارے سلام کا جواب دے کر ہمیں بیٹھنے کا کہا۔

تھوڑی دیر بعد میزبان نے اعلان کیا کہ نواب صمصام الدولہ چاہتے ہیں کہ شعراء اور مہمانوں کو مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے لب تر کرنے چاہئیں۔ سب نے اس بات کو سراہا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کسی مشاعرے میں شربت کی بجائے شراب پیش کی جا رہی تھی۔ جام گردش میں آئے اور تھوڑی ہی دیر میں سب سرور میں آ گئے۔

میں نے اس سے پہلے شراب پی تھی لیکن اتنی اعلیٰ شراب نہیں پی تھی۔ یہ شراب قندھاری انگوروں سے کشید کی گئی تھی اور اسے ہمالیہ سے لائی گئی برف سے ٹھنڈا کیا گیا تھا۔ میرا جگر شراب کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ میں شہر میں مذاق نہیں بننا چاہتا تھا اس لیے میں نے اپنا کلام سنانے کے بعد ہی جام دوبارہ بھرا۔

مشاعرے کا آغاز دلی کے شعرا کے کلام سے ہوا۔ اپنے شعروں میں انہوں نے شمع اور پروانہ، گل و بلبل، لیلیٰ اور مجنوں جیسے پامال مضامین باندھے تھے۔ کوئی ایک بھی نیا خیال یا نئی ترکیب سننے میں نہیں آئی۔ تاہم انہیں بھرپور داد دی گئی۔ کافی دیر بعد شمع ہمارے سامنے رکھی گئی۔ میزبان نے ہمارا تعارف کروایا۔ اس نے کہا: اگرچہ میں نوجوان ہوں تاہم میں آگرہ کا سب سے زیادہ معروف شاعر ہوں اور پہلی مرتبہ دلی میں اپنا کلام سنا رہا ہوں۔ میں نے اس کے تعریفی کلمات کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے آگرہ میں مقبولیت پانے والی محبت کے موضوع پر لکھی گئی ایک پرانی غزل سنانے کا

ارادہ کیا تھا لیکن محفل کا مزاج دیکھتے ہوئے میں وہ غزل پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں' جو میں نے شراب کا دور چلنے کے دوران فی البدیہہ کہی ہے۔ (سچ یہ ہے کہ وہ غزل میں نے آگرہ میں ایک رات اس وقت کہی تھی جب قمر نے اپنے منہ سے شراب ہمارے منہ میں انڈیلی تھی۔) لوگ بولے: "ارشاد! ارشاد!" میں نے غزل پیش کی۔

سامعین جھوم اٹھے۔ سب نواب یکے بعد دیگرے مجھ سے گلے ملے۔ گلے ملتے ہوئے انہوں نے میری مٹھی میں روپے رکھ دیئے۔ مجھے نواب صمصام الدولہ کے حضور لے جایا گیا۔ انہوں نے مجھے اپنا ہاتھ چومنے کی اجازت دی اور بڑے مشفقانہ لہجے میں بولے: "بیٹا! میں تمہارے والد کا مرید ہوں۔ تمہیں دلی میں دیکھ کر مجھے ان کا دنیا سے رخصت ہونا یاد آ گیا۔ میں ان کا بہت مقروض ہے اور وہ قرض تمہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔ کل صبح ہمارے غریب خانے میں آنا' ہم تمہارے لیے جو ممکن ہو گا کریں گے۔"

میں نے دوبارہ ان کا ہاتھ چوما اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے ٹھنڈی شراب کے کئی جام اس طرح پیے جیسے وہ پانی ہو۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں دوسرے شاعروں کا کلام سن نہیں پایا۔ میں کھانا پیش کیے جانے سے پہلے ہی وہاں سے کھسک گیا۔ دنیا رند کو معاف کر دیتی ہے۔ میں چاندنی سے نہائے ہوئے دلی میں پھرنے لگا۔ قندھاری شراب کے نشے میں ہر شے حسین لگ رہی تھی۔ گلیاں چاندی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں' گہرے نیلے آسمان پر چند ستارے دمک رہے تھے۔ میرے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی تاہم میں بغیر کسی دشواری کے فیض بازار سے جامعہ مسجد پہنچ گیا۔ وہاں سے میں طوائفوں والی گلی چاوڑی بازار سے گزرتا ہوا ہیجڑوں کے محلے حوض قاضی پہنچ گیا۔ میں قمر کو یاد کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دوسرے شاعروں پر میری برتری کی خوشی ہم دونوں کس طرح مناتے۔ میں ایک پان والے کی دکان پر رکا۔ میں نے گاہکوں کی بھیڑ میں سے آگے جا کر کہا: "اپنا سب سے اچھی قسم کا پان دے دو۔" پان والا ہمیں جواب دینے سے پہلے کچھ دیر ہمیں تکتا رہا' پھر بولا: "میر صاحب! میں آپ کو ایسا پان

کھلاؤں گا کہ آپ نے کبھی نہیں کھایا ہوگا۔ شاید آپ میرے پان کا قصیدہ کہیں اور اس میں میرا نام بھی شامل کریں۔"

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔

"تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

وہ مسکرانے لگا: "دلی میں کون ہے' جس نے میر کا کلام نہیں سنا۔ آپ کا کلام تو ہر فرد کی زبان پر ہے۔"

اس نے پیتل کے تسلے میں سے پان کے پتے نکالے اور سب سے نرم پتے پر چونا' کتھا لگایا اس پر خوشبودار چھالیا اور تمباکو کو رکھ کر پسے ہوئے موتی اور سونا چھڑکا۔ اس نے پان کو لپیٹا اور اسے لونگ سے بند کر کے سونے کا ورق لگا دیا۔ ہم دلی والے اسے "پلنگ توڑ" کہتے ہیں۔ آزما کر دیکھیے اگر میرا کہا سچ نہ نکلے تو میرا نام ہری رام چوراسیا نہیں۔ میں شاہ جہان آباد کا بہترین پنواڑی ہوں۔"

مجھے لوگوں کے سامنے اس کا اس طرح مجھ سے باتیں کرنا پسند نہ آیا۔ میں نے اسے چاندی کا ایک سکہ دیا اور لال کنواں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے پان منہ میں رکھ لیا۔ پان کھا کر میرا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پنواڑی کی دکان پر موجود لوگوں میں سے ایک شخص میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر اس سے پوچھا: "جناب کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

اس نے بڑے مودبانہ انداز میں کہا: "میر صاحب! یہ رات ویران گلیوں میں بھٹکنے کے لیے نہیں بلکہ محبت کے لیے ہے۔ میں آپ کو دلی کی حسین ترین لڑکی سے ملا سکتا ہوں۔ شہزادی ہے شہزادی اور عمر بمشکل سولہ سال ہے۔ اگر اس نے آپ کو زندگی میں سب سے زیادہ خوشی نہ دی تو میرا نام بھی چین میاں نہیں۔"

معلوم نہیں شراب کا اثر تھا یا پان کا یا میری ماہ رخ قمر کے خیالات کا اثر تھا کہ میں نے احتیاط کا لبادہ اتار پھینکا اور اس دلال کے پیچھے پیچھے لال کنواں سے نکلنے والی

ایک تنگ و تاریک گلی میں چل پڑا۔ اس نے ایک پرانے سے دروازے کو تھپتھپایا۔ کسی عورت کی آواز آئی: ''کون ہے اتنی رات گئے؟''

''کھولو میں گاہک لے کر آیا ہوں۔''

ایک بڑھیا نے کنڈی کھولی اور ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بولی: ''حضور! رات بہت ہو گئی ہے تاہم میں اپنی بیٹی کو جگا کر آپ کی خدمت کے لیے تیار کرواتی ہوں۔ حضور! اپنی اس حقیر باندی کو پان خریدنے کے لیے کچھ عنایت فرمایئے۔''

میں نے اسی شب ملنے والی سونے کی اشرفیوں میں سے ایک اسے دی۔ وہ میری فیاضی سے خوش تو ہوئی لیکن ایک تجربہ کار عورت ہونے کے ناطے سکے کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہنے لگی: ''مجھے تو آپ جیسے عالی مرتبت شخص سے زیادہ کی توقع تھی۔'' میں نے اسے ایک اور سکہ دے دیا۔ اس نے دلال کو اس کا معاوضہ ادا کیا اور مجھے اندر لے گئی۔ چراغ روشن کر دیے گئے۔ اس نے میرے سامنے خشک میوے کا طشت رکھا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ چند منٹ بعد وہ لڑکی آنکھیں ملتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی' کہ جسے اس نے اپنی بیٹی کہا تھا۔ بے شک وہ بہت کم عمر اور حسین تھی۔۔۔ میری قمر اس عمر میں یقیناً ایسی ہی رہی ہو گی: رنگ گورا اور چہرہ گول تھا لیکن وہ تھوڑی شرمیلی تھی۔ بوڑھی عورت کمرے سے جاتے ہوئے بولی: ''اس کے ساتھ نرمی برتیے گا' یہ ابھی بچی ہی ہے۔''

میں نے لڑکی کو سونے کی اشرفی دی: ''یہ تمہارے لیے ہے۔ تم اس بوڑھی عورت یا دلال کو مت بتانا۔''

اس نے اشرفی لے لی اور پھر میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اس کے لمبے لمبے بالوں اور پشت کو سہلایا۔ میں اپنا ہاتھ اس کے غرارے کے اندر لے گیا اور اس کے گول کولہوں کو تھپتھپانے لگا۔ میری شہوت ابھر آئی تھی۔ اس۔

میرے پاجامے کا ازار بند کھول دیا۔ میں نے اسے بستر پر لٹایا اور دخول کیا۔ کیا میں قمر سے بے وفائی کر رہا تھا؟ نہیں میں نے اس ننھی سی لڑکی میں اسے ہی تجسیم کر لیا تھا اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو دوبارہ جیا تھا۔ شراب اور شہوت افروز پان کی وجہ سے میں ایک گھنٹے تک مصروف عمل رہا۔ وہ میرے اس میں صرف ہونے سے پہلے کئی بار کلائمیکس پر پہنچی اور پسینے سے شرابور ہو گئی۔ اس نے اپنا جسم دھویا اور ایک گیلے کپڑے سے میرے جسم کے درمیانی حصے کو صاف کیا۔ پھر وہ میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولی: ''چمن کہتا ہے' آپ ایک مشہور شاعر ہیں۔ اپنی باندی کو ایک شعر تحفتاً عنایت فرمایئے۔'' میری طبیعت شعر کہنے کو مائل نہیں تھی اس وقت' تاہم میں اس لڑکی کے آبگینۂ احساس کو بھی ٹھیس نہیں لگانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا: ''مجھے کوئی کاغذ کا ٹکڑا' قلم اور روشنائی دو۔ میں تمہیں کچھ لکھ دیتا ہوں۔''

اس نے ایک بیاض سے ورق پھاڑ کر نکالا اور مجھے دیا۔ اس نے مجھے سرکنڈے کا ایک قلم بھی دیا اور مٹی کی دوات پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد شعر لکھا' جس کا مفہوم یوں ہے: ''موسم ابر ہے' شراب ہے' باغ میں گل کھلے ہیں اور تو بھی ہے۔''

جب میں فتح پوری میں واقع اپنے گھر پہنچا تو صبح طلوع ہونے والی تھی۔ میرا سر درد سے دھمک رہا تھا اور منہ کڑوا ہو رہا تھا۔ جب میں کپڑے تبدیل کرنے لگا تو مجھے پتا چلا کہ میری جیبوں سے سونے اور چاندی کے سارے سکے نکالے جا چکے ہیں۔ مغل شہزادی قرار دی جانے والی اس سولہ سالہ لڑکی کے علاوہ سکے کون نکال سکتا تھا؟ میر! ذرا احتیاط سے کام لو۔ یہ کوئی عام جگہ نہیں دلی ہے دلی!

نواب صمصام الدولہ سے ملاقات ہوئی تو اس کے بھانجے محمد واسط نے کہا کہ میرا وظیفہ لگا دیا جائے۔ نواب صاحب نے اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: ''ہم نے گذشتہ شب اس کا کلام سنا ہے۔ یہ وظیفے کا حق دار ہے۔ اس کے علاوہ ہم

نے اس کے والد کی آنکھیں بھی دیکھی ہیں۔ اسے ایک روپیہ روزانہ ادا کیا جائے۔“
اس کے بعد نواب صاحب اگلے سائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ اگلا سائل کچھ بولے میں نے ایک کاغذ نواب صاحب کے سامنے رکھا اور کہا: ”شاید نواب صاحب کو تحریری حکم دے کر خوشی ہو گی۔“

اگرچہ میں کم عمر تھا لیکن سرکاری ملازموں کے اطوار جانتا تھا' کہ وہ بطور ثبوت تحریری حکمنامے کا تقاضا کرتے ہیں۔ میری سادہ سی گزارش نے نواب صاحب کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے درشتی سے فارسی میں کہا: ”وقتِ قلم دان نیست۔“

میں گھبرایا نہیں۔ میں نے کہا: ”حضورا میں آپ کے جملے کا مفہوم نہیں سمجھا۔ کیا آپ نے یہ کہا ہے کہ لکھنے کا وقت نہیں۔ یا یہ کہا ہے کہ قلم دان کا وقت نہیں۔ میں آپ کی بات سمجھ تو گیا ہوں لیکن یہ کہنا نہایت نامناسب ہے کہ قلم دان کا وقت نہیں۔ قلم دان کوئی جاندار شے تھوڑا ہی ہے کہ جس کے لیے موزوں یا غیر موزوں وقت ہو۔ اسے تو حضور کے حکم پر لایا جا سکتا ہے۔“

نواب صاحب مسکرانے لگے: ”میر تقی! تم بڑے ذہین ہو۔ ہم تمہیں ضرور تحریری عہد دیں گے۔“

انہوں نے اپنے مبارک ہاتھوں سے میرا وظیفہ مقرر کرنے کا حکم نامہ لکھا۔ دستخط کیے اور اپنی انگوٹھی سے مہر لگائی۔ ”جاؤ' خوش رہو۔ خدا کرے تمہارا کلام تمہارے والد کے شایانِ شان ہو اور تم شہرت پاؤ۔“

دلی میں اس زمانے میں زندگی کیا حسین تھی! بے شمار لوگ اپنے شعروں پر اصلاح لینے کے لیے آتے تھے۔ میں جہاں کہیں جاتا لوگ مجھے پہچان جاتے اور میری ستائش کرتے۔ شہر میں کوئی مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جس میں مجھے مدعو نہ کیا جاتا۔ جامع مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے کا تو اپنا ہی لطف تھا۔ اگرچہ میں اپنے آپ کو ایک مسلمان مشکل ہی سے کہہ سکتا تھا اور میں مومنوں اور بت پرستوں میں کوئی فرق نہیں

دیکھتا تھا' تاہم میں ہر جمعے کو نماز ضرور ادا کرتا تھا کیونکہ نماز کے بعد سب لوگ میرے گرد اکٹھے ہو جاتے اور میری بہت تعریف و ستائش کرتے تھے۔ دلی کے لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میں بھی ان سے اور ان کے شہر سے محبت کرتا تھا۔

افسوس! خوشیوں کا زمانہ ہمیشہ نہ رہ سکا! پتا چلا کہ نادر شاہ ایرانی نے افغانستان پر قبضہ کر لیا ہے اور دریائے سندھ کے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔ نادر شاہ کے مقابلے کی تیاریوں کے ساتھ ہی دلی میں افراتفری پھیلنے لگی۔ امیر تاجر شہر سے جانے لگے۔ مجھے اپنی بیوی کے کئی خط ملے' جن میں اس نے مجھ سے آگرہ واپس آ جانے کی التجائیں کی ہوتی تھیں۔ اس نے یہ بھی اطلاع دی کہ بیگم صاحب نے کھانے اور تحائف بھجوانے بند کر دیے ہیں اور اپنے بیٹوں کے لیے نیا استاد رکھ لیا ہے۔ آگرہ سے آنے والوں نے بتایا کہ میں نے جس بیگم صاحب کو اپنی روح سونپ دی تھی' وہ اپنے بیٹوں کے استاد پر ملتفت ہے اور اس کے گھر پر تحفوں کی برسات کر رہی ہے۔ مجھے ان قصوں پر یقین نہ آیا اور میں نے نواب رحیم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایرانیوں سے لڑائی کے لیے گھوڑے اکٹھے کرنے کی مہم کے دوران مختصر قیام کے لیے دلی آیا ہوا تھا۔ اس نے میرے جانشین کی بڑی تعریفیں کیں۔ اس نے کہا کہ وہ شاعر تو نہیں ہے لیکن استاد اچھا ہے اور اس کے بیٹے اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ ان کے گھرانے کا فرد بن چکا تھا اور نواب صاحب کے آگرہ سے باہر جانے کی صورت میں ان کی حویلی میں قیام کیا کرتا تھا۔

میرا ذہن ایرانی حملے سے زیادہ آگرہ کے واقعات کی وجہ سے پریشان تھا۔ تاہم میں اس وقت تک دلی ہی میں مقیم رہا جب تک کہ وہاں رہنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دلی مجھے روزی فراہم کر رہا تھا۔ میں نے خود سے کہا کہ اگر ایک عورت اتنی بے وفا ہو سکتی ہے تو بہتر یہی ہے کہ اسے مرحوم تصور کر لیا جائے اور اس کی خاطر رت جگے کرنے کی بجائے اسے بھلا دیا جائے۔ تاہم میں نے اسے اپنے ذہن سے محو کرنے کی جتنی کوششیں کیں' اتنا ہی زیادہ اس کی یاد مجھے ستانے لگی۔ دل میں لگی

آگ کو مسلسل اشک فشانی ہی سے بجھایا جا سکتا ہے' تھوڑا رونے سے تو وہ اور بھڑک اٹھتی ہے۔ میں نے جس عورت کو اپنے شعروں میں دیوی کا درجہ دے دیا تھا' جسے میں نے اپنا جسم اور اپنی روح سونپ دی تھی' اس کی بے وفائی نے مجھے انسانوں سے نفور کر دیا۔ میں چڑچڑا ہو گیا اور ہر کسی سے لڑنے جھگڑنے لگا۔

نادر شاہ 1737ء کے موسمِ خزاں میں پنجاب کے میدانوں تک پہنچ گیا۔ مغل فوج اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے دلی سے روانہ ہوئی تو نواب صمصام الدولہ بھی اس فوج کے کمانداروں میں شامل تھا۔ میں نے مغل فوج کی فتح اور اپنے سرپرست کی بحفاظت واپسی کی دعا کی۔

1738ء کے موسمِ بہار کے ایک دن کرنال میں دونوں فوجوں میں تصادم ہوا۔ اللہ نے ایرانیوں کو فتح دی جبکہ مغل شکست کھا گئے۔ شہید ہونے والے ہزاروں فوجیوں میں میرے سرپرست نواب صمصام الدولہ بھی شامل تھے۔ میں ایسا قصیدہ نہیں لکھ سکتا' جس میں ان کی عظمت و شان کو بیان کرنے کا حق ادا کیا جا سکے۔ وہ میرے لیے دوستی کا ابر تھا۔ اللہ ان کی روح کو عافیت عطا کرے۔ اب مجھے حاسدوں کے شر سے بچانے والا کوئی نہ رہا۔ اب کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کے سامنے میں اپنا دامنِ افلاس پھیلا سکتا۔ میں غریب' کمزور' بے بس اور تنہا رہ گیا تھا: "جلانا برق کی فطرت ہے اے میر۔ اس نے تیرے آشیانے کو بھی جلا ڈالا ہے!"

کرنال والی بربادی کی خبر سنتے ہی میں نے ایک گھوڑا کرائے پر لیا اور آگرہ روانہ ہو گیا۔ کسی قافلے میں شامل ہونے کی ضرورت یوں نہیں تھی کہ دلی سے باہر جانے والے ہر راستے پر بے شمار لوگ دوسرے شہروں کو جانے کے لیے محوِ سفر تھے۔ راستے میں ہم ایرانیوں سے زیادہ اپنے ہم وطن مرہٹوں' جاٹو اور گجروں سے خوفزدہ تھے۔ وہ ہتھے چڑھ جانے والے ہر مرد کو لوٹ کر قتل کر دیتے اور ہر عورت سے زنا کرتے تھے۔ مجھے آگرہ پہنچنے میں پانچ دن لگے۔ اس وقت تک نادر شاہ کی فوج دلی پہنچ کر لوٹ مار اور قتل

وغارت شروع کر چکی تھی۔ میں نے خود سے کہا: "شہر کو دوبارہ بسایا جا سکتا ہے لیکن برباد ہونے والے دل کو آباد کرنا ممکن نہیں ہوتا۔"

آگرہ وہ شہر تھا جہاں میرا دل برباد ہوا تھا۔ میں وہاں اپنے دل کا ملبہ دیکھنے آیا تھا۔ اے دوست! رونا تو میرا معمول ہے' تو کب تک میرے آنسو پونچھے گا! مجھے یاد آیا کہ ہمارا تعلق کس طرح پروان چڑھا تھا اور ہم کس طرح جذبوں کے متلاطم دھارے میں کاغذ کی کشتیوں کے مانند بہہ گئے تھے۔ محبت ایک ایسا مرض ہے' جو کسی کو نہیں چھوڑتا۔ نہ بوڑھے کو اور نہ جوان کو' نہ شادی شدہ کو اور نہ کنوارے کو۔ میں نے کس طرح جذبات کی لہر میں اس کے پیروں میں عقیدت کے پھول رکھے تھے' کس طرح ایک ایسی عورت' جسے میں نے پہلے پہل کوئی خاص حسین تصور نہیں کیا تھا' میری محبوبہ بننے کے بعد میرے لیے دنیا کی سب سے حسین عورت بن گئی تھی۔ وہ حسین عورتوں کی محفل میں یوں دکھائی دیتی تھی جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند ہو' اس کی مسکراہٹ شگفتہ گلاب جیسی تھی' صبح کی ہوا اس کی زلفوں سے خوشبو مستعار لیتی تھی۔ ایسا کچھ اس لیے تھا کہ وہ میری خواہشات کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ ایسی عورت کا بے وفا نکلنا اور کسی دوسرے کی محبوبہ بن جانا میرے فہم سے باہر تھا۔

تاہم میں اب بھی اس کا آرزومند تھا۔ اب جبکہ میں آگرہ واپس آ گیا تھا' جذبوں کی آگ دوبارہ بھڑکنے لگی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ سرد ہو چکی ہے۔ اگرچہ میں خالی ہاتھ گھر واپس آیا تھا تاہم میرے گھر والوں نے میرا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ میں نے اپنے دوسرے بیٹے کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ میرے جانے کے مہینہ بھر بعد ہی بیگم صاحبہ کا میرے گھرانے کے ساتھ رویہ سرد مہری والا ہو گیا تھا (گویا افواہیں سچ تھیں!) اور آخری مرتبہ میرے اہل خانہ اسے ملنے حویلی گئے تو اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میرا سوتیلا بھائی مجھے اس کے دوسرے مرد کے ساتھ معاشقے کی کہانیاں مزے لے لے کر سناتا رہا

اور میرا دل جلاتا رہا۔ اس کے الفاظ نے تیروں کی طرح میرا دل چھلنی کر دیا۔

میں اگلی صبح نواب رئیس کی خدمت میں آداب کرنے حاضر ہوا۔ اس نے مغلوں سے قطع تعلق کر کے نادر شاہ سے دوستی کر لی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ نادر ایک کھرا اور انصاف پسند انسان ہے' ایک پختہ مسلمان ہے جو کفر کو مٹانے کے لیے ہندوستان آیا ہے۔ وہ مجھے زنان خانے میں لے گیا۔ وہاں کا منظر ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک اور استاد اس کے بیٹوں کو پڑھا رہا تھا اور بیگم صاحبہ موڑھے پر بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ لڑکوں نے گرمجوشی سے مجھے سلام کیا۔ اسی طرح استاد نے بھی گرمجوشی سے سلام کیا لیکن اس کے بدصورت چہرے پر فاتحانہ تاثر نمایاں تھا۔

بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر ابھرنے والی روشنی اب مفقود تھی۔ اس نے میرے ساتھ ویسا برتاؤ کیا' جیسا اجنبیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا دل بجھے ہوئے چراغ کی طرح سرد تھا۔ اس نے کہا: ''میر صاحب! ہم نے سنا ہے دلی میں آپ بہت مشہور ہو چکے ہیں۔ یہ آگرہ والوں کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔''

وہ عورت تین ایسے مردوں کے سامنے کتنی ڈھٹائی سے موجود تھی' جن کے ساتھ وہ ہم بستری کر چکی تھی! غصے سے میرا چہرا سرخ ہو گیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ چیختا ہوا نکلوں اور آگرہ کے ہر باسی کو بتاؤں کہ وہ عورت نہ صرف اپنے خاوند بلکہ اپنے محبوب سے بھی بے وفائی کر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسے سنگسار کر دیں' ایک بار نہیں بلکہ تین بار۔ تاہم میں خاموش رہا۔ میں کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

آگرہ کے لوگ مجھ پر فخر کرنے کی بجائے میرے خلاف ہو گئے۔ وہ لوگ جو میرے والد کے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ جانتے تھے' مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ میری آواز صحرا میں گونجتی قافلے کی گھنٹی کی آواز کے مثل ہو گئی تھی۔ چھ ماہ کی تذلیل وتحقیر کے بعد میں نے آگرہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں موسم گرما کے وسط میں دلی پہنچا۔ حیرت کی بات ہے کہ میں جنموں ساتھ

دینے کے وعدے کرنے والی عورت کی بے وفائی کے بعد بھی اسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا تھا۔ میں اسے دلی میں ہر طرف بکھرے ملبے میں تلاش کر رہا تھا۔ میری آنکھیں کشکول بن گئی تھیں اور میں اس کی دید کی بھیک مانگتا پھر رہا تھا۔ میں ہر صبح ہوائے صبح کے مانند در در دستک دیتا پھرتا تھا۔ میں تیز ہوا کے سامنے بجھنے والا چراغ بن چکا تھا۔ میں اندر ہی اندر جلتا' پگھلتا ہوا قریب المرگ ہو گیا۔ مجھ پر عجیب دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔ حکیموں نے کہا کہ دیوانگی میرا خاندانی مرض ہے اور اب میرے خون میں بھی دوڑ گئی ہے' لہٰذا اس کا علاج صرف یہ ہے کہ میرے جسم سے خون نکال لیا جائے۔ انہوں نے مجھے جونکیں لگا کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا' گویا میں کوئی پاگل تھا۔ حکیم صاحب میری حالت دیکھ کر حیران تھے۔ انہوں نے کہا: ''میں محبت کے مریض کا کیا علاج کر سکتا ہوں!''

مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے والی صرف ایک بوڑھی عورت تھی۔ وہ میری دور پار کی عزیزہ تھی۔ وہ میرے کپڑے تبدیل کرواتی' کھانا کھلاتی اور تسلیاں دیتی۔ اللہ اس پر مہربانی فرمائے! میں اپنی حالت سے مایوس ہو چکا تھا۔ میں اپنی وصیت میں خود کو نصیحت کرنا چاہتا تھا: ''دوست میرا اپنے دل کی ہر خواہش پر عمل کرو لیکن اسے محبت میں مبتلا نہ ہونے دو۔ محبت نہ محبّ کو چھوڑتی ہے نہ محبوب کو۔''

آخر مجھے کئی ہفتے بعد کوٹھڑی سے نکالا گیا۔ میں گلیوں میں پھرنے لگا۔ میں نے ہر جگہ نادر کے فوجیوں کی مچائی ہوئی تباہی کے نشانات دیکھے۔ کوئی گھر تباہی سے نہیں بچا تھا۔ قلعہ معلی کو اس کے قیمتی جواہرات سے محروم کر دیا گیا تھا۔ شہزادے بھکاری بن گئے تھے۔ کئی شہزادوں کو تو فاقے کرنے پڑ رہے تھے۔ میری کیا حیثیت تھی کہ شکوہ کناں ہوتا! میں اداسی کے عالم میں اس مکان کی طرف چلا گیا جہاں میں نے شہزادی کہلانے والی لڑکی کے ساتھ ایک رات بسر کی تھی۔ اس محلے کا کوئی مکان سلامت نہیں تھا۔ میں نے جس سے بھی اس بڑھیا اور لڑکی کا پوچھا' وہ ان کے احوال سے ناواقف نکلا۔ شاید

بڑھیا مرگئی تھی اور لڑکی کو کسی ایرانی فوجی نے کنیز بنالیا تھا۔

میرے محبوب شہر پر کیا تیرہ بختی ٹوٹی تھی! سکھوں' مرہٹوں' چوروں' گرہ کٹوں' فقیروں' حکمرانوں — سب نے ہمیں اپنا شکار بنایا تھا۔ خوش وہی تھا جس کے پاس دولت نہیں تھی' مفلسی واحد دولت تھی۔ ان حالات کی روشنی میں تو میں بیک وقت امیر ترین اور مفلس ترین انسان تھا۔

ایک روز گھومتے پھرتے ہوئے میں ایسی جگہ جا نکلا' جہاں کی عمارتوں کو حال ہی میں مسمار کیا گیا تھا۔ میں اس علاقے سے شناسا تو تھا لیکن کسی مکان کو پہچان نہ سکا کیونکہ انہیں مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا تھا۔ ان کے مکینوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نے جس شخص کے بارے میں پوچھا' بتایا گیا کہ وہ اب یہاں نہیں رہتا۔ جب میں پوچھتا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے تو لوگ جواب دیتے کہ انہیں کچھ علم نہیں۔ پورے محلے کے تمام مکان گرا دیئے گئے تھے۔ آنکھ جہاں تک دیکھتی ملبہ ہی نظر آتا تھا۔ بازار برباد ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ ہی ان کی رونق بڑھانے والے لوگ بھی۔ اب میں حسن و جمال کو کہاں ڈھونڈوں گا! میرے کل کے عیش پرست دوست کہاں چلے گئے؟ خوبصورت نوجوان اور دانش مند بوڑھے — سب غائب ہو چکے تھے۔

☆☆☆

نادر شاہ کے ہاتھوں برباد ہونے والے دلی شہر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں بچا تھا' جس سے میں کوئی مدد لے سکتا۔ میں نے مایوسی کے عالم میں سراج الدین علی خان آرزو کی صحبت اختیار کی' جو کہ میرے آنے سے پہلے دلی کا سب سے مشہور شاعر تھا۔ ابتدا میں تو اس نے میرے ساتھ نہ صرف اچھا برتاؤ کیا تھا بلکہ سرپرست ڈھونڈنے میں میری مدد بھی کی تھی۔ میں نے اسی کے مشورے پر فارسی میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا اور اس زبان میں شعر کہنے پر ساری توجہ مرکوز کر دی تھی' جسے عام لوگ بولتے تھے' وہ زبان جو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی تھی۔ اس طرح مجھے عوامی شہرت

حاصل ہوئی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا خان آرزو میرے خلاف ہو گیا۔ میں نے سوچا شاید میرے سوتیلے بھائی نے اسے خط لکھ کر میرے اپنے محسن کی بیوی کے ساتھ معاشقے کی خبر دے دی تھی۔

میں نہ تو مسلم تھا' نہ ہندو۔ میں دوسرے مسلمانوں کی طرح ہر جمعے مسجد جایا کرتا تھا اور ہندوؤں کی طرح میں نے اپنی پیشانی پر قشقہ کھینچا ہوا تھا۔ خان آرزو کی مجھ سے خفگی کا سبب میری بڑھتی ہوئی شہرت بھی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سلطان الشعراء کا تاج اس کے سر سے گر رہا ہے اور یہ عزت مجھے حاصل ہونے لگی ہے۔ حسد دوستی کو تلوار سے زیادہ تیزی سے فنا کرتا ہے۔ خان آرزو کی دشمنی کی وجہ سے مجھے کئی سرپرستوں سے محروم ہونا پڑا اور زندگی میرے لیے زیادہ مشکل ہو گئی۔ چونکہ میری کوئی باقاعدہ آمدنی نہیں تھی' اس لیے مجھے بنیوں' سبزی فروشوں اور دودھ والے وغیرہ سے ادھار کرنا پڑتا تھا۔

تاہم جیسا کہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ جب محلات اور لال قلعے تک سے نوحہ گری کی صدائیں بلند ہو رہی ہوں تو میر اپنی بدقسمتی کا رونا کیوں روئے! بدبخت نادر شاہ اپنے پیچھے ہزاروں بیواؤں کو اپنے مرحوم شوہروں کے واسطے سینہ کوبی کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے ہزاروں بچوں کو یتیم اور فقیر بنا دیا تھا۔ ہمارا ایک بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اس کے علاوہ تین حاکم تھے جن میں سے وزیراعلیٰ نواب صفدر جنگ ایک طرف تھا اور وزیر خزانہ نواب امداد الملک اور نواب انتظام الدولہ دوسری طرف۔ جہاں تک بادشاہ کا تعلق تھا تو اس کی شاہی اپنے حرم میں بھی نہیں چلتی تھی۔ ایک سابق ہندو رقاصہ' جو محمد شاہ کی بیوی بن گئی تھی اور ایک شخص نواب جاوید خان بادشاہ کی جانب سے احکامات جاری کرتے تھے۔ جاوید خان خواجہ سرا تھا۔ وہ شاہی حرم کا نگرانِ اعلیٰ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ جسمانی نقص کے باوجود وہ ہندو ملکہ پر حاوی تھا۔ میر کو شکوہ کناں کیوں ہو؟ ممکن ہے جاوید خان مردانگی سے محروم ہو' تاہم اس نے میرے حاسدوں کی شرانگیزی کے باوجود میرے ساتھ فیاضانہ برتاؤ جاری رکھا۔ میرے لیے ایک وقت کے کھانے اور تن ڈھانپنے

کا تو یقینی بندوبست ہو گیا تھا۔

قسمت کچھ عرصہ کے لیے نواب صفدر جنگ پر مہربان رہی۔ بادشاہ محمد شاہ کی وفات کے بعد اس نے اس کے اکیس سالہ بیٹے احمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ احمد شاہ نے کاروبار مملکت اپنی ماں اور اس کے بااعتماد فرد جاوید خان پر چھوڑا اور خود شراب و شباب کی محفلوں میں گم ہو گیا۔

جاوید صفدر جنگ کو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے نواب امداد الملک اور انتظام الدولہ کے ساتھ مل کر اسے معزول کرنے کا منصوبہ بنایا۔ صفدر جنگ کے وزیر اعظم بننے کے چند ماہ بعد اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس کا محل نگم بودھ گھاٹ کے قریب تھا۔ وہیں ایک دن اس پر گولیاں برسائی گئیں۔ وہ گھوڑے سے گر جانے کی وجہ سے بچ گیا لیکن اس کے کئی مصاحب ہلاک ہو گئے۔ صفدر جنگ کو شبہ تھا کہ اسے قتل کروانے کی سازش جاوید خان نے تیار کی تھی۔ اس نے جاوید خان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اسے بھرت پور کے راجا سورج مل جاٹ سمیت ناشتے پر بلایا۔ ناشتے کے بعد وہ جاوید کو ایک طرف لے گیا اور اس کے ایک نوکر نے جاوید کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔ بعد میں اس کا سر قلم کر کے لاش کو دریائے جمنا کے کنارے پھینک دیا گیا۔ ملکہ سوگ میں چلی گئی۔ میں اپنے ایک اور سرپرست سے محروم ہو گیا۔

صفدر جنگ اور ملکہ کے آدمیوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ان میں ہر روز لڑائی ہوتی، گولیاں داغی جاتیں، تلواریں چمکتیں اور خون نالیوں میں بہتا۔ انہوں نے روہیلوں، جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کو لڑائی کے لیے ملازم رکھ لیا۔ وہ بدمعاش دن میں اپنے مالکوں کے لیے لڑتے اور راتوں کو غریب شہریوں کو لوٹتے۔ دلی کے شہری خود کو اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے تحفظ کے لیے ملکہ سے درخواست کی۔ اس نے ان کی درخواست مان لی اور ہزاروں گھرانے چاندنی چوک کے ساتھ واقع صاحب آباد باغ میں کھلے آسمان تلے رہنے لگے۔ خوش قسمتی سے مون سون

کے موسم میں زیادہ شدید بارشیں نہ ہوئیں اور زیادہ لوگ نہیں مرے۔

آخرِ کار نواب صفدر جنگ مائل بہ امن ہوا۔ وہ زیادہ وقت اودھ میں واقع اپنی اراضی کی دیکھ بھال اور قطب اور رائے سین کے درمیان اپنی آخری آرام گاہ تعمیر کروانے میں کرنے صَرف لگا۔

محمد شاہ کی شاہی اس کی زندگی میں ہی لال قلعے میں ختم ہو گئی۔ ہولکر کی قیادت میں مرہٹوں نے محمد عزیز الدین کو بادشاہ بنا دیا تھا۔ وہ اورنگ زیب کا پڑپوتا تھا۔ اسے 5 / جون 1754ء کو تاج پہنایا گیا اور شہنشاہ عالمگیر ثانی کا خطاب دیا گیا۔ اس خود ساختہ فاتح عالم کی حکومت صرف لال قلعے کی فصیلوں کے اندر ہی تھی۔

دلی ایرانیوں کے ہاتھوں اپنی روح کے فنا ہونے کے بعد پہلے والا دلی کبھی نہ بن سکا۔ بادشاہ اور امراء اپنے حواریوں سمیت اس کی لاش کو نوچتے آتے رہے۔ میں دلی ہی میں مقیم رہا کیونکہ آگرہ کے علاوہ کوئی جگہ ایسی نہ تھی کہ جہاں میں جا سکتا۔ تاہم ایک عورت کی بے وفائی نے مجھ سے وہ شہر ہمیشہ کے لیے چھڑوا دیا تھا۔ اس ساری قتل و غارت کے دوران اس نے میری خیریت دریافت کرنے کے لیے ایک خط بھی نہیں لکھا۔ ایسے لوگوں کو بھلا دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس وقت تک میری بیوی میرے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو لے کر دلی آ چکی تھی۔ ہم شدید غربت میں جی رہے تھے۔ میں نے شہرت کے علاوہ کچھ نہیں کمایا تھا۔ میں تینوں بچوں پڑھایا کرتا تھا۔ مجھے علم ہوا کہ وہ ہمارے لیے روپے لانے والے کسی کام کی بجائے شاعری کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

1758ء کے موسمِ سرما میں نادر کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے مغلیہ سلطنت پر قبضے کا اعلان کر دیا۔ افغان پنجاب سے یوں گزرے کہ کسی کو بھی انہیں روکنے کی جرأت نہ ہوئی اور آ کر دلی پر قابض ہو گئے۔ ابدالی نے ہمیں جان و مال کا تحفظ دینے کا وعدہ کیا تھا' لیکن رات ہوتے ہی غارت گری شروع ہو گئی۔ شہر میں آتش زنی اور لوٹ مار ہونے لگی۔ افغان فوجی گھروں کے دروازے توڑ کر اندر داخل ہوتے اور مکینوں کو زندہ

جلا دیتے یا ان کے سر کاٹ دیتے۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور تباہی و بربادی مچا دی گئی تھی۔ لوگوں کو عریاں کر کے گلیوں میں دوڑایا گیا۔ کئی روز تک لوگوں کو فاقے کرنے پڑے۔ ستم زدوں کی چیخیں آسمان تک جا رہی تھیں۔

ہزاروں لوگ دلی سے بھاگ گئے۔ میں' جو غریب تھا' مزید غریب ہو گیا۔ مرکزی شاہراہ پر واقع میرے گھر کو مسمار کر دیا گیا۔

جب میری سرپرستی کرنے والے مسلمان نواب خود افلاس کا شکار ہو گئے تو میں نے ہندو امراء میں اپنے سرپرست ڈھونڈے۔ راجا جگل کشور اور راجا ناگر مل شاعری کے دلدادہ تھے اور اپنی غزلیں مجھ سے اصلاح کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

1759ء کے موسم سرما میں حالات نے بدترین رخ بدلا۔ نواب امداد الملک نے عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا۔ اس کا بیٹا مرزا عبداللہ علی گوہر فرار ہو کر اودھ چلا گیا۔ وہاں اس نے شاہ عالم ثانی خطاب اپنا کر بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

جہاں تک میرا تعلق تھا تو دلی کی تکالیف میرے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھیں۔ میں نے ہر چھ ماہ بعد تباہی کا شکار ہو جانے والے دارالسلطنت کی بجائے کسی قصبے میں بس جانے کا فیصلہ کیا۔

میں بھرت پور چلا گیا' جس کا حاکم سورج مل جاٹ تھا۔ اس زمانے میں مرہٹہ فوج ہندوستان پر دوبارہ حملے کرنے والے احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ کرنے کے لیے شمال کی طرف جا رہی تھی۔ 17 جنوری 1761ء کو ہمیں خبر ملی کہ دو دن پہلے مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں شکست ہوئی ہے۔ افغانوں کی تلواروں سے بچ نکلنے والوں کو گجروں اور جاٹوں کے گروہوں نے لوٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے افغانوں کی واپسی اور دلی میں امن بحال ہونے تک بھرت پور میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں چھ ماہ بعد گھر واپس روانہ ہوا۔ میں نے 1761ء کے موسم گرما میں اپنی بیاض میں لکھا:

میں اپنے محبوب شہر واپس آیا ہوں۔ بربادی کے مناظر دیکھ کر مجھے رونا آرہا ہے۔ ہر قدم پر میری اداسی اور رنج میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مجھ سے جانی پہچانی جگہیں اور گھر پہچانے نہیں جاتے۔ مکینوں میں سے کوئی نظر نہیں آتا۔ ہر طرف ہولناک ویرانی ہے۔ اچانک میں نے خود کو اس محلے میں پایا میں جہاں رہا کرتا تھا۔ مجھے گزرا زمانہ یاد آنے لگا: ''وہ شام کو دوستوں سے ملاقاتیں' شاعری سننا سنانا' محبت کرنا' حسین عورتوں کی یاد میں رات رات بھر تڑپتے جاگتے اور رہنا اور مجھے قیدی بنا لینے والی ان کی دراز زلفوں پر شعر کہنا۔'' زندگی تو یہ تھی! اب کیا بچا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ کوئی ایک شخص بھی تو ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ باتیں کر کے میں کچھ دیر جی بہلا سکوں۔ میں گلی سے نکل کر ویران سڑک پر آ گیا۔ ہر طرف تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے عہد کیا کہ زندگی بھر اس راستے سے دوبارہ نہیں گزروں گا۔ دلی ایک ایسا شہر ہے' جس کی گلیوں میں خاک اڑ رہی ہے۔ کبھی اسی شہر کے لوگ سونا اچھالتے پھرتے تھے۔

راجا ناگرمل نے فیاضی سے دست کشی اختیار کر لی تو کیا ہوا! مجھے اب ناقابل اصلاح شعروں کی اصلاح نہیں کرنی پڑے گی۔ میں تہی دست تھا۔ میں بھیک مانگنے نکلا اور امراء کے دروازوں پر دستکیں دینے لگا۔ مشہور شاعر ہونے کی وجہ سے میں کسی نہ کسی طور زندہ رہنے کا بندوبست کر لیتا ہوں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ دلی کبھی دوبارہ منحوس افغانوں کو نہ دیکھے۔ ابدالی کے فوجیوں کے پاس لوٹ کا مال اتنا زیادہ تھا کہ ان کے ہاتھی اور اونٹ کم پڑ گئے تھے۔ انہوں نے ابدالی سے کہا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتا ہے تو رہے' وہ یہاں سے جا رہے ہیں۔ ابدالی کو ہندوستان سے جانا پڑا۔ وہ اپنے برباد کیے ہوئے علاقوں کے منتظمین مقرر کر گیا ہے۔ اے اللہ تیرا شکر ہے!

''اللہ کو افغانوں کا تکبر پسند نہ آیا اس لیے اس نے انہیں معاشرے کے پست ترین افراد یعنی سکھوں کے ہاتھوں ذلیل کروا دیا۔ چالیس پچاس ہزار سکھوں کی فوج

نے واپس جانے والے افغانوں کا راستہ روک لیا۔ انہوں نے اتنی بہادری سے جنگ لڑی کہ پہلے کبھی جس کی مثال نہیں ملتی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک سکھ شدید زخمی ہونے کے باوجود میدانِ جنگ سے نہیں بھاگتا۔ وہ افغانوں کا گھیراؤ کر کے انہیں تہہ تیغ کر دیتے ہیں وہ رات ہوتے ہی افغانوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے افغانوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ان سکھوں کے سر اور ڈاڑھی کے بال لمبے لمبے اور شکلیں ڈراؤنی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات وہ بال کھلے چھوڑ کر افغانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور انہیں دہشت زدہ کر دیتے ہیں۔ وہ پیادہ یا افغان سواروں سے لڑتے اور ان کی رکابوں کو تلواروں سے کاٹ دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان سکھوں نے افغانوں کو ایسی ذلت سے دوچار کیا ہے جو پہلے کبھی دیکھی سنی نہیں گئی۔ افغان لڑنے کی ہمت کھو بیٹھے اور جانیں بچا کر بھاگ گئے۔ ریاست کی حکمرانی ہندوؤں کو مل گئی۔

سکھ فوج نے دریائے اٹک تک افغانوں کا تعاقب کیا۔ پھر پنجاب واپس آ کر سکھوں نے ابدالی کے مقرر کردہ لاہور کے ہندو صوبہ دار کو قتل کر دیا اور پنجاب کے حکمران بن گئے۔ کسی خوبصورت شہر کی اس سے بڑی بدبختی کیا ہو گی کہ وہ وحشیوں کے قبضے میں چلا جائے!

☆☆☆

میں بھاری دل کے ساتھ ایک سے دوسری جگہ پھرتا رہا۔ دلی میں میرے اور میرے گھرانے کے لیے کھانا بھی میسر نہیں رہتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر بھرت پور میں پناہ لی۔ میری شہرت مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی اور لوگ ہر سمت سے میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔

شہرت اور ستائشی الفاظ خالی پیٹ کو تو نہیں بھر سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ زندگی صرف ایک مرتبہ جینے کو ملتی ہے جبکہ خواہشیں ہزاروں ہوتی ہیں۔ میری عمر بڑھتی جا رہی

تھی۔ میری مثال تیز ہوا کے سامنے بھڑکتی ہوئی چراغ کی لو جیسی تھی۔

ایرانیوں، افغانوں اور مرہٹوں کے بعد جاٹ آئے۔ میں اس وقت میں بھرت پور میں تھا، جب جاٹ راجا سورج مل نے آگرہ اور دلی کو تاخت و تاراج کیا۔ دلی میں لوٹنے کو کچھ نہیں بچا تھا تاہم مجھے دوستوں کے خطوں سے پتا چلا کہ جاٹ گردی ایرانیوں کی نادر شاہی سے بھی بدتر تھی۔ دلی والوں کی واحد امید نواب نجیب الدولہ تھا، جس نے سکھوں اور جاٹوں کو ان کی حد میں رکھا ہوا تھا۔ یہ امید بھی نجیب الدولہ کی وفات کے ساتھ ختم ہو گئی۔ مرہٹے، جنہیں صرف چار سال پہلے ابدالی نے پانی پت میں شکست سے دوچار کیا تھا، دوبارہ طاقت پکڑ چکے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ یا پھر سکھ، دونوں منحوس نسلوں میں سے کوئی ایک دلی کے حاکم بن جائیں گے۔ خدا ہمیں ایسے سانحے سے بچائے!

میں کئی سال سے خانہ بدوشوں کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر پھرتا ہوا زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب شاہ عالم ثانی دلی لوٹا تو میں نے بھی دلی لوٹنے اور اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے وزیر اعظم مرزا نجف خان سے امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔

وہ ایرانی ہونے کی وجہ سے شیعہ تھا اور اس مسلک سے مجھے اس لیے انسیت سی تھی کہ میری والدہ بھی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی تھیں۔ نجف خان نے آگرہ کو جاٹوں سے آزاد کروایا تھا اور بدمعاش سکھوں اور روہیلوں کو مار بھگایا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مرہٹے بھی اس کا سامنا کرنے سے خوفزدہ تھے۔ خدا اس کی شمشیر کو ہمیشہ فتح مند رکھے۔

تاہم اللہ کی رضا یہ تھی، جس کا پتہ بعد میں چلا۔ اپریل 1782ء میں مرزا نجف خان فوت ہو گیا۔ اسے نواب صفدر جنگ کے محل کے سامنے واقع باغ میں دفنا گیا۔ خون کے دھبوں سے بھرا بربادی کا خنجر دوبارہ نیام سے باہر آ گیا۔ نجف خان کے بھانجے مرزا شفیع نے اقتدار مرحوم حکمران کے حبشی بیٹے مرزا افراسیاب سے چھین لیا۔ ستمبر 1783ء میں افراسیاب نے کرائے کے ایک قاتل کے ذریعے مرزا شفیع کو قتل کروا دیا۔ چند ماہ بعد مرزا شفیع کے بھائی نے افراسیاب کو قتل کروا دیا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کے

ہاتھوں قتل ہوتا تھا۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔

بھوک اور عدم تحفظ کا احساس مجھے اپنے محبوب شہر سے لکھنؤ لے گئے۔ یہاں نواب آصف الدولہ نے بڑی مہربانی کی اور میرے گھرانے کی گزر بسر کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ تاہم لکھنؤ کے لوگوں نے، جنہیں اپنے ادب و آداب اور شائستہ زبانی پر فخر تھا، میرے ساتھ ان دونوں ہی کا مظاہرہ نہ کیا۔ میں جس محفل میں پہلی بار شریک ہوا، اس میں انہوں نے میری بڑی پگڑی اور ڈھیلے ڈھالے لباس کا مذاق اڑایا اور پوچھا کہ میں زمین پر کہاں سے آیا ہوں؟

☆☆☆

لکھنؤ والے مجھے نہیں سمجھتے تھے اور میں انہیں نہیں سمجھتا تھا۔ میں ان کی اجنبی سرزمین پر اپنی کہانی کیسے کہہ سکتا تھا؟ میں وہ زبان بولتا تھا، جو وہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میرؔ کا ہر لفظ کثیر المعنی ہوتا ہے۔ میں جو زبان استعمال کرتا تھا۔ اسے دلی کے عام لوگ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اے میرؔ! ان مرے ہوؤں کے اجتماع سے بات کرنے کا تردد کیوں کرتے ہو؟ آنسو میری آنکھوں سے دریا کی طرح بہنے لگے۔ میرا دل بھی دلی کی طرح برباد ہو گیا تھا۔ گلاب کا پھول کھلتا تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوتی، نہ اس کے کانٹوں کے چبھنے سے مجھے درد ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے دلی ضرور واپس جانا ہوگا، کہ جہاں میں نے اس محبت کے نشے میں چور زندگی بسر کی تھی، جسے میں نے اپنے خونِ دل کی گلاب رنگ شراب میں ملا کر پیا تھا۔

دلی سے آنے والی خبریں سن کر ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ نادر شاہ، ابدالی، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں نے ویسی تباہی نہیں مچائی تھی، جیسی کہ نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر اور اس کے روہیلہ غنڈوں نے مچائی۔ اس وحشی نے شاہ عالمگیر ثانی کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اللہ اسے جہنم رسید کرے! اللہ ہی جانتا ہے کہ دلی میں کب تک قتل و غارت گری اور لوٹ مار جاری رہے گی! انہیں لوگوں کو اپنا شکار بنانے

کے انہیں دوبارہ بعد زندہ کرنا ہوگا اور لوٹ کا کچھ مال واپس کرنا ہوگا تاکہ پھر سے لوٹ مار کر سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ دلی ایک زندہ لاش بن چکا ہے۔

☆☆☆

تاہم کچھ اچھی خبریں بھی تھیں۔ مرہٹوں نے روہیلوں کو عبرت ناک شکست دی۔ غلام قادر کو زندہ گرفتار کر لیا گیا اور اذیتیں دینے کے بعد اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس کے لیے کوئی نہ رویا۔ میں بھی مطمئن تھا کیونکہ میرے محبوب شہر کو برباد کرنے والے بدمعاش کو بالآخر اس کے کیے کی سزا مل گئی تھی۔ کیا دلی کی عظمتِ رفتہ بحال ہو جائے گی؟ یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

میں اس خاک داں میں اٹھاسی موسمِ سرما دیکھ چکا تھا۔ میری آنکھوں کی روشنی ماند پڑ گئی تھی' تین سال میں مَیں اپنے گھرانے کے چار افراد کو کھو چکا تھا۔ میرے بیٹے' بیٹی اور بیوی فوت ہو گئے تھے۔ میں لکھنے پڑھنے سے بھی قاصر تھا اور میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کاش میری خاک دلی کی معطر خاک میں مل جاتی۔ تاہم میری یہ آخری خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ قسمت مجھے لکھنؤ لے گئی۔

پتا نہیں لوگ موت کے حوالے سے اتنی خوفناک کہانیاں کیوں سناتے ہیں؟ مجھے تو موت کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ زندگی میں مَیں نے دو محبتیں کی تھیں۔ ایک قمرالنساء سے' دوسری دلی سے۔ ایک نے مجھے برباد کر دیا اور دوسرا میرے لیے برباد ہوا۔ اب میرے لیے جینے کو کچھ نہیں رہا تھا۔

❀❀❀

بھاگ متی

بھاگ متی نے وہ شام میرے ساتھ گزارنا ہے۔ اسے توقع ہے کہ میں اس سے ہم بستری کروں گا۔ اگر میں جوش نہیں دکھاؤں گا تو وہ کہے گی کہ میں اس سے غفلت برت رہا ہوں یا پھر اس سے بری بت وہ یہ کہے گی میں نامرد ہو گیا ہوں۔ مجھے اس سے ہم بستری نہ کرنے کا کوئی اچھا سا بہانہ سوچنا ہوگا: تیز بخار بازو کی ہڈی کا ٹوٹنا یا قضیب پر چوٹ۔ تاہم مجھے صرف پیٹ میں ریح ہوئی۔ جو شخص بھی ریح کا شکار بنتا ہے' وہی جانتا ہے کہ جب تک وہ نکل نہ جائے شہوت کے شعلے کو فروزاں نہیں ہونے دیتی۔

بہت عرصہ پہلے جب یہ مسئلہ شروع ہوا تھا' تب میں نے ریح پیدا کرنے والی چیزوں کی ایک لمبی فہرست بنائی تھی۔ ان میں میری بہت سے پسندیدہ غذائیں شامل تھی: کچے پیاز' آم' چیکو' آئس کریم' کیک...... میں نے اپنے جنسی عمل کے شیڈول میں تھوڑی سی تبدیلی لا کر اس مسئلے پر قابو پا لیا تھا۔ میں ان چیزوں کو جنسی عمل سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں کھایا کرتا تھا۔ "پہلے نہیں بعد میں" والی فہرست میں مَیں نے بعدازاں ان اشیاء کا اضافہ کیا: چاول' دالیں' آلو اور تلی ہوئی اشیاء۔ اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہا' یہاں تک کہ کھانے والی ہر شے اس میں شامل ہو گئی۔ شام تک میرا پیٹ ہوا سے بھر چکا ہوتا۔ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا اور ملاقات کے لیے شام کی بجائے سہ پہر کا وقت مقرر کر دیا۔

اس تبدیلی سے کچھ عرصہ فائدہ ہوا۔ جب بھی بھاگ متی نے مجھ سے ملنے آنا ہوتا تھا' میں ناشتے میں صرف سیاہ کافی پیتا اور روٹا مِن بی کی گولیاں کھاتا تھا — یہ شہوت افروز دوا کا قریب ترین متبادل تھا۔

آج میں نے صبح سے سیاہ کافی کے دو مگ اور وٹامن بی کمپلیکس ہی پیے ہیں۔ اس کے باوجود میرا پیٹ غبارے کی طرح ہوا سے بھرا ہوا ہے اور شہوت بالکل بھی نہیں ابھری ہے۔ مجھے جنسی عمل کی خواہش نہیں ہے۔ اس کے بجائے میں ایک لمبا' سکون بخش پاد مارنے کا خواہش مند ہوں۔ میں اس کے لیے کمرے میں ایک ٹانگ پر اچھلتا رہا ہوں' گھٹنے توند سے جوڑ کر پشت کے بل لیٹا رہا ہوں' اپنی توند کو مسلتا رہا ہوں' لیکن سب ترکیبیں بیکار گئیں۔ شیخ سعدی نے کہا تھا: "اے شیراز کے دانا! ریح میرے قلب پر پتھر کی طرح ضرب لگاتی ہے! میں اسے کس طرح خارج کروں گا؟"

پاد مارنا دنیا کی تین عظیم ترین مسرتوں میں ایک ہے۔ پہلی ہے جنسی عمل؛ دوسری ہے خشکی بھرے سر میں تیل کی مالش اور تیسری ہے ایک لمبا سکون بخش پاد۔ ادھیڑ عمر کا ہونے کے بعد میں نے اس فہرست کی ترتیب بدل دی۔ اب پاد مارنا میری زندگی کی مسرتوں میں سب سے پہلے نمبر پر ہے۔

پادوں کے شہنشاہ کو ہمارے پرکھوں نے "اُتم پادم" کا نام دیا تھا۔ یہ مردانہ پاد ہوتا ہے۔ اسے اپنی مرضی سے خارج کیا جاتا ہے۔ اس کی آواز اونچی اور بو کم ہوتی ہے۔ جتنا زیادہ اونچا اتنا کم بدبودار۔ میرے دوست' گنجے' گول آنکھوں والے فوٹو گرافر نے اس موضوع پر بھرپور تحقیق کی ہے۔ اتم پادم کے حوالے سے اس کی رائے ہے کہ یہ پاد وہی لوگ مار سکتے ہیں جو صرف تازہ پھل اور غیر ریشہ دار سبزیاں کھاتے ہیں۔ ایسی خوراک "ستوِک" (خالص) ہوتی ہے۔ (اگرچہ مرغی' مچھلی اور بھیڑ بکریوں وغیرہ کا گوشت صحت بخش ہوتا ہے لیکن اس کا شمار دوسرے درجے کی خوراک میں کیا جاتا ہے۔ مصالحہ جات' اچار' چٹنیاں' مربہ جات' آلو' مولیاں' گاجریں' لہسن' پیاز' گوبھی' شلجم اور بند

کو بھی تیسرے درجے کی خوراک شمار ہوتی ہے)۔ میرے فوٹو گرافر دوست نے خالی پیٹ تازہ رس بھرا تربوز کھا کر اتّم پاد مارنے کا مظاہرہ کیا۔

پاد دوسری قسم "شہنائی" کہلاتی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے اسے مدھیما کا نام دیا تھا۔ میں اسے شہنائی کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ یہ پاد بھی اپنی مرضی سے مارا جا سکتا ہے اور بیٹھنے کے انداز میں ہلکی سی تبدیلی سے یا توند پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر شہنائی پاد مارنا ممکن ہوتا ہے۔ اتّم پاد اور اس میں فرق یہ ہوتا ہے کہ یہ ہلکی آواز والا اور لمبا ہوتا ہے۔ سکاٹش بیگ پائپ کے ابتدائی سر اس کے مماثل ہوتے ہیں — ہیں۔

تیسری قسم کا پاد اصل میں کئی چھوٹے چھوٹے پادوں کو مجموعہ ہوتا ہے۔ اس کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے پرانا کپڑا پھٹ رہا ہو۔ یہ پاد "تمسک" غذائیں کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عمر بڑھنے کی وجہ سے مقعد کے اعضا ڈھیلے پڑ جانے کے باعث بھی یہ پاد خارج ہوتا ہے۔

چوتھی قسم کے پاد کو طبلہ کہا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک "گھٹ" کی آواز سے اپنا اعلان کرتا ہے — جیسے طبلے پر ایک مرتبہ تھاپ دی گئی ہو۔ طبلہ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے اور انسان کی مرضی کے بغیر خارج ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر یہ کسی محفل میں خارج ہو جائے تو انسان کی شرمندگی کا باعث بھی بنتا ہے۔

پانچویں قسم کا پاد "پھسکن" کہلاتا ہے۔ یہ بے آواز ہوتا ہے اس لیے اسے ہمسایوں کو ایک "گپت دان" کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس پاد کو مارنے والا اپنے چہرے پر "میں نے تو نہیں مارا" کا تاثر دے سکتا ہے یا نتھنوں کو چٹکی سے دبا کر ساتھ موجود شخص کو الزام دینے والی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے۔ تاہم اسے جاپانی ضرب المثل ضرور یاد رکھنی چاہیے: "جو بولتا ہے پاد اسی نے مارا ہوتا ہے۔" اگر تم "گپت دان" پاد مار چکے ہو تو دوسروں کو اندازے لگانے دو کہ یہ مہربانی کس نے کی ہے۔

پاد کے حوالے سے مختلف قوموں کے رویے مختلف ہیں۔ یورپی اور امریکی

اس حوالے سے بالکل شرم نہیں کرتے۔ یہ ان کا یونانی ورثہ ہے۔ نیارکس نے پہلی صدی عیسوی میں پاد کی خصوصیات یوں بیان کی تھیں:

"اگر پاد کو روکا جائے تو وہ انسان کو ہلاک کر سکتا
ہے' اگر اسے خارج ہونے دیا جائے تو وہ صحت
بخش گیت گا سکتا ہے۔
پاد ہلاک بھی کرتا ہے اور زندہ بھی بچاتا ہے۔
پاد ایک طاقتور بادشاہ ہے۔"

نیارکس بے آواز متعفن بم اور با آواز پاد کی خصوصیات سے آگاہ تھا۔ وہ طنزاً کہتا ہے:

"ہنری نے آہ بھری ہے یا پاد مارا ہے؟
وہ دونوں طرف سے زور دار سانس خارج کرتا
ہے۔"

ہم عصر انگریزی شاعری میں بھی پاد کا ذکر مل جاتا ہے:

"تم پاد کیوں نہیں مارتی ہو ڈیئر مس برائٹ؟
مجھے تو پاد مارنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ میں
لکھاری ہوں۔"

اگرچہ سفید فام لوگ ایسی غذائیں کھاتے ہیں' جو زیادہ ہوا پیدا نہیں کرتیں اور اگر ہوا پیدا ہو بھی جائے تو وہ اسے دوسرے لوگوں کے درمیان بے فکری سے خارج کر سکتے ہیں۔ شرابی کا پاد بہت بدبودار ہوتا ہے۔ سفید فام لوگوں کا گھٹیا پن تب عیاں ہو گیا جب ایک فرانسیسی شخص نے سٹیج پر پاد مارنے کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے ٹراؤزر کو پیچھے سے پھاڑا ہوا تھا اور وہ معمولی سا معاوضہ لے کر تین فٹ دور عقب میں جلنے والی موم بتی کو اپنے پاد سے بجھا کر دکھاتا تھا۔

سفید فام تو غلیظ ہیں سو ہیں' ہندوستانی بھی ان سے بہتر نہیں ہیں۔ ہندوستانیوں کی حسِ مزاح بہت گھٹیا ہے۔ انہوں نے پاد مارنے کو ہنسی ٹھٹھول کا موضوع بنالیا ہے۔ چونکہ وہ بہت زیادہ مصالحہ دار تمسک غذائیں کھاتے ہیں اس لیے پاد مارنے میں ورلڈ چیمپئن ہیں اور بیشتر اوقات ایک دوسرے پر ہنستے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک وزیر کا آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروسز کے لیے تقریر ریکارڈ کراتے ہوئے ایٹم پاد نکل گیا۔ اس تقریر کو دوبارہ ریکارڈ کرنا پڑا تھا۔ تاہم جب تقریر نشر کرنے کا وقت ہوا تو غلطی سے پاد والی ریکارڈنگ نشر کر دی گئی۔ اس سے ایک ہندوستانی کو یہ امتیاز حاصل ہو گیا کہ اس کا پاد ساری دنیا میں سنا گیا۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ توجہ کرے۔

پاد کے حوالے سے عربوں اور ایرانیوں کا رویہ بہت سخت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نوجوان ایرانی کا محفل میں پاد خارج ہو گیا۔ وہ اتنا شرمندہ ہوا کہ اس شہر سے چلا گیا۔ طویل عرصے بعد وہ اپنے شہر واپس گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد لوگوں نے اس کی معمولی سی ناشائستگی کو بھلا دیا ہوگا۔ اس نے اپنے شہر پہنچ کر گلی کے بچوں سے اپنے پرانے گھر کا راستہ پوچھا تو بچے بولے: ''اچھا فلاں پدوڑے کے گھر کا راستہ پوچھ رہے ہو؟'' وہ بے چارہ الٹے قدموں شہر سے نکل گیا۔

پاد مارنے والوں کو شرمندگی کے بچانے کے حوالے سے بلخ کے باشندے عبدالرحمٰن حاتم ابن الصعام کو پہلا انعام دیا جانا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت اسے اپنا مسئلہ سنا رہی تھی۔ بات کرتے کرتے اس کا پاد نکل گیا۔ حاتم نے اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے کان پر ہاتھ رکھا اور بولا: ''اونچی آواز میں بات کرو' میں بہرا ہوں۔'' وہ عورت پندرہ سال زندہ رہی اور حاتم اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے ساری دنیا کے سامنے بہرا بنا رہا۔ میں سوچتا ہوں' کہ کیا بھاگ متی اصل کام کے بدلے پادوں پر اس عالمانہ مقالے کو پسند کرے گی؟

1857ء

ایلس آلڈویل

میں کلکتہ سے دلی منتقل ہونے پر اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔

کلکتہ میں کوئی برائی نہیں تھی لیکن کئی وجوہات کے تحت میں وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہاں یوریشین بڑی تعداد میں رہتے تھے اور اگر تم ان کی محبت سے مکمل کنارہ کشی نہ کرو تو انگریز تمہیں بھی انہیں میں سے ایک تصور کرنے لگتے تھے۔ محسوس نہ کرنا میں ذاتی طور پر یوریشینز کے خلاف نہیں ہوں! وہ دوغلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ ان میں کئی لوگ بہت اچھے ہیں۔ یہ میں ذاتی طور پر جانتی ہوں۔ مم کو کلکتہ میں رہتے اتنا طویل عرصہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنے وطن کو بھلا چکی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا خاوند پکا انگریز جنٹل مین تھا۔ میرے خاوند کا نام الیگزینڈر آلڈویل تھا اور وہ محکمۂ ڈاک وتار میں ملازمت کرتا تھا۔ اس سے شادی کے وقت میری عمر سولہ سال اور اس کی عمر پچاس سال تھی۔

شادی کے پہلے ہی دو سال بعد میں اس کی دو بچیوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے حاملہ نہیں کر پایا۔ پچپن سال کی عمر میں اسے ملازمت سے ریٹائر کر دیا گیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہمیں انگلستان واپس لے جائے گا لیکن اس نے کلکتہ کو چھوڑنے

سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہاں رہنا زیادہ مہنگا نہیں ہے۔ وہاں انگلستان میں ہمیں کوئی ''آیا'' اور ''چھوکرا'' میسر نہیں ہوں گے۔

چونکہ میرے خاوند نے زیادہ رقم پس انداز نہیں کی تھی اس لیے ہمیں چورنگی اور بازار کے درمیان واقع یوریشین علاقے میں ایک سستے مکان میں رہنا پڑا۔ میں اپنے ہمسایوں سے دور رہتی تھی۔ تاہم الیگزینڈر نے ان سے کافی میل جول بڑھا لیا۔ وہ ان کے گھروں میں آنے جانے اور ان کے ساتھ پینے پلانے لگا۔

میں نے اس سے التجا کرتے ہوئے کہا: ''میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹیاں ہندوستان میں پروان چڑھیں۔ میں انہیں انگلستان کے کسی اچھے سکول سے تعلیم دلانا چاہتی ہوں۔ اگر تمہاری پنشن ناکافی ہے تو چلو کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں تمہیں ملازمت مل جائے۔ ہم تمہاری تنخواہ اور پنشن سے بچیوں کی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ ہم بچت کر کے انگلستان واپس جا سکتے ہیں۔ اس دوران ہم اچھی قسم کے لوگوں سے میل جول رکھیں گے۔''

میں نے اس سے کئی بار ایسی باتیں کیں۔ وہ ہر مرتبہ کہتا: ''میری عمر کے شخص کو ملازمت کون دے گا؟'' اور تیز تیز چلتا ہوا گھر سے نکل جاتا۔

میں عاجز آ چکی تھی۔ میں اسے بتائے بغیر اس کے سابق باس مسٹر جارج ہنکنز کے پاس چلی گئی۔ مسٹر ہنکنز بہت اچھا انسان تھا۔ اس کی عمر صرف چالیس سال تھی اور وہ کنوارا تھا۔ اس نے میرا مسئلہ سنا اور اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے مجھے کلکتہ کلب میں رات کا کھانا کھانے کی دعوت دی۔ کلکتہ کلب انگریز شرفاء کا کلب تھا۔ اس کا ماحول خالصتاً انگلستانی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ میرے جیسی دلکش خاتون کے ساتھ دیکھے جانے پر فخر کرے گا۔ میں نے اس کی ناک کو دوستانہ انداز میں چٹکی سے دبایا۔ رات کا کھانا کھانے اور رقص کرنے کے بعد ہم اس کی بگھی میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اسے ایک بھرپور الوداعی بوسہ دیا۔

چند دن بعد مسٹر ایلکنز نے مجھے رات کے کھانے کے لیے اپنے بنگلے میں مدعو کیا۔ ماحول بڑا رومانوی تھا۔ شمعیں روشن تھیں' شیمپین موجود تھی اور ایسے ہی سب لوازمات مہیا تھے۔ کلکتہ کے سب سے مہنگے سٹور ''دی ہال آف آل نیشنز'' سے انگریزی سؤر کا گوشت' پنیر اور دیگر اشیاء منگوائی گئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے — اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اس کا وقت حقیقتاً خوشگوار بنا دیا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے' میرا خاوند تو نامرد ہو چکا تھا۔ میری عمر چھبیس سال تھی اور میں نے ایک سال سے کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

جارج ایلکنز کو جنسی عمل کے حوالے سے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ دخول کرتے ہی خلاص ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو دوسری مرتبہ کے لیے تیار کیا۔ اس مرتبہ اس نے بڑی شدت سے کام لیا۔ اس نے میری چھاتیوں کو دانتوں سے کاٹا' میرے بے چارے کولہوں میں ناخن گاڑے اور ممکنہ حد تک سختی سے دخول کیا۔ جب وہ اختتام کے قریب پہنچا تو میں نے چیخ کر کہا: ''تم نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہے ڈارلنگ!'' وہ ہنسنے لگا اور ایک زوردار ''ہا'' کی آواز کے ساتھ خلاص ہو گیا۔

میں نے بھی یوں ظاہر کیا جیسے میں بھی اسی جیسی کیفیت سے گزری ہوں اور تھک چکی ہوں۔ وہ سینٹ جارج جیسا دکھائی دے رہا تھا — کہ جس نے اپنے پہلے اژدہے کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ نہایت مہذبانہ انداز میں بولا: ''کیا میں نے تمہیں تکلیف دی ہے؟ پلیز مجھے معاف کر دو!''

مجھے تکلیف ہوئی ہے؟ مائی فٹ! بہرحال میں نے نہایت تھکی ہوئی آواز میں کہا: ''نہیں ڈارلنگ! تم نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی بلکہ بے پناہ مسرت دی ہے۔ تھینک یو تھینک یو۔''

جارج ایلکنز کے چہرے پر خوشی کے ایسے تاثرات ابھرے جیسے اس کی تنخواہ

دگنی ہو گئی ہو یا جیسے اس نے کرکٹ میچ میں سنچری بنالی ہو۔ وہ اپنا سینہ یوں تھپتھپاتے ہوئے' جیسے وہ طلائی تمغوں سے بھرا ہو' میرے پہلو میں لیٹ گیا۔ میں نے اس کی چھاتیوں کو سہلانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ سخت ہو گئیں۔ میں نے اس کی توند کو چوما اور اپنا ناک اس کی ناف میں گھسا دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا قضیب بڑی بے چارگی کی حالت میں تھا۔ میں اس کی ناف کے نیچے کے سرخ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور اس کی سپاری کو سہلانے لگی۔ وہ یوں حرکت میں آیا جیسے سانپ پٹاری سے نکل رہا ہو۔ پھر میں نے زبان سے کام لیا' یہاں تک کہ وہ دوبارہ پوری طرح زندہ ہو گیا۔ اس کا قضیب کافی بڑا تھا۔ میں اس کے اوپر آ گئی اور اسے اپنی رانوں کے درمیان لے لیا۔ میں اسے ایک ایسی لذت دینا چاہتی تھی جو اسے تاحیات یاد رہے۔

وہ بازو میری کمر میں ڈالتا ہوا بولا: "میرا خیال ہے یہ تمہارے اندر کی ہندوستانی عورت ہے۔ جس نے تمہیں اتنی زبردست محبت کرنے والی بنا دیا ہے۔"

مجھے اس کی بات پسند نہیں آئی۔ میں نے اسے ناپسندیدگی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا: "نہیں جارجی ڈیئر! مجھ میں کوئی ہندوستانی عورت نہیں ہے۔ میں بھی تمہاری طرح پکی انگریز ہوں۔ سو فیصد انگریز اور مجھے اس پر فخر ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم الیگزینڈر کو کوئی ملازمت دلوا دو گے۔"

میں نے اسے چوما اپنا درمیانی حصہ اس کے جسم سے ملا دیا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی: "وعدہ کرو۔" اس نے منہ دوسری طرف کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا سر پکڑ لیا۔

اس نے کہا: "میں اپنی سی بہترین کوشش کروں گا۔"

اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے اپنا منہ اس کے منہ سے جوڑ دیا اور اس کے منہ میں زبان گھمانے لگی۔ ہم دونوں جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو دانت کاٹنے' بھینچنے اور خراشیں لگانے لگے۔ آخری عمل میں ہم نے ایک دوسرے کو تقریباً مار ڈالا۔ وہ رات تین

بجے مجھے گھر چھوڑ آیا۔

اگلی صبح میں نے الیگزینڈر سے کہا کہ وہ مسٹر ایمکنز سے ملے۔ (میں نے اسے کہا کہ میں نے کسی سے مسٹر ایمکنز کو سفارش کروائی ہے)۔ امکان صرف اس بات کا تھا کہ ایمکنز نہیں چاہے گا کہ میں کلکتہ سے چلی جاؤں لیکن خیر تم تو مردوں کو جانتے ہی ہو! ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے الیگزینڈر کو دلی میں ملازمت دلوا دی۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنے اس کے بنگلے گئی۔ اس مرتبہ نہ شمعیں تھیں، نہ شیمپین، نہ کھانا۔ اس نے میرے ساتھ صرف ہم بستری کی۔

یوں ہم 1856ء کے موسم بہار میں دلی پہنچے۔ ہم نے دریا گنج میں ایک بڑا دو منزلہ مکان کرائے پر لے لیا۔ بیشتر یورپی اسی علاقے میں رہتے تھے۔ ہمارے بنگلے کا صحن کشادہ تھا۔ اس میں ہمارے آیا، خانساماں، مسالچی، آب دار، بہشتی، سائیس، جمعدار اور دوسرے ملازموں کے لیے کوارٹر تھے۔ اس کی دیواریں کسی قلعے کی فصیل کی طرح اونچی اور بہت بڑا دروازہ آہنی تھا۔ ہمارے بنگلے کی شرقی سمت دریائے جمنا بہتا تھا اور شہر کی فصیل تھی۔

نومبر میں میرے بطن سے تیسرا بچہ پیدا ہوا۔ یہ بھی لڑکی تھی۔ ہم نے کشمیری گیٹ کے گرجا گھر میں اسے عیسائی بنایا۔ میں نے اس کا نام جارجینا رکھا۔ (میں نے ایک کارڈ بھیج کر مسٹر ایمکنز کو بچی کی پیدائش اور اس کے نام سے آگاہ کیا)۔

چندرہ دن بعد ہم نے جارجینا کی پیدائش کی خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ دلی کے ہر اہم شخص کو مدعو کیا گیا۔ پچاس سے زیادہ لیڈیز اور جنٹل مینوں نے تقریب میں شرکت کی۔ ریذیڈنٹ مسٹر تھیوفیلس میٹکاف بھی، جو "بڑا صاحب" کہلاتے تھے، چند منٹ کے لیے آئے۔ چاندنی چوک والے بینک کے منیجر مسٹر بیرسفورڈ اپنی بیوی بچوں سمیت آئے۔ لال قلعے کے گارڈز کے کمانڈر کیپٹن ڈگلس اور کمشنر سائمن فریزر بھی آئے۔ بچی کو جنم دینے کی وجہ سے میں نہ تو رقص کر سکی اور نہ شراب پی سکی تاہم باقی سب

نے خوب اچھا وقت گزارا۔

ہم نے کسی مقامی کو نہیں بلایا تھا۔ اس کے باوجود کئی مقامیوں نے ہمیں تحائف بھیجے۔ بوڑھے بادشاہ بہادر شاہ کی چہیتی بیوی زینت محل نے بھی مخمل کا ایک خوبصورت پارچہ بھیجا۔

مسٹر مٹیکاف نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ انہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہ کہا انہیں کسی ایسی خاتون کی تلاش ہے جو نوابوں کے حرموں میں جا کر ان کی بیگمات کے خیالات سے مجھے آگاہ کرے۔ مجھے نہیں پتا کہ انہوں نے کیسے یہ اندازہ لگایا کہ میں ہندوستانی سمجھتی ہوں۔ چونکہ انہوں نے ذاتی طور پر مجھے کہا تھا' اس لیے میں نے ان کی ہر خدمت بجالانے کا وعدہ کیا۔

دلی میں سردیوں کا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ دسمبر میں سردی اتنی ہو جاتی ہے کہ آتش دان روشن رکھنا پڑتا ہے۔ صبح کے وقت زمین اوس سے بھیگی ہوتی ہے۔ دن روشن اور حرارت بھرے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر کو نہایت سکون بخش بنالیا تھا اور یورپیوں کے لیے اس کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ کیپٹن ڈگلس اور اس کے نوجوان ماتحت تو اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ میں لونگ ملی شراب سے ان کی تواضع کرتی تھی' جو کہ انہیں بہت پسند تھی۔ ہم نے کرسمس سینٹ جیمز چرچ میں منائی۔ اگلی صبح میرے خاوند کے ماتحتوں نے ''بڑا دن'' کی خوشی میں ہمیں پھولوں اور پھلوں سے بھری ٹوکریاں بھیجیں۔ سارا برآمدہ ان ٹوکریوں سے بھر گیا۔ سہ پہر کو مسٹر میٹکاف نے یورپی برادری کے افراد سے اپنے گھر میں ملاقات کی۔ ہم نے وہاں ملکۂ معظمہ کی صحت و سلامتی کے جام پیے اور شجر کرسمس کے گرد رقص کیا۔ رقص میں کچھ کنوارے بھی ہم میں شامل ہو گئے۔ اس شام ہر شے مستی میں تھی۔ الیگزینڈر بالکل مست ہو گیا اور اسے اٹھا کے لے جانا پڑا۔ مردوں نے مجھ سے فلرٹ کیے۔ کرسمس کی مبارک باد کے بہت سے بوسے دیے لیے گئے۔

باکسنگ ڈے پر الیگزینڈر کیپٹن ڈگلس کے ساتھ شکار پر چلا گیا۔ وہ دو سیاہ ہرن، چار مرغابیاں اور پچاس سے زیادہ تیتر شکار کر کے لائے۔ ہم نے ہرنوں کی رانیں اور دو تیتر اپنے دوستوں کو بھیجے۔

نئے سال کی شام ہم نے ایک بڑی تقریب برپا کی۔ مسٹر میٹکاف نے ہمیں ایک بار پھر عزت بخشی اور تھوڑی دیر کے لیے تقریب میں شریک ہوئے۔ وہ مجھے ایک مرتبہ پھر الگ لے گئے اور مجھے میرا وعدہ یاد دلایا۔ وہ اس حوالے سے بڑے مشتاق لگ رہے تھے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں یہ کام ضرور کروں گی۔

اصل موج میلہ مسٹر میٹکاف کے جانے کے بعد شروع ہوا۔ الیگزینڈر نشے میں دھت ہو گیا اور اسے بستر پر لٹا دینا پڑا۔ ایک شخص نے الیگزینڈر سے ایک گز کے فاصلے پر ہی میرے ساتھ تقریباً زنا کر ڈالا۔ میرا احمق شوہر اسے کہتا رہا: "اس خونی کتیا کو نہ چھوڑنا......"

دلی میں زندگی یوں گزر رہی تھی۔

تقریبات کا موسم ختم ہونے کے بعد میں نے مقامی لوگوں کی بیویوں کو شکریے کے خطوط لکھے کہ انہوں نے جار جینا کی پیدائش اور "بڑا دن" پر ہمیں تحائف بھیجے۔ کچھ بیگمات نے آ کر گلہ کیا کہ ایک ہی خاندان کے افراد کے لیے ایسے خطوط ضروری نہیں ہوتے۔ (میں اور ایک مقامی گھرانے کی فرد! یا حیرت!!)۔ خیر مقامی لوگ اسی طرح مبالغہ آمیزی کرتے ہیں۔ میں ہر کسی کی "بہن" تھی! ان کے بچے مجھے خالہ کہتے تھے۔ یہ لوگ منہ پر تو مسکراہٹ سجائے رکھتے ہیں لیکن تمہاری پشت میں خنجر گھونپنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔

☆☆☆

اپریل 1857ء کی بات ہے۔ موسم بہت گرم ہو گیا تھا۔ ہم نے دروازوں پر خس کے پردے لگوا دیے تھے اور ان پر بہشتیوں سے پانی کا چھڑکاؤ کروا دیا تھا۔ گرمی

اتنی تھی کہ کسی کو سہ پہر میں باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ راتیں بھی ناخوشگوار ہو گئی تھیں۔ ہم چھت پر سوتے اور ملازم ساری ساری رات ہمیں پنکھوں سے ہوا دیتے۔ ایک روز ملکہ زینت محل نے تال کٹورا کی اپنی زرعی اراضی سے آنے والے تربوزوں اور آموں سے بھرا طشت ہمارے گھر بھیجا۔ میں نے خادموں کو اچھی خاصی بخششیں دی اور مسٹر میٹکاف کو اس کی اطلاع کر دی۔ انہوں نے مجھے ہدایت بھیجی کہ میں بھی زینت محل کی طرف سے پھلوں کا تحفہ پانے والی یورپی عورتوں کے ساتھ جا کر ملکہ کا شکریہ ادا کروں۔

میں مسٹر بیرسفورڈ کی بھیجی ہوئی فٹن میں اپنی دو بڑی بیٹیوں سمیت روانہ ہوئی۔ کیپٹن ڈگلس نے لاہوری دروازے پر ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہاں سارجنٹ فلیمنگ کی بوڑھی بیوی اور اس کی بیٹی' مسز سکلی اور کچھ دوسری خواتین موجود تھیں۔ کیپٹن ڈگلس نے ہمیں ایک فربہ خواجہ سرا بسنت علی خان کے سپرد کیا۔ وہ حرم کے محافظوں کا سربراہ تھا۔ ہم اس کی معیت میں مینا بازار اور لمبی ناختم ہونے والی راہداریوں سے گزرے' جن کی دونوں اطراف میں شاہی خاندان کے افراد کے کمرے تھے۔ اتنی گندی جگہ دنیا میں کہیں اور نہ ہو گی۔ ان کے کمرے میرے ملازموں کے کمروں سے زیادہ گندے تھے' عورتوں نے میری آیاؤں سے بھی پست درجے کا لباس پہنا ہوا تھا۔ ہمیں ملکہ کے کمرۂ استقبالیہ میں بٹھایا گیا' جہاں سے دریا نظر آتا تھا۔

ایرانی قالینوں پر دیوان رکھے تھے۔ ہم مخملیں گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ گرمیوں میں قالین! خیر یہ مقامی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہر مہمان کے پیچھے دو عورتیں کھڑی بڑے بڑے پنکھے ہلا رہی تھیں۔ انہوں نے ہم پر گلاب اور کیوڑے کا عرق چھڑکا۔ ایک خاتون نقیب نے اعلان کیا" ملکۂ معظمۂ ہندوستان' ملکۂ عالم' ملکۂ دوراں تشریف لاتی ہیں!"

یہ مقامی لوگ بڑے بڑے خطابات والقابات کو پسند کرتے ہیں۔ ملکہ تشریف

لے آئی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور باداموں جیسی تھیں، جلد کا رنگ زیتون جیسا تھا اور بال سیاہ تھے۔ اس نے قمیض اور غرارہ پہنا ہوا تھا اور سر پر کریب کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ ہم سب عورتیں اس کے احترام میں کھڑی ہوگئیں۔ اس نے ہم سب سے مصافحہ کیا۔ انگریزی میں ''گڈ آفٹرنون'' کہا اور میری بچیوں کے گال تھپتھپائے۔ میری بچیوں نے اسے نذرانہ سلام پیش کیا۔ پھلوں اور مٹھائیوں سے ہماری تواضع کی گئی۔ اس نے ہمیں اصرار کیا کہ ہم انہیں چکھیں تو سہی۔ اسے تھوڑی سی انگریزی آتی تھی۔ ہم بھی تھوڑی بہت ہندوستانی سمجھ لیتی تھیں۔ یوں کام چل گیا۔ جب ہمارا ذخیرۂ الفاظ ختم ہو جاتا تو ہم ہنسنے لگتیں۔

میم صاحبوں کو دیکھنے اور ان سے بات کرنے کے لیے بہت سی متجسس بیگمات آئیں۔ اگرچہ زنان خانے میں مردوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی تاہم شہزادہ جواں بخت کو اپنی نوبیاہتا دلہن کے ساتھ آنے کی اجازت دی گئی۔ شہزادہ جواں بخت کی عمر سولہ سال تھی اور اس کی شادی تھوڑا ہی عرصہ پہلے اپنی ایک عم زاد سے ہوئی تھی۔

ملکہ نے ہم سب کو تحائف دیے۔ ہم نے بھی اسے اور اسے کے داماد کو تحائف پیش کیے۔ میری بیٹیوں کو ایک ایک ریشمی قمیض شلوار اور سونے کی چوڑی ملی۔ میں نے ملکہ اور اس کے داماد کو یارڈلے کے لیونڈر واٹر کی ایک ایک بوتل اور ملکہ کو ایک لیڈیز گھڑی دی۔

ہم چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئیں۔ ہماری ٹولی میں جواں بخت اور اس کی بیوی بھی شامل تھے۔ لڑکے کو عورتوں کی صحبت میں رہنے کے لیے آداب سکھائے نہیں گئے تھے۔ وہ پان چباتا اور اگال دان میں بار بار سرخ خوفناک پیک تھوکتا رہا۔ ایک خواجہ سرا اگال دان اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا۔ عام مقامیوں کی طرح وہ اعضائے مخصوصہ کو بار بار کھجا رہا تھا۔ اسے اپنے حواریوں کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے کی بھی بری عادت تھی۔ بعض اوقات اس نے کچھ تبصرے فارسی میں بھی کیے۔

اس کا خیال تھا کہ ہمیں فارسی نہیں آتی۔ چونکہ میں نے اس سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی تھی اس لیے اس نے اپنی گندی آنکھوں اور زبان کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ اس نے اپنی بیوی کو فارسی کا ایک شعر سنایا' جس کا مفہوم تھا: "بلبل سے وفا کی توقع مت رکھنا' جو ہر نئے گلاب کے گیت گا رہی ہوتی ہے۔"

وہ احمق لڑکی چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ کر بے تحاشا ہنسنے لگی۔ چونکہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس لیے میں سمجھ رہی تھی کہ شعر مجھے مخاطب کر کے سنایا گیا تھا۔ یہ ہنسی مخول یونہی جاری رہا۔ وہ فحش گوئی پر اتر آئے تھے۔ مجھے حقیقتاً غصہ آ گیا۔

میں نے جواں بخت سے کہا: "یہ تمہاری بیوی نے کیا بک بک لگا رکھی ہے؟"

جواں بخت چالاکی دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں فارسی سمجھ سکتی ہوں۔ اس نے بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "آلڈویل میم صاحب! یہ شعر تو جوانی اور حسن کی ستائش میں تھے۔ آپ کیوں غصے ہو رہی ہیں۔ سعدی نے غصے میں آنے والی عورت کے حوالے سے کہا ہے......" اور اس نے فارسی میں شعر پڑھے۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے فارسی ہی میں کہا: "مجھے پتا ہے کہ ان شعروں کا کیا مطلب ہے۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ کیا میں تمہاری والدہ سے شکایت کروں کہ تم کیا کہہ رہے تھے؟"

کاش تم نے اس کا چہرا دیکھا ہوتا۔ بالکل کسی کیلے کے خشک پتے کی طرح زرد۔ وہ کانٹے میں پھنسے کسی کیڑے کی طرح بل کھانے لگا تھا۔ اس کی ماں میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی: "تم کیا جھگڑا کر رہے ہو آپس میں؟"

میں نے کہا: "ملکۂ معظمہ اپنے بیٹے سے پوچھیے۔"

میں جواں بخت کی ٹولی سے نکل کر ایک کمرے میں موجود لڑکی سے بات کرنے چلی گئی جو مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنے سیکھے ہوئے انگریزی الفاظ کو آزمانا چاہتی تھی۔ جواں بخت بھی تیزی سے دوسری طرف چلا گیا اور

مسز سکلی سے باتیں کرنے لگا۔ پتا نہیں اس نے اس سے کیا کہا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ ایک دم کھڑی ہوگئی اور مسز فلیمنگ سے بولی: ''مدر! آپ نے سنا یہ بدمعاش کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہتا ہے جلد ہی وہ انگریزوں کو اپنے پیروں تلے روند دے گا' اور اس کے بعد ہندوؤں کو مار دے گا۔''

مسز فلیمنگ بوڑھی اور بڑی منہ پھٹ تھی۔ اس نے غصے سے کہا: ''جواں بخت! کیا تم نے ایسا کہا تھا؟''

ملکہ سخت غصے سے اپنے بیٹے کو گھورنے لگی۔ جواں بخت بندر کی طرح اپنے سرخ دانت نکال کر ہنسنے لگا: ''میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔''

مسز فلیمنگ بولی: ''تم کیسے مذاق کر رہے ہو؟ پہلے تم نے ایک خاتون سے (مراد تھی مجھ سے) بدتمیزی کی اور پھر انگریز قوم سے! اگر ہندوستان میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو سب سے پہلے تمہارا سر قلم کروا دیا جائے گا۔''

خادمائیں بولیں: ''لاحول ولا قوۃ۔'' ملکہ زینت محل کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہوگیا۔ سب جانتے تھے کہ وہ جواں بخت کو دلی کا اگلا بادشاہ بنوانے کے لیے ''صاحبوں'' کے دروازوں پر دستکیں دے رہی ہے۔ جبکہ وہ اس کی امیدوں پر یخ پانی انڈیل رہا تھا۔ اس نے مضبوط لہجے میں اس سے کہا: ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ چلو معافی مانگو۔''

وہ بدمعاش بولا: ''اماں جان! میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ایرانیوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی افواہیں گردش کر رہی ہیں' اور جس طرح سو سال پہلے نادر شاہ نے کافروں کو ہلاک کروایا تھا' ایرانی بھی ویسا ہی کریں گے۔ اماں جان! آپ خوب جانتی ہیں کہ میں تو دلی کی یورپی خواتین کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔''

اس کی اس بات سے میرے اس خیال کی توثیق ہوگئی کہ مقامی لوگ بڑے جھوٹے ہوتے ہیں۔ خیر مجھے مسٹر میٹکاف کو بتانے کے لیے کچھ مل گیا تھا۔

استقبالیہ اختتام پذیر ہوا۔ زینت محل نے پانوں سے بھرا طشت منگوایا اور ہم سب کو اپنے ہاتھ سے ایک ایک پان دیا۔ میں بھی دوسرے یورپیوں کی طرح پان نہیں کھا سکتی' تاہم درباری آداب کا تقاضا تھا کہ پان لے لیا جائے۔ لہٰذا ہم نے پان منہ میں ٹھونسے' ملکہ کو سلام کیا اور رخصت ہوئیں۔

میں نے الیگزینڈر کو محل میں ہونے والی تقریب کا احوال سنایا۔ وہ حیران نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ ایرانیوں یا روسیوں کے حملہ آور ہونے کی افواہیں سن چکا ہے تیز جامع مسجد کی دیواروں پر چسپاں اشتہار بھی دیکھ چکا ہے' جن میں بتایا گیا ہے کہ حملہ اس موسم گرما میں ہونے والا ہے۔ اس نے کہا کہ لارڈ کیننگ کے وائسرائے بننے کے دن سے ہی ایسی افواہیں پھیلی ہوئیں ہیں۔ اس دن حلف لینے کے لیے جاتے وقت ان کا پاؤں قالین میں اٹک گیا تھا اور وہ لڑکھڑا گئے تھے۔ مقامی لوگ کہتے تھے کہ یہ نشانی اللہ نے دکھائی تھی کہ گورنر کا اقتدار اسی طرح لڑکھڑا کر ختم ہو جائے گا۔ الیگزینڈر نے کہا کہ بیشتر مقامیوں کو یقین ہے کہ انگریز راج جنگِ پلاسی کے سوویں سال ختم ہو جائے گا۔ اور یہ وقت جون میں پورا ہوتا ہے۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: "یہ بدمعاش کالے صرف بک بک کر سکتے ہیں۔ انہیں کوشش تو کرنے دو' ہم ان کے گندے کالے مقعدوں میں چکنائی دار بانس چڑھا دیں گے۔" جب سے الیگزینڈر نامرد ہوا تھا' وہ ایسی ہی زبان بولنے لگا تھا۔

الیگزینڈر نے مسٹر میٹکاف سے مل کر انہیں وہ باتیں بتائیں جو میں نے محل میں اور اس نے بازار میں سنی تھیں۔ مسٹر میٹکاف نے الیگزینڈر کا شکریہ ادا کیا اور اسے کہا کہ وہ مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ میں بادشاہ کے پوتے مرزا عبداللہ کے حرم کی عورتوں سے میل جول رکھوں۔

مرزا عبداللہ دریا گنج میں رہتا تھا۔ وہ حسن عسکری نامی ایک شخص کا مرید تھا۔ حسن عسکری ہمارے گھر کی عقبی گلی میں رہتا تھا۔ مشہور تھا کہ حسن عسکری بادشاہ کا مخبر تھا۔

بادشاہ کی بیٹی' جو دو سال پہلے مرگئی تھی' اس کی بیوی تھی۔ مرزا عبداللہ کی بہن کئی مرتبہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ حقیقت میں تو میں اس سے جوابی ملاقات کی بالکل بھی خواہش نہیں رکھتی تھی۔ تاہم مسز میٹکاف کی درخواست کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے اپنے وطن کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے۔

میں ایک سہ پہر مرزا عبداللہ کے گھر چلی گئی۔ حیرت ہے' جب کوئی یورپی لیڈی ان مقامیوں سے ملاقات کرے تو وہ کتنے خوش ہوتے ہیں! عورتیں تو اتنی گھبرا گئیں کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور ان سے بات بھی مشکل ہی سے ہو سکی۔ وہ سب مجھے حملے کی افواہیں سنانے کو بے چین ہوئی جا رہی تھیں۔

مرزا کی بڑی بیوی بولی: ''آپ لوگوں کی زبان کو تو نہیں پکڑ سکتے نا؟ جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں۔''

میں نے اس سے حسن عسکری کے بارے میں پوچھا۔ بیگم نے جواب دیا: ''وہ اللہ والے ہیں۔ ہمارا ان سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے۔''

وہ جھوٹ بول رہی تھی کیونکہ جو درزی میرے کپڑے سیتا تھا' وہی مرزا عبداللہ کے گھرانے کی خدمت بھی کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ حسن عسکری اکثر مرزا عبداللہ کے گھر آتا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' تم مقامیوں پر کبھی بھروسا نہیں کر سکتے۔ وہ جس دن بولنا سیکھتے ہیں' اسی دن جھوٹ بولنا بھی سیکھ جاتے ہیں۔

الیگزینڈر نے جا کر مسز میٹکاف کو میرے مرزا عبداللہ کے گھر جانے کا احوال سنایا۔ واپسی میں اس نے بتایا کہ چھاؤنی میں پراسرار انداز میں آتش زنی ہوئی ہے اور اجنبی لوگ چپاتیاں بانٹتے رہے ہیں۔ اس نے کہا: ہمیں یقین ہے کہ کالے بدمعاش ہمارے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ تاہم ابھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ منافق کب ہماری پشت میں چھرا گھونپیں گے۔

ہمارا معمول تھا کہ سونے سے پہلے شام کا سارا وقت چھت پر ہی گزارتے

تھے۔ (سوائے آندھی والی شام کے)۔ ہم چھت پر رات کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ پھر جیسا کہ میں بتا چکی ہوں' بہشتی پانی کا چھڑکاؤ کر دیتے اور نوکر ہمارے بستر لگا دیتے۔ پہلے میں الیگزینڈر کے قریب ہی بستر لگواتی تھی لیکن جب سے اس نے کڑھی کھانا شروع کی تھی' بہت بدبودار پاد مارنے لگا تھا۔ اس لیے میں اس کا بستر دور لگوانے لگی تھی تا کہ ہم تو اس کے پادوں سے پریشان نہ ہوں۔ چھت پر راتیں ٹھنڈی اور صبح کی ہوا بہت خوشگوار ہوتی تھی۔

غدر رمضان کے مہینے کی ایک صبح شروع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ مؤذن نے اذان دی تو میری آنکھ کھل گئی۔ اگرچہ ابھی اندھیرا تھا لیکن میری آنکھ دوبارہ نہ لگ سکی۔ ہمارے مسلمان نوکر جلدی جلدی کھانا تیار کر کے کھا رہے تھے۔ جونہی دریا کے پار واقع جنگل پر صبح کا اجالا نمودار ہوا' شاہی مسجد سے ایک گولہ داغا گیا۔ دھماکے نے الیگزینڈر اور بچوں کو بھی جگا دیا۔ خانساماں ہمارا ''چھوٹا حاضری'' لے آیا۔

میری بیٹیاں چھت پر ٹہلتے ہوئے دودھ پی رہی تھیں۔ میں اور الیگزینڈر چائے پی رہے تھے کہ ہم نے ایک موٹے بنیے کو پیتل کا لوٹا اٹھائے فصیل کے نیچے اکڑوں بیٹھتے دیکھا۔ یہ مقامی لوگ دیوار کو دیکھ کر کبھی باز نہیں رہ سکتے۔ الیگزینڈر صبح کی چائے پینے کے وقت ہمیشہ ایک غلیل اور کنکریوں سے بھرا طشت ساتھ رکھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ بنیا فراغت پائے الیگزینڈر نے غلیل سے کنکری پھینکی۔ کنکری پیتل کے لوٹے سے ٹکرائی۔ بنیا جلدی سے دھوتی باندھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ الیگزینڈر نے چلا کر کہا: ''کالے حرامی دفع ہو جاؤ۔'' وہ بے چارہ وہاں سے دفع ہو گیا۔ ہم دیر تک ہنستے رہے۔ پھر ایک اور شخص آیا۔ اس نے ایک پنجرا اٹھایا ہوا تھا' جس میں ایک تیتر بند تھا۔ ایک اور تیتر چند گز پیچھے زور سے صدائیں بلند کرتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ الیگزینڈر نے اپنی ''بندوق'' اٹھائی ـــ وہ دریا کی طرف سے ادھر آ نکلنے والی مرغابیوں کو مارنے کے لیے بندوق ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا ـــ اس نے تیتر کا نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ وہ ہر صبح ایسا ہی کیا کرتا تھا۔

وہ دن بھی باقی دنوں کی طرح شروع ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سورج آگ برسانے لگا۔ دھوپ کے ساتھ مکھیاں بھی آ گئیں۔ الیگزینڈر اور بچیاں نیچے اتر گئے۔ میں سیڑھیاں اترنے ہی والی تھی کہ مجھے دریا کے پار غبار اڑتا نظر آیا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے رک گئی کہ وہ غبار کیسا ہے۔ وہ گھوڑ سواروں کا ایک جتھا تھا' جو کار بینوں سے گولیاں داغتا ہوا کشتیوں والے پل پر سے ادھر آ رہا تھا۔ میں نے پکار کر کہا: ''الیگزینڈر! الیگزینڈر! ادھر آؤ۔ ذرا دیکھو تو سہی!''

اس سے پہلے کہ الیگزینڈر دوبارہ چھت پر آئے' گھوڑ سوار قلعے کے پیچھے غائب ہو گئے۔ تاہم ان کے پیچھے پیچھے ایک اور جتھا نمودار ہو گیا۔ یہ جتھا فصیل کے ساتھ ساتھ دریا گنج کی طرف آنے لگا۔ انہوں نے ہمیں چھت پر کھڑے دیکھ لیا اور چیخ کر بولے: ''مار ڈالو سالے فرنگیوں کو۔'' انہوں نے کمپنی کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔

ہم بھاگ کر نیچے اترے اور اپنے بنگلے کے دروازے بند کر لیے۔

❀❀❀

آخری بادشاہ

ایک ضرب المثل ہے کہ گناہگار روزے رکھے تو اللہ دن کو لمبا کر دیتا ہے۔ ہمیں 1273 ہجری کے رمضان بمطابق مئی 1857ء میں ایسا ہی محسوس ہوا۔ ہم اسلامی شعائر پر عمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں تاہم انسان کمزور ہوتا ہے اور خواہشات کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس سال رمضان کا مقدس مہینہ آموں کے موسم میں آیا تھا۔ آموں سے لطف اندوز ہونے کا وقت سہ پہر کا ہوتا ہے۔ رمضان میں اس وقت کچھ نہیں کھایا پیا جا سکتا۔ پس آم بھی نہ کھائے گئے۔

مدتوں سے ہمارا معمول تھا کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے جاگ جاتے اور بالکونی میں بیٹھ کر دریا کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ ہم نے حکم دے رکھا تھا کہ ہمیں فجر کی نماز ادا کرنے تک کوئی پریشان نہ کرے۔ اس طرح ہمیں تین چار گھنٹے تنہا بیٹھنے کا وقت مل جاتا تھا۔ ہمیں یوں تاریکی اور خاموشی میں بیٹھنا پسند تھا' ہمیں جمنا میں چاندنی کا عکس جھلملاتا دیکھنا پسند تھا' جن راتوں کو چاند نہیں ہوتا ہم آسمان پر دمکتے ستاروں کو تکتے رہتے تھے' ہمیں صبح کے ستارے کی روشنی کو پہلے ہوتے آسمان سے غائب ہوتا دیکھنا پسند تھا۔ ہمیں سورج کو طلوع ہوتے دیکھنا اور کوئلوں کی کوکو سننا پسند تھا۔ صبح کی ہوا ہمارے سینے میں شاعری کی اداس دیوی کو جگا دیتی تھی۔ بعض اوقات ہم شمع روشن کر کے دو ایک شعر کہتے' بعض اوقات ہم غزل بھی کہتے تھے۔ بعض صبحوں میں ہم ذوق یا مرزا غالب یا ہمارے شہر کے چند دیگر شعرا کے بھیجے ہوئے اشعار پڑھتے تھے۔

ہمیں ان چند گھنٹوں کا سکون نہایت خوشی عطا کرتا تھا کیونکہ ہم اس وقت خود کو دیگر اوقات کی نسبت اپنے خالق سے زیادہ قریب محسوس کرتے تھے۔ جب دنیا رات کے پردے میں لپٹی ہوتی ہے تب ذہن اُس آسمان کی مانند ہوتا ہے' جس پر خیالات کے ستارے دمک رہے ہوتے ہیں۔ یہ وقت انسان کے اپنی ذات میں جھانکنے کے لیے موزوں ترین ہوتا ہے اور یہ جاننے کے لیے کہ وہ خود کو شہنشاہِ شاہاں اور شہنشاہِ ہندوستان کہلوانے کے باوجود کتنا حقیر ہے! سکون کا یہ وقت گزارنے کے بعد ہم عظیم المرتبت اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کروائی ہوئی موتی مسجد میں جا کر اپنے خالق اور اس کے نبیؐ کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے تھے (وہ خالق جس نے چاند ستاروں کو نور اور سورج کو حرارت و روشنی عطا کی ہے)۔

رمضان کے مقدس مہینے میں اس معمول میں تھوڑی سی تبدیلی آ جاتی تھی۔ صبح طلوع ہونے سے کافی پہلے چولہے روشن کر دیے جاتے تاکہ لوگ مشرقی افق پر اجالا نمودار ہونے سے پہلے پہلے کھانا کھا لیں۔ رمضان کے مہینے میں ہم سحری کا وقت دیوانِ خاص میں ایک کاؤچ پر بیٹھے تسبیح پر اللہ کے ننانوے ناموں کا ورد کرتے ہوئے گزارتے تھے۔ ہمیں ناشتہ پیش کیا جاتا' جو ہم اکیلے ہی کھاتے تھے۔ ہماری محبوب ملکہ زینت محل اپنے ہاتھوں سے پان بنا کر ہمیں بھجواتیں۔ ہم پان کھاتے ہوئے' حقے کے کش لگاتے جاتے اور جمنا کے بہتے پانی کو آسمان کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتے دیکھتے رہتے تھے۔ جونہی لاہوری دروازے پر نصب توپ سے گولہ داغ کر سحری ختم ہونے کا اعلان کیا جاتا' ہمارا حقہ بردار حقہ ہمارے سامنے سے ہٹا لیتا۔

☆☆☆

ہمیں خوب یاد ہے کہ 11/مئی 1857ء سولھویں روزے کو سوموار کی صبح کیا کیا ہوا۔ گزشتہ شب میں اور میری ملکہ بیگم زینت محل بالکونی میں کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا اور آسمان صاف تھا۔ انہوں نے دریا میں چاند کے عکس کو دیکھ کر اس کی

تعریف کی۔ ہم نے موسم کا گلہ کیا تو انہوں نے کہا کہ آموں کو ان کا ذائقہ اور یاسمین اور مولسری کو ان کی خوشبو صحرائی ہواؤں ہی سے ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے سر میں بندھے جوڑے میں سے پھول نکال کر ثبوت کے طور پر ہمیں پیش کیے۔ ہم نے انہیں سونگھ کر واپس کیا تو وہ بولیں: "انہیں اپنے تکیے کے نیچے رکھیے گا۔ یہ حضور کو اپنی بندی زینت کی یاد دلائیں گے۔"

چونکہ رمضان میں عورتوں سے میل جول ممنوع ہوتا ہے اس لیے ہم نے پھولوں کے اس تحفے کو قبول کرلیا۔ ان کی خوشبو ہمارے خوابوں میں سما گئی' جب ہم جاگتے تو صبح کا ستارہ اور صبح کی ہوا دونوں ہماری محبوبہ کی یاد تازہ کر دیتے۔ ۱۱ رمئی کو ہم نے نماز قدرے تاخیر سے ادا کی تاہم دریائے جمنا پر اجالا ابھرنے سے پہلے ہی ہم نماز ادا کر چکے تھے۔ ہم نے دریا کے پار تربوز کے کاشتکاروں کی جلائی ہوئی آگ کو ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی میں زرد پڑتے اور کشتیوں والے پل پر اپنے پہریدار فوجیوں کو باری بدلتے دیکھا۔ ہم نے تھوڑا سا تیتر پلاؤ اور اس کے بعد دو ثمر بہشت آم کھائے تھے۔ ہم نے زعفران ملے ٹھنڈے دودھ کا ایک کٹورہ بھی پیا۔ اس کے بعد معمول کے مطابق پان کھایا اور حقے کے چند کش لیے تھے۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم دیوان خاص میں چلے گئے۔ حکیم احسان اللہ ہماری خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ہماری اجازت سے ہماری نبض دیکھی۔ اللہ جل شانہ کی مہربانی سے اس نے کہا کہ ہم بالکل تندرست ہیں۔ پھر ہمارے غلاموں خواجہ سرا بسنت علی خان اور وکیل غلام عباس نے شاہی گھرانے کا حساب کتاب ہمیں پیش کیا۔ ہمارے اخراجات ہمیشہ جتنے ہی تھے۔۔۔ یعنی ہماری آمدنی سے زیادہ۔ ہم نے حساب کتاب دیکھنے سے انکار کردیا اور انہیں رخصت کردیا۔ ہم نے سائلوں کی طرف سے رخ پھیر لیا اور دریائے جمنا کا نظارہ کرنے لگے۔

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ دھوبی میلے کپڑوں کو پتھروں پر پٹخ رہے تھے جبکہ ان کی عورتیں دھلے ہوئے کپڑوں کو سکھانے کے لیے دریا کے کنارے دھوپ میں پھیلا رہی۔

تھیں۔ ان کے بچے ریت پر کھیل رہے تھے۔ بہت سے کسان تربوزوں کی ٹوکریاں اٹھائے کشتیوں والے پل پر سے گزر رہے تھے۔ وہ گرما کی دوسری صبحوں جیسی ایک صبح تھی۔ اچانک افراتفری پھیل گئی۔ ہم نے دیکھا کہ گھوڑ سوار کاربینوں سے ہوائی فائرنگ کرتے کشتیوں کے پل پر سے تیزی سے ادھر آ رہے ہیں۔ پل پر متعین سنتریوں نے ان کی پیش قدمی نہیں روکی۔ گھوڑ سوار ریت پر گھوڑے دوڑاتے ہماری طرف آنے لگے اور محل کی فصیل کے نیچے باگیں کھینچ کر رک گئے۔ انہوں نے چلا کر کہا: "دہائی ہے! دہائی ہے! ہماری فریاد سنیے۔" کچھ گھوڑ سواروں نے نعرہ لگایا: "بادشاہ سلامت زندہ باد!"

ہم نے برجی سے نیچے دیکھا۔ انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے ہمیں سلامی دی اور دوبارہ نعرہ لگایا: شہنشاہِ ہندوستان زندہ باد!" ایک شخص نے بلند آواز میں کہا: "ہم نے میروت میں فرنگیوں کو قتل کر دیا ہے۔ نصاریٰ ہمارے دین کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ان کافروں کو اپنے وطن سے نکال دیں گے۔ ہم آپ کو ہندوستان کا بادشاہ بنائیں گے!"

پھر وہ سب مل کر نعرے لگانے لگے: "مغلیہ خاندان زندہ باد!"

ہم نے کہا: "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔" پھر ہم نے خواجہ سرا بسنت علی خان سے پوچھا: "کون ہیں یہ لوگ؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے سیاہ چیچک کے داغوں والے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ہم نے اسے حکم دیا: "فوراً جا کر کیپٹن ڈگلس کو اطلاع دو اور دیکھو ان لوگوں کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔"

بسنت علی خان ہمارے سامنے جھکا اور روانہ ہو گیا۔ اس کے انداز سے ایسا کچھ عیاں تھا کہ جس سے ہمیں پتا چل گیا کہ اسے ہمارے احکامات پر عمل کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم نے کیپٹن کی طرف ایک اور شخص کو بھیجا۔ میروت سے آنے والے فوجیوں نے حرم کے سامنے فصیل کے نیچے کھڑے ہو کر نعرے لگانے شروع کر دیے: "ملکۂ ہندوستان زندہ باد!" اُدھر مزید گھوڑ سوار پل پر سے گزرتے ہوئے اِدھر آ رہے

تھے۔ کیپٹن ڈگلس محل کے محافظوں کا انچارج تھا۔ اس نے ہمارے حضور حاضر ہو کر جھک کر ہمیں تعظیم دی۔ وہ ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے نیچے جانا چاہتا تھا۔ ہم نے اس کی جان خطرے میں ہونے کی وجہ سے اجازت نہیں دی۔ ہم بالکونی میں چلے گئے۔ ہم اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے تاکہ کوئی اسے نقصان نہ پہنچائے۔ اس نے ان سے پوچھا: ''تم کیا چاہتے ہو؟ تمہیں حضور کو اس طرح تنگ کرنے کا کیا حق ہے؟ فوراً اپنی رجمنٹوں میں واپس چلے جاؤ ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔''

نیچے موجود لوگوں نے نعرے لگانے بند کر دیے اور حرم کی کھڑکیوں کے نیچے جمع ہو جانے والے اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ کیپٹن ڈگلس نے باغیوں سے نمٹنے کی اجازت لی۔ ہم انتظار کرنے لگے۔ ہم نے کمپنی کی وردیوں میں ملبوس فوجی دستوں کو پل پر سے گزرتے دیکھا۔ مسٹر سائمن فریزر نے' جو قلعے ہی میں رہتا تھا' فرستادہ بھیج کر درخواست کی کہ ہم پالکیاں مستعار دیں تاکہ وہ اپنی عورتوں کو ہمارے حرم کی حفاظت کے لیے بھیجے۔ اس نے قلعے کے دروازوں پر توپیں نصب کروانے کی اجازت بھی مانگی۔ ہم نے اس کی دونوں درخواستیں منظور کر لیں۔ تاہم قسمت کی ستم ظریفی کہ ہم نے ان احکامات کی تعمیل کے لیے جس ''آدمی'' پر بھروسہ کیا' وہ خواجہ سرا بسنت علی خان تھا۔

ہم انتظار کرنے لگے۔ قاصدوں نے آ کر اطلاع دی کہ شہر کے مختلف حصوں میں گڑبڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم متفکر ہو گئے۔ ہم نے فرمان جاری کیا کہ باغیوں کو شہر میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے شہر سے جانے والے صاحبوں کو مشورہ دیا کہ وہ ان کی سرزنش کریں۔ کسی نے ہمارے مشورے پر توجہ نہیں دی۔ ایک گھنٹے بعد ہمیں پتا چلا کہ باغی شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اور انہوں نے دریا گنج میں کچھ یورپیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ ہم نے سنا کہ بینک منیجر کے گھرانے کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ہم قلعے میں موجود یورپیوں کی سلامتی کے حوالے سے فکرمند ہو گئے۔ ہم نے پتا کروایا کہ کیا ان کی خواتین کو ہمارے حرم میں لے آیا گیا ہے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ کیپٹن ڈگلس'

مسٹر فریزر اور ان کی خواتین کو ہلاک کیا جا چکا ہے۔

کسی نے قلعے کے دروازے باغیوں کے داخلے کے لیے کھول دیے تھے۔ ہمیں بے شمار فوجیوں نے گھیر لیا تھا۔ ان میں ہمارے محل کے محافظ بھی شامل تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہم ان کے حقیقی بادشاہ ہیں۔ ہم نے احتجاجاً کہا: ''ہمیں بادشاہ مت کہو۔ ہم تو فقیر ہیں اور جیسے تیسے اس منحوس دھرتی پر اپنا وقت گزار رہے ہیں۔ ہمارے بازوؤں میں طاقت نہیں' ہماری کمزور آواز اس قلعے کی فصیل سے باہر نہیں سنی جاتی۔'' تاہم انہوں نے میرے احتجاج پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم طوفانی دھارے میں بہتی کاغذ کی ناؤ کی مثل تھے۔

سارا دن فوجی بغیر مدعو کیے اور بغیر اطلاع دیے ہمارے محل میں آتے رہے۔ انہوں نے درباری آداب کا کوئی پاس نہیں کیا۔ انہوں نے ہمارے خدام کو دھکیل کر پرے کر دیا اور خاص مہمانوں کے لیے مخصوص دیوان خاص میں گھس گئے۔ انہوں نے ہمارے ہاتھ چومے اور ہماری دعائیں لیں۔ کچھ فوجیوں نے ہمیں چاندی کے سکوں کی نذر پیش کی' بیشتر نے صرف ہماری انگلیوں کو بوسے دیے۔

یہ اچھے اور برے واقعات پر مبنی ایک خواب لگتا تھا۔ پھر جیسا کہ بعض اوقات ہوتا ہے' ہزاروں بادلوں کی کڑک جیسے دھماکے نے ہمارا خواب توڑ دیا۔ ہمارے قلعے کی فصیل یوں لرزی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ چند منٹ بعد ہمیں اطلاع دی گئی کہ انگریزی فوجیوں نے کشمیری دروازے میں واقع بارودخانے کو آگ لگا دی ہے۔ ہماری رعایا کے سینکڑوں افراد اس دھماکے میں ہلاک ہو گئے ہیں اور سارے شہر میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔

❀❀❀

ایلس آلڈویل عرف عائشہ بانو بیگم

میں نے کبھی کسی ہندوستانی کی زبان پر اعتبار نہیں کیا اور میں ہر بار درست نکلی ہوں۔ تاہم جیسا کہ میں بتا چکی ہوں' اس سہ پہر ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا: "الیگزینڈر! ہمیں اپنے سارے انڈے ایک ہی ٹوکری میں نہیں رکھنے چاہئیں۔ تم دوسروں کے ساتھ نکل جاؤ۔ میں لڑکیوں کو مرزا عبداللہ کے ہاں لے جاتی ہوں۔" الیگزینڈر راضی ہوگیا۔

میں نے اپنی بیٹیوں کو مقامی لباس پہنائے' جو کہ بیگم زینت محل نے انہیں دیے تھے۔ میں نے آیا سے ایک صاف ستھری شلوار قمیص لی اور اس کا میلا برقعہ اوڑھ لیا۔ میں نے دو پالکیاں منگوالیں۔ میں نے دو بڑی لڑکیوں کو ایک پالکی میں بٹھایا اور چھوٹی کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ہمارا ایک نوکری ہمارے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔ پالکیوں کے پردے اسی طرح گرا دیے گئے جس طرح عالی مرتبت مقامی خواتین کے سفر کرتے وقت گرا دیے جاتے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں مرزا عبداللہ بادشاہ کا پوتا تھا۔ وہ شاہی مسجد کے قریب اردو بازار میں رہتا تھا۔ اس نے میرے شوہر سے کافی کام نکلوائے تھے۔ اس کی

بیوی اور بہن اکثر مجھے ملنے آیا کرتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں: ''آپ ہماری بہن ہیں۔'' وہ میری بچیوں کو ''بیٹی'' کہا کرتی تھیں۔

ہجوم نے ہمیں گزرنے کا راستہ دے دیا۔ ہم اردو بازار پہنچ گئے۔ شکر ہے راستے میں کسی نے ہم سے سوال جواب نہیں کیے۔ مرزا عبداللہ کے گھرانے کی عورتوں نے بڑی محبت کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس کی بہن نے میری بچیوں کو پیار کیا اور کہا کہ جب تک وہ زندہ ہے ان کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دے گی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ جونہی گڑبڑ ختم ہوگی' میرا خاوند انہیں ان کی مہربانیوں کا صلہ ضرور دے گا۔

اردو بازار مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ وہاں کتابوں کی چند دکانوں کے علاوہ قصابوں' رنگریزوں' پتنگ فروشوں' حلوائیوں اور پنواڑیوں کی بہت ساری دکانیں تھیں۔ ان دکانوں کے پیچھے دولت مند نوابوں کے محل تھے۔ مرزا عبداللہ کے گھر تک ایک تنگ سی گلی جاتی تھی' جس کے دونوں سروں پر متعفن نالیاں تھیں۔ تاہم اس کا گھر اندر سے بہت ہوادار تھا' اس میں ایک وسیع وعریض صحن اور برآمدے تھے۔ صحن کے وسط میں پیپل کا ایک بہت گھنا درخت تھا' جس کے ساتھ مرزا عبداللہ کے کبوتروں کی کابکیں تھیں۔ برآمدوں میں یاسمین کے پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ صحن کی ایک جانب زنان خانہ تھا' جہاں مرزا عبداللہ کی بیویاں' ماں' بہن اور بے شمار رشتہ دار عورتیں اور خادمائیں رہتی تھیں۔

مرزا عبداللہ کو پرندے پالنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے چھت پر ایک اٹاری میں کبوتر رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہر سہ پہر رومال اور سیٹی کے ذریعے ہدایات دیتے ہوئے انہیں اڑایا کرتا تھا۔ مرزا عبداللہ بھی دوسرے شہزادوں کی طرح بالغ مرد نہیں بن سکا تھا۔ تیس سال سے زیادہ عمر کا ہونے کے باوجود اس نے کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ وہ بادشاہ سے ملنے والے وظیفے پر گزر بسر کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ مقامی بنیوں کا مقروض رہتا تھا۔ اس کے گھر کی عورتوں کا زیور ہمیشہ رہن رہتا تھا۔ اس سب کے باوجود وہ مزید شادیاں

کرنے اور چلے جانے سے باز نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی سہ پہریں اپنے ہمسایوں کے ساتھ پتنگوں کے پیچ لڑانے یا کبوتر بازی کے مقابلوں میں صرف کرتا تھا۔ شام کے وقت اپنے بٹیروں اور تیتروں کو دوسرے نوابوں کے بٹیروں اور تیتروں سے لڑوایا کرتا تھا۔ اگر شہر میں کوئی مقابلہ ہوتا تو مرزا عبداللہ اس میں لازماً شرکت کرتا تھا۔

مرزا عبداللہ اندھیرا ہو جانے کے بعد گھر آیا۔ وہ بہت اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ میں بتا سکتی تھی کہ وہ شیخیاں بگھار رہا ہے۔ جب کسی نے اسے گھر میں میری موجودگی سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے زنان خانے میں آ کر مجھے ایسی بے تکلفی سے سلام کیا کہ جس کے بارے میں اس نے پہلے کبھی سوچنے کی بھی جرأت نہیں کی تھی۔ اس نے انگریزی میں کہا: ''گڈ ایوننگ' میم صاحب! بلکہ میڈم اور بچیوں نے جیسے لباس پہنے ہوئے ہیں مجھے السلام علیکم چاہیے۔''

مقامیوں کی ایک کہاوت ہے: غریب کی جورو سب کی بھابی ہوتی ہے۔ میں ان کے لیے ایک غریب بھابی تھی۔ میں نے اس کا مذاق سہہ لیا اور بہت نرم لہجے میں جواب دیا: ''وعلیکم السلام نواب صاحب! آپ کی بڑی عنایت ہے کہ آپ نے چند دنوں کے لیے ہمیں اپنے گھر میں پناہ مہیا کی ہے۔ اللہ آپ کو آپ کی مہربانیوں کا صلہ دے گا۔''

وہ اپنے اعضائے مخصوصہ کو کھجاتے ہوئے اسی لہجے میں بولا: ''آپ کا یہاں آنا ہماری عزت افزائی ہے۔ تاہم میں آپ کو مسلمانوں کے علاقے اردو بازار کی بجائے کسی دوسری محفوظ جگہ جانے کا مشورہ دوں گا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے مسلمان فرنگیوں اور نصاریٰ کے حوالے سے کیا سوچتے ہیں!''

مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ ہمارے لیے ''فرنگی'' اور ہندوستانی عیسائیوں کے لیے ''نصاریٰ'' جیسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے!

وہ پھر بولا: ''تاہم اب آپ سچ مچ مسلمان لگ رہی ہیں۔ آپ کو اپنی سلامتی

کے لیے اسلامی عقائد سے واقفیت حاصل کر لینی چاہیے۔ میں آپ کو پڑھانے کے لیے ایک مولوی کو بھیج دوں گا۔ وہی آپ کو "نئی سڑک" والے میرے دوسرے گھر لے جائے گا۔ آپ حفاظت کے خیال سے اپنی قیمتی اشیاء یہیں چھوڑ جائیے گا۔ میں کل آ کر دیکھوں گا کہ آپ خیریت سے ہیں نا!"

میں نے سوچا کہ میں اپنی بچیوں کی زندگیوں کے تحفظ کی خاطر سب کچھ کر گزروں گی۔ جب مولوی آیا تو میں نے اسے بتایا کہ میری ماں کشمیری مسلمان تھی اور میں ایک "صاحب" سے شادی ہونے کے باوجود مسلمان ہی ہوں۔ اس نے ہمیں دوبارہ کلمہ پڑھوایا: لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ اس نے ہمارے مسلمانوں والے نام رکھے۔ میں ایلس سے عائشہ بن گئی۔ میری بڑی بیٹی مریم بن گئی۔ دوسری بیٹی فیونا فاطمہ بن گئی۔ جارجینا جہاں آرا بن گئی۔ مولوی ہمیں مسلمان بنا کر بہت خوش تھا۔

میں نے چاندی کے سکوں کی ایک پوٹلی مرزا عبداللہ کی تجوری میں رکھوا دی' عورتوں سے رخصت لی اور مرزا عبداللہ کے دوسرے گھر روانہ ہو گئی۔ میں نے بچیوں کو اپنی پالکی میں بٹھا لیا تھا۔ ہمیں کئی جگہ روکا گیا لیکن مولوی کی وجہ سے آگے بڑھنے دیا گیا۔ ہم "نئی سڑک" پر واقع ایک حویلی میں پہنچ گئے۔ مولوی نے نگران سے بات کی۔ اس نے ہمیں اندر جانے دیا۔

میں دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ مرزا عبداللہ اس حویلی کو عیاشی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ حویلی کا نگران ہیجڑا تھا۔ وہ ہمیں جس کمرے میں لے گیا' اس میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ ان پر گاؤ تکیے پڑے تھے۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے اور چھت سے ایک شمع دان معلق تھا۔

ہمارے لیے ایک کمرے میں بستر لگا دیے گئے تھے۔ لڑکیاں تھکی ہوئی تھیں؛ وہ لیٹتے ہی سو گئیں۔ میں ان کے پاس بیٹھی جاگتی رہی۔

اگلی صبح میں نے اپنا نوکر بھیج کر مرزا عبداللہ سے اپنی رقم منگوائی وہ ایک گھنٹے

بعد واپس آیا۔ اس نے کہا کہ مرزا عبداللہ اس بات سے انکاری ہے کہ اس نے مجھ سے کوئی شے لی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے سہ پہر تک مکان خالی کرنے کا کہا ہے۔ ہیجڑے نے کہا کہ اگر میں اس کے کہنے کے مطابق عمل کروں تو وہ ہماری طرف سے اس معاملے میں مداخلت کرتا ہے۔ میں راضی ہو گئی۔ میں اپنی بچیوں کے تحفظ کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

شام کو ہیجڑا مجھے نواب صاحب کے ہاں لے جانے کے لیے تیار کروانے آیا۔ اس نے میری ہتھیلیوں اور تلوؤں پر مہندی لگائی۔ مہندی سوکھنے تک اس نے بہشتیوں سے نہانے کے ٹب میں پانی بھروایا۔ اس نے پانی میں عرق گلاب کے کئی پیالے انڈیل دیئے۔ اس نے مجھے غسل خانے میں لے جا کر میرے کپڑے اتار دیئے۔ اس نے اپنے سخت ہاتھ میرے جسم پر پھیرے۔ اس نے مجھے فرش پر لٹا کر میری ناف کے نیچے کے بال صاف کیے۔ اس نے اپنی گندی انگلیاں میری یونی میں گھسیڑیں اور فحش باتیں کیں۔ نہلانے کے دوران اس نے میری چھاتیاں بھینچیں۔ ایک گندے تولیے سے میرا بدن پونچھنے کے بعد اس نے میرے اعضائے نہانی پر پھٹکڑی کا سفوف مل دیا۔ مقامیوں کا ایقان ہے کہ اس سے عضلات سخت ہو جاتے ہیں۔ یہ تسلی کرنے کے لیے کہ سفوف نے مطلوبہ نتائج پیدا کیے ہیں' اس نے مجھے فرش پر لٹا کر میرے اعضائے نہانی پر زبان پھیری۔ ہیجڑے اپنی فطری کمی کی تلافی بہت سی دوسری چیزوں سے کرتے ہیں۔ وہ ایک جنون کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور اپنا متعفن ادھورا قضیب میرے منہ میں گھسیڑتے ہوئے بھاری آواز میں بولا: "اسے چومو چومو اسے۔" یہ ناقابل برداشت حرکت تھی۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ اس نے دھمکی دی: "اگر تم نے مرزا کو ایک لفظ بھی بتایا تو میں تمہاری بیٹیوں کو ذبح کر دوں گا۔"

اس نے مجھے ریشمی لباس پہنایا' میری آنکھوں میں کاجل ڈالا اور مجھے ایک

کڑوا لیکن خوشبودار پان کھلایا۔

اس سہ پہر میں پریشانی اور شرم سے دوچار تھی۔ میں اپنے حالات اس لیے بیان کر رہی ہوں تاکہ دنیا جان لے کہ ہندوستانی کتنے غلیظ' دھوکے باز' بدمعاش اور ذلیل ہوتے ہیں! اس پوری قوم کو مار کر لاشیں کتوں کے آگے ڈال دی جانی چاہئیں!

مرزا عبداللہ اپنے دو حواریوں کے ساتھ آیا۔ انہوں نے سر میں تیل لگایا ہوا تھا' آنکھیں سرمے سے سیاہ تھیں' کانوں میں روئی کی معطر پھریریاں ٹھنسی تھیں اور پان کی پیک ہونٹوں کے گوشوں سے نکل رہی تھی۔ انہوں نے ململ کی قمیصیں اور شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔

مرزا عبداللہ اپنے دوستوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے بولا: ''واہ' واہ! میم صاحب! اس لباس نے تو آپ کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ یہ دونوں میرے حقیقی بھائیوں جیسے ہیں' نہیں' نہیں۔ یہ تو مجھے اپنے حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں!''

ان میں سے ایک نے کہا: ''تم نے بڑا لذیذ شکار مارا ہے۔ یہ تجربہ کار لگتی ہے۔''

اپنے خراب ترین حال کے باوجود اس کا جملہ مجھے تیر کی طرح لگا۔

دوسرا بولا: ''میری سب سے بڑی دلی آرزو یہ تھی کہ کبھی کسی گوری کے ساتھ ہم بستری کروں۔ مرزا صاحب میں یہ خواہش پوری کروانے پر آپ کا شکرگزار ہوں۔''

مرزا عبداللہ بولا: ''تم میرا آدھا شکریہ ادا کروں کیونکہ تمہاری صرف آدھی خواہش ہی پوری ہوگی۔ ایلس عرف عائشہ بیگم آدھی میم صاحب' آدھی کشمیری ہے۔ بلاشبہ تم کئی کشمیری عورتوں سے ہم بستری کر چکے ہو۔''

تینوں مرد ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگانے لگے۔ مجھے تو مرزا عبداللہ کو دوغلی نسل والی بات اچھی نہیں لگی۔

مرزا عبداللہ نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے گاؤ تکیے سے ٹیک لگوا کر بٹھا دیا۔

باقی دونوں میرے سامنے بیٹھ گئے۔ ہیجڑا ایک صراحی لایا۔ اس نے صراحی سے کوئی بدبودار محلول چاندی کے چار گلاسوں میں بھرا۔ جب اس نے ایک گلاس مجھے دیا تو میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

ان تینوں نے اپنے اپنے گلاس حلق میں انڈیل لیے۔ ہیجڑے نے انہیں پھر بھر دیا۔ مرزا عبداللہ نے ایک گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا اور بولا: ''پیو ورنہ میں زبردستی تمہارے حلق میں انڈیل دوں گا۔''

میں سمجھ گئی تھی کہ یہ کالے میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ نشے میں ہوئی تو سب کچھ آسانی سے برداشت کر لوں گی۔ میں نے ایک چسکی لی اور پھر پورا گلاس ایک گھونٹ میں پی گئی۔ وہ برانڈی تھی۔ میرے حلق سے معدے تک آگ سی لگ گئی۔

وہ بیک آواز چلائے: ''شاباش۔ اب محفل رنگ پر آئے گی۔''

میرا گلاس پھر بھرا گیا۔ انہیں نشہ ہونے لگا تھا۔ ایک آدمی نے سعدی کے شعر سنائے۔ مرزا عبداللہ نے درباری شعرا ذوق اور غالب کے شعر سنائے۔ تیسرے آدمی نے بوڑھے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے شعر سنائے۔ پھر وہ مغلوں کی شان و شوکت کی باتیں اور انگریزوں کی برائیاں کرنے لگے۔

مرزا عبداللہ بولا: ''جونہی کمپنی ہتھیار ڈالے گی' ہم سارے فرنگیوں کو آختہ کروا دیں گے اور ان کی عورتوں کو اپنے حرم میں شامل کر لیں گے۔''

وہ یوں قہقہے لگانے لگے جیسے اس نے لطیفہ سنایا ہو۔

مرزا عبداللہ نے میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میری رانیں تھپتھپانے اور ان میں چٹکیاں بھرنے لگا۔ اس نے میری چھاتیوں کو چھوا اور بھٹنیوں سے کھیلنے لگا۔ اس کے دوست اٹھتے ہوئے بولے: ''کیا ہمیں ساتھ والے کمرے میں جانے کی اجازت ہے؟''

مرزا عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ہم ایک ہی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

مرزا عبداللہ تھوڑی دیر تو میری بھٹنیوں سے کھیلتا رہا۔ اس کا دوسرا ہاتھ میری کمر پر چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے پاجامے کے ازار بند کی گرہ کھول دی' میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے درمیانی حصے پر رکھ دیا۔ وہ ایستادہ تھا۔ میں نے گلاس اٹھایا اور سیال آگ کو پی گئی۔ اب مجھے پروا نہیں تھی کہ کوئی میرے ساتھ کیا کرتا ہے۔ میں نے پہل کرنے میں ہی بہتری جانی۔ میں نے کمر کے بل لیٹ کر مرزا عبداللہ کا قضیب اپنی اندام نہانی میں ڈال لیا۔ شراب کے نشے میں مرد دیر سے کلائمیکس پر پہنچتا ہے۔ بہت دیر بعد جب عبداللہ کو احساس ہوا کہ وہ کلائمیکس پر پہنچ گیا ہے تو اس نے اپنے دوستوں کو آواز دے کر بلایا کہ آ کر دیکھیں وہ کیا کر رہا ہے۔ جب وہ خلاص ہوا اس نے میرے رخسار میں دانت گاڑ دیئے۔ جونہی وہ اترا' اس کے دوستوں نے میرے بچے کھچے کپڑے بھی اتار پھینکے اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میری حالت گوشت کے اس پارچے جیسی تھی جس پر دو کتے غراتے ہوئے' کاٹتے ہوئے' پنجے مارتے ہوئے لڑ رہے ہوں۔ وہ رات بہت لمبی ہو گئی تھی۔ ساری رات یہی کچھ ہوتا رہا۔ ایک ختم ہوتا تو دوسرے پر جنون طاری ہو جاتا۔ ہیجڑا بھی اپنی انگلیوں' زبان اور ادھورے عضو کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ میں پسینے سے نچڑ گئی تھی اور تھکن کی وجہ سے قریب المرگ تھی۔ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں نے اپنے گندے جسموں میں سے سارا مادۂ منویہ خارج کر دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے گانے گا رہے تھے اور فحش بکواس کر رہے تھے۔ صرف ہیجڑا ہوش و حواس میں تھا۔

مجھے جار جینا کی چیخوں نے جگا دیا۔ وہ مجھے پکار رہی تھی: ''ممی! ممی! جاگو!'' لڑکیاں بہت ڈری ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھے پہلے کبھی اس حال میں دیکھا نہیں تھا۔ الف ننگی اور جسم پر خراشیں ہی خراشیں۔ جن لوگوں نے نمک حلالی کی وہ صرف دو تھے۔ ایک میرا نوکر علی احمد اور دوسری اس کی بیوی۔ اسے پتا تھا کہ مجھ پر کیا بیت چکی ہے۔ علی

احمد نے اپنے پلے سے دو پالکیاں کرائے پر لیں اور ہمیں اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں لے گیا۔ جلد ہی وہاں لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ میں نے لوگوں کو چیخ چیخ کر بولتے سنا: ''اس فرنگن کو ہمارے حوالے کر دو۔''

علی احمد کی بیوی بڑی جرأت مندی کے ساتھ باہر گئی۔ اس نے کہا: ''میں سید ہوں' میں رسول اللہؐ کے خاندان سے ہوں۔ میں نے جس عورت اور بچیوں کو پناہ دی ہے' وہ مسلمان ہیں۔ تم مجھے اور میرے شوہر کو مارے بغیر انہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ کیا تم میں سے کوئی ہے' جو سادات کے خون سے ہاتھ رنگنا چاہے؟ آؤ' یہ رمضان کا مقدس مہینہ ہے۔'' ہجوم چھٹ گیا۔

میں ان غریبوں کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے علی احمد سے کہا کہ وہ میرا خط بادشاہ اور ملکہ زینت محل تک پہنچا دے۔ میں نے اس خط میں ان سے مدد مانگی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری ماں مسلمان تھی۔ میں نے لکھا کہ میں بیٹیوں سمیت مسلمان ہو چکی ہوں۔ خط کے آخر میں میں نے عائشہ آلڈویل لکھا۔ مجھے اس خط کا کوئی جواب نہیں ملا۔

میں نے کئی نوابوں کو خطوط لکھے۔ یا تو انہوں نے جواب ہی نہیں دیا یا پھر مدد کرنے سے قاصر ہونے پر معذرت نامے بھیجے۔ جب امیروں اور بارسوخ لوگوں نے ہمیں بے یارومددگار چھوڑ دیا تو ایک ایسا غریب شخص ہمارے کام آیا جس پر ہمارا کوئی احسان نہیں تھا۔ وہ ایک درزی تھا۔ میں نے اس سے کبھی اس کا نام نہیں پوچھا۔ وہ میری بچیوں کے لباس سیا کرتا تھا اور انہیں بہت پیار کرتا تھا۔ ایک صبح وہ اپنے عم زاد کے ساتھ آیا۔ اس کا عم زاد سپاہی تھا۔ اگرچہ وہ باغیوں سے مل گیا تھا لیکن اس نے قرآن پر حلف دیا کہ وہ کسی کو ہمیں گزند پہنچانے نہیں دے گا۔ ہم نے درزی کے گھرانے کے ساتھ ایک دن اور ایک رات بسر کی۔ مغرب کے وقت' کہ جب مسلمان نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں' ہم بازار سے نکل گئے۔ درزی اور اس کا عم زاد سپاہی ہماری پالکیاں قلعے لے

گئے۔ قلعے کے محافظ ہمیں بادشاہ کے بیٹے مرزا مغل کے پاس لے گئے۔ مجھے تب پتا چلا کہ میرے خط اسی نے بادشاہ اور ملکہ زینت محل تک نہیں پہنچنے دیئے تھے۔ اس نے محافظوں کو حکم دیا کہ ہمیں بھی اسی تہہ خانے میں پہنچا دیا جائے جہاں دوسرے یورپی موجود تھے تاہم ہمارے ساتھ بدذات نصاریٰ جیسا نہیں بلکہ مسلمانوں جیسا سلوک کیا جائے۔

بدھ 13/مئی 1857ء کو ہمارا خاندان پھر سے یکجا ہوا۔ میں جن مظالم سے گزری تھی' الیگزینڈر نے انہیں درگزر کر دیا اس نے قسم کھا کر کہا: "میں اس خونی مرزا عبداللہ کا قضیب کاٹ ڈالوں گا۔" تاہم انگریز عورتوں نے میرے ساتھ سردمہری کا رویہ برتا کیونکہ محافظوں نے ہمیں مسلمان سمجھتے ہوئے ہم پر کچھ مہربانیاں کیں' اور اس بات نے انہیں مشتعل کر دیا تھا۔ انہیں چپاتیاں دی جاتی تھیں جبکہ ہمیں کڑھی گوشت دیا جاتا تھا۔ محافظ بعض اوقات مجھے اور میری بچیوں کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت بھی دیا کرتے تھے۔

تہہ خانے میں گرمی اور بدبو بلا کی تھیں۔ وہاں لیٹرین نہیں تھی اور ہمیں ایک تاریک گوشے میں فراغت پانا پڑتی تھی اور اپنے ہاتھ سے فضلہ اٹھا کر دیوار کے ایک سوراخ سے باہر پھینکنا پڑتا تھا۔ ہمیں بہت زیادہ تذلیل برداشت کرنا پڑی۔ لوگ روز ہمیں یوں دیکھنے آتے جیسے ہم چڑیا گھر کے جانور ہوں۔ وہ ہمیں فحش ترین گالیاں دیتے تھے۔ ایک دن جواں بخت آیا۔ اس نے مجھے بھابی کہہ کر پکارا۔ اس نے کمینے پن سے مسکراتے ہوئے کہا: "مرزا عبداللہ میرے بھائیوں جیسا ہے۔ پس تم میری بھابی ہی لگیں نا!"

پھر 6/مئی اتوار کا دن آ گیا۔

میں جانتی تھی کوئی ہولناک واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ ہمیں ناشتہ نہیں ملا۔ سنتریوں نے کہا: "تمہیں جہاں بھیجا جا رہا ہے وہاں بہت کھانے کو ملے گا۔" انہوں نے

مجھے تسلی دی کہ مجھے یا میری بچیوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ کوئی درجن بھر سپاہی آئے اور انہوں نے ہمارے علاوہ باقی سب مردوں' عورتوں اور بچوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میری بچیاں بھاگ کر اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئیں۔ سپاہیوں نے کھینچ کر انہیں ان کے باپ سے الگ کر کے میری طرف دھکیل دیا۔ وہ رونے اور چلانے لگیں: ''انہیں کہو ہمارے ڈیڈی کو نہ لے جائیں۔'' میں نے سپاہیوں کی منت سماجت کی لیکن انہوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ بے چارے الیگزینڈر کو دھکیل کر دوسروں کے ساتھ باہر لے جایا گیا۔ انہوں نے میری بیٹیوں' مجھے اور ایک بوڑھی مسلمان عورت کو' جو کہ تہہ خانے میں یورپیوں کی مدد کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی' تہہ خانے میں چھوڑ کر دروازہ مقفل کر دیا۔

میں نے لوگوں کو چیختے ہوئے سنا۔ پھر گولی چلی' پھر بچے اور عورتیں چیخنے لگیں۔ پھر خاموشی چھا گئی' گہری خاموشی۔

میں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندہ نہیں ہوں کہ میری پہلی سوچ یہ تھی: ''اب مجھ پر ناک بھوں چڑھانے والا کوئی نہیں رہا۔ صرف مرزا عبداللہ اور اس کے حواری میرے حوالے سے باتیں بنائیں گے۔ جونہی حالات ٹھیک ہوں گے مجھے الیگزینڈر کی پنشن مل جائے گی۔ میں اپنی بچیوں کو انگلستان لے جاؤں گی اور نئے سرے سے زندگی شروع کر دوں گی۔ کوئی میرے حوالے سے گندی باتیں نہیں کرے گا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں!'' پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❀❀❀

بہادر شاہ ظفر

سہ پہر میں دیر گئے کوئی چالیس کے قریب یورپی مردوں اور عورتوں کو (جن میں شاید کچھ بچے بھی تھے) میرے سامنے لایا گیا۔ ان کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے گرد ایک بڑا ہجوم تھا۔ محافظ ہجوم کو بڑی مشکل سے دور رکھے ہوئے تھے۔

ہجوم میں شامل لوگ پکار رہے تھے: ''دہائی! دہائی! انہوں نے ہمارے لوگوں کو قتل کیا ہے۔ ہمیں انصاف چاہیے۔ انہیں یا تو پھانسی دی جائے یا ہمارے حوالے کر دیا جائے۔''

وہ لوگ بارود خانے میں ہونے والے دھماکے میں مرنے والوں کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ گوروں نے ہمارے اور ہمارے آباؤ اجداد کے ساتھ بہت غلط کام کیے تھے لیکن ہم نے بارود خانے میں لگنے والی آگ سے غیر متعلق لوگوں سے انتقام لینے کی منظوری نہیں دی۔ ہم نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو حفاظتی تحویل میں لے لیا جائے اور ہمارے حرم کے ایک تہہ خانے میں رکھا جائے۔

ہجوم گالیاں بکنے لگا۔ کچھ لوگوں نے ہماری شان میں بھی گستاخی کی۔ ہم نے

دربار برخاست کرنے کا حکم دیا۔ ''تخلیہ'' کی آواز بلند کی گئی اور سرخ پردہ گرا دیا گیا لوگ پھر بھی ہنگامہ کرتے رہے۔ آخر کچھ دانا لوگوں نے گرم مزاج لوگوں کو سمجھایا' بجھایا کہ انہیں اپنے بادشاہ کی حکم عدولی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا چاہیے۔ انہوں نے نعرہ لگایا: ''خلق خدا کی' ملک بادشاہ کا' حکم جہاں پناہ کا۔'' اور وہاں سے چلے گئے۔ ہم نے حکم دیا کہ یورپی قیدیوں کو شاہی باورچی خانے سے کھانا بھیجا جائے۔

ہم نے مغرب کی نماز موتی مسجد میں ادا کی۔ ہم نے دیکھا کہ ہماری پچھلی صف میں بہت سارے اجنبی لوگ کھڑے ہیں۔ ہم پریشان نہ ہوئے کیونکہ ہم خدا کے گھر میں موجود تھے۔ تاہم ہمارا ذہن کافی الجھا ہوا تھا۔ ہم اللہ سے رہنمائی لینے سے قاصر تھے۔ ہم مسجد سے باہر آئے تو ان لوگوں نے دوبارہ فرنگیوں کو ان کے حوالے کر دینے کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ہم نے ایک بار پھر ان کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ ہم نے دھماکے میں ہلاک ہو جانے والوں کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اللہ کی رضا میں راضی ہیں اور مرحومین کی تدفین انجام دیں۔

شام کو ہمیں پتا چلا کہ جامع مسجد میں ہمارے کا خطبہ پڑھا گیا ہے۔ ہمارے نام درباری ہمارے آباؤ اجداد کی عظمت وشان اور ہماری خوبیاں بیان کرنے لگے تھے۔ قسمت ہماری پتنگ کو طوفانی بادلوں میں لے گئی تھی' ہم بے بس تھے اس کی ڈور ہمارے ہاتھ میں نہیں تھی۔

لوگوں نے ہمیں چاندی کی اس کرسی پر بٹھا دیا' جو تیس سے زیادہ برسوں سے تہہ خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ چاندی کی اس کرسی پر ہمارے آباء بیٹھا کرتے تھے: تیمور' بابر' ہمایوں' اکبر' جہانگیر' شاہ جہاں' اورنگ زیب عالمگیر' بہادر شاہ اول' جہاندار شاہ فرخ سیر' محمد شاہ' عالمگیر ثانی' شاہ عالم اور ہمارے عزت مآب والد اکبر شاہ ثانی۔ رعایا کے لوگ ہمیں خراج عقیدت ادا کرنے آتے رہے یہاں تک کہ توپ داغی گئی۔ یہ سورج

غروب ہونے کا اعلان تھا۔ ہم نے رسومات ختم کرنے کا حکم دیا۔

ہجوم منتشر نہیں ہوا۔ بہت سے لوگوں نے رات بسر کرنے کے لیے دربار کے سنگِ مرمر کے فرش پر چادریں بچھالیں۔ ان کے گھوڑے ہمارے باغ کے پھولوں سے پیٹ بھر رہے تھے۔ صرف دریا کے کنارے والے محلات ہمارے لیے بچ گئے تھے۔

ہم نے لوگوں سے کہا کہ ہمیں تنہا رہنے دیا جائے۔ ہم دیوانِ خاص میں اپنے مخصوص کاؤچ پر نیم دراز ہو کر چھت کو تکنے لگے۔ ہمیں وہ دن یاد آئے جب یہ چھت چاندی اور سونے کے پتروں سے ڈھکی ہوتی تھی۔ اب یہ حالت تھی کہ کئی جگہوں سے پلستر بھی اکھڑ چکا تھا۔ ہم نے سنگِ مرمر کے ستونوں اور خالی طاقوں کو دیکھا۔ کبھی ان پر جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ میری نظر اپنے عظیم بزرگ شاہ جہاں کی لکھوائی ہوئی اس تحریر پر پڑی جس کے مٹتے ہوئے لفظ گزرے زمانے کی عظمتوں کا اعلان کر رہے تھے:

اگر فردوس بروئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

ہمارے سینے سے ایک سرد آہ نکلی اور ہماری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆

ہم خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ کسی نے ہلکے سے کھانس کر ہمیں متوجہ کیا۔ وہ ہماری ملکہ زینت محل کی خادمہ تھی۔ اس نے بتایا کہ ملکہ زینت محل نے ہمیں روزہ افطار کرنے کے لیے بلایا ہے۔

ہم بھاری قدموں سے چلتے ہوئے اپنے حرم کی طرف بڑھنے لگے۔ خواجہ سرا اور نقیب عورتیں ہمارے ایک سے دوسرے کمرے میں داخل ہونے پر ہماری آمد کا اعلان کرتی تھیں۔ اس مرتبہ یہ الفاظ جنہیں ہم اپنی بائیس سالہ بادشاہت کے دوران مسلسل سنتے آرہے تھے ایک نئی معنویت اختیار کر گئے تھے: سراج الدین خان محمد ابوظفر بہادر شاہ غازی ظلِ الٰہی، شہنشاہِ ہندوستان۔ ہم بیگم زینت محل کے کمرے میں پہنچ

گئے۔ کھانا دستر خوان پر سجا دیا گیا تھا۔ شمع دانوں سے یاسمین اور موسری کے پھولوں کی لڑیاں معلق تھیں۔ کونوں میں کیوڑے سے بھرے ہوئے برتن رکھے تھے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی خادمائیں احترام سے جھکیں اور کمرے سے چلی گئیں۔ ہم نے قالین پر بیٹھ کر پشت گاؤ تکیے سے لگالی۔

بیگم زینت محل بھی آ گئیں۔ انہوں نے ویسا ہی لباس پہنا ہوا تھا' جیسا کہ آج سے سترہ سال پہلے اس روز پہنا ہوا تھا' جب ہم انہیں دلہن کی حیثیت سے اپنے حرم میں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے سنہرے بروکیڈ پر سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا' جس نے ان کی سیاہ ناگن زلفوں کو چھپایا ہوا تھا۔ انہوں نے ہمارے دیئے ہوئے موتیوں کے جوڑے سے بالوں کو باندھا ہوا تھا۔ ان کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں خواہش کی چمک تھی۔ وہ اتنے دلکش انداز میں چلتے ہوئے ہماری طرف آئیں کہ اگرچہ انہوں نے پیروں میں گھنگھرو نہیں باندھے ہوئے' پھر بھی ہمارے کانوں میں انتہائی مدھر موسیقی رس گھولنے لگی۔ یوں لگا جیسے دکھائی نہ دینے والے ہاتھوں نے دیوں کی لو کو تیز کر دیا ہو اور وہ پہلے سے زیادہ روشنی بکھیرنے لگے ہوں۔ زبانِ بلاغت ان کے حسن و جمال کے بیان سے قاصر تھی۔

''کیا یہ بندی شہنشاہ ہندوستان کی خدمت میں سلام عرض کر سکتی ہے؟'' انہوں نے تین بار جھک کر آداب کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے ان کا حسن اپنی آنکھوں میں بھرتے ہوئے کہا: ''سبحان اللہ!'' جب ہم نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تب ہم صرف سبحان اللہ ہی کہہ سکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر سولہ برس اور ہماری عمر پینسٹھ برس تھی۔ ان کے جمال کو پختگی عطا کرنے والے سترہ برسوں نے ان کے لیے ہماری طلب میں اضافہ کیا تھا۔ ہم ان کے تیار کردہ پکوان کھانے کی بجائے ان کی آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گئے اور وہ ہمارے خاکستری بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ ضرور انہوں نے ہمارے خیالات جان لیے تھے۔ انہوں

نے پوچھا کیا ہم نے اپنی آسودگی کا اہتمام کرلیا ہے۔ ہم نے جواب میں سعدی کا ایک شعر پڑھا' جس میں عاشق کی بیتابیٔ دل کا ذکر کیا گیا تھا۔ ان کا چہرہ انار کی طرح سرخ ہوگیا۔

زینت محل نے ہمارے لیے ہمارے پسندیدہ پکوان تیار کیے تھے' ان میں شامل تھے: کباب' نواشیا سے تیار کی گئی نورتن چٹنی' بھنے ہوئے مور اور بٹیر اور سونے کے ورق سے ڈھکی قلفی جس پر آم کے قتلے سجے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمارے ہاتھ دھلائے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا کر ہمیں کھلائے۔ ہمیں یاد نہیں تھا کہ آخری مرتبہ کب انہوں نے ہمارے ساتھ اتنا محبت بھرا برتاؤ کیا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے ایک پان بنایا اور اپنے ہاتھ سے ہمیں کھلایا۔

جب ہم پان کھا رہے تھے تو انہوں نے بیبا کی سے دریافت کیا کہ کیا آج شب وہ ہمارے ساتھ سو سکتی ہیں؟ ہمیں تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ تاہم یہ پریشانی کی بات نہیں تھی کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد کہہ گئے ہیں کہ وہ زندگی کے آخری ایام تک عورتوں کے ساتھ ہم بستری کر سکتے ہیں۔ ہمیں ورثے میں اور کچھ تو بہت کم ملا تھا لیکن ہمارا خون تو وہی تھا۔ ہم ستر برس کی عمر میں بھی ایک نیل گائے کو اپنے ہاتھ سے شکار کر چکے تھے۔

اللہ نے ہمارے صلب کو بھی اتنی ہی قوت عطا کی تھی جتنی کہ ہمارے بازوؤں کو۔ تاہم انہوں نے ہماری آنکھوں سے ہمارے تذبذب کو بھانپ لیا۔ انہوں نے اپنی مدھر آواز میں حافظ کا شعر سنایا جس کے مفہوم یہ تھا کہ ''خوشیوں' گلابوں اور یاسمین کا موسم ہے' پس اپنے محبوب اور شراب کے بغیر ایک لمحہ بھی نہ گزارو۔''

ان کے دہن سے ایسی مسحور کن خوشبو آ رہی تھی' ان کے نرم و گداز اور پر گوشت کولہوں کی حرارت ایسی تھی کہ بیاسی سال کے ہونے اور کشیدگی سے بھرپور ایک طویل دن گزارنے کے باوجود ہمارے اعضاء کی تھکن غائب ہوگئی۔ ہم نے جواباً حافظ ہی کا

شعر سنایا' جس کا مفہوم تھا: ''شراب کی مسکراہٹ اور دوشیزہ کی زلفیں توبہ شکن ہوتی ہیں۔''

ہم نے حکیم احسان اللہ کے تیار کردہ کشتے سے ایک بڑا چمچ بھر کر کھایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اپنی بیگم کے ساتھ ویسے ہی جذبے کے ساتھ ہم بستری کرنے لگے' جس طرح پہلی رات ہمارا ملاپ ہوا تھا۔ جب ہم نے فراغت پالی تو انہیں حافظ کا ایک شعر سنایا' جس کا مفہوم تھا: ''میں مر بھی جاؤں تو اس کے وصل کی آرزو ختم نہیں ہوگی۔ اگر میری قبر کھولی جائے تو میرا دل جلتا پاؤ گے۔''

اس کے بعد ہم نوجوان محبت کرنے والوں کی طرح ایک دوسرے سے یوں لپٹ کر سو گئے کہ ہمارے درمیان سوائے بالوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

ہم توپیں داغے جانے کی آواز سے جاگ اٹھے۔ زینت محل نے اپنی بڑی بڑی بادامی آنکھیں کھولیں اور شرما کر رہ گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی لباس پہنا اور پوچھا: ''اس وقت رات کو توپیں کون داغ رہا ہے؟'' انہوں نے گنتا شروع کیا: ''ایک' دو' تین ...... اکیس۔'' وہ بولیں: ''یہ تو شہنشاہ ہندوستان کو سلامی دی گئی ہے۔ اپنی بندی کو سب سے پہلے نذرانہ عقیدت ادا کرنے کی اجازت دیجئے۔'' انہوں نے جھک کر تین بار آداب کیا اور کمرے سے چلی گئیں۔

میں ان کے جانے کے بعد ایک ادھوری غزل کو مکمل کرنے لگا:

میں محبت میں صبر و سکون کے غارت ہونے پر گریہ کناں نہیں ہوں۔
محبت کا غم تو اس وقت میرا مونس و رفیق بنا ہے جب سب دوستوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے
حیرت ہے کہ ساقی یہ جانتے ہوئے بھی کہ خوشیوں کا زمانہ عارضی ہوتا ہے
شراب کی صراحی اور پیمانہ نہیں لایا ہے
یوں ہماری شمع امید بدقسمتی کے اندھیروں میں روشن تھی۔ یوں ہم بڑھاپے

اور کمزوری کے عالم میں ہندوستان کے تلاطم انگیز ماحول میں نعرہ زن تھے۔

☆☆☆

نوجوانی میں تو یہ ہوتا ہے کہ محبت کی رات گزارنے کے بعد آنے والی نیند نہایت ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں نصف شب کا اعلان کرنے والے گجر کی آواز نے جگا دیا۔ ہم عمر کے بوجھ سے بھاری اعضاء کے ساتھ اپنی محبوبہ کے پہلو سے اٹھے۔ پاک صاف ہو کر مسجد چلے گئے اور اللہ سے معافی کے طلب گار ہوئے۔ ہم مسجد ہی میں بیٹھے رہے۔ چاندہمارے سر پر چمک رہا تھا۔ سنگِ مرمر کا صحن ہمالیہ کی برف جتنا سرد تھا۔ ہمیں رسولؐ اللہ کی معراج کا واقعہ یاد آیا۔ آپؐ اس مقدس مہینے میں معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ ہمیں قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات یاد آئیں۔

اقرا باسم......

ہمیں یہ انوکھا سا احساس ہو رہا تھا کہ اللہ ہماری توبہ قبول کر کے ہمیں معاف کر دے گا۔ ہم ہلکے پھلکے دل کے ساتھ مسجد سے نکلے۔ اس کے بعد ہمیں چند گھنٹے بڑی پرسکون نیند آئی۔

ہم اپنے سارے خادموں کے جاگنے سے پہلے جاگ گئے۔ ہم نے ہشت پہلو مینار میں جا کر کچھ لمحے اپنے ساتھ گزارے۔ اس وقت ہمیں گزشتہ روز رونما ہونے والے واقعات کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ہم سوچنے لگے کہ کیا ہم نے درست عمل کیا ہے؟ کیا ہم اپنی تقدیر کے مالک خود ہیں یا کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں؟

اس وقت ہم نے درج ذیل اشعار کہے:

ہم تلاطم انگیز حالات کی گرفت میں ہیں\
سکون کی نیند اور چین کی زندگی نہیں رہی\
ہم جانتے ہیں کہ موت یقینی ہے اور

کسی بھی صبح یا شام کو ہماری زندگی انجام کو پہنچ جائے گی۔

ہمارے ذہن کا آئینہ صاف نہیں تھا۔ ہم صرف نام کے بادشاہ تھے۔ ہم ایک ایسے محل میں رہتے تھے' جو کبھی دنیا کا سب سے خوبصورت محل تھا۔ اب یہ صرف نام کا محل تھا۔ حد تو یہ تھی کہ ہمارے بیٹوں کو اب اس میں رہنے سے روک دیا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہماری موت کے بعد (اللہ موت جلد بھیج دے!) ہمارے گھرانے کو لال قلعے سے نکل جانے کا کہا جائے گا۔ فرنگیوں نے ہمارے عظیم آباؤ اجداد کے ہمیں ودیعت کردہ قسمت کے سمندر سے صرف ایک قطرہ دیا تھا اور وہ اسے بھی اپنا احسان قرار دیتے تھے۔ فرنگی اسے پنشن کہتے تھے۔ ایک بادشاہ اور اپنی رعایا سے پنشن لے!

فرنگی یکے بعد دیگرے ہمارے آباؤ اجداد کی عظیم سلطنت کے تمام حصوں پر قابض ہو گئے۔ فرنگیوں نے دوست دشمن میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ ابھی چند ماہ پہلے انہوں نے اودھ کے اپنے دوست حکمران خاندان کو حکومت سے محروم کر دیا تھا۔ اودھ سے پہلے ناگ پور' جھانسی' تنجور' مرشد آباد اور کرناٹک پر قبضہ کر چکے تھے۔

اللہ کی کتاب میں لکھا ہے کہ "اللہ جابروں کو پسند نہیں کرتا۔" کوئی شخص غریبوں پر ویسے ظلم وستم نہیں کر سکتا جیسے فرنگی کر رہے تھے۔ فرنگیوں کو کسی مذہبی عقیدے سے سروکار نہیں تھا۔ انہوں نے حلال وحرام کی تمیز مٹا دی تھی۔ وہ گائے اور سوٴر کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ تاہم انہیں کیا حق تھا کہ وہ ہمارے ہندو اور مسلمان فوجیوں کو ایسے کارتوس منہ سے کھولنے کا حکم دیں جن میں گایوں اور خنزیروں کی چربی استعمال کی گئی ہو؟ کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں کہ وہ اسلام اور ہندومت کو مٹا کر ہر شخص کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں؟ انسان اپنے مذہب اور وقار کے لیے ہی تو زندہ رہتا ہے؟ ہم نے سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا کہ وہی تو ہے جس نے نوح کی کشتی کو طوفان سے بچا لیا تھا۔

پھر ہمیں ایک اور پریشان کن مسئلہ یاد آیا' کہ ہمارا جانشین کون ہوگا؟ ہماری

محبوب ملکہ زینت محل ہمارے بڑے بیٹے مرزا دارا بخت کی جگہ مرزا جوان بخت کو ولی عہد نامزد کروانا چاہتی تھیں۔ اس حوالے سے گورنر جنرل نے ہمارا مشورہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اللہ نے پہلے شاہ رخ خان کو اور پھر دارا بخت کو اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں بیٹوں کی وفات کے بعد ہم نے زینت محل کے دباؤ کو قبول کر لیا اور جواں بخت کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔ گورنر جنرل نے ایک بار پھر ہمارے مشورے کو رد کر دیا اور ہمارے دوسرے بیٹے مرزا فخرو کو ولی عہد بنا دیا۔

فخرو نے رشوت لے کر اس معاہدے پر دستخط کر دیے تھے جس کے مطابق وہ ایک معمولی سی پنشن کے عوض لال قلعہ خالی کر دیتا۔ تب اللہ نے مرزا فخرو کو بھی بلا بھیجا۔ فرنگی ہماری موت کے اس قدر خواہاں تھے کہ ایک مرتبہ ہم بیمار پڑے تو انہوں نے محل کے دروازوں پر اپنے محافظ متعین کر دیے۔ ہمیں مجبوراً صدر کو خط لکھ کر شکوہ کرنا پڑا: ”جناب والا! کیا ہمیں سکون سے مرنے کا بھی حق نہیں ہے؟ کیا آپ کو شبہ ہے کہ ہماری لاش آپ کے خلاف بغاوت کر دے گی؟“

سعدی نے درست کہا تھا: ”ایک گدڑی میں دس درویش رہ سکتے ہیں لیکن ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔“ ہندوستانی میں اس سے ملتی جلتی ایک کہاوت ہے: ”جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔“ واضح تھا کہ یا ہم رہیں گے یا فرنگی۔

ہم نے شہزادوں، امراء اور فوج کے سالاروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ غیر ملکیوں کو اپنے علاقوں سے نکالنے کے منصوبے تیار کریں۔ اس اجتماع نے ہمارے بڑے بیٹے مرزا مغل کو فوج کا سالار اعلیٰ منتخب کیا۔ مرزا ابوبکر کو، جو لڑنے مرنے پر تلا تھا، کرنل بنایا گیا۔

اس اجلاس کے بعد ہم نے حسن عسکری کو بلایا۔ وہ ایک درویش تھے۔ مشہور تھا کہ وہ مستقبل میں جھانکنے والی نظر رکھتے ہیں۔ وہ دریا گنج میں ہماری مرحومہ بیٹی نواب

بیگم کے مکان میں رہتے تھے۔ درویش کی آمد کے انتظار میں ہم نے حکم دیا کہ ہمیں اس روز کے اخبارات پڑھ کر سنائے جائیں۔ "اخبار اردو دہلی" "سراج الاخبار" اور "صادق الاخبار" نے کشمیری گیٹ میں ہونے والے دھماکے کا آنکھوں دیکھا احوال اور شہید ہونے والے سینکڑوں افراد کے نام درج کیے تھے۔ ہم نے پوچھا: کیا انگریزی اخبار "دی گزٹ" نے اس حوالے سے کچھ لکھا ہے۔ ہمارے اخبار پڑھنے والے نے بتایا کہ "گزٹ" شائع نہیں ہوا ہے کیونکہ اس کے انگریز عملے کو قتل کیا جا چکا ہے اور صرف ایک امریکی بچا ہے' جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہم نے اس اطلاع پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اخبار پڑھنے والے کو رخصت کر دیا۔

حسن عسکری آئے تو ہم ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ اللہ کے ولی تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی عمر کے بیس سال لگ جانے کی دعا کی تھی۔ ہم نے انہیں اپنے کاؤچ پر اپنے ساتھ بٹھایا اور پوچھا کہ ہمارے شہر پر جو طوفان چھایا ہوا ہے اس کے حوالے سے ان کے تاثرات کیا ہیں۔ انہوں نے جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے تسبیح پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا منہ چھت کی طرف اٹھاتے ہوئے ڈاڑھی پر دونوں ہاتھ پھیرے اور بولے: "شکر اللہ! شکر اللہ!"

ہم بے چین ہو رہے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا: "آپ تو کتاب تقدیر کو پڑھنے پر قادر ہیں' ہمیں بتائیے کہ ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: "مستقبل کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ میری کیا بساط ہے۔ میں تو کبھی کبھار ہی آئینہ ایام میں کچھ جھلکیاں دیکھ لیتا ہوں۔"

وہ دوبارہ خاموش ہو کر تسبیح پڑھنے لگے۔ ہم نے اس سے دوبارہ استدعا کی: "خدارا' مستقبل کے آئینے میں دیکھیے اور کچھ فرمائیے۔ اس حقیر کو مزید اذیت مت دیجیے۔"

آخر وہ بولے: ''آپ کو میرا وہ خواب یاد ہوگا جس میں مَیں نے مغل تخت کے علاوہ باقی ہر شے کو سیلاب کی زد میں دیکھا تھا۔''

''بے شک یاد ہے۔''

''اس وقت ہم نے اس خواب کی تعبیر یہ کی تھی کہ ایرانی یا روسی ہندوستان پر حملہ آور ہوں گے۔ تاہم اب ہمیں پتا چلا ہے کہ طوفان تو ہندوستان کے اندر سے ہی اٹھنا تھا۔ اس طوفان میں حضور کے دشمنوں کا اقتدار غرق ہو جائے گا۔ صرف تخت طاؤس باقی بچے گا۔'' (اگرچہ تختِ طاؤس کو سو سال سے زیادہ پہلے نادر شاہ چھین کر لے جا چکا تھا تاہم ہماری رعایا کے لوگ چاندی کے پتروں سے ڈھکے لکڑی کے سٹول کو تختِ طاؤس کہا کرتے تھے)۔

ہم نے کہا: ''آمین! آمین! اللہ ضرور اپنے محبوب بندوں کی پیشگوئی کو سچ کرے گا!''

ہم نے ان سے پوچھا کیا کہ فرنگیوں کے خلاف جدوجہد میں ایرانی ہماری مدد کے لیے آئیں گے؟ انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ اسلامی افواج نصاریٰ سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہیں۔ درویش نے ہمیں بتایا کہ حوض قاضی کی ایک ہندو عورت نے تین جڑواں لڑکیوں کو جنم دیا ہے۔ وہ لڑکیاں پیدا ہوئے ہی بولنے لگی تھیں۔ پہلی نے کہا: اگلے سال بڑی مصیبتیں نازل ہوں گی۔ دوسری نے کہا: جو زندہ رہیں گے' وہی دیکھیں گے۔ تیسری نے کہا: اگر ہندو اس سال ہولی منائیں گے تو ہر مصیبت سے محفوظ رہیں گے۔ بھگوان ہر جگہ موجود ہے۔ درویش حسن عسکری نے کہا کہ ہندو سردیوں کے موسم کے اختتام کی بجائے ابھی ہولی منا رہے ہیں۔ ہم نے حسن عسکری کا شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ ہمارے لیے دعا کرتے رہیں۔ ہم نے انہیں سونے کی مہر پیش کی اور اس سے پہلے کہ وہ اس پر احتجاج کریں' ہم اپنے حرم چلے گئے۔

☆☆☆

ہم درویش کی باتیں ملکہ زینت محل کو سنانے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے ملاقات کے لیے آنے والی خواتین اور خادماؤں کو رخصت کر دیا۔

ہم نے انہیں بتایا: "درویش حسن عسکری ہمیں ملنے آئے تھے۔" اتنا کہہ کر ہم خاموش ہو گئے تاکہ ان کے تجسس میں اضافہ ہو جائے۔

وہ بولیں: "اور انہوں نے آپ کو اپنا طوفان والا خواب سنایا' اور ہندوؤں کے ہولی منانے کی اطلاع دی' اور تین جڑواں لڑکیوں کے پیدا ہوتے ہی بولنا شروع کر دینے کی خبر دی۔ آپ کی بندی بھی نصاریٰ کے خاتمے اور مغل شہنشاہی کے احیا کی پیشگوئی سن کر انہیں سونے کی مہر عطا کر چکی ہے۔"

ہم نے حیرت سے سوچا محل میں خبریں کتنی تیزی سے سفر کرتی ہیں! ایسا لگتا ہے جیسے دیواریں کان اور ہوائیں زبان رکھتی ہوں! ملکہ نے ہماری آنکھوں سے ہماری حیرت کو جان لیا۔ انہوں نے اپنے ماتھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا: "میں کتاب تقدیر کو اپنے انداز سے پڑھتی ہوں۔"

انہوں نے حافظ کا دیوان اس صفحے سے کھولا' جس کی نشاندہی ایک ریشمی ڈوری سے کی گئی تھی۔ فال نکلی کہ "اچھا وقت آنے والا ہے' مایوس مت ہو۔"

انہوں نے فال والے اشعار دوبارہ پڑھے۔ ہم انہیں سن کر خوش ہو گئے۔ ہم نے ان کے رخسار کو چوم لیا۔ وہ شرما گئیں اور بولیں: "یہ دن کا وقت ہے' حضور کو حیا نہیں آتی کیا؟"

ہم نے حافظ کا شعر پڑھا' جس کا مفہوم تھا: "تم حیا کی بات کرتی ہو' ہماری حیا تو مشہور ہے۔"

غدر کے پہلے دو دن تو ہم اپنے آپ کو حقیقتاً ہندوستان کا بادشاہ تصور کرتے رہے۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ فرنگی ہندوستان سے نکل جائیں گے۔ تاہم تیسرے دن وہم کا وہ رنگین پردہ ہٹ گیا جس نے ہماری آنکھوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔ ہمارے بیٹے مرزا

مغل نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ لوگ اس کے احکامات پر عمل کرنے لگے۔ حد تو یہ ہے کہ خواجہ سرا بسنت علی خان جیسے ہماری ذاتی خدام بھی شہزادے کی اطاعت کرنے لگے۔

شہزادہ مرزا مغل نے ہماری حفاظت میں موجود یورپیوں کے خلاف شہر کے لوگوں کو اکسایا۔ ہم نے اسے ڈانٹا اور خبردار کیا کہ وہ بسنت علی خان جیسے "آدمیوں" کی باتوں میں نہ آئے۔ تاہم اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تین دن بعد 16 مئی بروز ہفتہ انہوں نے قیدیوں کو تہہ خانے سے گھسیٹ کر نکالا اور عورتوں اور بچوں سمیت 39 قیدیوں کے سر قلم کر دیئے گئے۔ ہمارے محل کے سامنے واقع شاہی فوارہ لاشوں اور خون سے بھر گیا تھا۔ ہم نے حرم میں پناہ لی۔ زینت محل ہماری آغوش میں سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگیں۔ ہمارے کانوں میں مرنے والوں کی چیخیں اب بھی گونج رہی تھیں۔ رات کے وقت دریا کنارے گیدڑوں کی آوازیں یوں محسوس ہوئیں جیسے عورتیں کسی جنازے پر رہی ہوں۔

جب ہم نے مرزا مغل اور اس نانہجار ہیجڑے بسنت علی کو ڈانٹا تو انہوں بے ادبی کے ساتھ ہم سے پوچھا کہ ہم کافروں کے ساتھ ہیں یا ان کے؟ انہوں نے الزام لگایا کہ زینت محل کے والد حکیم احسان اللہ انگریزوں کے تنخواہ دار مخبر ہیں۔

ہم نے ان کی باتیں سنی ان سنی کر دیں۔ تاہم اس کے بعد ہمارا دل ٹوٹ گیا۔ بعض اوقات ہم جلد فتح کی امید کرنے لگتے تھے اور بعد اوقات ہم چاہتے تھے کہ "صاحبوں" سے ہماری صلح ہو جائے وہ ہمیں اور ہمارے وارثوں کو ہندوستان کے بادشاہ تسلیم کر لیں اور ہمارے ملک کا انتظام سنبھال لیں۔ دونوں صورتوں میں ہم امن وسکون کی دعائیں کرتے تھے تاکہ ہم اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام کسی الگ تھلگ گوشے میں عبادت واذکار کرتے ہوئے بسر کر سکیں۔

اتوار 26 مئی کی شام نیا چاند دکھائی دیا۔ ہم آسمان پر موجود گرد وغبار کی وجہ

سے چاند کو نہ دیکھ سکے تاہم ملکہ زینت محل نے غروب ہوتے ہوئے سورج کے اوپر سرخی مائل افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ چاند وہاں ایک نقرئی برچھی کی طرح چمک رہا ہے۔ اگلے دن ہم اپنے پسندیدہ ہاتھی مولا بخش پر سوار ہو کر بازاروں سے گزرتے ہوئے شاہی مسجد گئے اور عصر کی نماز اپنی رعایا کے ساتھ شاہی مسجد میں ادا کی۔ واپسی میں ہم نے اپنے ہاتھی کے اردگرد جمع ہو جانے والے فقیروں پر سکے پھینکے۔ ہمارے لاہوری دروازے تک پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہمارے محل کی دیواروں پر چراغ روشن کر دیے گئے تھے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا' جامع مسجد سمیت سارا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ہوائیاں آسمان پر جا کر پھٹ رہی تھیں اور رنگ برنگی روشنیاں بکھیر رہی تھیں۔ ہمیں اکیس گولوں کی سلامی دی گئی۔

عیدالفطر ہمیشہ خوشیوں سے بھرپور ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کو خوشیاں منانے کی اجازت دیا کرتے تھے تاہم ہمارے بیٹے دوسروں کو تکلیف دیے بغیر خوش ہونا نہیں جانتے تھے۔ داروغہ نے آدھی رات کے وقت ہمیں جگا کر ہماری مدد مانگی کہ ہم اپنے اس بیٹے کو پکڑنے کی اجازت دیں' جو ایک امیر ہندو تاجر کے گھر زبردستی گھس گیا تھا۔ دوسرے کو لال کنواں میں ہیجڑوں کے محلے سے نشے میں دھت اور الف ننگا پکڑا گیا تھا۔ تیسرے کو دریا گنج کے ایک بدنام مکان میں ہڑبونگ مچاتے پکڑا گیا تھا۔ وہ اڈا ایک ایسی عورت کا تھا جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا۔ تیمور اور بابر کا خاندان کتنا پست ہو گیا تھا!

ہم نے اگلی صبح اپنے بیٹوں کو بلا کر ان کی سرزنش کی۔ وہ سر جھکائے کھڑے رہے۔ ان کی آنکھیں سرخ اور چہروں کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے لوگوں کی شکل گھوڑوں پر سواری کرنے والے اناڑیوں کی سی تھی۔ وہ خرچ کرنا تو جانتے تھے لیکن کمانا نہیں۔ انہوں نے فضول خرچیاں کر کر کے خزانہ خالی کر دیا تھا۔ گوروں سے لڑنے کے لیے بہت سے لوگ تیار

تھے لیکن انہیں تربیت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ انہیں تربیت یافتہ بندوق برداروں کے مقابلے میں کلہاڑیاں، نیزے اور چاقو دے کر میدانِ جنگ میں اتار دیا گیا تھا۔ عیدالفطر کے پانچ دن بعد دریا کے پار غازی آباد میں ایک معرکہ ہوا۔ فرنگیوں نے فتح حاصل کی۔ یہی قصہ چند دن بعد شیر شاہ سوری کی تعمیر کروائی ہوئی عظیم شاہراہ پر بدلی کی سرائے میں دہرایا گیا۔

درویش حسن عسکری نے کہا کہ ان شکستوں کے ذریعے اللہ ہمیں خبردار کر رہا ہے کہ ہم بہتر تیاری کریں۔ ہمارے نجومیوں نے بھی پیشگوئی کی تھی کہ فرنگیوں کے اقتدار کا خاتمہ 23/جون کو ہو جائے گا۔ جنگِ پلاسی کو اس روز سو سال پورے ہو جاتے تھے۔ ہمارے ہزاروں جوانوں نے شہر کی فصیل کے باہر سبزی منڈی میں اکٹھے ہو جانے والے دشمن کے دستوں پر حملہ کر دیا۔ ہمارے جوانوں کو ایک بار پھر موت کے جام پینا پڑے جبکہ فرنگیوں اور ان کے سکھ اور گورکھا اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی۔

سبزی منڈی میں ہونے والی شکست سے شہری مایوس ہو گئے۔ لوگوں کو اپنے عسکری سالاروں کی فوجی لیاقت پر بھروسہ نہ رہا۔ ہر کوئی ایک دوسرے پر غداری اور فرنگیوں کی مخبری کا الزام لگانے لگا۔ صحرا سے آنے والی گرم ہوائیں لوگوں کے صبر کا امتحان لے رہی تھیں۔ اچانک تاجروں نے اپنا مال چھپانا شروع کر دیا۔ بازار میں کھانے کو کچھ دستیاب نہ رہا۔ غریب تباہی کے عالم میں مارے مارے پھرنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے چوری چکاری شروع کر دی۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ تب دلی میں ایک اجنبی وارد ہوا۔

❀❀❀

نہال سنگھ

میں ساری زندگی دلی کی باتیں سنتا رہا تھا۔ جب میں بچہ تھا تو مائی نے مجھے دلی کے بادشاہ اورنگ زیب کے بارے میں بتایا تھا' جس نے ہمارے گرو کا سر قلم کروا دیا تھا۔ وہ اسے اورنگا کہتی تھی اور جب بھی اس کا نام لیتی تھی' زمین پر تھوکا کرتی تھی۔ جب میں بڑا ہوا تو باپو نے مجھے بتایا کہ ہمارے آباؤ اجداد نے دلی میں لوٹ مار مچائی تھی اور چاندی سونے سے بوریاں بھر کر واپس آئے تھے۔ باپو نے بتایا کہ سردار بھاگل سنگھ نے عین اس جگہ ایک گردوارہ تعمیر کروایا تھا' جہاں ہمارے گرو کا سر قلم کیا گیا تھا۔ جب میں پنجاب پولیس میں بھرتی ہوا تھا تو میرے دوستوں نے کہا تھا: ''اگر تم نے دلی نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا۔'' انہوں نے کہا کہ دلی میں سب کچھ مل سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آم جتنی چھاتیوں والی کم عمر طوائفیں' تربوز کی طرح گول گول کولہوں والے لڑکے اور اگر طوائف یا لڑکے کے لیے تمہاری جیب میں کافی پیسے نہ ہوں تو تم دو پیسے میں ہیجڑا حاصل کر سکتے ہو' جبکہ وہ تمہیں ان دونوں سے زیادہ لطف اندوز کرے گا (یا کرے گی)۔ میں نے گرو سے پرارتھنا کی کہ میں کسی نہ کسی طرح دلی پہنچ جاؤں۔

گرو نے' جو ہمارے دلوں کے رازوں سے واقف ہے' میری دعا قبول کر لی۔

ایک روز میں چھٹی پر گھر میں موجود تھا کہ دو آدمی ہماری بستی میں آئے۔ ایک نے ساری بستی میں منادی کی کہ سب لوگ پیپل کے درخت تلے اکٹھے ہو جائیں۔ جب لوگ اکٹھے ہو گئے تو دوسرے آدمی نے بتایا کہ مسلمان جان کمپنی کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں اور انہوں نے دلی میں ایک مغل کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔ وہ مغل اسی اورنگ زیب کا پوتا ہے' جس نے ہمارے گرو کو قتل کروایا تھا۔ اس نے کہا: اگر ہم کمپنی کی فوج میں شامل ہوں گے تو دلی پر قبضے کے بعد جو سونا چاندی ہمارے ہاتھ لگے گا' ہمارا ہی ہوگا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ تھانے عرضی لکھ کر مجھے مزید چھٹی دلائے' باپو اور مائی کے چرن چھوئے اور دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے ساتھ میری بستی کے دو لڑکے لہنا اور نتھا بھی تھے۔ بہت گرمی تھی۔ ایسا لگتا تھا دنیا کو تندور میں ڈال دیا گیا ہے۔ آندھی نے ہمارے نتھنوں اور آنکھوں میں گرد بھر دی اور ہماری سیاہ ڈاڑھیاں مٹیالی ہو گئیں۔ ہم نے خود سے کہا ''سکھوں کے سامنے گرمی کی کیا اوقات!'' اور گرم دوپہروں میں سفر شروع کر دیا۔ ہم راستے میں آنے والے کنوؤں پر نہاتے' نیم کے درختوں تلے تھوڑی دیر سستانے اور دوبارہ چل پڑتے۔ ہم دو دن میں انبالہ پہنچ گئے۔

ایک یحیم شحیم گنجا صاحب' جس کا رنگ بندر کے پچھلے حصے کی طرح سرخ تھا' ہم سے معلومات حاصل کرنے آیا۔ اس کو جند کے راجہ نے سو سکھ فراہم کر دیے تھے۔ اس نے راستے میں آنے والی بستیوں سے مزید سو سکھ اکٹھے کیے تھے۔ میں نے پولیس کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ میرے پاس گھوڑا بھی تھا۔ پس اس نے مجھے بھرتی کر لیا۔ اس نے لہنا اور نتھا کو بھی بھرتی کر لیا۔ پھر اس نے ہم سے پوربی بولی میں باتیں کیں۔ مجھے اس کی ساری باتیں تو سمجھ نہ آسکیں۔ البتہ اتنا سمجھ میں آیا کہ ہمیں مسلمانوں سے لڑنا ہوگا اور یہ کہ ہمارے گرو نے اورنگا سے کہا تھا کہ چڑھتے سورج والی سمت سے ''صاحب'' آئیں گے اور سکھوں کی مدد سے اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس پیشگوئی کا

تذکرہ نہ تو کبھی میرے باپو نے کیا تھا اور نہ ہی مائی نے' تاہم میں نے اپنے آپ سے کہا کہ صاحب سچ ہی کہہ رہا ہوگا' کیونکہ صاحب لوگ ذہین ہوتے ہیں۔ ایک صبح پریڈ کے وقت صاحب' جس کا نام مجھے بعد میں پتا چلا کہ ہڈسن تھا' لڑکوں سینے' پیٹ اور بازوؤں میں انگلی کھبا کھبا کر جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے مجھے پگڑی سے لے کر پیروں تک دیکھا۔ میں قطار میں موجود سب لڑکوں سے لمبا اور تنومند تھا۔

اس نے پوچھا: ''کیا نام ہے تمہارا؟''

میں نے کہا: ''نہال سنگھ۔''

اس نے کسی پکے پنجابی کی طرح کہا: ''نہال سنگھ۔ آج سے تم میرے اردلی ہو۔''

ہڈسن صاحب ایسا ہی تھا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں پوچھتا تھا۔ وہ صرف حکم دیا کرتا تھا۔

لڑکے حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ انہوں نے میری کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا: ''شاباش! ودھائیاں!'' تاہم جونہی میں وہاں سے گیا انہوں نے مجھے صاحب کے ''چمچے'' کا خطاب دے دیا۔ میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ میں ہڈسن صاحب کو پسند کرنے لگا تھا۔ ہڈسن صاحب کو میں پسند تھا۔ اگرچہ میری تنخواہ دوسرے ''سواروں'' سے زیادہ نہیں تھی' تاہم حد تو یہ ہے کہ سردار مان سنگھ بھی' جو کہ ہمارا صوبیدار تھا' مجھے ہمیشہ بھائی نہال سنگھ جی کہا کرتا تھا۔

ہمیں نئی وردی دی گئی۔ یہ لال پگڑی' خاکی قمیض' لال کمر بند اور خاکی برجیس پر مشتمل تھی: لال خاکی' لال خاکی۔ دوسرے صاحب ہمیں فلیمنگو کہنے لگے۔ ہم سب کو نئی بندوقیں دی گئیں' جو کہ بہت تیزی سے فائر کر سکتی تھیں اور ان کی نالوں پر لمبی سنگین نصب تھی۔ ہمیں برچھیاں بھی دی گئیں۔

چند دن کی تربیت کے بعد ہم دلی روانہ ہو گئے۔ کرنال میں پہاڑوں سے آنے والی گورا کمپنیاں ہمارے ساتھ مل گئیں۔ گورے دھوپ اور گرم ہوا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم رات کے وقت سفر کرتے اور دن کے وقت درختوں کے سائے میں سوئے رہتے۔ ہم ان قصبوں سے گزرے جنہوں نے جان کمپنی کے خلاف بغاوت کی تھی تاہم کسی کو ہمارے سامنے "چوں" کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ ہم رات کی تاریکی میں دلی کے نواح میں پہنچے۔ ہمیں ہمارے لیے لگائے گئے خیموں میں لے جایا گیا۔ صاحبوں کا "بندوبست" بہت اچھا تھا۔

ہم نے گرم اور حبس زدہ رات میں بیس میل کا سفر کیا تھا۔ تھکے ہوئے جوان کمر بند کھولے اور بوٹ اتارے بغیر سو گئے میں بہت پر جوش تھا۔ اس لیے مجھے نیند نہ آئی۔ خیمے میں بارہ آدمی خرانے اور پاد مار رہے تھے۔ چنانچہ میں خیمے سے باہر نکل گیا۔ میں نہا کر ایک ہموار پتھر پر لیٹ گیا۔ میں اپنے لمبے بال کھول کر انہیں ہوا لگوانے اور آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تکنے لگا۔ ضرور مجھے نیند آ گئی ہو گی کیونکہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ستاروں کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور آسمان خاکستری ہو گیا تھا۔ میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ مجھے گرو نانک کے الفاظ یاد آئے: "مرد بنو! مالک معجزہ دکھائے گا!"

میں نے اپنے آپ سے کہا: "واہ! بھائی واہ! عظیم گرو نے واقعی ایک حیرت ناک شہر بنایا ہے۔"

میرے بائیں طرف' کہ جدھر سے سورج طلوع ہو رہا تھا' ایک دریا بہہ رہا تھا' جو ستلج جتنا چوڑا تھا۔ وہ دریا شہر کی فصیل کے دوسری طرف بہہ رہا تھا۔ فصیل بہت اونچی اور بہت لمبی تھی۔ وہ دریا کے کنارے سے لے کر وہاں تک موجود تھی جہاں تک میری نگاہ دیکھ سکتی تھی اور درختوں کے جھنڈوں میں غائب ہو رہی تھی۔ اس میں بے شمار برجیاں اور دروازے تھے۔ اس خاکستری فصیل کے پیچھے مجھے ایک بڑے قلعے کی سرخ

فصیل دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ گنبد اور مینار اور مکانوں کی چھتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے جنگ کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ حتیٰ کہ کوئی ذی روح بھی نظر نہ آیا۔

☆☆☆

جونہی سورج طلوع ہوا ایک توپ نے گولہ داغا ہزاروں کبوتر اڑنے اور کوے کائیں کائیں کرنے لگے۔ میں نے درختوں کی سب سے اوپر والی ٹہنیوں پر سینکڑوں گدھوں کو بیٹھے دیکھا۔ وہ گلی سڑی لاشوں پر یوں جمع تھے جیسے شہد کے چھتے پر مکھیاں جمع ہوتی ہیں۔ پھر مجھے ٹہنیوں سے لٹکی ادھ کھائی لاش نظر آئی۔ مجھے قے آ جاتی ہے۔ میں خیمے کے اندر جا کر اپنے رفیقوں کے ساتھ لیٹ جاتا ہوں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوتا تھا۔

بگل بجتے ہیں تو ہم اٹھ جاتے ہیں۔ میں چائے کا ایک مگ پیتا ہوں اور کیمپ کا جائزہ لیتا ہوں۔ ہم سرخ چٹانوں کے ایک سلسلے پر خیمہ زن تھے۔ پہاڑی سلسلے کی چوٹی پر ایک بڑا مکان ہے۔ ہمارے باورچی نے بتایا ہے کہ وہ مکان ہندوراؤ نامی ایک مرہٹے کا ہے۔ چونکہ وہ دشمن کے توپ کے گولوں کی رسائی سے باہر ہے اس لیے صاحب افسروں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ گورا پلٹنیں پہاڑی سلسلے کی اونچائیوں پر خیمہ زن ہیں اور گولوں کی رسائی سے دور ہیں۔ ہم کالے شہر کی فصیل کے زیادہ قریب ہیں۔ ہم میں پٹھان' بلوچی اور پنجابی مسلمان بھی شامل ہیں۔ میں باورچی سے پوچھتا ہوں: ''یہ مسلمان یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور گورکھے یہاں کیوں آئے ہوئے ہیں؟'' وہ کہتا ہے: ''یہ صاحبوں کے حکم کے مطابق کسی سے بھی لڑنے کے لیے آئے ہیں۔ گورکھے کی کھوپڑی لوہے کی بنی ہوتی ہے اور اس میں گوبر بھرا ہوتا ہے۔ اگر صاحب کہے کہ اپنے باپ کو گولی مار دو تو وہ اپنے باپ اور ماں کو گولی مار دے گا۔'' حیرانی کی بات یہ ہے کہ صاحب ہم مقامیوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔ گرو نے انہیں زبردست عقل عطا کی ہے۔ اس کے علاوہ ہمت و جرأت بھی۔ ہڈسن صاحب کہا کرتا ہے: ''ایک گورا دس کالوں پر بھاری ہوتا ہے۔''

دوپہر کا وقت ہے۔ سورج عین ہمارے سروں پر آگ بکھیر رہا ہے۔ میں نیم کے درخت تلے سکون سے خراٹے بھر رہا ہوتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیتا ہے: ''اوئے نہالیا! کیا تو نے بگل نہیں سنا؟ کیا تو سوتے میں مارا جانا چاہتا ہے؟''

میں جست لگا کر اٹھتا ہوں اور سر پر پگڑی باندھتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ صاحب دوربینوں سے دور دیکھ رہے ہیں۔ میں نے دور شہر کے مشرقی سرے کی طرف سے' جسے سبزی منڈی کہا جاتا ہے' دشمن کے گھڑسواروں کو اِدھر آتے دیکھا۔ گھڑسواروں کے پیچھے پیادہ فوجی بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ انہوں نے جان کمپنی کی وردیاں پہنی ہوتی ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے شہر کی فصیل سے یوں آتش بازی شروع کی جیسے کسی کی شادی ہو رہی ہو۔ توپیں ''بھاں' بھاں'' گولے داغ رہی ہوتی ہیں اور گولے ''شاں' شاں'' گزر رہے ہوتے ہیں۔ گولے پہاڑی سلسلے پر گر کر ہمارے خیموں کو تباہ اور گھوڑوں کو ہلاک کر رہے ہوتے ہیں۔ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان بدمعاشوں کا نشانہ اچھا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں بڑے حربے آتے ہیں۔ جونہی ہم گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں وہ ''ہر ہر مہادیو'' اور ''علیؓ' علیؓ '' کے نعرے لگاتے ہوئے ہم پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہڈسن صاحب تلوار کھینچتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں ''حملہ!'' ہم تیزی سے ان پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ جونہی ہم بندوقوں کی رسائی میں آتے ہیں' وہ ہم پر گولیاں چلا دیتے ہیں اور فوراً پرے بھاگ جاتے ہیں۔ ابھی ہم اپنے مُردوں اور زخمیوں کو شمار کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے صاحب پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ایک شخص مجھ سے کہتا ہے: ''او سردار جی! تم ان فرنگی سوروں کو اپنی جان کیوں بیچ رہے ہو؟ ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ تمہیں زیادہ رقم ملے گی۔''

وہ ہمارے بہت سے آدمیوں کو مار دیتے ہیں۔ ہم بھی ان کے کچھ آدمیوں کو مار دیتے ہیں۔ تاہم وہ ہمارے کسی لڑکے کو زندہ نہیں پکڑ پاتے اور ہم ان کے تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔

ہم ان کے مُردوں کی تلاشی لیتے ہیں تو ہمیں ان کی پیٹیوں میں سونے اور چاندی کے ڈھیر سارے سکے ملتے ہیں۔ ہم ان کی انگلیاں کاٹ کر انگوٹھیاں اور کان کاٹ کر بالیاں حاصل کر لیتے ہیں۔

ہڈسن صاحب گرفتار ہونے والوں کو ایک درخت تلے صف میں کھڑا کروا دیتا ہے۔ وہ انہیں گھٹنوں کے بل کھڑے ہونے کا حکم دیتا ہے۔ وہ اپنی بندوق میں کارتوس بھرتا ہے اور خاکستری ڈاڑھی والے ایک بوڑھے کا نشانہ باندھتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے: ''تم نے کتنا عرصہ کمپنی کا نمک کھایا تھا؟''

خاکستری ڈاڑھی والا ہاتھ باندھ کر گڑگڑاتا ہے: ''ہم سے قصور ہوا' ہمیں معاف کر دیجئے۔''

دوسرے قیدی بھی گڑگڑانے لگتے ہیں: ''ہمیں معاف کر دیجئے۔ ہمارا سب کچھ لے لیجئے لیکن ہمیں ہلاک نہ کیجئے۔'' وہ اپنی پیٹیاں کھول کر سکے نکال دیتے ہیں۔ وہ اپنی انگوٹھیاں اور ایسی ہی دوسری اشیاء بھی نکال کر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔

ہڈسن صاحب ان چیزوں کی طرف دیکھتا تک نہیں۔ وہ خاکستری ڈاڑھی والے سے پوچھتا ہے: ''تمہاری رجمنٹ کون سی تھی؟''

''چھبیسویں۔ ہم کئی لڑائیوں میں صاحب کی ماتحتی میں لڑ چکے ہیں۔ آپ جب کہیں گے ہم دوبارہ آپ کے لیے لڑیں گے۔''

وہ ہڈسن صاحب کا پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ صاحب اسے دوسرے پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے پوچھتا ہے: ''تمہارا کمانڈر کون ہے؟''

''صاحب! مرزا مغل ہمارا کمانڈر ہے۔ خدارا ہمیں ہلاک مت کیجئے۔ ہم آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔''

''تمہاری تعداد کتنی ہے؟''

وہ ایک دوسرے سے پوچھ کر بتاتے ہیں۔ ان کی تعداد دس ہزار ہوتی ہے۔

ہڈسن صاحب جو کچھ جاننا چاہتا ہے' معلوم کر لیتا ہے۔

وہ اپنی کاربین کی نال بوڑھے کے سینے سے لگا کر گولی چلا دیتا ہے اور کہتا ہے: "یہ لو نمک حرام!"

خاکستری ڈاڑھی والا چیخ مارتے ہوئے "یا اللہ" کہتا ہے اور گر جاتا ہے۔

ہڈسن صاحب حکم دیتا ہے: "ان نمک حراموں کے سر کاٹ کر لاشیں گیدڑوں کے آگے ڈال دو۔"

قیدیوں کی حالت ایسی ہو جاتی ہے' جیسے وہ زندہ لاشیں ہوں۔ ہم ان کی پٹیاں کھول لیتے ہیں۔ ہماری فوج کا صفائی کا عملہ ان کی وردیاں اور بوٹ اتار لیتا ہے۔ ہمیں ان کو ننگا کر کے پہاڑی سلسلے سے نیچے لے جاتے ہیں۔ ہم انہیں صف میں گھٹنوں کے بل کھڑا کر کے سر جھکانے کا حکم دیتے ہیں۔ وہ رونے گڑگڑانے لگتے ہیں۔ ان کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی کرپانوں سے ان کے سر کاٹ دیتے ہیں۔ یہ ایسے تھے جیسے گروبھنڈار کے لیے بھیڑوں کا جھٹکا کیا گیا ہو۔ صرف آدمی کی گردن بھیڑ سے موٹی ہوتی ہے اور ایک جھٹکے میں نہیں کاٹی جا سکتی۔

ہڈسن صاحب ہمیں رَم کا اضافی راشن دیتا ہے۔

☆☆☆

ہمارے دو گھڑسوار شدید زخمی ہوتے ہیں۔ میں انہیں دیکھنے کیمپ کے ہسپتال جاتا ہوں۔ وہ کیکر کے ایک درخت تلے پڑے ہوتے ہیں۔ وہاں مقامیوں کو کمرے میں نہیں رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گوروں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو ہیضہ' اسہال یا تپ لرزہ ہو گیا ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو یوں نچڑ گئے ہوتے ہیں جیسے موم دھوپ میں پگھل جاتا ہے۔ میں اپنے زخمی گھڑسواروں کے پاس بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دباتا ہوں۔ ہڈسن صاحب ایک ڈاکٹر کو بھیجتا ہے' جو مرہم کا ایک پیکٹ زمین پر پھینک کر کہتا ہے: "اسے اپنے زخموں پر لگا لو اور دو دن کے اندر اندر اپنی

ڈیوٹی پر حاضر ہو جاؤ۔"

میں سہ پہر کے وقت ہڈسن صاحب سے ملنے جاتا ہوں۔ وہ اپنے خیمے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: "ضرور صاحب بہت تھک گئے ہوں گے۔ کیا میں صاحب کے بوٹ اتاروں؟" وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ میں زمین پر بیٹھ کر اس کی "پٹیاں" کھولتا ہوں اور اس کی ٹانگوں کو دباتا ہوں۔ وہ لکھنا چھوڑ کر میری طرف رخ کر لیتا ہے۔

"ایہہ آج اچھی لڑائی ہوئی نا؟"

میں کہتا ہوں: "صاحب! انہوں نے ہمارے بہت سارے آدمی مار دیے ہیں۔"

صاحب کاغذ کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے: "سترہ ہلاک، پچیس زخمی۔ بیس گھوڑے بھی مرے ہیں۔"

میں نے اپنے سترہ سے زیادہ آدمیوں کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں سمجھ جاتا ہوں۔ صاحب صرف گوروں کو گن رہا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "یہ گیدڑ انگریزوں سے نہیں لڑ سکتے۔ آج 23/جون ہے۔ آج جنگِ پلاسی کو سو سال پورے ہو گئے ہیں۔ اس جنگ میں انگریزوں نے مسلمانوں کو شکست دی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ سو سال بعد وہ جنگ جیتیں گے لیکن گیدڑ 'صاحب لوگ' کو شکست نہیں دے سکتے۔"

میں اس کے بوٹ اتارتا ہوں اور اس کے پاؤں دباتے ہوئے کہتا ہوں: "انگریز بہت بہادر ہوتے ہیں۔"

"ہاں، دنیا کے بہترین جنگجو۔"

میں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا: "سکھ بھی بہت بہادر ہوتے ہیں۔ ایک سکھ سوا لاکھ پر بھاری ہوتا ہے۔"

ہڈسن صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے کہا: "مدکی' پھیرو شہر' سکھراؤں' ملتان' چیلیانوالہ اور گجرات میں کیا ہوا تھا؟"

"صاحب! سکھ فوج کے اپنے افسروں نے غداری کی تھی۔"

"ہر شکست کے بعد یہی کہا جاتا ہے ـــ کہ ہماری شکست کا باعث ہمارے سالار ہیں۔"

ہڈسن صاحب کو غصہ بہت جلدی آ جایا کرتا تھا۔ میں اس سے بحث کر کے اسے غصہ نہیں دلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دل میں کہا: "اگر سکھوں کے جنرل اچھے ہوتے تو وہ سیدھے تمہارے شہر لندن تک پہنچ جاتے اور تمہاری ماں...... دیتے۔"

میں نے اس کی جرابیں اتاریں اور اس کے پیروں کے تلوے سہلانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بلی کی طرح غرغر کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا: "ٹھیک ہے' تم جا سکتے ہو۔"

میں اسے سیلوٹ کر کے وہاں سے چلا گیا۔

اگلی صبح میں یہ دیکھنے گیا کہ زخمی لڑکے کیا کر رہے ہیں۔ وہ مجھے کیکر کے درخت تلے نہیں ملے۔ میں ہسپتال گیا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھے۔ ایک صفائی کرنے والے نے مجھے بتایا کہ وہ رات کو مر گئے تھے اور ان کی لاشوں کو دفنانے کے لیے لے جایا جا چکا ہے۔ دلی والے ہمیں سانس بھی نہیں لینے دیتے تھے۔ آدھی رات کو' جب ہم گہری نیند سوئے ہوتے تھے' وہ ہم پر توپیں داغنا شروع کر دیتے۔ ہم گرم دوپہروں میں درختوں کی چھاؤں میں سو رہے ہوتے تو وہ چوروں کی طرح رینگتے ہوئے اوپر آتے اور کاربینوں سے "ٹھاہ ٹھاہ" کر جاتے۔ انہوں نے ہمارے کیمپ میں اپنے قاصد بھی بھیجے۔ مسلمانوں کے پاس مسلمانوں کو بھیجا گیا تھا۔ وہ قرآن لے کر آتے اور ان سے درخواست کرتے کہ وہ فرنگیوں کے خلاف جنگ کریں۔ سکھوں کے پاس برہمن بھیجے گئے۔ وہ پیتل کے لوٹوں میں گنگا کا پانی لے کر آتے تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک گورے کا سر کاٹنے پر سو روپے کی پیشکش کی جبکہ اس سے بھی زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش کی

گئی۔ ہم نے نمک حرامی نہیں کی۔ ہم نے ان کی دی ہوئی رقم لے لی اور انہیں نیم کے درختوں پر لٹکا دیا۔

صاحبوں نے مخبروں کو بھی ملازم رکھا تھا۔ مخبروں کا سربراہ یک چشم رجب علی تھا۔ وہ جب چاہے ہمارے کیمپ میں آ جاتا اور پھر شہر واپس چلا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کا مخبر تھا۔ وہ ہڈسن صاحب کے کان میں بھی بڑی پھس پھس کرتا اور ان سے رقم لے جاتا تھا۔

کالے ہڈسن صاحب کو پسند کرتے تھے لیکن گورے اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ میں نے اس کا مظاہرہ تب دیکھا جب پشاور سے ''گائیڈز'' کہلانے والی پلٹن آئی۔ ہڈسن صاحب اکثر کہا کرتا تھا: ''جب میں گائیڈز میں تھا......'' وہ جس انداز سے بات کرتا تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ گائیڈز دنیا کے سب سے بڑے جنگجو ہوں گے۔ جب گائیڈز آئے اور انہوں نے ہڈسن صاحب کو دیکھا تو کالے لوگ دوڑتے ہوئے انہیں گلے ملنے کے لیے آگے بڑھے۔ کیا منظر تھا وہ! پٹھان' بلوچ' سکھ سب ہڈسن صاحب سے گلے مل رہے تھے۔ تاہم صاحبوں نے یوں منہ پھیر لیے جیسے وہ اسے جانتے ہی نہ ہوں۔

ایک دن ایک گورے نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔

میں نے اٹینشن ہو کر کہا: ''ہڈسن کا گھوڑا۔''

وہ ہنسنے لگا۔ اس نے دوسرے گوروں کی طرف رخ کر کے کہا: ''ہڈسن کا گدھا۔''

حد تو یہ ہے کہ ''جنگی لاٹ'' ولسن صاحب بھی ہڈسن صاحب کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے مزید فوجیوں کے آنے تک اسے دلی پر حملہ نہیں کرنے دیا۔ جب گرم ہوا زیادہ گرم ہونے لگی اور دوپہر کے وقت ہر روز آندھی آنے لگی تو ہڈسن صاحب کا مزاج پہلے سے زیادہ خراب ہو گیا۔

جولائی میں ایک دن ایسا طوفان آیا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گرم گرم مٹی ہماری آنکھوں اور نتھنوں میں بھر گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہی مٹی ٹھنڈی ہوگئی۔ آسمان پر بادل گرجنے اور بجلی کڑکنے لگی۔ پھر ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ مٹی تو مٹی ہر شے کو بہا لے گئی۔ میں دوڑتا ہوا خیمے سے نکلا اور اپنے دوستوں کو پکارنے لگا: ''اوئے لہنیا! بارش! اوئے نتھیا! انیمی! باہر آؤ' آسمان پھٹ پڑا ہے!''

ہم نے اپنی پگڑیاں اور وردیاں اتار پھینکیں اور جانگیوں میں باہر آگئے۔ ہم نے بال کھلے چھوڑ دیے اور گانا اور ناچنا شروع کر دیا۔ ''اوئے اگر کوئی معشوقہ ہوتی تو مزا آ جاتا!''

گورے مقامیوں سے پوچھنے لگے کہ ہمیں کیا ہوگیا ہے۔ پٹھانوں نے سر ہلائے اور مسکرانے لگے۔ ڈوگروں نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''صاحب! ان سکھوں کے بال ہوتے ہیں۔ انہیں گرمی چڑھ گئی ہے' یہ پاگل ہوگئے ہیں۔'' ہم نے چلا کر انہیں کہا: ''اوئے تمہاری ماؤں بہنوں کے بھی بال لمبے ہیں۔ انہیں بھی ضرور گرمی چڑھتی ہوگی۔ انہیں ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم ان کی رانوں کے درمیان والی گرمی مٹا دیں گے۔''

اس پر وہ لاجواب ہوگئے۔

شام کے وقت درختوں پر بے شمار جگنو اکٹھے ہوگئے۔ ہم نے انہیں پکڑ کر اپنی ڈاڑھیوں میں سجا دیا۔ ہماری ڈاڑھیاں جگمگانے لگیں۔ جگنو ڈاڑھیوں میں سجا کر ہم بھنگڑا ڈالنے لگے۔

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ بارش کے تھپیڑے ہمارے خیموں سے ٹکراتے رہے۔ بعض اوقات دور سے گرج کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ کسی کو زیادہ نیند نہ آئی۔

میں صبح سویرے جاگ اٹھا۔ آسمان پر خاکستری اور سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر شے دھلی دھلی اور ہری لگ رہی تھی۔ میں نے ایک مور کی آواز سنی۔ ہندو راؤ کے محل کی برجی پر ایک مور اور دو مورنیاں موجود تھیں۔ مور نے دم پھیلا لی۔ میں خیمے

میں سر گھسا کر پکارا: ''اوئے انیمیو! جاگو!! دیکھو مور ناچ رہا ہے!''

لہنا نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا: ''مور کو اپنی ماں کے ساتھ سونے دو۔'' دو آدمی اس حیرت ناک منظر کو دیکھنے باہر آ گئے۔

آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور ایک مور ایک مکان کی چھت پر ناچ رہا تھا۔ یہ منظر سو روپوں سے زیادہ قیمتی تھا! گرو نے اس پرندے کو کیا حسن بخشا ہے! مور نے اپنا سر یوں اٹھایا ہوا تھا جیسے کوئی نوجوان شہزادہ اپنی مردانگی پر نازاں ہو۔ وہ دو قدم آگے بڑھتا اور دو قدم پیچھے ہٹ جاتا۔ اس کے پر یوں پھڑ پھڑا رہے تھے جیسے کوئی بے صبرا عاشق بے خود ہوا جا رہا ہو۔

ٹھاہ!

مور دیوار سے گھسٹتا ہوا نیچے آ گرا۔

ٹھاہ' ٹھاہ!

دونوں مورنیاں بھی نیچے گر گئیں۔

''ہوئے! ہم نے تینوں کو مار گرایا!'' گورے چلائے۔

میں گیلی زمین پر بیٹھ کر رونے لگا۔ ہم ان موروں کو ہلاک کرنے والوں' مادر...... کے لیے لڑ رہے ہیں! ان گورے ''بندر لوگوں'' کو بارش کا کیا پتا؟ ان کی عورتوں کی زلفیں سیاہ نہیں ہوتیں کہ جو انہیں ساون کے موسم میں آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی یاد دلائیں۔ نہ ہی ان کی چھاتیاں بڑی بڑی اور گول ہوتی ہیں کہ جو انہیں سفید بادلوں کی یاد دلائیں۔ ان کی لڑکیاں آم کے درختوں میں جھولے ڈالنا اور ساون کے گیت گانا نہیں جانتیں۔ کیا تم نے کبھی گورا لوگ کو گاتے دیکھا ہے؟ میں نے انبالہ کے گرجے میں انہیں گاتے سنا ہے۔ میمیں چیخ رہی تھیں: ہی' ہی ہو' ہو۔ مرد گدھوں کی طرح رینک رہے تھے۔ وہ ساون کے راگوں اور مور کے ناچ کی تعریف کیسے کر سکتے تھے؟ ساری دنیا ہری ہری اور حسین تھی جبکہ یہ گورے صرف قتل و غارت کا سوچ رہے

تھے۔ جب میں ہڈسن صاحب کو صبح کی چائے کا مگ دینے گیا تو اس نے کہا: "اب حملے کا وقت آ گیا ہے۔ جوانوں سے کہو جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔"

☆☆☆

بھاری توپیں ہاتھیوں پر لادی گئیں جبکہ ہلکی توپوں کو بیلوں اور اونٹوں پر لادا گیا۔ زمین پھسلواں تھی۔ چنانچہ ہم ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ صرف ہڈسن صاحب گھوڑے پر سوار تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پہاڑی سلسلے میں تو کیچڑ نہیں تھا لیکن سبزی منڈی کے نزدیک ہم گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں دھنس گئے۔ ایک ہاتھی پھسلا اور زوردار دھماکے کے ساتھ پہلو کے بل گر گیا۔ ہاتھی کو تو کچھ نہ ہوا تاہم توپ گر گئی اور اس کی نال زمین میں گڑ گئی۔ ہاتھی خود بخود اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنی ایک اگلی ٹانگ اٹھا کر مہاوت کو سہارا دیا۔ بیس آدمیوں نے مل کر توپ کو سیدھا کیا۔ ہاتھی پھسلے تو بڑا تماشا ہوتا ہے' اونٹ پھسلے تو اس سے بھی بڑا تماشا ہوتا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی لمبی لمبی ٹانگیں آپس میں الجھ جاتی ہیں۔ اگر تم ہنسو تو اونٹ کو بہت غصہ آتا ہے۔

ہم بوندا باندی میں گرتے پڑتے' پھسلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہم ڈیڑھ میل کا فاصلہ دو گھنٹوں میں طے کر کے سبزی منڈی پہنچے۔ بہر حال دشمن کی توجہ ہم پر نہیں گئی۔ ہمارے دشمن بھنگ پی کر اور اپنی معشوقوں کے ساتھ وقت گزار کر ساون کی پہلی بارش کا مزہ لے رہے تھے۔

☆☆☆

بارش رک جاتی ہے۔ بادل پھٹ جاتا ہے اور کہیں کہیں سے نیلا آسمان دکھائی دینے لگتا ہے۔ فوراً ہی دلی شہر کا آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے بھر جاتا ہے۔ وہ ہوا میں لڑ رہے ہوتے ہیں۔ (پیچ لڑا رہے ہوتے ہیں)۔ جب کوئی پتنگ کٹتی ہے تو لڑکے چلاتے ہیں "وہ کاٹا!" ان کی بلند آوازیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان پر سیاہ' سفید اور بھورے کبوتر چکریاں کاٹ رہے ہیں اور لوگ رومال ہلا رہے ہیں اور

سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ سبزی منڈی کے ایک مکان سے کسی ناچنے والی کے گھنگھروؤں کی چھن چھن اور طبلے کی تھاپ سنائی دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے دلی کا ہر شہری خوشی منانے میں محو ہے۔

دور کشمیری دروازے کے نزدیک ہماری توپ گرجتی ہے۔ بھوم' بھوم' بھوم۔ پتنگیں تیزی سے اتاری جاتی ہیں۔ کبوتر واپس اپنی کابکوں میں چلے جاتے ہیں۔ گانے اور ناچنے کی آوازیں دم توڑ جاتی ہیں۔

بھوم' بھوم' بھوم۔ کشمیری دروازے اور موری دروازے کے قریب نصب باغیوں کی توپیں جواب دیتی ہیں۔ ہماری چال کامیاب رہی ہے۔ جب کشمیری دروازے اور موری دروازے کے اردگرد توپیں ایک دوسری پر گولے داغ رہی تھیں' ہم نے سبزی منڈی کے علاقے میں ایک بازار اور ایک باغ کو گھیر لیا تھا۔ اس باغ میں ایک بڑا مکان بھی تھا۔ بگل بجا کر حملے کا اعلان کیا گیا۔ ہماری توپ نے بازار پر گولے داغے۔ پھر ہم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ہم نے کھڑکیوں میں نمودار ہونے والے ہر چہرے کو گولی ماردی' جو کوئی سامنے آیا اسے سنگین گھونپ دی۔ خواہ وہ مرد تھا یا عورت تھی یا بچہ۔ صرف باغ والے بڑے مکان سے جواباً گولیاں چلائی گئیں۔ ہم نے درختوں کی آڑ لے لی۔ ہمارا جو ساتھی بھی مکان کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا' گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ ہم توپ وہاں لے آئے۔ پہلے گولے نے دیوار میں سوراخ کر دیا۔ دوسرے گولے نے دوسرا سوراخ کر دیا۔ چھت کا ایک حصہ ٹوٹ گرا۔ ہم نے مکان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر سنگین سیدھی کر کے آگے بڑھے۔ ہمارا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی ہم محتاط تھے۔ ہم نے مکان کو گھیرا ڈال لیا اور ایک قطار میں پنجوں کے بل چلتے اندر داخل ہوئے۔ میں ایک ٹولی کے ساتھ بڑے کمرے سے گزرتا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ ہم نے وہاں کیا دیکھا؟ میں تمہیں ہزار بار پوچھنے کا موقع دوں تو تم نہیں بتا سکو گے۔ وہ ایک عورت تھی! وہ ستاروں جیسی چمکتی آنکھوں کے ساتھ

اوپر سیڑھیوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی ناک میں ہیرے کی لونگ جگمگا رہی تھی۔ اور تم اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ کیا کر رہی ہو گی؟ وہ مجھ پر تلوار لہرا رہی تھی!

میں نے اپنے پیچھے پیچھے آنے والے نتھا سنگھ کو مخاطب کر کے کہا: ''اوئے نتھیا! دیکھو تو مجھے کیا شے ملی ہے؟''

نتھا سنگھ میرے ساتھ آ کر اس عورت کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے: ''بلّے 'بلّے!''

وہ پکار کر دوسروں کو بلاتا ہے۔ پورا زینہ بندوق بردار سکھ فوجیوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ عورت ایک پرانی تلوار ہم پر تانے ہوئے تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اس شہر کی دوسری عورتوں کی طرح فربہ تھی اور اس کا رنگ زرد تھا۔ اس کے سفید بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ اس کے دانتوں پر پان کے داغ جمے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی چھاتیاں ململ کی باریک قمیض سے جھلک رہی تھیں۔

نتھا اس کی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''بی بی! کیا تم اس سے اپنے دانت کریدتی ہو؟''

پھر اس نے بڑی دلیری سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔ اس نے پوچھا: ''بی بی! تم ہمیں اس سے کیوں مارنا چاہتی ہو؟ ہمیں آنکھوں سے مارنا زیادہ آسان ہے!''

میں نتھا سے کہتا ہوں: ''اس سے چھیڑ چھاڑ مت کرو۔ یہ تمہاری ماں کی عمر کی ہے۔''

نتھا کہتا ہے: ''میں مشہور مادر...... ہوں۔'' ہم زور زور سے قہقہے لگانے لگتے ہیں۔

ہڈسن صاحب اندر آتا ہے تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ نتھا اس عورت کو گھسیٹ کر سیڑھیوں سے اتارتا ہے اور ہڈسن صاحب کے گھوڑے کے سامنے ڈال دیتا ہے۔

عورت کھڑی ہو کر کہتی ہے: "کیا تم مجھے گولی مارنا چاہتے ہو۔" اس کی آواز میں لرزش بالکل نہیں ہوتی۔

ہڈسن صاحب بھونچکا سا رہ جاتا ہے۔ وہ حیرت سے کہتا ہے: "عورت!"

وہ اس کے پیشے کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھتا ہے: "کیا تم طوائف ہو؟ تم اس مکان میں کیا کر رہی ہو؟"

وہ کہتی ہے: "میں بدذات نصاریٰ کے خلاف جنگ میں اپنے بھائیوں کا ساتھ دے رہی ہوں۔"

ہڈسن صاحب کو اتنی ہندوستانی آتی ہے کہ وہ "بدذات نصاریٰ" کا مفہوم سمجھتا ہے۔ میں صاحب کو خوش کرنے کے لیے سنگین اس عورت کی کمر میں چبھو کر کہتا ہوں: "اگر تم نے زبان کو لگام نہ دی تو میں سنگین سے تمہارا پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

اس کو جھرجھری تک نہیں آتی۔

ہڈسن صاحب حکم دیتا ہے: "نہال سنگھ! اسے تفتیش کے لیے کیمپ لے چلو بعد میں اسے جہنم رسید کر دینا۔"

ہم عورت کو آگے آگے لیے روانہ ہو گئے۔ اگر وہ آہستہ چلتی تو میں اس کے کولھوں پر ضرب لگاتا۔ ایک مرتبہ تو میں نے اس کے درمیان انگلی گھسا دی۔ ہم سارے راستے خوب مزے لیتے رہے۔

نتھا کہتا ہے: "بھائی! آج رات ہم اپنے ہتھیار تیز کریں گے۔"

لہنا کہتا ہے: "اچھی عورت! تم ہماری کاربینوں کو ٹھنڈا کرو ہم تمہارے جسم میں گولی ٹھنڈی کریں گے۔"

عورت چپ رہتی ہے۔ وہ ہماری طرف دیکھتی تک نہیں۔

میں اسے صاحب کے خیمے میں لے جاتا ہوں۔ اس نے اپنا ہیلمٹ اور تلوار اس وقت اتارے ہوتے ہیں۔ کوئی لفظ بولے بغیر ہڈسن صاحب اس کے منہ پر تھپڑ مارتا

ہے۔ وہ قد آور تو نہیں البتہ طاقتور بہت ہوتا ہے۔ عورت تھپڑ کھا کر زمین پر گر جاتی ہے۔ وہ رونا شروع ہو جاتی ہے۔ وہ روتے ہوئے کہتی ہے: ''اگر تم نے مجھے قتل کرنا ہے تو قتل کر دو۔ مجھ پر تشدد کیوں کرتے ہو؟''

ہڈسن صاحب کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ ڈیسک میں سے نوٹ بک اور پنسل نکال کر اس سے پوچھتا ہے: ''نام؟''

''انور بائی۔''

''تم کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''چاوڑی بازار کی۔''

''تمہاری فوج کا سالار کون ہے؟''

''جنرل بخت خان۔''

صاحب غصے سے پوچھتا ہے: ''کس نمک حرام نے اس صوبیدار کو جنرل بنایا ہے؟ سبزی منڈی میں کتنے فوجی ہیں؟''

''مجھے پتا نہیں۔ مجھے آج ہی وہاں پہرا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ورنہ میں عورتوں کی بیرک میں ہی رہتی ہوں۔''

''عورتوں کی بیرک؟''

''جی حضور! عورتیں بھی جنگ میں شریک ہیں۔ کچھ میری طرح فوجی بن گئی ہیں' کچھ ہسپتال میں کام کرتی ہیں اور کچھ فوجیوں کے لیے کھانا تیار کرتی ہیں۔''

''تم اس مکان میں کیا کر رہی تھیں؟''

''میں نے صاحب کو بتایا تو ہے کہ میں وہاں پہرا دے رہی تھی۔ میں نے دو ماہ پہلے پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یقین ہے اللہ میرے گناہوں کو معاف کر دے گا۔''

ہڈسن صاحب بہت غصے ہو جاتا ہے: ''تم عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرنے کو مقدس جنگ کہہ رہی ہو؟''

عورت کوئی جواب نہیں دیتی۔

صاحب دوبارہ غصے سے چنگھاڑتا ہے۔ وہ عورت بڑی نڈر ہوتی ہے۔ وہ بے خوفی سے کہتی ہے: ''صاحب! میں نے تمہارے لوگوں کو عورتوں کے پیٹ میں تلواریں گھونپتے دیکھا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ بچوں کو ہوا میں اچھال کر نیزوں اور سنگینوں میں پرو دیا گیا۔''

ہڈسن صاحب کا چہرا سرخ ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے اتنا غصہ آیا ہوتا ہے کہ وہ بول بھی نہیں سکتا۔ عورت اپنے انجام سے بے نیاز بولے چلی جاتی ہے: ''اور صاحب اب آپ خود ایک عورت کا خون اپنے ہاتھوں بہانے والے ہو۔''

وہ ایک چالاک طوائف ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ صاحب کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ صاحب کچھ دیر چپ رہتا ہے۔ وہ دوبارہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے کہتا ہے: ''جب کوئی عورت ہتھیار اٹھالے تو اس کو یہ توقع کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ دوسرے فوجیوں سے مختلف برتاؤ کیا جائے گا۔ اسے لے جاؤ۔ میں اس کے بارے میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔''

میں عورت کو بازو سے پکڑ کر باہر لے جاتا ہوں۔

سورج غروب ہونے والا ہوتا ہے۔ جلد تاریکی چھا جانے کو ہوتی ہے۔ میں اس کے ساتھ پہل کروں گا کیونکہ میں صاحب کا اردلی ہوں۔ پھر میں کچھ دیر سوؤں گا اور دوسرے اپنی باریاں لیں گے۔ پھر میں دوسری باری لوں گا' پھر تیسری۔ صبح کے وقت میں اسے گولی مار دوں گا۔ ہماری کہاوت ہے: ''پہلے پیاس بجھاؤ پھر کنویں میں تھوک دو۔''

میں عورت کو اپنے خیمے میں لے جاتا ہوں۔ میرے ساتھی روٹی کھا رہے ہوتے ہیں۔ وہ پھر سے فحش باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ میں انہیں کہتا ہوں: ''اوئے

اوئے کچھ تو خیال کرو' یہ بڑھی عورت ہے......"

"میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ اس کا تندور اب بھی گرم ہے۔ ہم اپنی روٹیاں لگا سکتے ہیں۔"

"اوئے' یہ طوائف ہے۔ ضرور اس نے فوجی لنگر کھولا ہوا ہوگا۔ اس کی راتوں سے بہت سی رجمنٹیں گزری ہوں گی۔"

ایک جوان کہتا ہے: "نہالیا! پہلے تم اپنا ہتھیار تیز کرو' پھر ہم اپنے فالتوں مادے سے چھٹکارہ پائیں گے۔"

عورت ایسا تاثر دیتی ہے' جیسے وہ کچھ نہ سن رہی ہو۔ وہ میری طرف رخ کر کے کہتی ہے: "سردار جی! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں مغرب کی نماز ادا کر لوں۔ پھر آپ جو چاہے کر لینا۔"

وہ یہ بات اتنے پرسکون انداز میں کرتی ہے جیسے مجھ سے اپنے لیے کچھ پکانے کی اجازت لے رہی ہو۔

میں اسے اجازت دیتے ہوئے کہتا ہوں: "ٹھیک ہے۔۔ لیکن جلدی کرو۔ فٹافٹ۔"

میں باقی جوانوں کے ساتھ دم لینے بیٹھ جاتا ہوں۔

طوائف اپنا دوپٹہ کیچڑ آلود زمین پر بچھا کر اس میں بیٹھ جاتی ہے اور رخ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف کر لیتی ہے۔ اس کی ہیرے کی لونگ چمکنے لگتی ہے۔

نہالا پوچھتا ہے: "اس کی لونگ کون لے گا؟"

کوئی جواب نہیں دیتا۔ لہنا کہتا ہے: "اس کے کانوں اور کلائیوں میں سونے کے زیور بھی ہیں۔ نہال سنگھ انہیں بیچ دے گا اور ہم رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔"

طوائف کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور ہونٹ ہل رہے ہوتے ہیں۔ وہ جھک جاتی ہے۔ اس کی باریک قمیض سے اس کی چھاتیاں نظر آنے لگتی

ہیں۔ وہ اسی طرح چند مرتبہ جھکتی اور زمین پر پیشانی ٹکاتی ہے۔ پھر وہ دوزانو بیٹھ کر اپنی ہتھلیاں ملا کر چہرے کے سامنے یوں پھیلا لیتی ہے جیسے کتاب پڑھ رہی ہو۔ اس کا چہرا چمک رہا ہوتا ہے۔ ہم اس کے حوالے سے مذاق کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوتی ہیں۔ آنسو اس کے رخساروں پر سے بہتے ہوئے اس کی ململ کی قمیض پر گر جاتے ہیں۔ ہم باتیں کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے ہونٹ ہلنا بند ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے آنسوں بھرے چہرے پر پھیرتی ہے۔ پہلے وہ دائیں طرف منہ پھرتی ہے پھر بائیں طرف۔ میں جانتا ہوں کہ اس طرح مسلمان دونوں اطراف کے لوگوں پر سلامتی بھیجتے ہیں۔ وہ قمیض کی جیب سے تسبیح نکال کر کچھ پڑتی ہے پھر تسبیح گلے میں ڈال کر کھڑی ہو جاتی ہے: ''سردار صاحب! میں تیار ہوں۔''

کوئی نہیں بولتا۔ کوئی اس کی طرف دیکھتا تک نہیں۔ میں تھوڑی دیر بعد کہتا ہوں: ''چلو اندر۔''

وہ خیمے کے اندر چلی جاتی ہے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اندر جا کر پردہ گرا دیتا ہوں۔

''بیٹھ جاؤ۔''

میں تین روٹیاں اور دال اس کے ہاتھ میں ٹھونس کر کہتا ہوں: ''کھاؤ۔''

وہ عام سے لہجے میں کہتی ہے: ''سردار جی! اگر آپ نے مجھے گولی ہی مارنی ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''کھاؤ! ہم باتیں بعد میں کریں گے۔''

وہ چند لقمے کھاتی ہے۔ میں اسے اپنی پانی کی بوتل دیتا ہوں۔ وہ ڈھیر سارا پانی پی جاتی ہے۔ اندھیرا پوری طرح چھا چکا ہوتا ہے۔ میں اپنی کاربین اٹھاتا ہوں اور اسے خیمے سے نکلنے اور اس کے دوسرے سرے کی طرف جانے کا حکم دیتا ہوں۔ میری کاربین کی نال تقریباً اس کی ریڑھ کی ہڈی کو چھو رہی ہوتی ہے۔

سنتری مجھے روک کر شناخت پوچھتے ہیں۔ میں پاس ورڈ بولتا ہوں اور انہیں بتاتا ہوں: ”یہ قیدی ہے۔ اسے گولی مارنی ہے۔“

ہم گند کے ڈھیر کے پاس سے گزرتے ہیں۔ وہاں خوفناک تعفن ہوتا ہے۔ عورت دوپٹے سے ناک چھپا لیتی ہے۔ ہم سبزی منڈی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ یہیں سے ہم نے اسے گرفتار کیا ہوتا ہے۔

”کیا تمہیں آگے کا راستہ پتا ہے؟“

وہ مڑ کر مجھے دیکھنے لگتی ہے: ”اللہ تمہیں سلامت رکھے...... اللہ تمہیں اور تمہارے بچوں کو لمبی عمر دے...... اللہ......“

میں کاربین زمین پر رکھ کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگاتا ہوں: ”ہماری بدسلوکی پر ہمیں معاف کر دو...... ہماری بدزبانی پر ہمیں معاف کر دو...... تم ہماری ماں جیسی ہو۔“

”اللہ سب گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ اگر اللہ میرے گناہوں کو معاف کر سکتا ہے تو وہ یقیناً تمہارے گناہوں کو بھی معاف کر دے گا۔“

وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے۔ میں کیچڑ میں اس کی چپلوں کی فپ، فپ کی آواز سنتا ہوں پھر خاموشی ہو جاتی ہے۔ مجھے باغیوں کے سنتری کی آواز سنائی دیتی ہے، جو اس کی شناخت پوچھتا ہے۔

میں کاربین کا رخ آسمان کی طرف کر کے ایک گولی چلاتا ہوں۔

❀❀❀

بہادر شاہ ظفر

بخت خان کیم شحیم اور ساون کے بادل کی طرح کالے رنگ والا تھا۔ اس کی آنکھیں آسمانی بجلی کی طرح چمکتی تھیں' اس کی آواز بادلوں کی کڑک جیسی تھی۔ وہ اس زمانے میں دلی آیا تھا' جب ہم بارش کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ بخت خان درباری آداب سے ناآشنا تھا۔ تاہم جب اس نے ہمارے حضور حاضر ہو کر ہمارے ہاتھ میں دو روپے ٹھونسے تو ہم نے جان لیا کہ اللہ نے ہماری دعائیں قبول کر لی ہیں۔ ہم نے اسے خلعت عطا کی اور جنرل بخت خان کا خطاب دیا۔

اس نے بہار کے کرخت لہجے میں کہا: ''بادشاہ سلامت! میں کوئی جرنیل ورنیل نہیں ہوں۔ میں تو فقط صوبیدار ہوں۔ تاہم دس ہزار جوان میرے ساتھ ہیں۔ ہمیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے کہ حضور والا کے قدموں میں اپنی جان نچھاور کر دیں۔''

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہماری فوج اور ہندو مسلم رعایا نے بخت خان کی بڑی پذیرائی کی تھی۔ ہم نے اسے کہا: ''بخت خان! ہم تمہیں جنرل بناتے ہیں اور اپنی افواج کا سالار اعلیٰ مقرر کرتے ہیں۔ اللہ تمہیں فتح عطا کرے۔''

اس نے سادگی سے کہا: ''ارے بھائی بادشاہ! تمہارا نام 'ظفر' ہے اور ظفر کا مطلب فتح ہوتا ہے۔ ہے نا؟ تم ظفر ہو گے۔ کوئی بھی مجھ سے شرط لگا سکتا ہے۔'' یہ جملہ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا تھا۔

بخت خان کے آتے ہی ساون آ گیا۔ ہمارے باغ سے خزاں چلی گئی اور مختصر عرصے کے لیے بہار آ گئی۔ ہم نے جنگ کے معاملات بخت خان پر چھوڑ دیے۔ ہم ''ساون بھادوں'' نامی عمارت میں وقت گزارنے لگے۔ ہم نے یہ عمارت موتی مسجد کے پیچھے واقع حیات بخش باغ میں تعمیر کروائی تھی۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان بہت بڑا تالاب تھا اور اس تالاب کے درمیان بھی ایک عمارت تھی' جو یوں لگتا تھا کہ پانی میں تیر رہی ہو۔ ہم اپنے مہمانوں کو ایک چھوٹی کشتی میں بٹھا کر اس عمارت میں لے جایا کرتے تھے۔ ہماری رعایا نے ہمارے نام پر اس کا نام ظفر محل رکھ دیا تھا۔ ہم یہاں مشاعرے منعقد کرواتے تھے اور اپنے دوستوں کی ناچ گانے سے تواضع کیا کرتے تھے۔ اس سال ہم نے زینت محل کی چھوٹی بہن تاج محل بیگم کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کروایا تھا۔ زینت محل نے اسے ہمارے حرم میں شامل ہونے پر آمادہ کیا تھا۔

کچھ دنوں سے توپوں کی گرج کی جگہ سیاہ بادلوں کی گرج سنائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بوندوں کی ٹپ ٹپ اور طبلے کی تھاپ پر گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دے رہی تھیں۔ صبح کا وقت ہم کبوتر بازی میں صرف کرتے تھے۔

پھول والوں کا میلہ شروع ہو گیا۔ ہم اپنی چہیتی ملکہ زینت محل اور مرزا جواں بخت کے ساتھ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے مہرولی گئے۔

ہم اپنے پسندیدہ ہاتھی مولا بخش پر سوار ہو کر لاہوری دروازے اور چاندنی چوک سے گزرے۔ ہم اپنے روحانی مرشد کالے خان صاحب کو نذرانہ' عقیدت پیش کرنے کے لیے بلّی ماراں کے محلے میں اترے۔ اس کے بعد آگے روانہ ہو گئے۔ ہم نے مسجد بیگم فتح پوری سے بائیں طرف مڑ کر لال کنواں کا رخ کیا' جہاں زینت محل کے

والد اسد قلی خاں نے ہمیں نذر اور آموں کی ایک ٹوکری پیش کی۔ ہم محلہ قاضی کا حوض میں طوائفوں کے علاقے سے گزرے۔ طوائفوں نے اپنے بالاخانوں سے ہم پر پھول نچھاور کیے۔

ہم اجمیری دروازے سے شہر سے باہر نکل آئے۔ ہم پہاڑ گنج اور رائے سینا نامی بستیوں کے قریب سے گزرے۔ ''جنتر منتر'' کے نام سے مشہور راجا مان سنگھ کی رصدگاہ میں تال کٹورہ باغ کے باغبانوں نے ہمیں آموں کی ایک اور ٹوکری پیش کی۔ (ہم یہ باغ زینت محل کو تحفتاً عطا کر چکے تھے)۔ ہم نے صفدر جنگ کے مقبرے پر کچھ دیر ٹھہر کر مسجد اور مدرسے کا جائزہ لیا۔ ہمارا اگلا قیام یوسف سرائے میں ہوا۔ یہاں ہم نے آم چکھے اور قیلولہ کیا۔ جب سہ پہر کے وقت ہماری آنکھ کھلی تو جنوبی افق پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہمارے مہاوت نے مولا بخش کو تیز رفتاری سے چلایا۔

جب ہم مہرولی پہنچے تو بارش ہو گئی۔ وہاں کئی گھنٹوں سے ہمارا انتظار کرنے والے لوگوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہمیں ایک جلوس کے ساتھ لے جایا گیا' جس کے آگے آگے ناچنے اور گانے والوں کی ٹولیاں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ہم مہرولی کی تنگ گلیوں سے آہستہ روی سے گزرے۔ لوگوں نے ہم پر پھول برسائے' آسمان نے بارش برسائی۔ جب ہم اپنی رہائش گاہ جہاز محل پہنچے تو آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا۔ ہوائیوں کی روشنی سے شمسی تالاب کا پانی نیلا' لال اور سنہرا ہو گیا تھا۔ شعلے تالاب میں گر کر عجب نظارہ پیش کر رہے تھے۔ واللہ! دنیا کتنی حسین تھی! ہم چھت پر برستی بارش کی ٹپ ٹپ اور بہتے پانی کی صدا سنتے ہوئے سوئے۔

☆☆☆

اگلی صبح آسمان صاف تھا۔ ہم نے مسجد اولیاء میں فجر کی نماز ادا کی۔ اس چھوٹی سی مسجد کے حجروں میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، فرید الدین گنج شکرؒ اور لاتعداد دیگر اولیاء چلے کاٹ چکے تھے' جس کی وجہ سے اس مسجد کے گرد نور کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ فجر کی

نماز ادا کرنے کے بعد ہم حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر گئے۔ ہم نے مزار کے احاطے میں دفن اپنے بہت سے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی۔

ملکہ زینت محل کو' جو کہ ہمارے ساتھ تھیں' مزار کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ انہوں نے یاسمین اور گلاب کے پھولوں کی چادر مزار پر چڑھائی۔ پھر غوطہ خوروں نے 80 میل گہرے کنویں میں غوطے لگانے کا مظاہرہ ہمیں دکھایا۔ ہم نے انہیں انعام سے نوازا۔ ہم ہاتھی پر سوار ہو کر سارا دن مہرولی کے اردگرد موجود یادگاروں کی سیر کرتے رہے۔ سب سے پہلے ہم قطب مینار اور مسجد قوت الاسلام گئے۔ ہم نے علاءُ الدین خلجی اور التمش کے مقبروں پر فاتحہ خوانی کی۔ پھر ہم میٹکاف صاحب کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے شاعر کمالی کی مسجد پہنچے۔ شہنشاہ بلبن کے مقبرے کی حالت بہت خراب تھی۔ ہم نے اس کی مرمت کے احکامات جاری کیے۔

شام کا وقت ہم نے جہاز محل میں گزارا۔ شمس تالاب کے پرلے کنارے پر چھتری نما پویلین بنے ہوئے تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ شہنائی نواز وہاں بیٹھ کر شہنائی بجائیں۔ شہنائی کے سر تالاب کی سطح پر تیرتے' گرداب پیدا کرتے ہماری طرف آنے لگے۔ مدھر الاپ کے ساتھ ساتھ آسمان پر بادل جمع ہونے لگے۔ جب گت شروع ہوئی تو ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ بادل تیزی سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ طبلے کی تھاپ سے ہم آہنگ ہو کر حرکت میں ہیں۔ کیا بات تھی' سبحان اللہ! ہم نے بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اور ہوا کی سنسناہٹ سنی۔ ہم نے دیکھا آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ چراغ روشن کر دیئے گئے۔ جب شہنائی تیز سروں میں اختتامیے پر پہنچی تو بارش شروع ہو گئی۔ سچ کہا جاتا ہے کہ سچے موسیقار بارش برسا سکتے ہیں۔ نیز بجھے چراغوں کو روشن کر سکتے ہیں۔ ہم نے پہلے راگ میگھ ملہار اور پھر دیپک سنا۔

جب ہم دلی پہنچے تو حالات سعدی کے الفاظ میں حبشیوں کے بالوں کی طرح الجھے ہوئے تھے۔ دشمن نے دلی کا محاصرہ کر کے رسد بند کر دی تھی۔ ہماری فوج کے

پاس گولہ بارود اور کھانے پینے کی اجناس کی قلت ہو گئی تھی۔ مرزا مغل اور بخت خان ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔ شہریوں اور فوجیوں میں بھی کئی بار جھگڑے ہو چکے تھے۔ شہری فوجیوں کو بزدلی کے طعنے دیتے اور فوجی تاجروں کو طعنے دیتے کہ وہ دشمن سے تجارت کر رہے ہیں۔ ہمارے بیشتر فوجی مسلمان تھے جبکہ بیشتر تاجر ہندو تھے۔ ادھر بقر عید نزدیک تھی۔ مرزا مغل اور کچھ مسلمان امراء کا موقف تھا کہ ہندوؤں کی املاک غصب کر لی جانی چاہئیں کیونکہ انہوں نے فرنگیوں کی مدد کی تھی۔

بخت خان اس موقف کا مخالف تھا۔ ہم بھی اس کے حامی تھے۔ ہم نے گائے کی قربانی پر پابندی لگا دی اور اونٹ قربان کر کے خود مثال پیش کی۔ بقر عید خیریت سے گزری۔

دو دن بعد بارود خانے پر شیطان کا ہاتھ پھر گیا۔ بڑی مقدار میں بارود غائب ہو گیا۔ بہت سے لوگوں کے گھر تباہ ہو گئے اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ فرنگیوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے ایسے جعلی خط پھیلا دیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس دھماکے میں ہمارے با اعتماد مشیر حکیم احسن اللہ اور ہماری محبوب ملکہ زینت محل کا ہاتھ تھا۔ لوگوں نے حکیم احسن اللہ کے گھر کو آگ لگا دی۔ ہم نے اس کی اور اس کے اہل خانہ کی حفاظت کے لیے اپنے ذاتی محافظ بھیجے۔ باغیوں نے اتنی جسارت کی کہ وہ دیوان خاص تک گھس آئے۔ انہوں نے ہم پر دھوکا دہی کا الزام لگایا۔ ہم نے صبر و تحمل سے کام لیا اور پورے عزم کے ساتھ حلفاً کہا کہ اگر کسی نے حکیم احسن اللہ کی املاک پر قبضہ کیا تو ہم اس کا پیٹ پھاڑ دیں گے۔

"میرے دشمنوں نے مجھے گھیر لیا ہے
اے علیؑ! اے بہادروں کے بہادر! خدا کے لیے میری مدد کو غیبی فوج بھیج۔"

☆☆☆

دلی کی فضاؤں میں شک و شبے کا زہر گھل گیا تھا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ

قسمت ہمارے خلاف ہو گئی ہے اور ہم اس سے نہیں لڑ سکتے۔ دلی کی قسمت پر مہر لگ چکی تھی۔ ہم نے دشمن فوج کے کمانڈر ولسن صاحب کے پاس ایک خفیہ قاصد بھیجا اور کہا کہ اگر ہماری زینت محل اور بچوں کی جان بخش دی جائے اور ہماری پنشن بحال کر دی جائے تو ہم شہر کے دروازے اس کی فوج پر کھول دیں گے۔ اس نے ہمیں جواب تک نہ دیا۔

ہم آخری لمحے تک انتظار کرتے رہے۔ سات دن بعد 14 ستمبر کو فرنگیوں اور ان کے اتحادی پٹھانوں' پنجابیوں' سکھوں' ڈوگروں اور گورکھوں نے دلی پر حملہ کر دیا۔ شمالی فصیل پر کابلی دروازے سے لے کر دریا تک شدید گولہ باری کی گئی۔ توپوں کے گولے لال قلعے میں بھی گرے۔ کچھ سلاطین کے گھر تباہ ہو گئے۔

جنرل بخت خان بڑی دلیری سے لڑا۔ صبح کے وقت وہ سبزی منڈی میں تھا' دوپہر کو موری دروازے پر اور شام کے وقت کشمیری دروازے پر۔ اس نے ہر جگہ بے جگری سے دادِ شجاعت دی۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہ ہم سے ملنے ہمارے محل آیا۔ اس نے بتایا کہ دشمن شہر میں داخل ہو چکا ہے۔ شہری گلی گلی ان گوروں سے دوبدو لڑائی کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ عورتیں اور بچے بھی حملہ آوروں پر پتھراؤ کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہم ضعیف تھے لیکن اپنے فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اپنے عربی گھوڑے "ہمدم" پر سوار ہو کر ان سے جا ملے۔ تاہم اللہ ہمیں سبق سکھانا چاہتا تھا۔

21 ستمبر کو بخت خان نے ہمیں کہا کہ دلی ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ اودھ چلیں اور ہم وہاں سے جنگ کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ہم نے اس سے معذرت کر لی۔ ہماری عمر بیاسی سال ہو چکی تھی جس کی وجہ سے ہم اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔

لوگ شہر سے بھاگنے لگے۔ ہم نے بھی شہر سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو ہم نے مہرولی جانے کا سوچا' جہاں ہم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خاک پاک کی قربت میں رہ سکتے تھے۔ تاہم ہمارے مرحوم ولی عہد مرزا فخرو کے سسر مرزا الٰہی بخش

نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لیں۔ اس نے کہا کہ مہرولی محفوظ مقام نہیں ہے جبکہ شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ قلعہ نما ہے۔ وہاں رہتے ہوئے ہم ''صاحب'' کے ساتھ مذاکرات کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس کا مشورہ مان لیا۔

تقدیر کوچ کا نقارہ بجا چکی تھی۔ ہمارا دل بھاری بھاری سا تھا۔ ہم نے ''مولا بخش'' اور ''ہمدم'' کو الوداع کہا۔ وہ ہماری نوجوانی سے ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے اپنے سارے کبوتروں کو کابکوں سے آزاد کر دیا اور انہیں کہا کہ وہ ہماری بربادی کی خبر ہر طرف پھیلا دیں۔ ہم پالکی پر سوار ہو کر آگرہ روڈ سے گزرے۔ ہمارا حرم' سلاطین اور خدام بھی ساتھ تھے۔ راستے میں ہم نے بے شمار لوگوں کو بیل گاڑیوں' اونٹوں' خچروں پر اور پیدل دلی سے نکلتے دیکھا۔ ہم عرب سرائے پہنچے تو مقبرے کے گرد واقع باغات کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ہمارے تمام بیٹے' پوتے' پوتیاں' بھانجے' بھانجیاں اور بھتیجے' بھتیجیاں اپنے اہل خانہ سمیت وہاں موجود تھے۔ وہ رات' ہم نے شہنشاہ ہمایوں کی قبر کی پائنتی میں گزاری۔

اگلی صبح سویرے' کہ جب لوگ سردی کی وجہ سے چادریں کفن کی طرح لپیٹے مردوں کی طرح سوئے ہوئے تھے' ہم نظام الدینؒ اولیاء کے مزار کی طرف روانہ ہو گئے۔ کسی نقیب نے بادشاہ غازی' ظلِ الٰہی' شہنشاہِ ہندوستان کی آمد کا اعلان نہیں کیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد ہم نظام الدین اولیاء کی قبر کی پائنتی بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگے۔ ہم نے اپنے والد اکبر شاہ ثانی' اپنے بھائی مرزا جہانگیر' بیگم جہاں آرا کی قبروں اور امیر خسروؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ ہمیں خیال آیا کہ جلد ہی ہم بھی ان کے درمیان سو رہے ہوں گے۔ ہم نے درویش کی دعا دہرائی: ''اے اللہ! ہم بروں پر رحم فرما کہ تُو اچھوں کو اچھا بنا کر پہلے ہی ان پر کرم فرما چکا ہے۔'' ہم تقدیر کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح سے آمادہ و تیار ہو کر مقبرے واپس پہنچے۔

❁❁❁

نہال سنگھ

اس کے بعد روزانہ بارش ہونے لگی۔ دریائے جمنا میں پانی کی سطح اونچی ہو گئی۔ سیلاب کشتیوں والے پل کو بہالے گیا۔ یہ حادثہ ہماری خوش قسمتی تھا کیونکہ باغی اسی پل کے ذریعے آمدورفت کرتے تھے۔ ان کی کمک اور رسد اسی پل سے گزرا کرتی تھی۔ بارشوں کے دوران زیادہ جھڑپیں نہیں ہوئیں — صرف قدسیہ باغ میں ایک جھڑپ ہوئی اور اس کے علاوہ توپیں ایک دوسری پر گرجتی رہیں۔

بارشیں اسی طرح ایک دم رک گئیں جس طرح شروع ہوئی تھیں۔ ہمارے کیمپ میں مزید گورے آ گئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ بڑی بڑی توپیں اور بہت سا گولہ بارود لے کر آئے تھے۔ دو صاحب نکلسن اور ٹیلر' جو مشہور تھا کہ بڑے زبردست جنگجو ہیں' دلی پر حملے کی قیادت کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ بنیاؤں نے' جو کہ ہمیں کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرنے آیا کرتے تھے' بتایا کہ شہر میں لال مرچوں کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے جبکہ کالی مرچوں کی قیمت میں کمی ہو رہی ہے۔ کانا رجب علی روز آنے اور ہڈسن صاحب کے کانوں میں گھسر پھسر کرنے لگا۔

میں نے ایک روز ہڈسن صاحب کے پاؤں دباتے ہوئے پوچھا: ''صاحب' یہ

کانا آپ کے کان میں کیا 'گھس پھس' کرتا رہتا ہے؟"

پہلے تو ہڈسن صاحب بہت غصے میں آ گئے۔ انہوں نے پوچھا: "کیا تم نے سن گن لی تھی؟"

میں نے کہا: "نہیں صاحب! اگر میں نے سن لیا ہوتا تو آپ سے پوچھتا ہی کیوں؟"

تب ہڈسن صاحب نے مجھے بتایا: "بوڑھا بادشاہ کہتا ہے کہ اگر ہم اس کی جان بخش دیں اور اسے پنشن دیں تو وہ دلی کے دروازے کھول دے گا۔"

میں نے پوچھا: "اور آپ کیا کہتے ہیں؟"

"میں کہتا ہوں' پہلے دروازے کھولو' بات چیت بعد میں ہو گی۔"

یہ بات سن کر میں نے سوچا کہ حملہ کسی بھی دن کیا جا سکتا ہے۔ تاہم کچھ نہ ہوا۔ تقریباً دو ہزار گورے ہسپتال میں تھے۔ ہر روز چند گورے قے اور خونی پیچش کرتے ہوتے مر جاتے تھے۔ کچھ گوروں کو رم کی کمی کی شکایت تھی۔ انہوں نے ہندو راؤ کے محل کی دیواروں پر تصویریں بنائیں' جن میں افسروں کو شراب پیتے اور زنا کرتے دکھایا گیا تھا۔ میں نے سوچا ایسے لوگ جنگ کیا خاک کر سکتے ہیں؟ ولسن صاحب بہادر نے "کل ......کل" لگا رکھی تھی۔ ادھر وہ بخت خان — جو صوبیدار یا جنرل جو بھی تھا — مسلسل ہمارے کیمپ پر حملے کر رہا تھا اور ہمارے آدمیوں اور گھوڑوں کو مار رہا تھا۔

☆☆☆

تم گوروں کو کچھ بھی کہو تاہم جب لڑائی کا وقت آتا ہے تو وہ اس طرح لڑتے ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم ان کی طرح نہیں لڑ سکتی۔ مثال کے طور پر نکلسن صاحب راون جتنا اونچا لمبا تھا اور اس کی ڈاڑھی ہمارے گروؤں جیسی تھی۔ (کچھ احمق تو کہتے تھے کہ گرو نے نکلسن کے روپ میں دوبارہ جنم لیا ہے۔ یہ احمق اپنے آپ کو "نکلسنی" کہلوانے لگے تھے)۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ اس سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ خود ہمارا

ہڈسن صاحب ڈاڑھی سر بالوں سے صاف ہونے اور لمبا تڑنگا نہ ہونے کے باوجود شیر کی طرح بہادر تھا۔ نکلسن اور ہڈسن صاحب بہت بے چین تھے۔ وہ کہتے: ''یہ نکلسن صاحب کس قسم کا ''جنگی لاٹ'' ہے کہ روز ''کل......کل'' کے علاوہ کچھ نہیں کہتا؟''

وہ دونوں ولسن صاحب سے ملے اور اسے کہا: ''اب ہمیں جنگ لازماً شروع کرنی ہوگی۔''

عین اسی وقت کانا رجب علی خبر لایا کہ بخت خان پنجاب سے آنے والی گورا پلٹنوں پر حملہ کرنے کے لیے ایک بڑی فوج نجف گڑھ اور رہتک لے جا رہا ہے۔

چنانچہ ولسن صاحب نے نکلسن سے کہا: ''اگر تم جنگ لڑنے کو بے قرار ہو تو نجف گڑھ چلے جاؤ۔'' اس نے ہڈسن صاحب سے کہا: ''اگر تمھیں لڑائی کا زیادہ شوق ہے تو رہتک چلے جاؤ۔''

اگلی شام ہم رہتک روانہ ہو گئے۔ ہماری فوج پانچ سو سواروں اور دس گورے افسروں پر مشتمل تھی۔ ہم رات بھر سفر کرتے رہے اور صبح سویرے رہتک سے ایک میل دور رک گئے۔ سورج طلوع ہوا تو ہم جنگ کے لیے تیار تھے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد شہر کے دروازے کھلے بندوقوں اور تلواروں سے مسلح بے شمار گھڑ سوار ہماری طرف بڑھنے لگے۔

ہڈسن صاحب نے ہمیں پسپا ہونے کا حکم دیا۔ ہم آدھا میل پیچھے چلے گئے۔ وہ لوگ سمجھے کہ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ وہ نعرے لگاتے ہمارا پیچھا کرنے لگے۔ جب وہ ہمارے قریب پہنچ گئے تو ہڈسن صاحب نے حکم دیا: ''مڑ کر ان پر حملہ کر دو۔''

ہم تیزی سے مڑے اور اپنی کاربینوں سے تابڑ توڑ گولیاں چلانے لگے۔ ان میں سے پچاس مارے گئے۔ تب ہم برچھیوں سے ان پر حملہ آور ہو گئے۔ وہ صفیں توڑ کر بھاگنے لگے۔ صرف چند لوگ اتنے جری تھے کہ ہمارے مقابلے پر جم گئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہمارا صاحب جنگ کو کتنا پسند کرتا تھا۔ اس نے تلوار سونت کر ایک

دشمن کو دو بدو مقابلے کی دعوت دی۔ مقابل نے تھوڑی دیر تلوار سے حملے کیے اور پھر مقابلے سے بھاگ گیا۔ صاحب نے اسے للکارا: "بس اتنی ہی ہمت تھی تم میں؟"

میرا صاحب شمشیر زنی میں اتنا ماہر تھا کہ ایک ہی وار میں مقابل کو دو ٹکڑے کر دیتا تھا۔ یوں اس نے یکے بعد دیگرے کئی دشمنوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا: "واہ! واہ! ہڈسن صاحب! واہ! واہ! آپ لاکھوں میں ایک ہیں!"

ہم نے دشمن کے تین سو کے لگ بھگ آدمیوں کو ہلاک کر دیا جبکہ ہمارے صرف دو جوان ہلاک ہوئے۔ شام ہونے تک ہم پہاڑیوں میں واپس پہنچ چکے تھے۔ نکلسن صاحب بھی واپس آ چکا تھا۔ اس نے نجف گڑھ میں بخت خان کو شکست دی تھی۔ اب ولسن صاحب کے پاس "کل" کہنے کا کوئی بہانہ نہیں رہا تھا۔ پنجاب سے گورا پلٹن ہماری ضرورت کی تمام توپیں لے کر پہنچ چکی تھی۔ توپیں نصب کر کے ان سے گولہ باری شروع کر دی گئی۔ چند گھنٹوں بعد ایسا دکھائی دینے لگا جیسے شہر کی فصیل کو چیچک ہو گیا ہو۔ ہمیں بڑا حملہ کرنے سے پہلے فصیل کو توڑنا پڑا۔ یہ کام ہمارے سکھوں نے کیا۔ گرو نے ان بے چاروں کو کتنی ہمت عطا کی تھی! وہ ایک رات بارود کو تھیلے میں لے کر فصیل کی طرف بڑھے۔ ابھی وہ فصیل سے کچھ فاصلے پر تھے کہ باغیوں کی نگاہ ان پر پڑ گئی۔ واپس بھاگنے کی مہلت نہیں تھی۔ ایک سکھ بارود کا تھیلا لے کر فصیل کی طرف بڑھا۔

ٹھاہ۔ گولی چلی اور وہ مر گیا۔ تب دو اور سکھ بارود کا تھیلا اٹھا کر آگے بڑھے۔ ٹھاہ ٹھاہ۔ گولیاں چلیں اور وہ بھی مر گئے تاہم وہ تھیلا کچھ آگے لے گئے تھے۔ یوں باری باری سکھ بارود کا تھیلا لے کر آگے بڑھتے اور مرتے رہے۔ چالیس سکھ مر گئے تب بارود کا تھیلا فصیل کے قریب پہنچ گیا۔ صبح ہو چلی تھی کہ گرو نے انہیں کامیابی عطا کی۔ بارود کو فصیل کی بنیاد میں رکھ کر آگ دکھا دی گئی۔ بھڑم! اتنا اونچا بھڑم تم نے پہلے کبھی نہیں سنا ہو گا! زمین لرزنے لگی۔ فصیل کا کافی بڑا حصہ ٹوٹ گرا۔ خلا اتنا بڑا تھا کہ ہل اٹھائے ہوئے پانچ جوڑی بیل گزر سکتے تھے۔

صاحبوں نے ہمیں نہیں بتایا کہ بڑا حملہ کب شروع ہو گا۔ وہ آپس میں "گِٹ مِٹ" کرتے رہتے۔ جب ہم کالوں میں سے کوئی ان کے نزدیک جاتا تو وہ اسے گالیاں نکالتے اور آپس میں باتیں کرنا بند کر دیتے۔ وہ غصے کے تیز ہو گئے تھے۔ وہ اسُو (ستمبر) کے مہینے کا پہلا ہفتہ تھا۔ ایک دن سویرے سویرے ہی ہماری توپوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ یہ سلسلہ سارا دن اور آدھی رات تک جاری رہا۔ آدھی رات کو ہمیں بتایا گیا کہ سورج طلوع ہونے سے پہلا بڑا حملہ شروع ہو گیا۔

ہماری فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے دریا سے سبزی منڈی تک پھیلا دیا گیا۔ سب نے بیک وقت حملہ کرنا تھا۔ ہمیں رم کا دگنا راشن ملا۔ ہم سے وعدہ کیا گیا کہ اگر ہم نے دلی پر قبضہ کر لیا تو چھ ماہ کی اضافی تنخواہ دی جائے گی۔ رات حبشی کی رنگت جیسی کالی تھی۔ مجھے اپنا ہاتھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی کو بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم جوتے اتار کر چوروں کی طرح اپنی اپنی پوزیشنوں پر پہنچے۔ ہم کشمیری دروازے کے سامنے متعین تھے۔ جونہی سپیدۂ سحر نمودار ہوا توپ گرجنے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ باغیوں نے ہماری نقل و حرکت کو بھانپ لیا تھا۔ لڑائی شروع ہو گئی اور کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی۔ پھر توپیں خاموش ہو گئیں۔ کتنا خوفناک سناٹا تھا وہ! میرے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں ڈھیر ساری رم ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ تب ایک زبردست دھماکا ہوا۔ پتھر ہوا میں اڑنے لگے۔ کشمیری دروازے سے مٹی اور دھوئیں کا ستون سا اٹھا۔ دروازے کو اڑا دیا گیا تھا۔ ہمارے صوبیدار مان سنگھ نے کرپان نکال کر نعرہ لگایا: "بولے سو نہال۔" ہم نے بھی کرپانیں نکال کر نعرہ لگایا: "ست سری اکال۔" پھر ہم دلی شہر پر چڑھ دوڑے۔

باغیوں کے نقارے بج رہے تھے — ڈگ' ڈگ' ڈگا' ڈگ۔ انہوں نے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور "علیؑ، علیؑ،" اور "ہر ہر مہادیو" کے نعرے لگاتے ہمارے مقابلے میں اتر آئے۔ کون کہتا ہے کہ ان میں لڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی؟ تاہم

ہمارے پاس زیادہ توپیں' زیادہ کاربینیں اور زیادہ آدمی تھے۔ پس ہم مردوں اور مرنے والوں کے جسموں کو روندتے چلے گئے۔ کانے رجب علی نے جھوٹ بولا تھا کہ باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ انہوں نے ڈٹ کر اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر ہم پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کی عورتیں اور بچے ہمیں غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ وہ ہمیں فرنگیوں کے بوٹ چاٹنے والے کہا اور ہم پر پتھراؤ کیا۔ (اگر وہ طوائف — کیا نام تھا جانے اس کا؟ — پکڑی جاتی تو میں نے مارا جانا تھا!)

جنگ سہ پہر تک جاری رہی۔ شام ہوتے ہوتے ہم نے کشمیری دروازے سے موری دروازے تک پھیلے بازاروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہم تھکے ہوئے اور پیاسے تھے۔ کشمیری دروازے میں شراب کی بہت سی دکانیں تھیں۔ ہم ان کے دروازے توڑ کر اندر گھس گئے اور ساری شراب پی گئے۔ گورے بھی دھت ہو چکے تھے۔ وہ ساری رات رم کی بوتل کی تعریف میں "ہو ہو" کرتے گاتے رہے۔ ہم نے گھروں کو لوٹ لیا۔ ہم نے مردوں کی جیبوں سے سکے نکال لیے اور عورتوں کے زیورات اتار لیے۔ ہم نے گھروں میں بند گایوں اور بھینسوں کو شہر سے باہر نکال کر اپنے مذہبی سکھوں کی حفاظت میں دے دیا۔

ولسن صاحب بہادر بہت غصے ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ باقی ماندہ ساری شراب نالیوں میں بہا دی جائے۔ اس نے حکم دیا کہ لوٹ مار کرنے والے ہر شخص کو گولی ماردی جائے۔ کون کسے گولی مارتا؟ صاحب نے کہا کہ اس نے مال غنیمت بانٹنے کے لیے آدمی متعین کر دیئے ہیں۔ ہم نے کہا: "اچھا۔"

اگلی صبح جنگ دوبارہ شروع ہوئی۔ ہمیں گلی گلی کوچے کوچے لڑائی کرنا پڑی۔ ہم نے دیکھا کہ پردہ دار عورتیں اور بچے باغیوں کی مدد کر رہے تھے۔ گورے کہتے تھے کہ باغیوں نے ان کی میم صاحبوں اور بچوں کو قتل کیا تھا' اس لیے وہ بھی سامنے آنے والی ہر عورت اور ہر بچے کو قتل کر دیں گے۔

بازاروں میں چار دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ تب کہیں جا کر لال قلعے کے دروازے ہم پر کھل سکے۔ ہم بینڈ کی دھن پر مارچ کرتے ہوئے لاہوری دروازے سے لال قلعے میں داخل ہوئے۔ لال قلعے میں ایک اندھی عورت اور ایک معذور بوڑھے کے سوا کوئی نہیں تھا۔ گورے اپنی سنگینوں کے ساتھ ان سے کھیلنے لگے۔ ایک نے سامنے سے اور دوسرے نے پیچھے سے سنگین گھونپ کر دیکھا کہ ان کی سنگینیں آپس میں ٹکراتی ہیں کہ نہیں۔ اس کے بعد وہ قہقہے لگانے لگے۔

قلعے کی فصیل پر برطانوی پرچم لہرایا گیا۔ ہم نے پرچم کو سلامی دی۔ گوروں نے اپنی ملکہ کی طویل عمر کی دعا پر مشتمل گانا گایا۔ ملکہ کو اکیس توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔ گورے محل میں مقیم ہو گئے۔ ہمیں خندق سے پرے خیمے لگانے کا حکم دیا گیا۔

☆☆☆

اگلے دن ہم نے باغیوں کو چاندنی چوک اور جامع مسجد کے اردگرد واقع بازاروں سے نکال دیا۔ چاوڑی بازار میں کوئی گانے والی نہیں تھی' حوض قاضی میں کوئی طوائف نہیں تھی' لال کنواں میں کوئی ہیجڑا نہیں تھا۔ تاہم ڈھیروں سونا چاندی اور بھینسیں ہمارے ہاتھ لگیں۔ ہم نے کئی پرانے محلات کو اور مکانوں کو آگ لگا دی۔ گورے بادشاہی مسجد کو آگ لگانا چاہتے تھے لیکن ولسن صاحب بہادر نے کہا: ''نہیں' اس سے ہمارے لیے لڑنے والے پٹھان' بلوچ اور پنجابی مسلمان مشتعل ہو جائیں گے۔'' صاحب بڑے سیانے تھے۔

مسجد سکھ گھڑ سواروں کے حوالے کر دی گئی۔ جوانوں نے گنبد کے نیچے والی وسیع و عریض جگہ رہنا' سونا تھا۔ ہم نے اطراف میں موجود طویل برآمدوں میں اپنے گھوڑے باندھ دیے۔ وسیع صحن کے درمیان دو تالاب تھے۔ ایک تالاب میں ہم خود نہاتے اور دوسرے میں اپنے گھوڑوں کو نہلاتے تھے۔

میں دلی کا نظارہ کرنے کے لیے مسجد کے ایک مینار پر چڑھ گیا۔ میں خود کو ایسا

بادشاہ تصور کر رہا تھا جو نیچے واقع اپنی سلطنت کا جائزہ لے رہا ہوں۔ محلات، مکانات، مسجد اور بازار ہم نے کئی مقامات پر آگ لگائی تھی۔ وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے جنوب کی سمت دیکھا۔ ہزاروں لوگ شہر کے دروازوں سے نکل رہے تھے۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں کہ شاہ کی آواز آئی اور ایک کنکر میری آنکھ کے پاس سے گزر گیا۔ کسی حرامی نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ گولی چاوڑی بازار کی طرف سے آئی تھی۔ ساری طوائفوں کے بھاگ جانے کے بعد وہ حرامی طوائفوں کے علاقے میں کیا کر رہا تھا؟ میں نے خوفزدہ نہیں ہوا۔ میں نے آڑ نہیں لی۔ میں نے اپنے ٹراؤزر کے بٹن کھول کر اسے وہ کچھ دکھایا' جو میرے پاس تھا۔

اس شام میں نے ہڈسن سے کہا: ''صاحب! وہ سب کچھ لے جا رہے ہیں۔ ہمیں ٹھینگے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے جا کر ولسن صاحب سے شہر کے جنوبی سرے پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی۔

دو دن بعد ہڈسن نے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی فصیل کے گرد چکر لگایا۔ ہم نے گھوڑوں پر سوار ہو کر نیزہ بازی کا کھیل کھیلا۔ ہم زمین میں گڑی ہوئی لکڑیوں کو نہیں بلکہ فرار ہونے کی کوشش کرنے والے لوگوں کو اپنے نیزوں سے نشانہ بنایا تھا۔ جو لوگ ہمارے نیزوں سے بچ نکلے' ہم نے انہیں کاربینوں سے نشانہ بنایا۔ ہم دلی دروازے سے شہر میں دوبارہ داخل ہوئے اور دریا گنج سے گزرتے ہوئے جامع مسجد کی سیڑھیوں تک پہنچ گئے۔ زبردست گھڑ سواری اور انسانوں کے شکار کے بعد ہم نے مسجد کے تالاب میں اپنے نیزوں اور تلواروں کو دھویا۔ پانی اتنا لال ہو گیا کہ گھوڑے بھی اس کے قریب نہیں جاتے تھے۔

❁❁❁

بہادر شاہ ظفر

ہم نے دو دن انتظار کیا۔ تیسری صبح ایک گورا پچاس سکھ گھڑسواروں کے ساتھ مقبرے کے دروازے پر پہنچا۔ ان کا قاصد رجب علی تھا۔ یہ وہی کانا تھا جو اکثر ہمارے حضور سجدے کرتا تھا اور ہمارے پاؤں چومنے کی التجائیں کیا کرتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ مرزا الٰہی بخش نے ولسن صاحب بہادر سے' جو کہ انگریز فوج کے سالار ہیں' ہمیں گرفتار کروانے کا وعدہ کیا ہے۔ میجر ہڈسن وارنٹ گرفتاری پر عمل کرنے آیا ہے۔ ہمیں یہ سن کر اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ حکیم احسن اللہ خان بھی دشمن سے مل گئے ہیں۔ درست کہا گیا ہے کہ سانپ جتنا نرم ہوتا ہے' اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ بدصورت کانے' حرامی رجب علی نے ہمیں یقین دلایا کہ اگر ہم اس کے ساتھ چلے جائیں گے تو ہماری جان بخش دی جائے گی۔ بیاسی سال کی عمر میں کیا تھی ہماری زندگی؟ تاہم ہمیں زینت محل اور جواں بخت کی فکر تھی۔ وہاں ہمارا بڑا بیٹا مرزا مغل تھا۔ اس نے کہا کہ ہم رجب علی کے منہ پر تھوک دیں۔ اس نے کہا: "ہم اس گورے اور اس کے سکھ بُرچھوں کے کباب بنا دیں گے۔"

ہم نے بیگم زینت محل اور جواں بخت کو بلایا۔ ہم انہیں لے کر مقبرے کی

سیڑھیاں اترنے لگے۔ مرزا مغل اور اس کے فوجی ہمیں پکار پکار کر روکتے رہے لیکن ہم نے ان کے مشوروں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم نے مرزا مغل اور اپنے دوسرے بیٹوں سے کہا کہ وہ دیکھیں صاحب ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں اور پھر اپنا لائحہ عمل طے کر لیں۔ ہم ان سے گلے ملے۔ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم آخری بار مل رہے ہوں۔ ہم نے اپنے عزیزوں اور خدام کو الوداع کہا۔ انہوں نے ہمارے ہاتھوں کو بوسے دیئے۔ وہ رو رہے تھے۔

ہمیں پالکیوں میں بیٹھا کر وہاں لے جایا گیا جہاں ہمیں گرفتار کرنے کو آنے والے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ پالکی سے باہر نکلنے سے پہلے ہم نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی: "اے اللہ ہم خود کو تیرے حوالے کرتے ہیں' تو ہی ہماری حفاظت فرمانا۔"

ہم سکھ گھڑسواروں کی کمان کرنے والے صاحب تک پہنچے اور اس سے پوچھا کہ وہ ہڈسن صاحب بہادر ہے؟

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہم نے کہا: "کیا وہ ہماری ملکہ اور بیٹے کی جاں بخشی کا وعدہ کرتا ہے؟"

اس نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔

ہم نے نادر شاہ کی دی ہوئی مشہور تلوار "ذوالفقار" صاحب کے حوالے کر دی۔ ہمارے بیٹے نے بھی اپنی تلوار اسے دے دی۔

صاحب نے ہمیں پالکیوں میں بیٹھنے کا حکم دیا۔

ہم فرنگیوں کے قیدی بن چکے تھے۔

☆☆☆

ہمیں دلی پہنچنے میں پورا ایک دن لگ گیا۔ راستے میں ہمیں لوگوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دیں اور ہماری پالکی کو کئی مرتبہ روکا گیا۔ سہ پہر ہونے تک ہنگامہ فرو

ہو گیا۔ جب ہم دلی دروازے سے داخل ہوئے تو شہر شہر خموشاں بنا ہوا تھا۔ ہمیں اپنے آگے پیچھے چلنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ماضی میں جب ہم قلعے میں داخل ہوتے تو ہماری آمد کا اعلان کرنے کے لیے توپ چلائی جاتی تھی اور نقار خانے میں بینڈ بجایا جاتا تھا۔ اس مرتبہ یہ ہوا کہ جب ایک گورا ہمیں دوسرے گورے کے حوالے کرتا تو ہمارے نام غلط تلفظ میں ادا کرتا ''بادرشا''۔ ہماری پالکی مینابازار سے گزری۔ ہمیں اس تہہ خانے میں بند کر دیا گیا جہاں چند ماہ پہلے ہم نے یورپی خاندانوں کو پناہ دی تھی اور بعدازاں ہجوم نے انہیں نکال کر ہلاک کر دیا تھا۔ دروازوں کو باہر سے کنڈی لگا کر پہریدار متعین کر دیا گیا تھا۔ ہم ساری دنیا سے کٹ چکے تھے۔

تقدیر کی کمان سے چلے ہوئے سینکڑوں زہریلے تیر ہمارے جسم میں اتر گئے تھے۔ جس طرح خون کی کمی سے بے حس ہو جانے والے عضو میں کانٹا چبھے تو اسے احساس نہیں ہوتا اسی طرح ہمارا دماغ غموں سے شل ہو چکا تھا۔

❀❀❀

نہال سنگھ

کمین گاہوں میں چھپے باغیوں کو نکالنے میں سات دن لگ گئے۔ اس کے بعد ہم یہ دعویٰ کرنے کے قابل ہوئے کہ اب دلی جان کمپنی کے قبضے میں ہے۔ اب دلی میں صرف ویران گھر اور لاشیں رہ گئی تھیں' اور انہیں کھانے والی بلیاں' کتے اور چوہے۔ چند دنوں بعد ہندوؤں کو واپس آنے اور اپنی دکانیں کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ جن مسلمانوں نے خود کو ہندو ظاہر کرنے کی کوشش کی' وہ اپنی جان سے گئے۔ ہم نے ان کے کپڑے اتار لیے تھے۔ ہم نے ان کے فوطوں کو سنگینیں چبھو کر پوچھا: ''اس کی سپاری کو کیوں کاٹا گیا ہے؟''

ان کا خون خشک ہو جاتا اور پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ مدفون سونے چاندی کے لیے واپس آئے ہیں۔ پس ہم انہیں ان کے گھروں میں لے گئے۔ وہاں ہمیں جو کچھ ملا' ہم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر ہم نے انہیں ''صاحب جج'' کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے ان سے چند ایک باتیں پوچھ کر حکم دیا کہ انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ انہیں چاندنی چوک کے مرکز میں واقع کوتوالی لے جایا جاتا' جہاں اورنگا نے ہمارے گرو کو سزائے موت دی تھی۔ وہاں ایک درجن پھندے نصب کیے گئے تھے۔ صاحب رات کا کھانا کھانے کے بعد گھوڑوں پر سوار ہو کر نظارہ کرنے آتے۔ خدمت گار ان کے لیے صوفے کرسیاں بچھا دیتے اور آب دار برانڈی اور پورٹ سے

ان کے جام بھر دیتے اور ان کے چرٹ سلگا دیتے۔

پھر تماشا شروع ہو جاتا۔ ان بدنصیبوں کو چھ چھ کی ٹولیوں میں ہانک کر لایا جاتا' ان کے ہاتھ پیچھے باندھ کر گلوں میں پھندے ڈال دیئے جاتے۔ صاحب مٹھی مند کر کے انگوٹھا نیچے کی طرف جھکا کر اشارہ کرتے تو پھٹے کھینچ لیے جاتے۔ صاحب شرط لگاتے کہ کون سا شخص دیر میں مرے گا۔ یہ بتانا آسان تھا کہ کون جلد مرے گا۔ جو زیادہ تڑپتا' اسی کا گلا جلد گھٹ جاتا۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں اور نتھنوں سے خون رسنے لگتا۔ کچھ لوگ جلدی مر جاتے اور کچھ لوگوں کی ٹانگیں کھینچ کر انہیں مارنا پڑتا تھا۔ صاحب شراب پیتے' مذاق کرتے' قہقہے لگاتے اور شرطیں بدتے ہوئے اس تماشے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

☆☆☆

ہڈسن صاحب اس قسم کے تماشوں میں کبھی وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ اس کا ذہن بڑھے کھیل کی طرف مائل تھا۔ ایک روز وہ ولسن صاحب بہادر سے ملا اور اس سے کہا: ''مجھے دلی کے بادشاہ کو گرفتار کرنے کی اجازت دی جائے۔''

''جنگی لاٹ'' نے جواب دیا: ''اچھا' لیکن اب میں کسی اور گورے کو کھونا نہیں چاہتا۔'' ہڈسن صاحب نے کہا: ''میں اپنے سکھوں کو لے جاؤں گا۔''

پھر اس نے مجھ سے کہا: ''نہال سنگھ! اپنے سب سے بہادر پچاس لڑکوں کو اکٹھا کرو اور اگلی صبح بڑے شکار کی تیاری کرو۔''

یہ 21/ ستمبر کا واقعہ ہے۔ موسم تبدیل ہو چکا تھا۔ راتیں سرد ہونے لگی تھیں اور اوس بارش کی پھوار کی طرح گرنے لگی تھی۔ میں نے نتھا اور لہنا سمیت پچاس لڑکوں کو منبر کے قریب سونے کا کہا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میں جاگ گیا۔ ہم نے جلدی جلدی دو دو روٹیاں کھائیں اور ایک مگ چائے پی۔ ہم نے وردیاں پہنیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر مسجد کی سیڑھیاں اتر گئے۔ ہڈسن صاحب بھی آ گیا۔ دو مسلمان بھی گھوڑوں پر سوار اس

کے پیچھے موجود تھے۔ ایک تو وہی کانا رجب علی تھا۔ دوسرے نے نوابوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا: فر کی بڑی ٹوپی اور سونے کے بٹنوں والا کوٹ۔ میرا صاحب اسے ''مرزا صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ (مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس کا نام مرزا الٰہی بخش تھا اور وہ کچھ عرصہ پہلے فوت ہو جانے والے بادشاہ کے بڑے بیٹے کا سسر تھا)۔

مرزا نے ہڈسن صاحب کے کان میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ ہم ''کلپ، کلاپ، کلپ، کلاپ'' کرتے فیض بازار سے گزرتے ہوئے دلی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ہڈسن صاحب گھوڑے پر سوار اپنی بے نیام شمشیر کندھے پر رکھے آگے آگے تھا۔ کانا رجب علی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں اپنے پچاس سواروں کی قیادت کرتا ہوا رجب علی کے پیچھے پیچھے تھا۔ ہم نے کرپانیں ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھیں۔ ہماری بھری ہوئی کاربینیں ہماری کمروں سے جھول رہی تھیں۔ ہم سب کے پاس دو دو کرپانیں تھیں۔ ایک ہماری کمر سے بندھی ہوتی تھی، دوسری زین سے۔ سورج طلوع ہوتے ہوتے ہم آگرہ کی طرف جانے والی شاہی سڑک پر رواں تھے۔ سڑک کی دونوں اطراف میں بہت سی یادگاریں تھیں۔ ان میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ مرد بندوقوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ تاہم کسی کو ہمارے نزدیک آنے یا بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

کانا رجب علی صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے اسے عمارتوں کے بارے میں بتانے لگا۔ ہڈسن صاحب نے اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ تاہم وہ بولتا رہا:

''صاحب! یہ فیروز شاہ کے محل کی چھت پر ایک بودھ ستون ہے۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ ایک مسلمان بادشاہ کے محل کی چھت میں بودھ ستون کس طرح آ گیا؟ ہم ایک قدیم قلعے کی بہت اونچی فصیل کے پاس سے گزرے تو اس کانے نے کہا: ''سر! دِس اِز پرانا قلعہ — دی اولڈ فورٹ۔ کہا جاتا ہے کہ اسے آریاؤں نے بنایا تھا۔ اسے 'اندر پرستھ' کہتے ہیں۔ اس کے اندر شیر شاہ سوری کی مسجد اور ہمایوں بادشاہ کی لائبریری ہے۔''

ہڈسن صاحب نے اس مرتبہ بھی کانے ٹٹو کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ اس وقت سورج نیزے بھر اونچا ہوا تھا کہ جب ہم ایک بہت اونچی فصیل والی ایک بہت وسیع عمارت کے دروازے پر پہنچے۔ ہمیں اس کے اندر سفید سنگ مرمر کے ایک بہت بڑے گنبد کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ کانے رجب علی نے بتایا کہ یہ ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ ہے۔ بوڑھا بادشاہ اور اس کے گھرانے کے افراد اندر چھپے ہوئے ہیں۔

کانا اپنی بک بک جاری رکھتا ہے: ''اور صاحب بہادر! یہ عیسیٰ خاں کا مقبرہ ہے اور وہ جگہ جہاں ہجوم نظر آ رہا ہے کسی وقت عرب سرائے کے نام سے مشہور تھی۔ اس سے پرے آپ عبدالرحیم خانِ خاناں کے مقبرے کا سرخ گنبد دیکھ سکتے ہیں۔ وہ شہنشاہ اکبر کا ایک وزیر تھا۔ آپ کے پیچھے موجود عمارتیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار شریف کی ہیں۔ اس ولی اللہ کے مقبرے کے نزدیک بہت سے بادشاہوں اور ملکاؤں اور شہزادوں کی قبریں ہیں۔''

ہڈسن صاحب نے غصے سے کہا: ''بس، بس رجب علی! تم پھر کسی وقت مجھے ان سب فضول یادگاروں کے بارے میں بتانا۔ اس وقت ہمیں اس سے بھی زیادہ اہم کام کرنا ہے۔ جلدی کرو، میں سارا دن ضائع نہیں کر سکتا!'' ہڈسن صاحب اور کانا گھوڑے سے اترے۔ میں بھی ان کے گھوڑوں کی لگامیں پکڑنے کے لیے گھوڑے سے اتر گیا۔

کانے نے بڑے دروازے کو تھپتھپایا۔ اندر سے آواز آئی: ''کون ہے؟''

''مولوی رجب علی، کمپنی بہادر کا قاصد۔ میں حضور والا کے لیے ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد بڑے دروازے کے ایک گوشے میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا۔ ایک سنتری نے سر باہر نکال کر کہا: ''حضور بہادر شاہ غازی، شہنشاہِ ہندوستان، شاہِ شاہاں، ظلِ الٰہی حکم دیتے ہیں کہ کمپنی بہادر کا وکیل مولوی رجب علی حاضر ہو۔ مولوی رجب علی اندر آ سکتا ہے۔''

میں نے خود سے کہا: "واہ بھی واہ! تم کسی چوہے کی طرح ایک بل میں چھپے ہوئے ہو اور خود کو شاہ و شاہاں کہلواتے ہو!"

رجب علی چھوٹے دروازے سے اندر چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔

ہڈسن صاحب نے زمین پر تھوک دیا۔ وہ دروازے کے سامنے ٹہلنے لگا۔ اس نے نہ تو کسی سے کوئی بات کی اور نہ ہی فصیل سے جھانک کر ہمیں دیکھنے والے بہت سارے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ اتنے لوگ تھے اور انہوں نے "چوں" تک نہیں کی! ہزاروں لوگوں کی خاموشی نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ مجھے صرف گھوڑوں کے ہنہنانے' پاد مارنے اور پیشاب کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر مجھے آپس میں تکرار کرنے والے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک نعرہ سنائی دیا: "نعرۂ تکبیر۔"

اور سینکڑوں آوازوں نے جواب دیا: "اللہ اکبر۔"

پھر مزید آوازیں سنائی دیں: "مار ڈالو فرنگی کو۔"

ایک گورا اور پچاس سکھ ہزاروں افراد کے خلاف کیا کر سکتے تھے؟ وہ تو ہمارا قیمہ بنا سکتے تھے۔ لیکن واہ' واہ ہڈسن صاحب! کوئی آپ جیسا نہیں ہو سکتا! ہڈسن صاحب ایسے ظاہر کرتے ہوئے کہ جیسے کچھ نہ سنا ہو ٹہلتا رہا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ میرا منہ خشک ہو گیا تھا جب کہ ماتھا ٹھنڈے پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ دوسری طرف کی آوازیں قریب سے قریب تر آ رہی تھیں۔ ہڈسن صاحب دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میں نے کانے کا گھوڑا ایک درخت سے باندھا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ہڈسن صاحب نے ہولسٹر سے پستول نکال کر گھوڑا چڑھا دیا۔ میں نے کرپان پکڑی۔ آہستہ آہستہ بڑا دروازہ پیچھے کی طرف کھینچا گیا۔ ایک کے پیچھے ایک' تین پالکیاں اور تلواروں' بندوقوں سے مسلح وحشی دکھائی دینے والے بے شمار آدمی نظر آئے۔ پالکیوں کے گرد موجود کچھ عورتیں رو رہی تھیں۔ انہوں نے ہڈسن صاحب اور سکھ سواروں کو دیکھا تو چھرا سی گئیں۔

رجب علی نے آ کر ہڈسن صاحب سے کچھ کہا۔ پھر وہ دوسرے نمبر پر موجود پالکی کی طرف جا کر کچھ بولا۔ ایک بوڑھا پالکی سے نکلا۔ وہ لمبا' بہت دبلا تھا اور بڑھاپے کی وجہ سے خمیدہ کمر تھا۔ اس کی سفید ترشی ہوئی ڈاڑھی تھی۔ اس نے فر کی بڑی سی ٹوپی سر پر رکھی ہوئی تھی اور پیروں تک لمبا' فر کے حاشیے والا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے ہڈسن صاحب کے قریب آ کر اس کی طرف دیکھا اور بولا: ''کیا مجھے ہڈسن صاحب بہادر سے بات کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟''

''ہاں میں ہوں میجر ہڈسن۔ تم بہادر شاہ ہو؟''

''ہاں یہ بدبخت انسان اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ ہڈسن صاحب بہادر! وعدہ کیجئے کہ ہماری ملکہ زینت محل' ہمارے بیٹے شہزادہ جواں بخت کی اور ہماری جان بخش دی جائے گی۔''

''ہاں' جنگی لاٹ ولسن صاحب بہادر نے ہم سے تمہاری جان بخشی کا وعدہ کیا تھا۔'' اس کی بات سن کر ہجوم سرگوشیاں کرنے لگا۔

ہڈسن صاحب نے پستول لہرایا اور اونچی آواز میں ہجوم کو مخاطب کر کے بولا: ''سنو لوگو! اگر کسی نے دخل اندازی کی کوشش کی تو میں ان پالکیوں میں موجود تینوں افراد کو کتوں کی طرح گولی مار دوں گا۔ سمجھے!'' ہجوم واپس چلا گیا۔

بوڑھے بادشاہ نے اپنی تلوار کمر سے کھولی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہڈسن صاحب نے گھوڑے سے اتر کر تلوار اس سے لے کر مجھے دے دی۔ کیا تلوار تھی وہ! سونے کے دستے پر نہایت قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

پھر آخری پالکی سے بادشاہ کا بیٹا جواں بخت نکلا۔ اس نے بھی اپنی تلوار صاحب کو دے دی۔ صاحب نے یہ تلوار بھی مجھے پکڑا دی۔ یہ تلوار بھی کمال خوبصورت تھی۔ سونا' ہیرے' موتی! ہڈسن صاحب نے حکم دیا کہ تینوں پالکیاں اٹھائی جائیں۔ آگے آگے پچاس سوار تھے' ان کے پیچھے پالکیاں' پھر میرا صاحب اور میں۔ ہمارے

پیچھے بہت بڑا ہجوم تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ارتعاش سا تھا اور جسم سے ٹھنڈے پسینے چھوٹے جا رہے تھے لیکن ہڈسن صاحب کے سرخ چہرے پر خوف کا نشان تک نہیں تھا!

ہم پرانے قلعے کے سامنے سے گزرے۔ ہجوم اب بھی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

قدیم اندر پرستھ سے ہزاروں باغی سپاہی باہر نکل آئے لیکن ہم انہیں نظر انداز کرتے ہوئے پالکیوں سمیت آگے بڑھتے چلے گئے۔ کوئی آدھے کوس کے سفر کے بعد ہجوم چھٹنے لگا۔ ہم اپنے ساتھ ہندوستان کے شہنشاہ اس کی ملکہ اور ان کے بیٹے کو قیدی بنا کر لے جا رہے تھے۔ یہ تو عظیم گرو کا معجزہ تھا!

ہم دلی دروازے سے گزرنے کی بجائے سورج کے غروب ہونے کی سمت بائیں طرف مڑے اور ترکمان اور اجمیری دروازے سے گزرے۔ پھر ہم شہر میں داخل ہونے کے لیے بائیں طرف مڑ کر کابلی دروازے سے گزرے۔

ہڈسن صاحب چاہتا تھا کہ سب دلی والوں کو پتا چل جائے کہ ان کے بادشاہ، ملکہ اور شہزادے کو قیدی بنا کر لایا گیا ہے۔ لیکن گلیاں ویران پڑی تھیں۔ صرف کتے لاشوں کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہ چیر پھاڑ چھوڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ گدھ اڑ کر ہمارے راستے سے کچھ دور جا بیٹھے۔ کوتوالی کے سامنے اب بھی چھ لاشیں پھندوں سے جھول رہی تھیں اور کوے انہیں ٹھونگیں مار رہے تھے۔ جب ہم اپنے نویں گرو کے گردوارے کے سامنے سے گزرے تو ہم نے کرپانیں نیاموں سے نکال کر سلامی دی۔ میں نے جنگی نعرہ لگایا: "بولے سونہال!" سواروں نے جواب دیا: "ست سری اکال۔"

ہم لال قلعے پہنچے تو ابھی دن کا اجالا باقی تھا۔ ایک گورے سنتری نے پوچھا:

"کون ہے؟"

"میجر ہڈسن قیدی بہادر شاہ ظفر سابق شاہ دلی، اس کی بیوی زینت محل اور ان کے بیٹے جواں بخت کو لے کر آیا ہے۔"

دروازہ کھل گیا۔ ہڈسن صاحب اور رجب علی پالکیوں کے ساتھ اندر چلے

گئے۔ہم جامع مسجد کی طرف واپس ہوئے۔

ہم نے بیس بکریوں کا جھٹکا کیا اور انہیں بھوننے کے دوران ڈھیر ساری رم پی۔ ہم سب نشے میں آ گئے اور گانے لگے۔ لہنا نے ایک پست قامت بوڑھے کے بارے میں گانا گایا' جو ایک اونٹنی کے ساتھ مجامعت کرنا چاہتا تھا۔ لہنا کو اس ''بڈھے بابے'' کے حوالے سے بہت سارے گانے یاد تھے۔ لیکن ہائے ری میری قسمت! صاحب کے سائیس نے آ کر کہا کہ مجھے لال قلعے میں یاد کیا گیا ہے۔ اگرچہ میں رم کے نشے میں دھت تھا لیکن اس کے ساتھ چل پڑا۔

میں صاحب کے کوارٹر پہنچا تو وہ کمرے میں بیٹھا' ان دونوں تلواروں کا معائنہ کر رہا تھا' جو اسے صبح دی گئی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں تلواروں کے دستوں میں جڑے جواہرات ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ کیا ہنرمندی تھی! صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک تلوار پر شہنشاہ جہانگیر کا اور دوسری تلوار پر ایرانی حملہ آور نادر شاہ کا نام کندہ ہے۔ وہ زیادہ خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے کہا: ''مجھے ولسن صاحب بہادر سے یہی کچھ ملا ہے۔ انہوں نے شاباش تک نہیں دی۔ کاش میں نے بڈھے بادشاہ اور اس کے پلے کو مار دیا ہوتا!''

''صاحب! اگر ہلکا سا بھی اشارہ کرتے تو میں نے ان کے سر تن سے جدا کر دیئے تھے۔''

وہ تیزی سے بولا: ''مجھے پتا ہے' مجھے پتا ہے۔ میں خود ہی انہیں مار سکتا تھا۔ تاہم سفید فام لوگوں کو اپنے عہد کی پاس داری کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال اب اس کے برعکس ہو گا۔ میں نے بادشاہ کے بیٹوں اور بھتیجوں کے لیے اجازت لے لی ہے۔ ان 'بدمعاشوں' نے 'میم صاحبوں' اور چھوٹے 'بابا لوگ' کو قتل کیا تھا۔ ولسن صاحب نے کہا ہے: ''جو تمہاری مرضی ہو کرو لیکن مجھے ان کے حوالے سے پریشان نہ کرنا۔'' تم صوبیدار مان سنگھ سے کہو کہ کل صبح منہ اندھیرے سو سواروں کے ساتھ تیار رہے۔ یہ کام خطرناک

ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد تمہیں ڈھیر ساری رم دی جائے گی۔"

☆☆☆

اگلی صبح جوانوں کو تیار کرانے میں مجھے بہت وقت پیش آئی۔ صوبیدار مان سنگھ کو انہیں ڈانٹنا ڈپٹنا پڑا۔ ہڈسن صاحب اپنے ساتھ ایک اور گورے میکڈوویل صاحب اور کانے رجب علی کو لے کر آیا۔ ہم مسجد کے سامنے گھوڑوں پر سوار صفیں باندھے کھڑے تھے۔ دونوں صاحب اور رجب علی آگے آگے تھے جبکہ میں ان کے عین پیچھے تھا۔ (میں اس کی کانی آنکھ والی سمت تھا' اس لیے ہماری نگاہیں تک آپس میں نہیں ٹکرائیں)۔ ہمارے پیچھے ہمارے دو صوبیدار اور پھر سو سکھ سوار تھے۔ ان کی پگڑیوں کے سرے صبح کی ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور کرپانیں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ رجب علی نے میرے ساتھ دلی کی پرانی عمارتوں کے حوالے سے "بک بک" نہیں کی۔ ہم ہمایوں کے مقبرے کے شمالی دروازے پر پہنچ گئے۔ جونہی ہم وہاں پہنچے ہمارے گرد ہجوم جمع ہونے لگا۔ کچھ لوگ ساتھ واقع عرب سرائے سے وہاں آگئے تھے کچھ لوگ "نظام الدین" سے۔ جلد ہی عمارتوں کی چھتوں اور دیواروں پر لوگ ہی لوگ نظر آنے لگے۔ بہت سے مرد کاربینوں سے مسلح تھے۔

☆☆☆

اس بار بھی رجب علی اندر گیا۔ ایک بار پھر ہمیں اللہ اکبر کے نعرے سنائی دیئے۔ ہم نے نعرے لگانے والوں کو دروازے کے قریب سے قریب تر آتے سنا۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ ایک بیل گاڑی باہر آئی۔ اس پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ کانا رجب علی پہیے پاس کھڑا تھا۔ بیل گاڑی کے پیچھے دہشت ناک چہروں والے مردوں کا ہجوم تھا' جو کاربینوں اور تلواروں سے مسلح تھا۔ صاحب اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر بیل گاڑی کی طرف بڑھے۔ ہڈسن صاحب نے حکم دیا: "رجب علی! تینوں قیدیوں کی پہچان کرواؤ۔"

رجب علی نے ایک شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''مرزا مغل بہادر۔''
وہ بیل گاڑی سے اترا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے تلوار آگے بڑھائی۔ میکڈوویل صاحب نے اس سے تلوار لے لی۔ رجب علی نے دوسرے شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''مرزا ابوبکر۔'' وہ بھی بیل گاڑی سے اترا۔ اس نے بھی اپنی تلوار میکڈوویل صاحب کو دے دی۔

''مرزا خضر سلطان۔''

اس تیسرے شخص نے بھی پہلے دونوں کی پیروی کی۔ پھر وہ تینوں واپس جا کر بیل گاڑی پر بیٹھ گئے۔ ہجوم نے اس منظر کو دیکھا۔ کچھ لوگ بہت مشتعل دکھائی دینے لگے تھے۔ اشتعال میں کی جانے والی ''بڑبڑ'' شور میں بدل گئی۔ جونہی بیل گاڑی آگے بڑھی' ہجوم اس کے پیچھے چلنے لگا۔

ہڈسن صاحب نے گھوڑا موڑا' تلوار نیام سے نکال کر لہرائی اور حکم دیا: ''رک جاؤ۔'' ہجوم رک گیا اور خاموشی چھا گئی۔ ہڈسن صاحب نے حکم دیا کہ پچاس سوار بیل گاڑی کے ساتھ آگے جائیں۔ وہ اور میکڈوویل صاحب گھوڑوں پر سوار ہجوم کی طرف بڑھے۔ ہجوم الٹے قدموں پیچھے ہٹتا ہوا مقبرے میں چلا گیا۔ ہڈسن صاحب نے بلند آواز میں کہا: ''اپنے ہتھیار پھینک دو۔''

گرد کا ایک چمتکار! انہوں نے اپنی بندوقیں اور تلواریں زمین پر پھینک دیں۔ انہیں اکٹھا کر کے بیل گاڑیوں میں لادتے ہوئے ہمیں دو گھنٹے لگ گئے۔ میں نے ساری زندگی میں ایسا وقت کبھی نہیں گزارا تھا! نہ ہی میں نے زندگی بھر ہڈسن صاحب بہادر جیسا آدمی دیکھا! جیسا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں' وہ لاکھوں میں ایک تھا!

ہم آگے جانے والے اپنے ساتھیوں سے ملنے کے لیے تیز رفتاری سے چلے۔ سارے راستے ہمیں مسلح آدمیوں کی ٹولیاں ملیں۔ جوں جوں ہم شہر کے قریب آتے گئے ٹولیاں بڑی ہوتی گئیں۔ ہم ان سے گزرتے ہوئے قیدیوں کو لے جانے

والے اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ ہمارے ارد گرد ہر طرف مسلح ہجوم نعرے لگاتا اور ہماری طرف تلواریں لہراتا رہا۔ میں نے اپنے گرو سے پرارتھنا کی کہ اگر میری جان بچ گئی تو میں چاندنی چوک والے گردوارے میں سوا روپے کا چڑھاوا چڑھاؤں گا۔ گرو نے میری پرارتھنا سن لی۔ ہڈسن صاحب نے قیدیوں والی بیل گاڑی تک پہنچ کر رک جانے کا حکم دیا۔ ''بڑ بڑ'' کا خاتمہ ہو گیا۔ ہم شہر سے کوئی آدھا میل دور واقع ایک دروازے سے گزر رہے تھے۔ ہماری دائیں طرف کسی مسلمان کا ٹوٹا پھوٹا محل تھا اور اس کے علاوہ ننگی تلواریں اور کاربینیں لہراتے ہوئے لوگوں کا سمندر تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ ہڈسن صاحب نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور لوگوں سے بات کرنے کے لیے مڑا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا: ''یہ تین آدمی' جو ہماری تحویل میں ہیں' قاتل ہیں۔ بہت سی معصوم عورتوں اور بچوں کے خون سے ان جلادوں کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ اب تم کمپنی بہادر کا انصاف دیکھنا۔ رک جاؤ اور دیکھتے رہو۔''

ہجوم جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ہمارے سواروں نے بیل گاڑی کے گرد دائرہ بنا لیا۔ ہڈسن صاحب نے حکم دیا: ''تم تینوں نیچے آؤ اور اپنے کپڑے اتار دو۔''

تینوں آدمیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ان کے چہرے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قمیصیں اتار دیں۔

ہڈسن صاحب نے پھر حکم دیا: ''سب کچھ اتار دو۔''

پتلون نما پاجامے اتارتے ہوئے ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یہ مسلمان نہ صرف ختنہ کرواتے ہیں بلکہ ناف کے نیچے کے بال بھی صاف کرتے ہیں! میں نے کبھی اتنے اداس مختون سروں والے قضیب نہیں دیکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں شرم آ رہی ہو! ہڈسن صاحب نے حکم دیا: ''ابوبکر! آگے آؤ۔'' تقریباً ایک 35 سالہ شخص چند قدم آگے آ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے ستر چھپا رکھا تھا۔

ہڈسن صاحب نے اس کے بازو پر بندھے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے مجھے حکم دیا: ''نہال سنگھ یہ اس کے بازو سے اتار لو۔''

میں نے تعویذ اتار کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''اپنی کاربین مجھے دو۔''

میں نے کاربین ہڈسن صاحب کو دے دی۔

ابوبکر دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولا: ''صاحب مت مارو۔''

ہڈسن صاحب نے اس کے سینے کا نشانہ لیا۔ ٹھاہ۔ ابوبکر چیخا: ''ہائے اللہ'' اور خون کے تالاب میں گر گیا۔

ہجوم دہشت سے خاموش کھڑا تھا۔ کسی ایک آدمی نے حرکت نہیں کی۔ جب ہڈسن نے باقی دو قیدیوں کے سروں میں گولیاں ماریں تو وہ پہلے ہی نیم مردہ ہو چکے تھے۔ تین ننگی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔ ان کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا' ان کے کھلے منہ سے تھوک نکل رہی تھی' آنکھیں پھر گئی تھیں۔ ان کی موت کا نظارہ کرنے والے ہزاروں مسلح لوگ ہمارے پیروں میں پڑے مردوں کی طرح مردہ لگتے تھے۔

صوبیدار مان سنگھ نے کرپان لہرا کر نعرہ لگایا: ''بولے سو نہال۔''

ہم سب نے بھی کرپانیں لہرا کر جواب دیا ''ست سری اکال۔''

لاشیں بیل گاڑی پر رکھی گئیں۔ ہم دوبارہ شہر کی طرف بڑھنے لگے۔ ہجوم یوں چھنتا جا رہا تھا جیسے دھوپ سے دھند چھٹتی ہے۔ ہم دریا گنج سے گزرے۔ چاندنی چوک سے ہم بائیں طرف مڑ کر گردوارے پہنچے۔ یہاں میں نے ہڈسن صاحب سے پوچھا: ''صاحب! کیا میرے لیے مزید کوئی کام ہے؟'' اس نے ایک خط لفافے میں رکھ کر مہر لگائی اور مجھے دیتے ہوئے بولا: ''ڈاک۔''

میں نے خط لے لیا۔ اچانک وہ کچھ کچھ خوش نظر آنے لگا۔

''صوبیدار مان سنگھ سے کہو وہ اپنے سواروں کو بتائے گا کہ صاحب بہت خوش ہے۔ وہ جتنی رم چاہیں انہیں دے دی جائے۔ کچھ عرصہ تک مزید کوئی کام نہیں ہے۔''

چھوٹے سے وقفے کے بعد وہ پھر بولا: "کیمپ میں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

"صاحب! لوگ آپ کا نام سنتے ہی واہ واہ کرتے ہیں۔"

وہ خوش ہو گیا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں نے جامع مسجد سے روانہ ہوتے وقت ایک قصہ سنا تھا: "صاحب کیا یہ سچ ہے کہ جن تین آدمیوں کو آپ نے گولی ماری تھی ان کے سر کاٹ کر بوڑھے بادشاہ کو پیش کیے گئے تھے؟ وہ کیا کہتا تھا؟"

ہڈسن صاحب کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا:

"نہال سنگھ! تم نے یہ قصہ کہاں سے سنا؟"

"صاحب......لوگ کہہ رہے تھے......"

"سنو" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا: "صاحب لوگ مہذب ہوتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں جیسے نہیں ہوتے۔ وہ لوگوں کے سر کاٹ کر اور طشت میں رکھ کر انہیں ان کے اعزا کے سامنے پیش نہیں کرتے۔ کمپنی بہادر انصاف پسند ہے۔ طاقتور لیکن انصاف پسند۔ سمجھے!"

میں نے کہا: "جی حضور۔"

میں نے صاحب کو سلیوٹ مارا اور جامع مسجد کی طرف چل پڑا۔

❀❀❀

بہادر شاہ ظفر

ایک قاصد نے تہہ خانے میں آ کر ہمیں ہمارے اعزا اور حمایتیوں کی ہلاکت کی خبر سنائی۔ ہمارے دو بیٹوں مرزا مغل اور مرزا خضر اور پوتے مرزا ابوبکر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ہم نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ البتہ ہم نے درخواست کی کہ ہماری املاک کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو اس سے مرحومین کی تدفین مناسب انداز میں کی جائے۔ مرزا مغل، ابوبکر اور خضر سلطان کو شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں دفنایا گیا۔ پھانسی پانے والے جھجر اور فرخ نگر کے نوابوں کو مہرولی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے قریب واقع ان کے خاندانی قبرستانوں میں دفنایا گیا۔ پھانسی پانے والے بلبھ گڑھ کے راجا بہادر کی چتا کو جمنا کے کنارے واقع نگم بودھ گھاٹ میں نذر آتش کیا گیا۔ مجھے اپنے باقی ماندہ بیٹوں اور بھتیجوں کے انجام کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ علم نہ ہوا کہ سزائے موت دیے جانے کے بعد ان کی لاشوں کو نظام الدین یا مہرولی میں دفن کر دیا گیا۔ صاحبوں کے ہاتھوں پھانسی پانے یا گولیوں سے ہلاک ہونے والے ہزاروں دوسرے لوگوں میں ہمارے دوست شاعر شیخ امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے بھی شامل تھے۔ کچھ پتا نہ چلا کہ ان کی لاشوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا۔

اس باغ میں' کہ جو کبھی ہماری سلطنت ہوا کرتا تھا' خزاں کی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے ہر درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ ہمارا قلبی سکون فنا ہو گیا تھا۔ ہم میں زندہ رہنے کی امنگ نہ رہی تھی۔ جیسے قیدی پرندہ اپنے پر قفس کی سلاخوں سے ٹکراتا ہے' اسی طرح ہم اپنا سر تہہ خانے کی دیواروں سے ٹکراتے اور اپنی قسمت پر ماتم کرتے تھے۔

کوئی زمانہ تھا کہ دنیا ایک ایسا باغ دکھائی دیتی تھی جہاں سہ پہر کی دھوپ کلیوں کو حرارت بخشتی تا کہ وہ اپنے سینوں میں چھپے خزانوں کو عیاں کر دیں۔ آج وہی دنیا لاکھوں لاشوں کی بدبو سے بھری ہوئی تھی۔

یہاں تھا وہ شہر جو دن میں دھوپ سے روشن ہوتا تھا اور رات کو چاندنی سے۔
یہاں تھا وہ شہر جہاں جنت کی حوروں جیسی حسین و جمیل عورتیں رہا کرتی تھیں!
کس نے برباد کر دیا اس شہر کو؟
وہ شہر دلی تھا۔ دنیا کے تمام شہروں کی ملکہ۔
اب وہ ایک ویرانہ بن چکا ہے۔
اے ظفر! کون سی قیامت گزری ہے؟ یا یوں ہے کہ تیرا شباب نہیں رہا؟
ہم پر جو گزری' اسے بیان کرنے کے لیے اشکوں سے بھرے کنویں کی ضرورت ہے۔

لوگ ہر وقت کھڑکیوں سے ہمیں یوں تکتے رہتے' جیسے ہم کوئی جانور ہوں۔ اچانک تہہ خانے کے دروازے کھلتے اور صاحبوں کی ٹولیاں داخل ہوتیں۔ ہماری عورتیں دیواروں میں چہرے چھپا لیتیں۔ ہمیں کھڑے ہو کر ہر سفید فام مرد اور عورت کو سلام کرنا پڑتا۔

وہ ہمیں طعنے دیتے: "تم ہی ہندوستان کا بادشاہ بننا چاہتے تھے نا!"
بعض اوقات کوئی نوجوان گورا بکری کے ممیانے کی نقل اتارتا۔ وہ کہتا:
"بڈھے! بتاؤ تمہاری بیویاں کہاں گئیں؟" اور سب ہنسنے لگتے۔

ہم نے ان سب ذلتوں کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کر لیا۔

ہم نے قلم اور کاغذ مہیا کرنے کی درخواست کی تھی' جسے رد کر دیا گیا۔ ہم نے اپنے حقے سے کوئلے لیے اور تہہ خانے کی دیواروں کو سلیٹ کے طور پر استعمال کیا۔ ہم اپنا وقت نماز ادا کرنے اور شعر کہنے میں صرف کرنے لگے۔

ہم نے اپنے شباب کے زمانے میں ایک ایسے عاشق کے حوالے سے شعر کہا تھا' جسے اس کی محبوبہ نے قید کر دیا تھا۔

لیکن ہمیں قید کرنے والا ہمارا محبوب نہیں بلکہ ہمارا دشمن تھا!

سفید فام لوگ ہمیں اس لیے وحشی کہتے تھے کیونکہ ہمارے فوجیوں نے سفید فام عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ واقفانِ حال حلفیہ کہتے تھے کہ ہم نے ہلاکتیں رکوانے کی ہر ممکن کوششیں کی تھیں۔ صاحبوں نے ہم پر یقین نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے تین درجن افراد کے بدلے ہمارے تین ہزار درجن افراد کو ہلاک کر دیا۔ ولد الحرام بوٹ چاٹنے والے کانے رجب علی کی یقین دہانیوں کے باوجود ہم پر مقدمہ چلایا گیا۔ صاحب ہی مدعی تھے' صاحب ہی وکیل تھے اور صاحب ہی جج تھے۔ انہوں نے ہمارا نمک کھانے والوں کو گواہ بنایا۔ حکیم احسن اللہ' درویش حسن عسکری' رجب علی' غلام عباس' مکندلال سب نے طوطوں کی طرح وہی کہانی سنائی جو انہیں رٹائی گئی تھی۔

ہمیں دکھ تو اس بات کا ہے کہ دوغلی نسل والی عائشہ آلڈویل نے بھی ہمارے خلاف گواہی دی۔ ہم نے اپنی جان داؤ پر لگا کر اس عورت کی اور اس کی تین بیٹیوں کی جان بچائی تھی۔ اس عائشہ کی ماں نے ایک گورے سے شادی کی تھی۔ عائشہ کی پرورش ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ تاہم چونکہ اس کی جلد کا رنگ قدرے صاف تھا اور اس کے باپ نے اسے انگریزی میں "گٹ مٹ" کرنا سکھا دیا تھا' اس لیے وہ ایک سفید فام عورت قرار پائی اور اس کی شادی ایک بوڑھے گورے سے ہو گئی۔ چونکہ اس نے قرآن مجید پڑھ رکھا تھا اور اس نے اپنی بیٹیوں کو کلمہ پڑھنا سکھایا تھا' اس لیے ہم

نے اس کا دفاع کیا تھا۔ ہمیں امید تھی کہ وہ ہمارے طرزِ عمل کی شہادت دے گی۔ تاہم اس نے ہماری توقعات پوری نہیں کیں۔ اللہ اسے اس کے کیے کی سزا دے!

اللہ ہمارا واحد گواہ تھا۔ کسی فانی انسان نے ہمارے حق میں بات کرنے کی جرأت نہ کی۔ انہوں نے ہم پر لگائے جانے والے ہر الزام کی تائید کی۔ ہمیں اس ملک سے نکل جانے کی سزا دی گئی' جسے ہمارے آباؤ اجداد نے فتح کیا تھا اور جس پر تین سو سال سے زیادہ عرصے تک ہمارے خاندان کی حکومت رہی تھی۔ کاش وہ ہمیں سزائے موت دے دیتے اور ہماری خاک دلی کی مقدس خاک میں مل جاتی۔

ہماری چودہ بیگمات اور بیٹا جواں بخت ہمارے ساتھ جلاوطن ہونے کے لیے آمادہ تھے۔ تاہم بعد میں کسی نہ کسی بہانے وہ لوگ ہمارے ہندوستان کی سرحد عبور کرنے سے پہلے ہی ہم سے الگ ہو گئے۔ ہماری محبوب بیگم زینت محل ہمارے ساتھ ہی رہیں۔ وہ اچھے دنوں کی طرح برے وقت میں بھی ہماری رفیق رہیں۔

بھاگ متی

بھاگ متی مجھ سے بہت مایوس ہے۔ وہ کہتی ہے: ذرا ان پنجابیوں کو دیکھو۔ جب یہ دلی آئے تھے تو ان کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی، اور اب؟ وہ سارے شہر کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے رہنے کو محل بنا لیے ہیں۔ وہ تندوری چکن کھاتے اور وسکی پیتے ہیں۔ وہ اپنی موٹی بیویوں کو غیر ملکی کاروں میں بیٹھا کر ہوا خوری کے لیے لے جاتے ہیں۔ ذرا خود کو تو دیکھیے! وہی چھوٹا سا فلیٹ وہی کھٹارا سی پرانی کار، ہارن کے علاوہ جس کا ہر حصہ بجتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ آپ ہی کی بستی سے چند سال پہلے آنے والے لوگ آدھے سے زیادہ نیو دلی کے مالک بنے ہوئے ہیں اور کروڑ پتیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کو سارا دن اخبار سے مکھیاں مار مار کر کیا ملا ہے؟ آپ نے کئی سال سے مجھے ایک ساڑھی تو کیا ایک چوڑی بھی نہیں دلوائی!''

جب بھاگ متی ایسے موڈ میں ہو تب خاموش رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ تاہم کبھی کبھار میرے چپ رہنے سے وہ زیادہ چڑ جاتی ہے اور کہتی ہے: ''آپ کچھ بولتے کیوں نہیں ہیں؟ آپ کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں؟ آپ سارا سارا دن آرام چیئر میں بیٹھے پاد مارتے ہوئے بوڑھے ہوئے جا رہے ہیں!''

اس کی یہ بات بچھو کی طرح ڈنک مارتی ہے۔ میں پھٹ پڑتا ہوں: ''چپ ہو جاؤ! میں تم سے ہم بستری کرتا ہوں اور تم اس کا معاوضہ لے لیتی ہو۔ اس سے زیادہ تم کیا چاہتی ہو؟''

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہتی ہے: ''ان دنوں آپ نہ تو ٹھیک سے ہم بستری کر سکتے ہیں اور نہ ہی مناسب معاوضہ دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ بدھو سنگھ چوکیدار بھی ہر مرتبہ میرے جاتے وقت پوچھتا ہے۔۔ وہ تمہاری پان بیڑی کے لیے تمہیں کتنے پیسے دیتا ہے؟۔ آپ کی دی ہوئی رقم سے صرف پان بیڑی ہی خریدی جا سکتی ہے۔ مجھ پر ناراض ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن میں آپ کی بہتری کے لیے سچ بولتی ہوں۔ میں کہتی ہوں' ٹھیکیداری یا ریڈی میڈ گارمنٹس برآمد کرنے جیسا کوئی دھندا کریں۔ آپ اخبار کے لیے قلم گھسیٹ کر اور میم صاحبوں کو قطب مینار کی سیر کروا کر جتنا کماتے ہیں' اس سے زیادہ کما لیں گے۔''

اس کی باتیں کسی حد تک درست ہیں۔ لیکن میں اس عمر میں کوئی ایسا نیا دھندا کیسے شروع کر سکتا ہوں' جس کی الف ب سے بھی میں واقف نہیں۔ اور اس کے لیے پیسہ کہاں سے لاؤں؟ میں چپ ہو رہتا ہوں۔ خاموشی اس قسم کے حملوں کا بہترین دفاع ہوتی ہے۔

میں ایک کتاب اٹھا کر یوں ظاہر کرتا ہوں جیسے اسے پڑھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی جائے۔ میں دلی کی طرح بھاگ متی سے بھی اکتانے لگا ہوں۔ جب کسی روز میرے پاس پیسہ آئے گا تو میں لندن یا نیویارک کا ون وے ٹکٹ خرید کر بھاگ متی کو بتائے بغیر آدھی رات کو دلی سے نکل جاؤں گا۔

وہ کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر میرے سامنے قالین پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے: ''آپ آج کل چڑچڑے سے ہو رہے ہیں۔ میں جب بھی آپ سے کچھ کہتی ہوں آپ غصے ہو جاتے ہیں۔ پہلے تو آپ مجھ پر کبھی غصہ

نہیں کرتے تھے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

میرے منہ سے آہ نکل جاتی ہے۔ میں اسے اس لیے جواب نہیں دیتا کیونکہ وہ درست کہہ رہی ہوتی ہے۔ وہ میری ٹانگیں دبانا شروع کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل نہایت خوشگوار اور شہوت افروز ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں جنگ ہار چکا ہوں۔ مجھے ایسی عورت کہاں سے ملے گی جو میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے میری اتنی خدمت کرے جتنی کہ بھاگ متی کرتی ہے؟ وہ میری ٹانگیں اپنی گود میں رکھ کر میرے تلوے سہلاتی ہے۔ اسے مالش کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ اسے پتا ہے کہ اب میں جنسی عمل سے زیادہ لطف مالش کروانے سے حاصل کرتا ہوں۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ میں اس وقت تک جنسی عمل کے لیے تیار نہیں ہو سکتا جب تک وہ میرے سر میں تیل ڈال کر اپنے سخت ہاتھوں سے بھرپور مالش نہ کرے۔ سر کے علاوہ پیروں کی مالش بھی مجھے جنسی عمل کے لیے تیار کر دیتی ہے۔ اگر مجھے نیند نہ آ رہی ہو تو مالش کروانے سے نیند آ جاتی ہے۔ میرے کسے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ میرا غصہ اُتر جاتا ہے۔ میں بھاگ متی اور دلی سے دور ہو جانے کے لیے ایئر ٹکٹ خریدنے کا خیال ترک کر دیتا ہوں۔ میں آپ کو بتا تو چکا ہوں کہ ایک بار آپ ان کی گرفت میں آ جائیں تو پھر کسی طور نکل نہیں سکتے۔

تعمیراتی ٹھیکیدار

ہماری ڈیوڑھی کی دیواروں پر دو رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔ وہ ڈیوڑھی ہمارے گھر کا داخلی راستہ بھی تھی اور مرد ملاقاتیوں کی انتظار گاہ بھی۔ ایک تصویر لکڑی کے اس تخت کے اوپر آویزاں تھی' جس پر میرا باپ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتا تھا۔ یہ ملکہ وکٹوریا کی تصویر تھی۔ اس کے سامنے والی دیوار پر گرونانک کی تصویر آویزاں تھی۔

میری ماں ہر صبح پوجا کے بعد ایک ایک سلگتی ہوئی اگربتی دونوں تصویروں کے فریموں میں لگا دیتی اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑتی تھی: پہلے گرو کی تصویر کے سامنے اور پھر ملکہ کی تصویر کے سامنے۔ میرا باپ بھی ہر شام پوجا کے بعد ملکہ کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور اونچی آواز میں کہتا: ''اے بھگوان! ہماری ملکہ پر رحمت فرما! ہماری ملکہ کی حکومت ہم پر طویل عرصے تک قائم رکھ! ہم رعایا پر رحمت فرما! ہمیں ہمیشہ اپنی ملکہ کا وفادار رکھ!''

جب 1901ء میں ملکہ وکٹوریا فوت ہوئی تو ہمارے گھر دو دن اور دو رات مسلسل گرنتھ کا پاٹھ ہوا اور پرارتھنا کی گئی کہ اس کی روح کو ہمارے گرو کے کنول جیسے قدموں میں جگہ ملے۔ جب اس کے بیٹے ایڈورڈ کو تاج پہنایا گیا تو ہم نے ان گھرانوں

کو مٹھائی بھیجی جن کے ساتھ ہمارا بھائی چارہ تھا۔ جب نو سال بعد بادشاہ ایڈورڈ فوت ہوا تو ایک بار پھر ہمارے گھر میں دو دن اور دو رات گرنتھ کا پاٹھ ہوا۔ جب چند دن بعد جارج پنجم کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا گیا تو ہم نے اس موقعے پر بھی مٹھائی تقسیم کی۔ ہمارا خاندان جتنا اپنے گرو کا وفادار تھا' اتنا ہی اپنے انگریز حکمرانوں کا بھی وفادار تھا' کہ جن کا نمک کھاتا تھا۔

جب 2 دسمبر 1911ء کو بادشاہ جارج اور ملکہ میری کا جہاز بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا' میرا باپ اور میں بذریعہ ریل گاڑی دلی پہنچے۔ میرا باپ اپنے حکمرانوں کے درشن کرنے اور تعمیراتی ٹھیکے حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ وہ کئی سال سے عمارتوں کی تعمیر کا کام کر رہا تھا۔ اس نے کالکا اور گرمائی دارالحکومت شملہ کے درمیان ریلوے لائن بچھائی تھی اور سرنگیں کھدوائی تھیں تاہم وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پہاڑوں میں سرنگیں کھدوانے سے زیادہ پیسہ مکانوں کی تعمیر میں ہے۔ اس نے مجھے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس نے کہا تھا: "تعلیم دولت کمانے کے لیے ہوتی ہے۔ دولت کمانے کے لیے جمع تفریق سیکھنا کافی ہوتا ہے۔ وہ تم سیکھ چکے ہو۔ باقی سب 'آلتو فالتو' ہے۔"

جب میں نے کہا کہ میں انگریزوں کی طرح انگریزی بولنا سیکھنا چاہتا ہوں تو وہ مشتعل ہو گیا۔ اس نے مجھے گالی دی: "بھڑوا۔" یہ اس کی پسندیدہ گالی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ اس نے میرے احساسات کو ٹھیس پہنچائی ہے تو اس نے نرمی سے کہا کہ انگریزی جنٹل مین اپنے جیسی انگریزی بولنے والے ہندوستانیوں کو نہیں بلکہ ٹوٹی پھوٹی انگریزیم بولنے والوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

میرا باپ غصے کا بہت تیز تھا اور اپنی چھڑی سے میری پٹائی کر دیا کرتا تھا۔ جب میں چودہ برس کی عمر کو پہنچا اور اس نے میری تعلیم کا سلسلہ منقطع کروانے کا فیصلہ کیا تو مجھے سکول چھوڑ کر اس کے تعمیرات کے کاروبار میں شامل ہونا پڑا۔ جب میں سترہ سال

کا ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ میری شادی کر دی جائے۔ اس نے ایک قریبی بستی کی تیرہ سالہ لڑکی کے ساتھ میری شادی کروا دی۔ میری بیوی کی عمر اٹھارہ اور میری بائیس سال ہونے سے پہلے ہم دو بیٹوں کے والدین بن چکے تھے۔ تب میرے باپ نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی بیوی اور دونوں بیٹوں کو بستی میں چھوڑ کر قسمت آزمانے کے لیے اس کے ساتھ دلی جانا چاہیے۔

میں نے دلی جتنا بڑا شہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ اس لیے بھی زیادہ بڑا لگ رہا تھا کہ پانچ سو راجے مہاراجے اپنے حواریوں سمیت وہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ دور دور سے ہزاروں عام لوگ اپنے حکمرانوں کو دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہمیں رہائش گاہ ڈھونڈنے میں تین دن لگ گئے۔ ہم نے ڈفرنگ برج کے قریب واقع بائیسکوپ کے عقب میں واقع ایک پرانی عمارت کی پہلی منزل پر دو کمرے لیے۔ دلی اور پنجاب' دلی اور راجپوتانہ' دلی اور وسطی ہندوستان کو جانے آنے والی ریل گاڑیاں ڈفرنگ برج کے نیچے سے گزرا کرتی تھیں۔

ہم نے چارپائیاں' میزیں اور کرسیاں خرید لیں۔ پھر ہم دربار کی تیاریاں دیکھنے گئے۔ شہر کی شمالی سمت 25 مربع میل کے رقبے پر 40000 خیموں کا شہر آباد کیا جا رہا تھا۔ اسے کنگزوے کیمپ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ کیمپ دریائے جمنا سے لے کر مشرق میں شالیمار باغ تک اور مغرب میں دور تک محیط تھا۔ وہاں سارا سارا دن رجمنٹل بینڈ ریہرسلیں کرتے رہتے' ہاتھیوں کو سونڈے سلامی دینے کی مشقیں کروائی جاتیں' مہاراجاؤں اور ان کے بیٹوں کو صفوں میں کھڑا ہو کر بادشاہ اور ملکہ کے سامنے جھک کر تعظیم دینے کی تربیت دی جاتی۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ' اس کی بیوی اور اس کا مشیر اعلیٰ میلکم ہیلے سارا سارا دن گھوڑے پر سوار وہاں چکر لگاتے اور ایک ایک شے کا جائزہ لیتے۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ ماہ 90000 چوہوں کو مارا گیا تاکہ دربار کی کارروائی میں کوئی خلل نہ پڑے۔

2 دسمبر 1911ء کو صبح چار بجے گھڑی کا الارم بجنے لگا۔ میرے باپ کی زندگی کا معمول گھڑی کے الارم کا پابند تھا۔ اس وقت شدید سردی تھی۔ جب میں نے ٹھنڈے برف پانی سے منہ دھویا تو میرے دانت بجنے لگے۔ ہم نے گزشتہ رات کی روٹیاں تیز گرم اور بہت میٹھی چائے کے ساتھ کھائیں اور اندھیرے ہی میں اپنی رہائش گاہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ ہم شاہی ٹرین کے گزرنے سے پہلے ڈفرنگ برج پر سے گزر گئے کیونکہ بعد میں پولیس نے اسے بند کر دینا تھا۔

ہم تین میل کا فاصلہ طے کر کے اپنی منزل پر پہنچے۔ بے شمار لوگ ہماری طرح کنگزوے کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ کیمپ کے قریب والی سڑکیں خوب روشن تھیں۔ سٹریٹ لائٹوں کے بجھنے سے پہلے ہم اپنی جگہوں پر پہنچ چکے تھے۔ سورج طلوع ہو گیا۔ میدان کے ایک سرے پر ایک چبوترہ تھا' جس پر لال قالین بچھا ہوا تھا اور ایک شامیانے تلے دو "تخت" رکھے ہوئے تھے۔ باقی سارے میدان میں مراتب کے اعتبار سے کرسیاں رکھی گئیں تھیں۔ وہاں 300000 افراد تو ضرور موجود رہے ہوں گے۔ میں نے خود سے کہا کہ تم دلی کے علاوہ پورے ہندوستان میں کس جگہ اتنے منظم اور باسلیقہ لوگ دیکھ سکتے ہو! سفید فام سپاہی لوگوں کو ان کی مقررہ نشستوں تک رہنمائی دے رہے تھے۔ کسی شخص کو ان سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ نہ کوئی چیخ چلا رہا تھا' نہ کوئی بحث و تکرار ہو رہی تھی۔ فوجی بینڈ مسلسل دھنیں بکھیر رہا تھا۔ ایک دھن ختم ہوتی تو دوسری شروع کر دی جاتی۔

اچانک بینڈ خاموش ہو گیا۔ ہم نے سنا دور کہیں توپوں نے اکیس گولوں کی سلامی دی۔ بادشاہ اور ملکہ دلی ریلوے سٹیشن پہنچ چکے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ ہمیں شہر کی طرف سے لوگوں کی آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں۔ ہم سمجھ گئے کہ شاہی جلوس آ رہا ہے۔ ہاتھیوں کی لمبی قطار گھنٹیاں بجاتی آئی۔ پھر رجمنٹل بینڈ آئے۔ ان کے بعد انفنٹری' کیولری' مزید بینڈز اور مزید

ہاتھی۔ میں غور سے ہر ہودے کو تکتا رہا تاکہ بادشاہ اور ملکہ کو پہچان سکوں' جن کی تصویریں میں دیکھ چکا تھا۔ جب سارے ہاتھی گزر گئے تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا:

"بادشاہ اور ملکہ کہاں ہیں؟"

وہ بھی انہیں دیکھ نہیں پایا تھا۔ اس نے گھوڑے پر سوار ایک لمبے تڑنگے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ لاٹ صاحب ہے۔"

میرے باپ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص بولا: "لارڈ ہارڈنگ کے ساتھ سفید گھوڑے پر سوار پستہ قامت جنٹل مین بادشاہ ہے۔"

میں مایوس ہو کر رہ گیا۔ اسے تو ہاتھی پر بیٹھا ہونا چاہیے تھا۔ لمبے تڑنگے وائسرائے کے پہلو میں تو بادشاہ ایک ڈاڑھی والا گلابی رنگ کا بونا لگ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب بادشاہ اور ملکہ تخت کی طرف جائیں گے' جب لوگوں کو پتا چلے گا کہ وہ تو گھوڑے پر سوار ان کے پاس سے گزرا تھا۔ جب بادشاہ اور ملکہ تخت کی طرف بڑھے تو سارے بینڈز قومی ترانہ "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے!" کی دھن بجانے لگے اور سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔

ہم ایسی جگہ بیٹھے تھے کہ کسی کی تقریر نہیں سن سکے۔ اگرچہ سفید فام سپاہی ہندوستانیوں کو دھکا کر اپنی اپنی حد میں رہنے پر مجبور کر رہے تھے تاہم دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو ہندوستانیوں کو مسلسل بولنے سے روک سکے۔ ہر کوئی دوسرے سے کہہ رہا تھا: "یہ دیکھو' وہ دیکھو۔" اچانک شور مچ گیا۔ ایک شامیانے کو آگ لگ گئی تھی اور لوگ بھاگنے لگے تھے۔ انگریز سپاہی چیخ رہے تھے: "بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ۔" لیکن کسی نے پروا نہیں کی۔ ہر شخص کو اپنی جان سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں تھی۔ میں اور میرا باپ بھی ہجوم کے ساتھ بھاگنے لگے اور چند منٹ میں کیمپ سے باہر نکل آئے۔ ہم نے اپنی رہائش گاہ میں پہنچنے سے پہلے کہیں دم نہ لیا۔

میں نے بنگال اور مہاراشٹر کے شرپسند لوگوں کے بارے میں سن رکھا تھا۔

شاید اس ہنگامے کے پیچھے انہی کا ہاتھ تھا۔ بازاروں میں لوگ آگ لگانے والوں اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد کے حوالے سے اندازے لگا رہے تھے اور شکر کر رہے تھے کہ بادشاہ اور ملکہ بال بال بچ گئے تھے۔ لوگ اندازے لگا رہے تھے کہ ضرور کچھ لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی اور سرکار شہر کے مشتبہ علاقوں کو نذر آتش کر دے گی۔

تاہم مقامی اخباروں کے شام کے وقت شائع ہونے والے خصوصی ضمیموں سے پتا چلا کہ آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی تھی' جسے فوری طور پر بجھا دیا گیا تھا اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ انہی ضمیموں میں اطلاع دی گئی تھی کہ حکومت نے چھ سال پہلے ہونے والے بنگال کی تقسیم کے فیصلے پر عمل درآمد کا حکم دیا ہے اور دارالحکومت کلکتہ سے دلی منتقل کر دیا گیا ہے۔

1905ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تو ہندو مشتعل ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق بڑھانے اور مشرقی بنگال میں ایک مسلم ریاست قائم کرنے کی سازش ہے۔ بنگال کے نوجوان ہندوؤں اور مہاراشٹریوں اور کچھ گمراہ سکھوں نے تقسیم بنگال کو ملتوی کرانے اور انگریز حکومت کو ختم کرنے کا سوچا۔ بنگال میں انگریز افسروں پر بم پھینکے گئے اور کچھ کو قتل کر دیا گیا۔ لارڈ کرزن کے بعد وائسرائے متعین ہونے والے لارڈ منٹو پر بھی گجرات میں قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ لندن میں پڑھنے والے ایک پنجابی نوجوان نے وِلی کو گولی مار کر قتل کر دیا۔

انگریزوں نے دانائی سے کام لیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ بنگال کو تقسیم نہ کیا جائے کیونکہ اس تقسیم سے لوگوں میں اشتعال پھیل رہا تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ بنگال کی تقسیم کا فیصلہ واپس لینے سے دہشت گردی ختم ہو جائے گی۔ ہوا بھی ایسا ہی لیکن اس سے یہ تاثر بھی قائم ہوا کہ انگریزوں کو بموں اور پستولوں سے ڈرایا جا سکتا ہے۔ قوم پرستوں نے کہا: یہ سوچنا غلط ہے کہ سفید فام نسل کے لوگ دوسروں کے افضل و برتر ہیں۔ اگر پستہ قد' زرد رنگت والے جاپانی روس کے سفید فام زار کو شکست دے سکتے ہیں

تو یہ امر یقینی ہے کہ 15 کروڑ ہندوستانی اپنے ملک میں موجود مٹھی بھر انگریزوں کا قیمہ بنا سکتے ہیں! وہ کہتے تھے کہ اگر سارے ہندوستانی مل کر ایک گڑھے میں پیشاب کریں تو ہندوستان میں موجود سارے انگریزوں کو اس میں ڈبویا جا سکتا ہے۔

دارالحکومت کی دلی منتقلی کا بے پناہ خیر مقدم کیا گیا۔ صرف کلکتہ میں کاروبار کرنے والے یورپیوں کے علاوہ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ انہیں شبہ تھا کہ یہ فیصلہ لارڈ ہارڈنگ کے ایما پر ہوا ہے۔ انہوں نے اس کے خلاف مہم شروع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ ''ھز میجسٹیز گورنمنٹ'' کے مخفف حروف ایچ ایم جی کا مطلب ہے: ''ہارڈنگ مسٹ گو۔'' (ہارڈنگ کو لازماً جانا ہوگا)۔ ان کی کوششیں اکارت گئیں۔

دلی ہمیشہ ہندوستان کا دارالحکومت رہا تھا۔ یہ ملک کے وسط میں تھا۔ ہارڈنگ سے پہلے بھی کئی وائسرائے اشارہ دے چکے تھے کہ وہ دلی کو ہندوستان کا سب سے اہم شہر تصور کرتے ہیں۔ 1877ء میں لارڈ لٹن نے دلی ہی میں ملکہ وکٹوریا کی تاج پوشی کا اعلان پڑھا تھا۔ اسی طرح 1903ء میں دلی ہی میں لارڈ کرزن نے بادشاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کے موقع پر دربار منعقد کیا تھا۔

اعلان کے بعد بادشاہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنا حکم واپس لے۔ دربار کے انعقاد کے تین دن بعد بادشاہ اور ملکہ نے کنگزوے کیمپ میں نئے دارالحکومت کی بنیاد کا پتھر رکھا۔ اگلے روز وہ برطانیہ جانے سے پہلے شیروں کا شکار کھیلنے کے لیے نیپال روانہ ہو گئے۔

میرا باپ ایک ایسا شخص تھا جو مستقبل میں دیکھ سکتا تھا۔ اسے دولت کمانے کا طریقہ آتا تھا۔

وہ بڑا کفایت شعار بھی تھا اور آلو پیاز جیسی چیزوں کی قیمتوں پر بھی کافی تکرار کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا: ''بچایا جانے والا پیسہ آمدنی میں شمار ہوتا ہے۔ آج ایک روپیہ بینک میں سود مرکب پر رکھوا دو۔ وہیں بینک میں پڑے پڑے وہ ایک روپیہ سو سال بعد

ایک لاکھ روپیہ بن جائے گا۔ اگرچہ اسے انگریزی بولنا نہیں آتی تھی مگر پھر بھی وہ انگریز افسروں کو شیشے میں اتار کر ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا تھا۔ وہ جب بھی ان سے ملنے جاتا سر پر بڑی سی پگڑی باندھتا' سیاہ کوٹ پہنتا اور بائیں کندھے سے کمر تک سنہری پٹی باندھتا تھا۔ وہ بازار میں دستیاب بہترین پھل خرید کر لے جاتا اور صاحبوں سے کہتا کہ یہ پھل اس کے باغ سے آئے ہیں۔ ہمارا کوئی باغ نہیں تھا۔ ہمارے آبائی قصبے ہڈالی میں صرف کھجوریں اگتی تھیں۔ اس نے مجھے کہا تھا: ''کبھی صاحبوں کو نقد رقم یا زیورات مت دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمہیں گالیاں دیں گے اور ٹھوکریں مار مار کر دفتر یا گھر سے نکال دیں گے۔ تاہم پھل تو 'ڈالی' ہوتا ہے' ایک قابل قبول تحفہ۔'' وہ صاحبوں کے چپراسیوں اور کلرکوں کو فیاضی کے ساتھ بخشش دیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے کہا تھا: ''یہ بخشش نہیں بلکہ محفوظ سرمایہ کاری ہوتی ہے۔'' اس کی یہ بات درست تھی۔ صاحبوں کے اس حق میں جاری ہونے والے احکامات کبھی فائلوں میں گم نہ ہوتے بلکہ ان پر فوری عمل درآمد کیا جاتا تھا۔

نئے دارالحکومت کی تعمیر کے منصوبے بننے لگے۔ میلکم ہیلے کو کمشنر بنایا گیا اور دارالحکومت کی تعمیر کا پراجیکٹ اس کے حوالے کیا گیا۔ جب ہیلے نے ہمارے ضلعی شہر شاہ پور کا دورہ کیا تو میرا باپ اس سے ملا۔ وہ اس ملاقات میں مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہم نے فتح پوری بازار میں دستیاب مالٹے' سیب اور قندھاری انار خریدے اور کئی ٹوکریوں میں رکھوا کر انہیں باریک گلابی کاغذ سے ڈھانپ کر چاندی کے دھاگوں سے بند کر دیا۔ ایک ٹوکری صاحب پرسنل اسسٹنٹ کو پیش کی گئی جبکہ دوسری کو کھول کر پھل اردلیوں میں بانٹا گیا۔ پرسنل اسسٹنٹ نے ہی ہیلے کو یاد دلایا کہ میرا باپ اسے پہلے بھی مل چکا ہے اور اپنے باغ کے پھل اس کی نذر کر چکا ہے۔ یقیناً ہیلے کو علم تھا کہ شاہ پور کے نواح میں پھل نہیں اگتے' تاہم اس نے خوشی کے ساتھ تحفہ قبول کر لیا۔ اس نے پنجابی میں میرے باپ سے پوچھا کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ میرے باپ نے مجھے

''آپ کا فرزند'' قرار دیتے ہوئے اس سے متعارف کروایا اور اپنے تعمیراتی تجربے سے اسے آگاہ کیا۔ ہیلے نے ہمارے نام پتے لکھ لیے اور بولا: ''اگر کوئی کام نکلا تو میں تمہیں بلا لوں گا۔''

چونکہ ہمیں ہیلے کے خط کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں تھا۔ اس لیے میرے باپ نے بینک میں مینیجروں' زمینوں کے مالکوں اور دلی کے نمایاں خاندانوں کے سربراہوں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کہا: ''انسان کو پتا نہیں ہوتا کہ کون کب کام آ جائے۔ انسان کو ہر اہم شخص سے میل جول رکھنا چاہیے۔''

ہم نے لال قلعے اور بادشاہی مسجد کی بھی سیر کی اور گوردواروں میں بھی گئے۔ گوردواروں کی حالت کافی خستہ تھی کیونکہ دلی میں سکھ بہت کم تھے اور وہ بہت امیر بھی نہیں تھے۔ حد تو یہ ہے کہ سیس گنج میں ہر اتوار کی شام کو ہونے والے اجتماع میں بھی سو سے زیادہ مرد اور عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔

ہم نے جس کو بھی بتایا کہ ہم نئے آئے ہیں' اس نے ہم سے پوچھا کہ ''ہم نے قطب مینار دیکھا ہے؟'' انہوں نے کہا کہ یہ دنیا کا سب سے اونچا مینار ہے اور اس کی سب سے اوپر والی منزل سے تم میلوں دور تک کا نظارہ کر سکتے ہو۔ ایک روز میرے باپ نے کہا: ''ہم کسی روز تانگے پر قطب مینار چلیں گے۔'' تب تک میں اپنے ہی خواب دیکھنے لگا تھا۔ میں نے کہا: ''میں تو اپنی موٹر کار میں قطب مینار جاؤں گا۔''

اس زمانے میں دلی کے درجن بھر امیر ترین گھرانوں کے علاوہ کسی کے پاس موٹر کار نہیں تھی۔ میرا باپ میرے عزم اور خود اعتمادی سے بہت خوش ہوا۔ تاہم اس نے ہنستے ہوئے کہا: ''موٹر کار خریدنے سے پہلے پیسہ کمانا تو سیکھو۔ تمہیں پتا ہے کار کی قیمت کیا ہے؟''

اس نے مجھے سائیکل دلوا دی۔ وہ بہت خوبصورت ہرے رنگ کی تھی۔ اسے انگلستان کی کمپنی ریلے نے تیار کیا تھا۔ میں جلد ہی اسے چلانا سیکھ گیا۔ ریلے سائیکل

اگلے پندرہ سال تک میری رولز رائس اور ڈائملر بینز رہی۔

انگریزوں کو شاباش ہو۔ وہ جب تمہارے لیے کچھ کرنے کا کہیں تو یقین رکھو کہ تمہارے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ ہیلے سے ملاقات کے ایک ماہ بعد اس کا خط آیا۔ اس نے ہمیں اپنے دفتر میں ملاقات کے لیے بلایا تھا۔

وہاں بہت سارے انگریز افسر موجود تھے۔ اس نے سینٹرل پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ (CPWD) کے چیف انجینئر سے ہمارا تعارف کروایا۔ چیف انجینئر نے ہمارے سلام کا جواب دینے کی زحمت کیے بغیر کہا: ''تم سڑکوں اور کلرکوں کے کوارٹروں کی تعمیر سے کام شروع کرو۔ میں تمہارا کام دیکھ کر مزید کام دینے پر غور کروں گا۔ کل سپرنٹنڈنگ انجینئر سے مل لینا۔''

میرا باپ سپرنٹنڈنگ افسر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سیدھا سی پی ڈبلیو ڈی کے دفتر چلا گیا۔ اس نے ایک کلرک سے اس دفتر میں کام کرنے والے ایس ای سے لے کر چپراسیوں تک کے نام پوچھ لیے۔ واپسی میں ہم ٹیلی گراف آفس رکے۔ میں نے زمینوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے گاؤں میں رہ جانے والے اپنے چھوٹے بھائی کو تار بھیجا کہ وہ ایسے بااعتماد آدمی بھیجے جو مزدوروں اور حساب کتاب کو سنبھال سکیں۔

اگلی صبح ہم دفتر سے پہلے ''اپنے باغ کے پھل'' لے کر ایس ای کے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے چپراسیوں کو فیاضی کے ساتھ بخشش دی۔ ایس ای نے ہم سے ملاقات نہیں کی۔ اس کے چیف اردلی نے ہمیں بتایا کہ صاحب ہندوستانیوں سے گھر میں کبھی ملاقات نہیں کرتا۔ مجھے آج تک پتا نہیں چلا کہ وہ پھل اس تک پہنچے تھے یا چپراسیوں نے خود کھا لیے تھے۔

ہم سی پی ڈبلیو ڈی کے دفتر چلے گئے۔ چند منٹ بعد ہی ایس ای بھی پہنچ گیا۔ اس نے ہمیں بلا لیا۔ یہ کام تو میری توقع سے بھی زیادہ آسان نکلا تھا۔ اس نے علی پور

روڈ پر واقع سیکرٹریٹ کی عارضی عمارت کے گرد بنائی جانے والی سڑکوں کا نقشہ دیا۔ کوئی ٹینڈر طلب نہیں کیا گیا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم دو دن کے اندر اندر لاگت اور کام کی تکمیل کے وقت کا تخمینہ جمع کروا دیں۔

ہم نے ساری سہ پہر بیٹھ کر مزدوروں، پتھروں، سیمنٹ، ریت اور نقل و حمل کے اخراجات کا اندازہ لگایا۔ دو لاکھ کا خرچ بنا۔ اگلے دن میرے باپ نے ہزار روپے کے نوٹ کے ساتھ تخمینہ اوورسیر کو دے دیا۔ اگلے دن اوورسیر ہمیں ملنے آیا۔ اس نے اچھے خاصے منافعے کے ساتھ ہمارے تخمینے کی منظوری دے دی تھی۔ میرے باپ نے اسے ہزار روپے کا ایک اور نوٹ اور سکاچ کی ایک بوتل دی۔ وہ اپنی کاروباری رفاقت کو پختہ بنانے کے لیے گلے ملے۔ یہ ہماری کاروباری زندگی کا معمول بن گیا۔ ہم اپنے تعمیراتی ٹھیکوں سے متعلقہ ہر ہندوستانی کو اس کا کمیشن پیشگی دے دیا کرتے تھے۔ بیشتر اینگلو انڈین افسر بھی رقم یا وسکی کے طلب گار ہوتے تھے۔ ہر بات سے باخبر انگریز افسر پھلوں کی ٹوکریوں یا "بڑا دن" پر دو ایک بوتل وسکی کے علاوہ اور کچھ قبول نہیں کرتے تھے۔

مجھے کاروبار کے گر سیکھنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ ہم نے باگڑی مزدور بھرتی کرنے کے لیے اپنے ایجنٹ راجپوتانہ بھیجے۔ وہاں سے مزدور بھرتی کرنے کا کام زیادہ مشکل نہیں تھا کیونکہ وہاں ہمیشہ قحط اور خشک سالی رہتی تھی۔ وہ آٹھ آنے میں (عورتیں اس سے بھی کم میں) سارا سارا دن پتھر کوٹنے اور ریت سیمنٹ ملا کر مصالحہ تیار کرنے جیسے مشکل کام کرنے کو تیار ہوتے تھے۔ وہ ہر شام اپنی کھولیوں میں واپس چلے جاتے جبکہ ان کی عورتیں مسلسل گانے گاتی رہتیں۔ ہم لوگ، جو کہ دولت کماتے تھے، اپنا وقت اسے شمار کرنے میں گزارتے اور اگر دوسرے ٹھیکیداروں نے ہم سے زیادہ دولت کمائی ہوتی تو ہم جلتے بھنتے رہتے۔

اپریل 1912ء میں بادشاہ کا متعین کردہ آرکیٹکٹ ایڈون لیوٹنز اور ٹاؤن

بلڈرز کی ایک ٹیم وہ جگہ دیکھنے آئی جہاں نیا دارالحکومت بننا تھا۔ انہوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر کنگز کیمپ' پہاڑی اور مجنوں کا قلعہ سے لے کر اوکھلا تک کا چکر لگایا۔ انہوں نے ہاتھیوں پر بیٹھ کر کئی مرتبہ کنگز کیمپ کا چکر لگایا اور فیصلہ کیا کہ یہ علاقہ دریا کے نزدیک اور دلدلی ہونے کی وجہ سے کارآمد نہیں ہے۔ انہوں نے پہاڑ گنج اور مہرولی نیز پرانا قلعہ کے عقب میں دریائے جمنا سے لے کر پہاڑی سلسلے تک محیط علاقے کا پندرہ دن جائزہ لے کر فیصلہ کیا کہ نئے شہر کے لیے موزوں ترین جگہ بستی ملچھا کے اردگرد کا علاقہ ہے اور وائسرائے کا محل اور سیکرٹریٹ رائے سین ہال پر تعمیر کیے جانے چاہئیں۔ لارڈ ہارڈنگ نے' کہ جس نے پہلے کنگز کیمپ کا انتخاب کیا تھا' ان سے اتفاق کیا۔ انہوں نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ بادشاہ اور ملکہ نے کنگز کیمپ میں بنیاد کا پتھر رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ زمین مقدس نہیں ہے۔ اسی بنیاد کے پتھر کو کسی اور جگہ بھی رکھا جا سکتا ہے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ ہیلے نے میرے باپ کو بلایا (اس وقت تک میرا باپ اس کا سب سے پسندیدہ ٹھیکیدار بن چکا تھا)۔ اس نے میرے باپ سے کہا کہ وہ بنیاد کے پتھر کو کنگز وے سے اکھاڑ کر ملچھا بستی میں رکھوا دے۔ اس نے کہا کہ اس بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی نہ بتایا جائے۔ وہ ہمیں اپنی کار میں صفدر جنگ کے مقبرے تک لے گیا۔ پھر وہاں سے ہم پیدل اس جگہ پہنچے جہاں بنیاد کے پتھر کو رکھنا تھا۔ وہاں خاردار تار لگوا کر دو مسلح پولیس والوں کو متعین کر دیا گیا تھا۔

میرے والد نے مجھے پہلی مرتبہ یہ ذمہ داری سونپی کہ میں کوئی کام اپنی مرضی سے انجام دوں۔ میں نے بنیاد کے پتھر کو اس کے پرانے مقام سے نکلوا کر نئی جگہ رکھوانا تھا۔ میں بہت پرجوش تھا۔ میں نے پہلے پتھر نکلوانے کے لیے گڑھا کھدوایا۔ پھر میں نے یہ کام انجام دینے کے لیے ایک بیل گاڑی اور چھ مزدور لیے۔ ہمیں چار پولیس والے بھی دیے گئے تھے۔ مئی کی ایک شام سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد میں بیل گاڑی پر مزدوروں اور پولیس والوں کو بٹھا کر خود سائیکل پر سوار ہو کر کنگز کیمپ پہنچا۔

میں نے پتھر نکلوا کر بیل گاڑی میں بچھائی گئی سوکھی گھاس پر رکھوا دیا۔ پتھر کو ترپال سے ڈھانپ دیا گیا۔ پھر ہم نے اپنا سفر شروع کیا۔ ایک آدمی پیٹرومیکس لیمپ لے کر آگے آگے چل رہا تھا۔ میں بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم کسی جنازے کی طرح لگ رہے تھے۔ ہم آدھی رات کے وقت ملیکھا پہنچے۔ ہمیں پتھر زمین میں رکھتے ہوئے مزید ایک گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے ہر مزدور کو ایک روپیہ اُجرت کے علاوہ دیا۔ جب میں گھر پہنچا تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ میرے باپ نے صبح کی پوجا کے درمیان مجھ سے پوچھا کہ کام کیسا رہا۔ میں نے اسے ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے مزدوروں کو ایک ایک روپیہ اضافی دیا ہے تو اس نے مجھے گالی دی: بھڑوا۔

اب ہم اتنی دولت کما رہے تھے کہ بہتر علاقے میں رہ سکتے تھے۔ (چونکہ ہم کھلی جگہ پر رفع حاجت کے عادی تھے' اس لیے تنگ بدبودار لیٹرین میں رفع حاجت کے لیے جانا ہمیں بہت برا لگتا تھا اور ہمیں قبض ہو جاتی تھی)۔

ہمیں عارضی سیکرٹریٹ کی تعمیر کا کوئی ٹھیکہ نہیں ملا۔ ہم نے نئے شہر کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے پاس تعمیراتی سامان اور مزدور تو موجود تھے' اس لیے ایک ماہ کے اندر ہی ہم نے دو کمرے' باورچی خانہ اور صحن تعمیر کروا لیا۔ ہمارا نیا گھر آٹے کی ایک پرانی چکی کے قریب تھا۔ ہماری دیکھا دیکھی دوسرے سکھ ٹھیکیداروں نے بھی ہمارے مکان کے ساتھ ساتھ مکان بنوا لیے۔ وہ علاقہ بعدازاں اولڈ مل روڈ کہلوایا۔ ہم پنجاب کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے اور مختلف ذاتوں سے تعلق رکھنے کے باوجود آپس میں یوں گھل مل گئے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

لیوٹز نے نئے شہر اور وائسرائے کے محل اور سیکرٹریٹ کا نقشہ تیار کیا۔ مجھے پتا چلا کہ پہلے لیوٹز نے جو نقشہ بنایا تھا' اس کے مطابق ہمایوں کے مقبرے کے پیچھے دریائے جمنا پر بند باندھ کر ایک آرائشی نہر نکالی جانی تھی' جو لال قلعے سے پرانے قلعے

تک جاتی۔ اس کے علاوہ پورے شہر سے گزرتی ہوئیں نہریں بنائی جاتیں۔ اس نقشے کو اس لیے منظور نہیں کیا گیا کہ اس پر بہت زیادہ رقم خرچ ہوتی۔ لیوٹز چاہتا تھا کہ جامع مسجد سے وائسرائے کے محل تک ایک سڑک بنائی جائے جو کہ پرانے شہر سے گزرے۔ اس کی بھی منظوری نہیں دی گئی۔ باقی نقشہ وائسرائے اور بادشاہ نے منظور کر لیا۔ لیوٹز نے انگلستان واپس جا کر بادشاہ سے ملاقات کی تھی۔ لیوٹز نے ہاتھ بٹانے کے لیے اپنے ایک پرانے دوست ہربرٹ بیکر کو اپنا معاون بنا لیا تھا۔ لیوٹز نے وائسرائے کے محل اور جنگ کی یادگاری محراب کا تفصیلی نقشہ بنایا جبکہ بیکر نے سیکرٹریٹ اور پارلیمنٹ کا نقشہ بنایا۔ باقی کام دونوں نے برابر برابر بانٹ لیا۔ وہ دونوں کئی سال سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بیکر نے جنوبی افریقہ میں عمارتوں کی تعمیر کے لیے لیوٹز کو اپنا معاون چنا تھا۔ لیوٹز نے نئی دلی کی تعمیر میں اسے اپنا معاون بنا کر اس کے احسان کا بدلہ دیا تھا۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ وہ اچھے دوست ہیں۔ تاہم لیوٹز کی اعلیٰ صلاحیتوں اور شاہی خاندان نیز وائسرائے کی بیوی کے ساتھ اس کے اچھے مراسم کی وجہ سے بیکر اس سے حسد کرتا تھا۔

لیوٹز وژن سے مالا مال شخص تھا۔ اگرچہ لیوٹز اور بیکر دونوں ہی کی رائے ہمارے قدیم محلات' مساجد اور مندروں کے حوالے سے اچھی نہیں تھی تاہم دونوں متفق تھے کہ وہ اپنے ڈیزائنوں کو ہلکا سا ہندوستانی رنگ ضرور دیں۔ مجھے لیوٹز کی اس بات نے بہت متاثر کیا کہ سڑکیں بنوانے سے پہلے اس نے ان کے لیے مجوزہ راستوں کے دونوں طرف درخت اگانے کا حکم دیا۔ اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑی نرسری بنائی گئی۔ لیوٹز چاہتا تھا کہ نیم' اور برگد جیسے آہستہ آہستہ بڑھنے والے لیکن گھنے اور طویل العمر درخت لگائے جائیں۔ سرکاری ہارٹی کلچرسٹ نے سالیج اور افریقی ٹیولپ جیسے انوکھے اور دلکش درخت درآمد کروائے۔ لیوٹز کہتا تھا کہ وہ ایسا شہر تعمیر کروائے گا جو اگلے دو سو سال تک لوگوں کے لیے کافی رہے گا۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جب انگریز ہندوستان کے معاملات ہندوستانیوں کے حوالے کر کے یہاں سے چلے

جائیں گے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ ویسا ہی پاگل انگریز تو نہیں جو قوم پرست ہندوستانیوں کے حامی تھے تاہم اس کی بیوی کے حوالے سے ایسا ہی مشہور تھا۔ افواہ پھیل گئی کہ وہ مدراس بھاگ گئی ہے جہاں وہ اوتار ہونے کا دعویٰ کرنے والے ایک ہندو لڑکے سے عشق کرنے لگی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں لیوٹز سے کئی مرتبہ اس کے دفتر اور بنگلے میں ملا تھا لیکن میں نے اس کی بیوی کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنی بیوی کے حوالے سے بات کرنے کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

دلی میں گزرنے والی پہلی گرمیوں نے ہی ہم سے فیصلہ کروا دیا کہ ہم یہاں گھر بنالیں۔ دلی میں ہماری بستی کی نسبت گرمی کم ہوتی تھی اور یہاں کا ساون بھی بہت خوشگوار ہوتا تھا۔ سب سے بڑھ کر ہم نے اپنی سوچوں سے بھی زیادہ دولت کمالی تھی۔ خزاں آتے آتے ہم نے اپنے مکان میں مزید کمروں کا اضافہ کرلیا' ایک مالی اور دو گھریلو ملازم رکھ لیے۔ میری ماں' بیوی اور بیٹے بھی یہاں آ گئے۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنی بستی کے جن لوگوں کو کلرک' منشی اور سٹور کیپروں کی حیثیت سے ملازمتیں دی تھیں' ان کے گھرانے بھی دلی آ گئے۔ اس کے بعد سے ہم صرف کسی شادی یا فوتیدگی پر ہی بستی جانے لگے۔

شاہی دربار کے انعقاد کے ٹھیک ایک سال بعد ایک اور دربار منعقد کیا گیا۔ اس مرتبہ دربار کا انعقاد وائسرائے اور اس کے خاندان کے دلی میں باقاعدہ قیام پر کیا گیا تھا۔ دلی ریلوے سٹیشن اور لال قلعے میں ان کے خیر مقدم کے زبردست انتظامات کیے گئے۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی ریہرسلیں کی گئیں اور سخت حفاظتی اقدامات اٹھائے گئے۔ ہیلے سارے انتظامات کروا رہا تھا۔ اس نے ڈی آئی ڈی کے سربراہ کلیولینڈ کو کہا کہ وہ راستے میں آنے والے ہر مکان اور دکان کی تلاشی لے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ کوئی دہشت گرد قریب بھی نہ آ سکے۔ چاندنی چوک میں مکانوں اور دکانوں کی چھتوں پر مسلح پولیس والے متعین کیے گئے۔ میں نے سوچا کہ یہ حفاظتی اقدامات قطعاً

غیر ضروری ہیں کیونکہ مجھے آج تک کوئی ایک دلی والا ایسا نہیں ملا تھا جو انگریزوں کا مخالف ہو۔

شاہی دربار والے دن کی طرح وائسرائے کے دربار والے دن بھی ہم صبح سویرے چار بجے جاگ گئے۔ ہمیں اس وقت جاگنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وائسرائے اور اس کی بیوی نے سہ پہر کے وقت آنا تھا۔ تاہم جوش اتنا تھا اور موزوں نشست ڈھونڈنے کی فکر اتنی تھی کہ ہم وقت سے پہلے ہی مقررہ جگہ پہنچ جانا چاہتے تھے۔ 23 دسمبر 1912ء کی صبح بہت سردی تھی اور نیلے آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ ہر پھول اور گھاس کی ہر پتی اوس سے دھلی ہوئی تھی۔ میں نے دلی میں آمد کے بعد سے اتنی کامل صبح کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ہم دن کے گیارہ بجے گھر سے نکل آئے۔ ہم نے اپنے گھرانے کے افراد' کلرکوں' ملازموں اور ان کے گھرانے کے افراد کے لیے چار تانگے لیے۔ ہمارے ساتھ سینکڑوں مزدور مرد اور عورتیں پیدل چل رہے تھے۔ ہم اجمیری دروازے پر تانگوں سے اتر آئے اور طوائفوں کے محلے چاوڑی بازار اور نئی سڑک سے گزرتے ہوئے کلاک ٹاور کے سامنے پہنچ گئے۔ وہاں ہجوم پہلے سے ہی اکٹھا ہو چکا تھا۔ ہم چاندنی چوک سے گوردوارہ سیس گنج پہنچ گئے۔ محافظوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس روز صرف سکھوں کو گردوارے میں داخل ہونے دیا جائے۔ پس ہم فوارے کے سامنے والی بالکونی میں بیٹھ گئے۔

توپیں چلنے کی آواز سے ہمیں پتا چل گیا کہ وائسرائے کی ٹرین پہنچ چکی ہے۔ ریلوے سٹیشن پر مہاراجاؤں نے ان کا استقبال کیا۔ دلی کے شہریوں کی طرف سے میونسپل بلڈنگز میں خطبۂ استقبالیہ دیا گیا۔ جب پولیس کا بینڈ ہمارے سامنے سے گزرا تو ہم سمجھ گئے کہ میونسپل بلڈنگز والی تقریب اختتام کو پہنچ چکی ہے اور وائسرائے ادھر آ رہا ہے۔ پولیس بینڈ کے پیچھے بیگ پائپ بجاتے ہائی لینڈرز' سکھ نیلاری اور دوسرے فوجی

دستے آ رہے تھے۔ میں نے ہاتھیوں کی قطار کو آہستہ آہستہ آتے دیکھا۔ ان کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی۔ وائسرائے اور اس کی بیوی ہندوستان کے سب سے بڑے ہاتھی ''گجومت'' پر بیٹھے تھے' جو قطار میں آٹھویں نمبر پر تھا۔ یہ ہاتھی اس موقعے پر استعمال کے لیے فرید کوٹ کے راجا نے مستعار دیا تھا۔

اچانک جلوس رک گیا۔ بہت سارے لوگوں نے زوردار آوازوں میں نعرے بازی شروع کر دی۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے ایک دھما کا سنا تھا لیکن اس بات کا مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ کریکر کا تھا یا بم کا۔ قطار کے پہلے چار ہاتھی ہم سے تھوڑے فاصلے پر رک گئے تھے۔ میں نے لوگوں کو چاندنی چوک کی پہلو والی گلیوں میں بھاگتے دیکھا۔ چھتوں پر موجود لوگ غائب ہو چکے تھے۔ کلاک ٹاور سٹریٹ کی طرف بھاگنے والے کچھ لوگ چیخ رہے تھے: ''بھاگو' بھاگو۔'' میں نے جو دوسرے الفاظ سنے' وہ تھے ''بم'' اور ''مار ڈالا۔'' میں نے سوچا کیا کسی نے وائسرائے کے ہاتھی پر بم پھینک کر اسے اور اس کی بیوی اور خدمت گاروں کو قتل کر دیا ہے؟

ہم دم بخود تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ اب کدھر جائیں۔ ہم جانتے تھے کہ وائسرائے کے مرنے کی صورت میں کیا ہو گا۔ گوردوارے سے تھوڑی ہی دور تھانے کے پرلی طرف سنہری مسجد تھی۔ اسی مسجد سے نادر شاہ نے دلی کے شہریوں کے قتل عام کا حکم دیا تھا' کیونکہ کسی نے اس پر گولی چلا کر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ صاحبوں کو غصہ آہستہ آہستہ آتا تھا لیکن جب آتا تو بہت خوفناک غصہ آتا تھا۔ 1857ء کی بغاوت کو کچلنے کے بعد انہوں نے اسی چاندنی چوک میں سینکڑوں لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا اور شاہی مسجد کے سامنے والے بازار کو دکانوں اور گھروں سمیت دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ ہم نے گردوارے کے دروازے بند کر دیے اور گرنتھ صاحب کے گرد جمع ہو کر گرو کا کلام سننے لگے۔

ہم نے رات ہونے کا انتظار کیا اور پھر گردوارے سے نکل لیے۔ کوئی تانگہ

یا اِکّا دستیاب نہیں تھا لہٰذا ہمیں ویران گلیوں سے پیدل گزرنا پڑا۔ میرا باپ سارے راستے زیرِ لب واہ گرو واہ گرو پڑھتا رہا۔

مجھے اس رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ میں سوچتا رہا کہ اگر وائسرائے مر گیا تو کیا ہوگا؟ کیا وہ نئی دلی کی تعمیر جاری رکھیں گے؟ کیا اس تجربے کے بعد انگریز کسی ہندوستانی پر بھروسہ کریں گے؟

اگلی صبح اخبارات کے ذریعے ہمیں اصل واقعے کا پتا چلا۔ بم ایک بینک کی عمارت کی چھت پر سے پھینکا گیا تھا۔ اس حملے میں وائسرائے شدید زخمی جبکہ اس کا چھتری بردار ہلاک ہوگیا تھا۔ وائسرائے کو فوراً کار میں ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ وائسرائے کا ذاتی ملازم بھی زخمی ہوا تھا۔ اسی ہاتھی پر موجود وائسرائے کی بیوی اور ایک اور ملازم محفوظ رہے تھے۔ لال قلعے میں تقریب منعقد ہوئی تھی اور وائسرائے کی جانب سے مسٹر فلیٹ وڈ ولسن نے تقریر کی تھی۔

لارڈ ہارڈنگ نے اس سے پہلے نئے شہر کے علاوہ کسی اور موضوع پر کم ہی غور کیا تھا۔ اب وہ اس میں دلچسپی کھو بیٹھا۔ اس کے زخم طویل عرصے میں بھرے۔ وہ لیوٹز کی بجائے بیکر کو زیادہ اہمیت دینے لگا۔ اس کی بیوی لیوٹز کی حامی تھی۔ پھر وہ بیمار ہوگئی اور اسے آپریشن کے لیے انگلستان لے جانا پڑا۔ آپریشن کے کچھ عرصے بعد وہ مر گئی۔ اس دوران اخبارات یورپ میں جنگ چھڑ جانے کی خبروں سے بھر گئے۔ میں نے سوچا کہ جنگ کے دوران نئے شہر کی تعمیر کے بارے میں کون سوچتا ہے؟ اگر انگلستان جنگ ہار جاتا تو نئی دلی بھی نہ ہوتا۔

اگست 1914ء میں انگلستان نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ہندوستان کی طرف سے جنگ کا اعلان کیا۔ میلکم ہیلے نے میرے باپ کو بلا بھیجا۔ اس نے مجھے بھی اس کے ساتھ بلایا تھا۔ اس کا انداز بڑا دوستانہ تھا۔ اس نے کہا: سجان سنگھ! (یہ میرے باپ کا نام تھا) تم جانتے ہو ہندوستان جرمنی کے ساتھ جنگ

کررہا ہے۔ ہمیں محاذ پر بھیجنے کے لیے بہت سارے لڑاکوں کی ضرورت ہے۔ تم ایک ایسے علاقے سے آئے ہو جس کے سپاہی سارے ملک کے بہترین سپاہی ہوتے ہیں۔ تم ہڈالی جا کر فوج کے لیے رنگروٹ بھرتی کرو۔ تمہیں اس کا اچھا معاوضہ دیا جائے گا۔

میرے باپ نے ہیلے کو یقین دہانی کروائی کہ وہ اپنی سی بہترین کوششیں کرے گا اور انگلستان کی فتح کے لیے بھگوان سے پرارتھنا کرے گا۔

ہم نے کام آپس میں بانٹ لیا۔ مجھے دلی میں کاروبار سنبھالنا تھا اور میرے باپ کو ضلع شاہ پور کی بستیوں کا دورہ کرنا تھا۔ اسے رنگروٹ بھرتی کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ وہاں بے شمار بے روزگار نوجوان موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر بلوچ مسلمان تھے' جن کے رشتہ دار فوج میں ملازمتیں کر رہے تھے۔ اس نے کچھ سکھوں کو بھی فوج میں بھرتی ہونے پر تیار کرلیا۔ ہماری چھوٹی سی بستی ہڈالی کی آبادی بمشکل دو سو گھرانوں پر مشتمل تھی۔ میرے باپ نے وہاں سے بھی چار سو 37 جوان بھرتی کرلیے۔ اس نے مجھے جوانوں کے ناموں کی فہرست بھیجی تاکہ میں وہ فہرست ہیلے کو دکھا دوں۔ مجھے بڑی نرم شرائط پر مزید ٹھیکے حاصل ہو گئے۔ ہیلے نے ہم سے یہ بھی وعدہ کیا کہ ہم نئی دلی میں جتنی زمین چاہیں خرید سکتے ہیں کیونکہ حکومت چاہتی ہے کہ نجی سرمایہ کار دکانیں' ریستوران' ہوٹل اور سینما گھر تعمیر کر کے نئی دلی کی تعمیر کا بوجھ بٹائیں۔

جنگ کے دوران کوئی بڑا تعمیراتی کام نہ ہو سکا۔ وائسرائے نے اپنی ساری توانائیاں جنگ جیتنے میں صرف کر دیں۔ اس نے سارے ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ اس کا ذہن اس کے اپنے خاندان میں رونما ہونے والے المیوں کی وجہ سے بھی بٹ گیا تھا۔ اس کی بیوی کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا فرانس میں ایک معرکے کے دوران شدید زخمی ہو گیا۔ اس کے تین اے ڈی سی چند ماہ کے اندر ہلاک ہو گئے۔

برطانیہ کو توقع تھی کہ وہ جنگ چند ماہ میں جیت جائے گا لیکن جنگ طول پکڑتی گئی۔ انگریز اتنے ناقابل شکست نہیں تھے جتنا کہ ہم یقین کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے

ہزاروں جوان انگریزوں کی جانب سے لڑ رہے تھے' اس کے باوجود ہم ہندوستانی انگریزوں کی شکستوں پر خوش ہوتے تھے۔ جب بھی جنگ کا موضوع چھڑتا' کوئی نہ کوئی شخص کسی اردو شاعر کا شعر ضرور پڑھتا' جس کا مفہوم تھا: ''فتح تو انگریز پاتے ہیں لیکن علاقے پر قبضہ جرمن کرتے ہیں۔''

لارڈ ہارڈنگ کا وائسرائے کی حیثیت سے ملازمت کا عرصہ ختم ہوگیا تو اسے کہا گیا کہ وہ مزید چھ ماہ اس عہدے پر خدمات انجام دے۔ اس کی جگہ آنے والے وائسرائے چیمس فورڈ نے اپنے پیشرو کی نسبت نئے دارالحکومت کی تعمیر کے منصوبے میں کم دلچسپی لی۔ مشہور تھا کہ لیوٹز اور بیکر میں بول چال بند ہے۔ اس بات پر مشکل سے یقین آتا تھا کہ دنیا کے دو عظیم آرکیٹیکٹ معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے جھگڑا کر سکتے ہیں۔ ان میں اختلاف اس بات پر ہوا تھا کہ لیوٹز چاہتا تھا کہ سیکرٹریٹ سے وائسرائے کے محل تک جانے والی سڑک ایسی بنائی جائے کہ وائسرائے کا محل دور سے نظر آئے جبکہ بیکر کی رائے اس کے برعکس تھی۔ معاملہ ہارڈنگ تک پہنچا۔ اس نے بیکر کی حمایت کی۔ چیمس فورڈ نے اس معاملے میں بھی اپنے پیشرو کی پیروی کی۔ جھگڑا زاویے میں صرف ڈیڑھ فٹ تبدیلی کا تھا۔

جنگ جتنی لمبی ہوتی گئی' ہندوستانی سیاست دان اتنے ہی زیادہ منہ زور ہوتے گئے۔ وہ بنئے اور سیاست دان تھے۔ انہوں نے ہمارے لڑاکا جوانوں کی مدد کے لیے انگلی تک نہیں ہلائی۔ بلکہ اپنے لیے زیادہ مراعات کی خاطر زیادہ خودمختاری کا مطالبہ کرنے لگے۔ چیمس فورڈ ایک کمزور شخص تھا۔ اس نے اپنی حکومت کو لکھا کہ ہندوستانیوں کو مزید اختیارات دیے جانے چاہئیں۔ نومبر 1917ء میں ایک 38 سالہ یہودی صورتحال کا جائزہ لینے ہندوستان آیا۔ وہ یہاں تقریباً چھ ماہ رہا۔ چیمس فورڈ اور اس نے مل کر اصلاحات تیار کیں۔ صوبوں میں منتخب اراکین کو مزید محکموں کا انتظام دے دیا گیا۔ وائسرائے کے چھ مشیروں میں تین ہندوستانی شامل کیے گئے۔ شہزادوں کو ان کے اپنے

چیمبر دیے گئے۔ تاہم ان سب اصلاحات پر عمل درآمد جنگ ختم ہونے کے بعد ہونا تھا۔

جنگ اچانک نومبر 1918ء میں ختم ہوگئی۔ یہ وقت تھا کہ ہم اپنے ساتھ کیے گئے وعدوں کے مطابق انعامات حاصل کرتے۔ ہم نے انگریزوں کی امید سے بڑھ کر کام کیا تھا۔

ہمیں پنجاب کی نہر کالونیوں میں بڑی بڑی زمینیں دی گئیں۔ مجھے دلی میں اپنی پسند کے پلاٹ خریدنے کا موقع دیا گیا۔ جب مرکزی عمارات کے ٹینڈر طلب کیے گئے تو میں نے سیکرٹریٹ کے جنوبی بلاک، وار میموریل آرک اور کلرکوں کے کوارٹروں کی تعمیر کا ٹھیکہ دینے کی التجا کی۔ میرے باپ کو جو اس وقت تک کافی بوڑھا ہو چکا تھا، سردار صاحب کا خطاب دیا گیا۔ میں اس کی زندگی ہی میں گھرانے کا حقیقی سربراہ بن گیا تھا۔ میں نے پنجاب کی زرعی زمینوں اور دیگر جائیداد کی نگرانی کا کام اپنے چھوٹے بھائی کو سونپ دیا۔ میں نے خود کو مکمل طور پر تعمیراتی کام میں محو کر دیا اور اپنی ذاتی کار کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے دولت کمانے میں مصروف ہو گیا۔

چار سالہ جنگ کے خاتمے کے بعد بھی ہندوستان میں امن قائم نہ ہوا۔ جنگ کے دوران ہندوستان میں زیادہ امن تھا لیکن جنگ کے بعد افراتفری میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا اس لیے میں نے اپنی آنکھوں سے بدامنی کا مشاہدہ کیا۔ مجھے ڈپٹی کمشنر اکثر پولیس کے ساتھ شہر کے گڑبڑ والے علاقوں میں بلا لیا کرتا تھا۔

ایک نیا لیڈر گاندھی منظر عام پر آیا۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے حکومت مخالف احتجاجوں میں مسلمانوں کو بھی ہندوؤں کے ساتھ ملا لیا۔ اسی زمانے میں ملک میں انفلوئنزا کی وبا پھیل گئی جس سے لاکھوں افراد ہلاک ہو گئے۔ پھر فصل اچھی نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑ گیا۔ ان عذابوں پر مستزاد گاندھی کا یہ مطالبہ تھا کہ حکومت جنگ کے دوران حاصل کرنے والے اختیارات کا استعمال ترک کر دے۔ مسلمان مطالبہ کر رہے تھے کہ انگریز عثمانی سلطنت کے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ میں سوچتا تھا کہ ہندوستان

کے 80 فیصد ہندوؤں اور سکھوں کو ترکی یا خلافت سے کیا دلچسپی ہے؟ تاہم لیڈروں کی چال کامیاب رہی۔ میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی گڑھے سے پانی پیتے دیکھا۔ میں نے انہیں "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے نعرے لگاتے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بازاروں میں جلوس نکالتے دیکھا۔ مسلمانوں نے شاہی مسجد میں جمعے کے اجتماع سے خطاب کے لیے ایک ہندو شردھانند کو دعوت دی۔ حکومت نے بالکل درست اقدام کیا کہ گاندھی کے دلی میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ اس پر گاندھی نے پنجاب جانے کی کوشش کی جہاں لاہور اور امرتسر سمیت کئی شہروں میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ ان حالات میں افغانستان کے امیر امان اللہ کو شہ ملی کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو۔ حکومت نے ان مسائل کو آہنی ہاتھ سے حل کیا۔ میں نے تقریباً تین ہفتے دن رات پولیس کے ساتھ ڈیوٹی دی' جو احتجاج کرنے والے ہجوموں کو منتشر کرنے پر مامور تھی۔

امرتسر میں جنرل ڈائر نے ایک غیر قانونی جلسے پر گولی چلوائی' جس سے ساڑھے تین سو سے زیادہ افراد ہلاک جبکہ ہزاروں افراد زخمی ہو گئے۔ صوبے میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ شرپسندوں کو سر عام کوڑے مارے گئے' ان کی املاک ضبط کر لی گئیں اور ان کے لیڈروں کو صوبہ بدر کر دیا گیا۔ جہاں تک امان اللہ کا تعلق ہے تو اس کا تختہ الٹ دیا گیا۔ 1919ء اور 1920ء کے برس یقینی طور پر ہندوستان کے لیے برے تھے۔ تاہم انہی برسوں میں میرے خواب حقیقت میں ڈھلنے شروع ہوئے۔

حکومت کو نئے شہر کی تعمیر سے کوئی شے نہ روک سکی۔ دلی کے جنوب میں بیس میل دور واقع بستی بدر پور سے کناٹ سرکس تک ایک ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اسے امپیریل دلی ریلوے کا نام دیا گیا۔ اسے تعمیراتی سازو سامان لانے کے لیے بچھایا گیا تھا۔ دو بڑے بڑے شیڈ بنائے گئے جن کے نیچے پتھر کاٹنے والی مشینیں نصب کی گئیں۔ سنگ مرمر کو مطلوبہ سائز میں کاٹنے کے لیے ہزاروں لوگوں کو بھرتی کیا گیا۔ 50 ہزار مردوں اور عورتوں کو مزدور کے طور پر بھرتی کیا گیا۔ خود میرے عملے میں 50 سے زیادہ

منشی اور اکاؤنٹینٹ اور 3 ہزار سے زیادہ مزدور تھے۔ سیاست دان اپنی تقریروں میں نئے دارالحکومت کو دولت کا مجرمانہ ضیاع قرار دیتے رہے جبکہ ہم ایک ایسا نیا شہر تعمیر کرتے رہے' جیسا شہر ہندوستانیوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

1920ء کا موسم سرما آتے آتے صورتحال بہتری کی طرف مائل ہوئی۔ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دلی ہی میں مقیم تھا جبکہ میرے باپ نے میرے چھوٹے بھائی کے پاس دیہات میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگرچہ میں کار خرید سکتا تھا' تاہم میں اپنے باپ کے ردعمل کی طرف سے ڈرا ہوا تھا۔ وہ ایسی فضول خرچیوں کا سخت مخالف تھا۔ کار کی بجائے میں نے ایک گھوڑا اور چار پہیوں والی وکٹوریا خریدی' جس میں بیٹھ کر میرے بچے—دو بیٹے اور ایک بیٹی—دریا گنج میں واقع اپنے سکول جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ میں اس میں بیٹھ کر مختلف زیرتعمیر عمارتوں کا جائزہ لینے جایا کرتا تھا۔ میں کبھی کبھار رات دس بجے گھر واپس آتا۔ کبھی کبھار میں سارا دن کام کرنے کے بعد رات کو کسی دوست کے ہاں جا کر ایک یا دو جام وسکی پیتا اور چاوڑی بازار سے آنے والی طوائفوں کے مجرے دیکھتا۔ اگر میرا باپ دلی میں ہمارے ساتھ رہ رہا ہوتا تو مجھے کبھی مذکورہ بالا کاموں کی جرأت نہ ہوتی۔

میں نے جنتر منتر روڈ پر اپنے لیے ایک دو منزلہ مکان تعمیر کروایا۔ یہاں نصف درجن کے لگ بھگ دوسرے سکھ ٹھیکیداروں نے بھی اپنے مکان تعمیر کروائے ہوئے تھے۔ اگرچہ میں ان سے زیادہ کما رہا تھا تاہم وہ اپنے اوپر زیادہ خرچ کرتے تھے جبکہ میں خود پر اپنا پیسہ کم خرچ کرتا تھا۔ ایک سکھ ٹھیکیدار نے' جو کہ پتھر کی فراہمی کے ٹھیکے لیتا تھا' اپنے لیے پتھر اور سنگ مرمر کا محل نما ایک مکان تعمیر کروایا تھا' جو کہ دلی کے تمام نجی مکانوں سے بڑا تھا۔ ایک اور سکھ ٹھیکیدار' جس کا باپ ڈاکو تھا' کا کاروبار مجھ سے آدھا تھا لیکن اس نے دو کاریں رکھی ہوئی تھیں۔

ایک موسم گرما میں مجھے اپنے بھائی کا تار ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ باپ بیمار

ہے اور میں جتنی جلد ممکن ہو اسے دیکھنے پہنچوں۔ اس زمانے میں میرا بھائی میاں چنوں میں رہتا تھا۔ وہاں وہ ایک کاٹن جننگ فیکٹری چلا رہا تھا اور دو سو ایکڑ سے زیادہ زرعی اراضی کا مالک تھا۔ اس نے ریلوے حکام کو قائل کیا کہ وہ قریبی ریلوے سٹیشن کا نام ہمارے باپ کے نام پر کوٹ سجان سنگھ رکھ دیں۔ میں ٹھیک وقت پر میاں چنوں پہنچ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا باپ دنیا چھوڑنے سے پہلے صرف مجھے دیکھنے کا منتظر تھا۔ جونہی میں اس کے پاس پہنچا اس نے مجھ سے کاروبار کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر کی اس ہدایت کو بھی نظرانداز کر دیا کہ اسے اپنے اوپر دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ رونے لگا کہ وہ مجھ پر اور میرے بھائی پر ایک لاکھ روپے کا قرض چھوڑے جا رہا ہے۔ ہم نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ اگر وہ کہے تو ہم ایک منٹ کے اندر اندر یہ قرض چکا سکتے ہیں۔ ہم اس کے قرض خواہوں کے نام چیک لکھ دیتے ہیں کیونکہ ہمارے اثاثے ایک سو لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ اس نے کہا: ''ٹھیک ہے ایسا ہو گا لیکن انسان کو دنیا چھوڑنے سے پہلے اپنے لیے ہوئے قرض ادا کر دینے چاہئیں۔'' اس نے رونا شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کے رونے کی وجہ سے ہم بھی رونے لگے۔ پھر اس نے میرے، میری ماں اور میرے بھائی کے علاوہ سب لوگوں کو کمرے سے چلے جانے کا کہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو وہ بولا: ''میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں بھائی اپنی ماں کی موجودگی میں مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ اتفاق سے رہو گے اور سود و زیاں کی پروا کیے بغیر ہر معاملے میں ایک دوسرے کا ساتھ دو گے۔''

ہم دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور دونوں اپنے باپ کے سینے پر جھک گئے۔ اس نے ہم دونوں کے گرد اپنا بازو حمائل کر لیا۔

چونکہ وہ ایک جہاں دیدہ اور دنیادار انسان تھا' اس لیے اس نے مزید کہا: ''اور اگر تم نے کبھی خاندانی جائیداد کو باہم تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کام کو یوں کرنا کہ دنیا کے کسی فرد کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے۔ اگر تم میں کسی معاملے پر اختلاف ہو جائے تو اپنی

ماں کے فیصلے کو بلا چون و چرا قبول کر لینا۔"

میری ماں، جو اس کے پاؤں دبا رہی تھی، رونے لگی اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی: "مجھے چھوڑنے کی بات مت کرو۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ گرو تمہیں صحت کاملہ عطا فرمائیں گے۔"

ڈاکٹروں نے مختلف ادویات آزمائی تھیں لیکن گرو اس کا کھاتہ بند کر چکا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد وہ اٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کرنا یا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے یوں منہ کھولا جیسے جمائی لے رہا، پھر الٹ کر گاؤ تکیے پر گرا۔ اس کا سانس رک چکا تھا۔ میری ماں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں اور گریہ کرنے لگی: "میرا چراغ اس واحد مالک کا نام ہے، جبکہ غم اس کا تیل ہے۔"

میرے باپ کے مرنے کی خبر فوراً پورے قصبے میں پھیل گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر سارے قصبے کے سکھ، ہندو اور مسلمان ہمارا غم بانٹنے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ پیشہ ور نوحہ گر عورتوں کی ٹولیاں بھی آ گئیں۔ وہ چھاتیاں پیٹ پیٹ کر ماتمی گیت گانے لگیں۔ سہ پہر کو اس کی ارتھی نکلی۔ اس کی لاش رنگین کاغذی پٹیوں اور غباروں سے سجی ہوئی تھی، آگے آگے قصبے کا بینڈ تھا اور پیچھے پیچھے 2000 سوگواران تھے۔ عورتوں نے اپنے بچوں کو کچھ دور تابوت کے نیچے چلایا تاکہ وہ بھی مرحوم جتنی لمبی عمر پائیں۔ ہمارے خاندان میں رواج تھا کہ بوڑھوں کی موت پر سوگ نہیں کرتے تھے بلکہ جشن مناتے تھے کہ وہ دنیا کے بندھنوں سے آزاد ہو گئے ہیں۔ وفات کے وقت میرے باپ کی عمر 65 سال تھی۔

میں دس دن اپنے بھائی کے گھر رہا اور پھر اپنی بیوی بچوں سمیت دلی واپس چلا گیا۔ چند ماہ بعد میری بیوی نے ہمارے آخری بچے کو جنم دیا۔ وہ لڑکا تھا اس کے چند ماہ بعد میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدی۔ وہ ایک "اولڈز موبائل" تھی۔ میں نے اسے ایک انگریز انجینئر سے خریدا تھا، جو چند ہفتوں بعد انگلستان واپس جا رہا تھا۔ چونکہ اس

نے مجھے ٹھیکوں کے حصول میں مدد دی تھی اس لیے میں نے اس کی پرانی کار نئی کار کی قیمت میں خریدی۔ اس نے صلہ یوں دیا کہ میرے سارے رکے ہوئے بل ادائیگی کے لیے منظور کر گیا۔

مجھے کار چلانی نہیں آتی تھی۔ میں نے ایک مسلم شوفر کو ملازم رکھ لیا۔ اس کے پاس ٹیچنگ لائنس تھا۔ وہ مجھے کام پر لے کر جاتا تو میں اس سے ڈرائیونگ بھی سیکھتا تھا۔ میں اپنی کار خود چلا کر قطب مینار جانا چاہتا تھا۔ یہ میرا بچپن کا خواب تھا۔

مجھے کار چلانا سیکھنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ چونکہ میں آنریری مجسٹریٹ تھا اس لیے میں نے ڈرائیونگ ٹیسٹ کے بغیر ہی ڈرائیونگ لائنس حاصل کر لیا۔ آخر وہ عظیم دن آ گیا۔ میں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ ہم اگلی اتوار کو پکنک منانے قطب مینار چلیں گے۔

اتوار کے دن میری بیوی نے زبردست تیاریاں کیں۔ اس نے آلو بھرے پراٹھوں اور پھلوں سے ٹوکریاں بھر لیں۔ وہ کھانا بیس افراد کے لیے کافی تھا۔ کار میں کوئی درجن بھر افراد سوار ہوئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ڈرائیور نے ہینڈل گھمایا (اس زمانے میں سیلف سٹارٹرز نہیں ہوتے تھے) اور کار میری زندگی میں دھڑکنے لگی۔ میری بیوی' بچے اور ملازم پچھلی سیٹ پر سوار ہوئے تھے۔ میرا ہیڈ کلرک اور شوفر اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ دو دو ملازم کار کے دونوں فٹ بورڈوں پر کھڑے تھے۔ روانہ ہوتے وقت ہم نے ست سری اکال کا زور دار نعرہ لگایا۔ میری طرف کھڑا ہوا ملازم مسلسل بلب ہارن بجاتا رہا۔ ہم صفدر جنگ کے مقبرے کے نزدیک یوسف سرائے اور حوض خاص کے قریب پھیلے ویرانے میں بکھری پرانی عمارتوں کے پاس سے گزرے۔ اچانک قطب مینار ہمیں دکھائی دیا اور سب بیک وقت چلائے: "دیکھو! دیکھو! وہ ہے قطب مینار۔"

ملازم باغ میں دریاں بچھانے اور کھانا سجانے میں لگ گئے جب کہ ہم مینار

پر چڑھ گئے۔ ہم اس کی سب سے اوپر والی منزل پر جا کر اردگرد موجود آثار قدیمہ کو دیکھنے لگے۔ میں نیچے اترا کر مسجد چلا گیا۔ وہاں میں نے درمیان میں ایستادہ آہنی ستون کو بازوؤں میں بھرنے کی کوشش کی۔ میں تاریخ سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ ستون پر اس کے معماروں کے نام وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ میرے بیٹے نے قطب الدین' التمش اور علاء الدین کے بارے میں بتایا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس نے اتنے کم وقت میں اتنا کچھ جان لیا ہے۔

ہم نے آلو بھرے پراٹھے کھائے۔ پھر بچے یادگاریں دیکھنے چلے گئے۔ میں دری پر لیٹ کر مینار کو دیکھنے لگا۔ بادل اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ٹھیکیداروں نے اس کی تعمیر سے کتنا پیسہ کمایا ہوگا۔ یہ بات واضح تھی کہ انہوں نے پرانی عمارتوں سے بہت سا سنگِ مرمر اور پتھر چرائے ہوں گے۔ کیا انہوں نے بل منظور کروانے کے لیے آرکیٹیکٹس اور اوورسیئروں کو رشوت دی ہوگی؟ انہوں نے سیمنٹ اور کنکریٹ کے بغیر ایسی عمارتیں کس طرح بنالیں جو ہزار سال سے قائم دائم ہیں؟ کیا میری تعمیر کردہ عمارتیں پانچ سو سال بھی قائم رہ سکتی ہیں؟ کیا کسی کو علم ہوگا کہ میں نے انہیں تعمیر کروایا تھا؟ یا پھر لوگوں کو صرف لیوٹز' بیکر اور ان وائسرائے کے ناموں کا علم ہوگا' جن کے ادوار میں یہ عمارتیں تعمیر ہوئیں؟

بہر حال ان خیالات نے مجھے پریشان نہیں کیا کیونکہ اس دن میرا ایک خواب حقیقت میں ڈھل گیا۔ میں اپنی کار خود چلا کر قطب مینار آیا تھا۔ جلد ہی میں ہر سال نئی کار خریدنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ میں لکھ پتی بننے والا تھا۔ انسان زندگی میں اس سے زیادہ کیا آرزو کر سکتا ہے؟

جنوری 1921ء میں بادشاہ کا چچا' جو ڈیوک آف کناٹ تھا' دلی کی سیر کرنے آیا۔ اس وقت تک دلی آباد شہر نہیں لگتا تھا۔ صرف کھلی سڑکوں کے ساتھ درختوں کے درمیان چند بنگلے موجود تھے۔ وائسرائے کا محل' دونوں سیکرٹریٹ اور وار میموریل آرک کی

تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ تاہم وائسرائے ڈیوک کے دورے کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سیکرٹریٹ کے قریب متعلقہ کی نئی عمارت کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ اس نے یہ بھی اعلان کروایا کہ سیکرٹریٹ کے شمال میں نصف میل دور واقع دلی کے مرکزی شاپنگ سینٹر کا نام کناٹ پیلس ہوگا۔ اس زمانے میں وہاں صرف ایک سرکلر روڈ تھا جبکہ عمارت کوئی نہیں تھی۔ وائسرائے نے جن ٹھیکیداروں کو ڈیوک سے ملوایا' میں بھی ان میں شامل تھا۔ وائسرائے کو بتایا گیا تھا کہ میں مستقبل کے شہر کے وسط میں سب سے زیادہ زمین خرید چکا ہوں۔ چنانچہ اس نے ڈیوک کے سامنے میرے بارے میں کہا: ''یہ ہے وہ شخص' جو آپ کے نام سے موسوم ہونے والے شاپنگ سنٹر میں پہلا شاپنگ آرکیڈ' سینما اور ریستوران تعمیر کرے گا۔''

اس وقت میں نے اپنی زمین کو استعمال میں لانے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ دلی میں اس وقت اتنے لوگ نہیں تھے کہ دکانوں اور ریستورانوں کی تعمیر کے بارے میں سوچا جاتا۔ تاہم میں جانتا تھا کہ وائسرائے جیسے کسی شخص کا اشارہ بھی حکم ہوتا ہے اور اس کی تعمیل کی جانی چاہیے۔ اس نے میری حوصلہ افزائی کے لیے بادشاہ کی اگلی سالگرہ پر مجھے سردار صاحب کا خطاب دیا۔

ہم ٹھیکیدار پنجاب کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ دلی میں ملاقات سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کے حوالے سے کبھی کچھ نہیں سنا تھا۔ میں ان میں سے واحد شخص تھا جس نے سکول کی تعلیم حاصل کی تھی اور تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا۔ باقی سب چٹے ان پڑھ تھے۔ چند ایک ہی ایسے تھے جو دستخط کرنے کے اہل تھے۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔۔ ہم سکھ تھے اور خود کو ایک ہی گھرانے کے فرد سمجھتے تھے۔ کچھ انجینئر اور اوورسیئر بھی سکھ تھے۔ اگرچہ وہ ہم سے فاصلہ رکھتے تھے اور رشوت لے کر ہمارے بل منظور کرتے تھے تاہم وہ بھی خود کو ہمارا حصہ تصور کرتے تھے۔ جب کبھی شہر میں کشیدگی ہوتی (مثلاً ہندو مسلم فساد ہو جاتا) تو ہم ایک دوسرے کے گھروں کی حفاظت

کرتے تھے۔ اگر کبھی ہمارا کوئی لڑکا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو ہم سب مل کر دباؤ ڈالتے اور اسے آزاد کروا لیتے۔ ایک مرتبہ ایک سکھ انجینئر کی بیٹی اپنے مسلمان میوزک ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی تو اس کے باپ نے برادری کو آگاہ کیا۔ ہم نے دلی سے باہر جانے والی ہر سڑک اور ریلوے سٹیشن کے ہر پلیٹ فارم پر اپنے آدمی بٹھا دیے۔ رات ہونے سے پہلے ہی ان دونوں کو کار میں جمنا کے پل کی طرف جاتے ہوئے پکڑ لیا گیا۔ لڑکی کو تو اس کے باپ کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ جیسا چاہے اس سے سلوک کرے۔ تاہم مسلمان لڑکے کو ہم نے اتنا مارا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ تھانے میں رپورٹ درج کروائے گا کہ لڑکی مسلمان ہو چکی ہے اور اس سے شادی کر چکی ہے۔ ہم نے اسے خبردار کیا کہ ہم پہلے ہی رپورٹ درج کروا چکے ہیں' جس میں اس پر اغوا اور زنا بالجبر کا الزام لگایا گیا ہے۔ اس لڑکے نے جتنی جلد ممکن ہو دلی سے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔

دولت اچانک ملے تو وہ بہت سے مسئلوں کو جنم دیتی ہے۔ ہم دولت کمانے میں اتنے محو تھے کہ اپنے بیٹوں پر نگاہ نہیں رکھ سکے کہ وہ دولت کو کس طرح خرچ کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنے لڑکوں کو ضائع کر کے مزا بھی آتا تھا۔ جب میں "ہم" کہتا ہوں تو اس سے میری مراد اپنے علاوہ باقی سب دوسرے سکھ ہوتے ہیں' کیونکہ میں تو اپنے بیٹوں پر بہت سختی کرتا تھا۔ دوسرے سکھوں نے اپنے بیٹوں کو چلانے کے لیے کاریں لے کر دی ہوئی تھیں لیکن میں نے اپنے بیٹوں کو صرف سائیکلیں لے کر دی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے بیٹے سکول اور کالج جاتے تھے جبکہ دوسرے سکھ ٹھیکیداروں کے بیٹے چاوڑی بازار جا کر رنڈی بازی اور شراب نوشی کرتے تھے۔ ایک راسخ العقیدہ سکھ ٹھیکیدار کے سب سے بڑے بیٹے نے ہندوستان کے ہر حصے کی عورت گھر میں ڈال رکھی تھی اور درجنوں بچے پیدا کیے ہوئے تھے۔ ایک اور سکھ ٹھیکیدار کے پانچ بیٹے تھے۔

یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ ان میں سے ایک اتنا سمجھدار نکلا کہ اس کے کاروبار

میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ باقی چاروں اپنا وقت شکار کھیلنے‘ ناچ رقص کی محفلیں برپا کرنے اور شراب نوشی میں گزارتے تھے۔ اس کا ایک بیٹا تو دلی کا بدنام رنڈی باز بن گیا تھا۔ وہ شیخی بگھارتا تھا کہ وہ دن میں تین عورتوں کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے اور مرنے سے پہلے دلی کی ہر طوائف کے ساتھ ہم بستری کر چکا ہوگا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے اپنا یہ عزم کس حد تک پورا کیا تھا تاہم ایک رات تیسری عورت کے ساتھ ہم بستری کے بعد ایک پنواڑی کی دکان کے سامنے اس کا کچھ مسلمانوں سے جھگڑا ہو گیا۔ ایک شخص نے اسے برف توڑنے والا سوا گھونپ دیا جو اس کی ٹھوڑی سے اترتا ہوا منہ تک چلا گیا۔ اس نے حملہ آور کو گریبان سے پکڑ لیا (وہ بہت طاقتور تھا) اور تھانے لے گیا۔ پھر وہ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ گیا‘ جہاں اس نے اپنے زخموں کو ٹانکے لگوائے اور پٹی کروائی۔ اس کے بعد وہ ہسپتال سے چار میل دور واقع اپنے گھر تک پیدل گیا۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے اسے محسوس ہوا کہ خون پٹی سے رس رہا ہے۔ وہ خون دھونے کے لیے غسل خانے چلا گیا۔ جونہی وہ پانی سے بھرے ٹب پر جھکا‘ اس میں گر گیا۔ وہ اپنے ملازموں کو اس حال میں ملا کہ مرا ہوا تھا اور اس کا سر خون سے بھرے ٹب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے اس کی موت پر ایک آنسو بھی نہیں بہایا۔ جب میں افسوس کرنے گیا تو اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا: ”وہ کتے کی موت مرا ہے۔ اس نے اپنی ایسی موت کو خود آواز دی تھی۔“

میرا طرز زندگی بدل گیا تھا۔ میں نے یورپی لباس پہننا شروع کر دیا۔ میں تقریبات میں فر کا سیاہ کوٹ اور پٹیوں دار خاکستری ٹراؤزر پہن کر شرکت کیا کرتا تھا۔ میں ان چند ہندوستانیوں میں سے ایک تھا‘ جسے جم خانہ کلب کی رکنیت حاصل تھی۔ میں نے رقص بالکل نہیں سیکھا۔ میں بھانپ چکا تھا کہ انگریز اپنی عورتوں کے ساتھ ایسے ہندوستانیوں کا رقص کرنا پسند نہیں کرتے جو اپنی عورتوں کو ان کے ساتھ رقص کرنے کے لیے کلب نہیں لاتے۔ میں نے اپنی بیوی کو انگریزی پڑھانے کے لیے ایک اینگلو انڈین

عورت کو ملازم رکھا لیکن وہ چند ایک الفاظ سے زیادہ نہ سیکھ سکی۔ وہ ''گڈبائی'' کی جگہ ''گڈمارننگ'' اور ''گڈمارننگ'' کی جگہ ''گڈبائی'' کہہ دیا کرتی تھی۔ جہاں تک رقص کا تعلق ہے تو اگر اسے فاکس ٹراٹ ناچنے کا کہا جاتا تو وہ شرم سے ڈانسنگ فلور میں ہی غرق ہو جاتی۔

میں ہفتے میں ایک بار جم خانہ کلب ضرور جایا کرتا تھا۔ میں انگریز اراکین کو شراب پینے کی پیشکش کرتا' جسے وہ قبول کر لیتے تھے۔ بعض اوقات وہ مجھے شراب پلاتے تھے۔ میں سکھوں کی بجائے اپنے ہندو اور مسلم دوستوں کے ساتھ زیادہ سکون محسوس کرتا تھا۔ ایک مسلم انجینئر نے دلی کی ایک مشہور ترین مغنیہ کو داشتہ بنا رکھا تھا۔ میں نے اسے ایک فلیٹ دلوا دیا تھا۔ وہ اکثر مجھے گانا سننے کے لیے مدعو کرتی تھی۔ ایک ہندو دوست نے ایک حسین ترین مسلمان لڑکی کو داشتہ بنایا ہوا تھا۔ ہم اکثر اس لڑکی کے فلیٹ جاتے' شراب پیتے اور گپ شپ کرتے تھے۔ میں طوائفوں کے محلے میں ہونے والی تقریبات میں شرکت سے ممکنہ حد تک دور رہتا تھا۔

لارڈ چیمس فورڈ کے بعد 60 سالہ لارڈ ریڈنگ کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔ وہ کوئی ''پیچھا'' (حسب نسب) نہیں رکھتا تھا کیونکہ اس کا باپ پھل فروش اور ملاح تھا۔ یہودی ہونے کی وجہ سے وہ ذہین تھا۔ یہودی ہونے ہی کی وجہ سے وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اسے برطانیہ سے انگریزوں کی نسبت زیادہ محبت ہے۔ جب 1921ء میں وہ ہندوستان آیا تو اس زمانے میں سکھوں نے احتجاجی تحریک شروع کی ہوئی تھی کہ ان کے گردواروں کو جدی پشتی مذہبی پیشواؤں سے چھٹکارا دلایا جائے۔ گاندھی اور اس کے ''کانگرس والے'' بھی خودمختاری کا مطالبہ کر رہے تھے جبکہ مالابار کے مسلمان موپلا ہندو ساہوکاروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ریڈنگ نے سب سے پہلے گاندھی کو اس کی اوقات یاد دلانے کے لیے چائے کی دعوت دی۔ چند ماہ بعد اس نے گاندھی کو موتی لال نہرو اور اس کے بیٹے جواہر لال

نہرو سمیت جیل میں ڈلوا دیا۔ انہوں نے پرنس آف ویلز کے دورے کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا۔ (اتفاق دیکھیے کہ پرنس کے ساتھ ہندوستان کا آخری وائسرائے مقرر ہونے والا شخص لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی آیا' جو ریڈنگ کی منعقد کردہ ایک تقریب میں ایڈوینا ایشلے کی محبت میں مبتلا ہوا) اس کے علاوہ ریڈنگ نے موپلاؤں کو کچلنے کے لیے مالابار میں فوج بھیجی۔ ریڈنگ اسی قسم کا آدمی تھا۔ وہ ہندوستانی سیاست دانوں کے ذہن اور ذہنیت جاننے کے لیے انہیں دوست بناتا تھا۔ تاہم وہ کانگرس کا ابھار روکنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ پارٹی نے 1923ء کے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی اور موتی لال نہرو مرکزی اسمبلی میں اس کا سب سے بڑا ترجمان بن گیا۔

ریڈنگ کو نیو دلی کی تعمیر سے زیادہ ہندوستانی سیاست سے دلچسپی تھی۔ تاہم اسی کے دور میں شہر کوئی صورت اختیار کرنا شروع ہوا تھا۔ وائسرائے کا محل مکمل ہو چکا تھا اور اب اس میں صرف فرنیچر وغیرہ رکھا جاتا تھا۔ دونوں سیکرٹریٹ بھی تکمیل کے آخری مراحل میں تھے۔ اسی طرح بڑی تعداد میں بنگلے اور کلرکوں کے کوارٹر بھی تکمیل کے آخری مراحل میں تھے۔ میں نے کافی تعداد میں دکانیں اور ان کے اوپر اپارٹمنٹس تعمیر کروائے۔ اس کے علاوہ میں دلی کے اولین سنیما' ریستوران اور ڈیپارٹمنٹ سٹور تعمیر کروا رہا تھا۔

نئے وائسرائے 45 سالہ لارڈ ارون کی آمد کے بعد نئے شہر کی تعمیر کے کام میں تیزی آئی۔ چونکہ اس کا صرف ایک بازو تھا' اس لیے وہ ہندوستانیوں میں ''ٹنڈا لاٹ'' کے نام سے مشہور تھا۔ مذہبی ذہن کا ہونے کی وجہ سے اسے ''پادری'' بھی کہا جاتا تھا۔ ہمیں کہا گیا کہ وائسرائے کے محل اور دونوں سیکرٹریوں کو ایک خاص تاریخ تک مکمل کیا جائے کیونکہ وائسرائے نئے شہر کا افتتاح کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد کام دن رات تین شفٹوں میں ہونے لگا۔

چونکہ وائسرائے نے قوم پرست لیڈروں کے ساتھ بہت دوستانہ سلوک روا

رکھا' اس لیے ہم محسوس کرنے لگے کہ انگریز اور ہندوستانی رفقائے کار کی طرح مل جل کر کام کر سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ قوم پرست بہت سے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ انگریزوں کے ساتھ تعاون کے لیے تیار تھے' کچھ انہیں ہندوستان سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔۔ اگر ضروری ہو تو طاقت استعمال کر کے۔ میں ایسی ایک کوشش کا عینی شاہد ہوں۔

اپریل 1929ء کی ایک صبح میں پاس کے ذریعے مرکزی اسمبلی میں داخل ہوا۔ میں وزیٹرز گیلری کی ایک نشست پر بیٹھا تھا۔ حکومت نے دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے اسمبلی میں پبلک سیفٹی بل پیش کیا تھا اور آج کانگرس کی طرف سے اس بل کے حوالے سے زور دار تقریروں کی توقع تھی۔ میں جھک کر ہال میں دیکھتے ہوئے ان سیاست دانوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا جن کی تصویریں اخبارات میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اپنی دائیں طرف بیٹھے ہوئے دو نوجوانوں کے علاوہ گیلری میں کسی فرد کی طرف توجہ نہیں دی۔ انہوں نے نہ کوٹ پہنے ہوئے تھے نہ ٹائیاں باندھی ہوئی تھیں اور کسی کالج کے طالب علم لگتے تھے۔ تقریریں میری توقع کے مطابق ولولہ انگیز نہیں تھیں۔ اس کی بجائے طویل تقریریں کی گئیں' جنہیں میں نے توجہ سے نہیں سنا۔ میں نے اپنے ساتھ لایا ہوا اخبار کھول کر سرخیاں پڑھنا شروع کر دیا۔ اچانک مجھے زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں نوجوان اراکین اسمبلی پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ ہال سے دھواں اٹھ رہا تھا اور ہر کوئی دروازوں کی طرف بھاگ رہا تھا یا بنچوں کے پیچھے پناہ لے رہا تھا۔ وزیٹرز گیلری خالی ہو گئی تھی۔ صرف میں وہاں بیٹھا تھا جبکہ نوجوان اسمبلی کے ہال کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ پر بالکل توجہ نہ دی۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اپنے پستول پر ہاتھ مار رہا تھا۔ وہ یا تو جام ہو گیا تھا یا اس میں گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر پستول بردار سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔

ایک اینگلو انڈین سارجنٹ نے حکم دیا: ''ہینڈز اپ'' ہم نے اپنے ہاتھ اوپر کر لیے۔ لڑکوں نے اپنے ہتھیار پولیس والوں کو دینے سے پہلے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ چونکہ میں آنریری مجسٹریٹ تھا' اس لیے پولیس والے مجھے پہچان گئے تھے۔ وہ مجھے اپنی حفاظت میں عمارت سے باہر لے گئے۔

میں جانتا تھا کہ گولیاں چلانے والے نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ (وہ اس سے پہلے ایک اینگلو انڈین سارجنٹ کو ہلاک کرنے کے جرم میں بھگت سنگھ' سکھ دیو اور راج گرو کو 23 مارچ 1931ء کو پھانسی پر لٹکا چکے تھے)۔ مجھے کانگرسی رہنماؤں کے رویے سے سخت گھن آئی کہ جو ایک طرف تو عدم تشدد کی بات کرتے تھے اور دوسری طرف سیاسی قتل و غارت کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ پادری اِروِن بھی ان کے ردِعمل سے مایوس ہوا تھا۔ اس نے ایک بیان میں کہا: ''کسی جرم کی مذمت کرنا اور ساتھ جن کے خلاف اس جرم کا ارتکاب کیا گیا ہو' ان پر الزام دھر کر اس کا جواز ڈھونڈنا کوئی حقیقی مذمت نہیں ہے۔''

میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ہندوستان کے لیے انگریز راج بہتر ہے۔ ہم ہندوستانی ایک منصفانہ حکومت چلانے کے اہل نہ کبھی تھے' نہ ہوں گے۔ تاہم ایسا لگتا تھا کہ میرے ساتھ اتفاق کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میری ماں جو کبھی ملکہ وکٹوریا کی تصویر کے سامنے بخورات سلگایا کرتی تھی اب چرخا کاتا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے اپنے کاتے ہوئے سوت کی اَٹی دی' تاکہ میں اسے گاندھی کو پیش کر دوں۔ میرے دو بڑے بیٹے اپنی سکول کی وردی کا کپڑا خریدنے بازار گئے تو کھادی (ہاتھ کا بنا ہوا سوتی کپڑا) لے کر واپس آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی نے انگریزی پارچات کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے سکھ ملازمین میری پیٹھ پیچھے مجھے ''جھولی چک'' کہتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں ہنگامہ روکنے کے لیے پولیس کے ساتھ کہیں موجود تھا اور جلوس نے ''ٹوڈی بچہ'' (خوشامدی کی اولاد) کے نعرے لگانے شروع کر دیے اور سینے

پیٹتے ہوئے ہائے ہائے پکارنا شروع کر دیا۔ میں اپنے اس ایقان میں پختہ ہی رہا کہ میرے جیتے جی ہندوستان میں انگریز راج ہی رہے گا۔ میں ان کا نمک کھا چکا تھا۔ مجھے ان سے غداری نہیں کرنا تھی۔

لارڈ اروِن نے قوم پرستوں کو خوش کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ اسی کی کوششوں سے 1923ء میں سرجان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ایٹلی بھی اس میں شامل تھا۔ کمیشن جہاں بھی گیا قوم پرستوں نے اس کے خلاف بڑے بڑے جلوس نکالے۔ اروِن نے ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دینے کے موضوع پر لندن میں گول میز کانفرنس کا انتظام کیا۔ قوم پرستوں نے پہلی گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کیا اور دوسری گول میز کانفرنس میں صرف گاندھی کو بھیجا۔ انہوں نے پے در پے سول نافرمانی کی تحریکیں چلا کر ملک کو انارکی کے قریب پہنچا دیا۔ وہ ستیہ گرہ (صداقت پسندی' حق گوئی) اور اہنسا (عدم تشدد) کی باتیں کرتے تھے لیکن بمباری اور سیاسی قتل و غارت کو بڑھاوا دیتے تھے۔ ان کے منافقانہ طرزِ عمل کی بدترین مثال' خدا ترس شخص اروِن سے ان کا سلوک تھا۔

نئی دلی کے اختتام کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ وائسرائے کی بیوی نے وائسرائے کے محل کے لیے فرنیچر' پردوں اور دیگر آرائشی اشیا کے لیے لیوٹز سے مشورہ کیا اور اس کے مشورے سے پھول اگانے کا فیصلہ کیا۔ ہر کام اگست 1931ء تک مکمل ہو گیا۔ 23/دسمبر 1931ء کو لارڈ اروِن اور لیڈی اروِن افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے ٹرین کے ذریعے آئے۔ مجھے بھی ان معززین میں شامل کیا گیا تھا جنہوں نے نئی دلی ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ان کا استقبال کرنا تھا۔ ٹرین ریلوے سٹیشن پر پہنچ رہی تھی کہ پٹڑی میں نصب بم پھٹ گیا۔ خوش قسمتی سے وائسرائے کا ڈبہ آگے گزر چکا تھا' اس لیے وہ اور اس کی بیوی محفوظ رہے۔ ان کے ڈبے سے پچھلا ڈبہ تباہ ہو گیا۔ لارڈ اروِن اور لیڈی اروِن دونوں ہی مطمئن اور بے خوف نظر آتے تھے۔ انہوں نے افتتاحی

تقریب میں یوں شرکت کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ستم تو دیکھئے کہ یہ حملہ اس وائسرائے پر ہوا تھا' جو اپنا دل ہندوستان کو دے چکا تھا اور جس نے اپنی رہائش گاہ کے سامنے والے ستون پر درج ذیل الفاظ کندہ کروائے تھے:

In Thought Faith

In Word Wisdom

In Deed Courage

In Life Service

—So May India Be Great.

مجھے اپنی وفاداری کا صلہ خطابات کی صورت میں ملا— سردار بہادر' پھر سی۔ بی۔ ای' پھر سر کا خطاب ملا اور پھر کونسل آف سٹیٹس کے لیے نامزد کیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستانی قوم پرست میری پیٹھ پیچھے میرے خطابات کو کس طرح بگاڑتے تھے' تاہم جب بھی مجھے کوئی خطاب ملتا' وہ سینکڑوں کی تعداد میں پھولوں کے ہار لے کر مجھے مبارک دینے آتے۔ اس وقت تک مجھے نئی دلی کا سب سے بڑا معمار تصور کیا جانے لگا تھا اور بعض اوقات مجھے آدھے نئے شہر کا مالک قرار دیا جاتا تھا (جو کہ سچ نہیں تھا)۔ میں اس وقت تک کوئنز وے کے ایک دو منزلہ مکان میں رہتا تھا۔ میں نے اس مکان کا نام بھی اپنے جنتر منتر روڈ والے مکان کی طرح بیکنٹھ (جنت) رکھا تھا۔ میرے گھر ہونے والی تقریبات میں چوٹی کے قوم پرست لیڈر بخوشی آیا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں سپرو' جے کر اور سی راج گوپال اچاریہ جیسے لیڈر میرے ہاں قیام کیا کرتے تھے۔ گاندھی میرے گھر کے سامنے واقع برلا ہاؤس میں رہا کرتا تھا۔ جناح کا مکان بھی وہیں تھا۔ یہ دونوں لیڈر میرے گلابوں کے باغ میں ٹہلتے ہوئے تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔

☆☆☆

اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور زندگی میں جو کچھ دیکھنے کے قابل تھا' سب

دیکھ چکا ہوں۔ ہندوستان پر ہندوستانی حکومت کر رہے ہیں۔ نوجوان نسل مجھ سے طنزاً پوچھتی ہے: ''آپ کو ساری زندگی انگریزوں کے بوٹ چاٹنے سے کیا ملا۔''

میں کوئی عالم فاضل انسان نہیں ہوں' نہ ہی میں نے تاریخ کو زیادہ پڑھا ہے۔ میں انہیں جو جواب دیتا ہوں وہ میرے مشاہدے اور اپنے ہم وطنوں اور چند شناسا انگریزوں کے ساتھ ذاتی تجربے کے حوالے سے ہوتا ہے۔ میں نے اپنے تعمیر کیے ہوئے اس شہر کو بیس سال میں برباد ہوتے دیکھا ہے' جسے لیوٹز نے دو سو سال کے لیے ڈیزائن کیا تھا۔ ہم نے ایسی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی تھیں جو کئی صدیوں تک قائم رہ سکتی ہیں' وہ جہاں کہیں ہموار قطعۂ اراضی دیکھتے ہیں وہاں بے شکل وصورت' کثیر المنزلہ دفاتر اور مکان بنا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بازاروں کے پیچھے واقع بے شمار قدیم یادگاروں کو بھی منہدم کر ڈالا ہے۔ ہم نے کشادہ سڑکیں تعمیر کی تھیں' وہ تنگ سڑکیں بناتے ہیں' جن پر دو گاڑیاں بھی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ ہم نے ایسے آہستہ آہستہ بڑھنے والے طویل العمر درخت لگائے تھے جن کا سایہ کئی نسلوں تک قائم دائم رہتا۔ وہ گل مہر اور ایسے ہی دوسرے تیزی سے پروان چڑھنے والے درخت لگاتے ہیں' جن پر پھول پندرہ دنوں کے لیے کھلتے ہیں اور ان کا سایہ ہے نہ کوئی پھل۔ وہ ہر کام کم سے کم وقت میں کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ جہاں تک انگریزوں کے بوٹ چاٹنے کا تعلق ہے تو میں انہیں کہتا ہوں کہ اگر مجھے اختیار دیا جائے کہ میں ہندوستان کے اپنی پسند کے عہد حکومت میں جنم لوں تو میں نہ ہندو عہد حکومت کا انتخاب کروں گا' نہ مسلم عہد حکومت کا۔ نہ ہی شمال میں قائم ہونے والی سکھ حکومت کے دور کا۔ بلکہ میں انگریز راج کے دور کا انتخاب کروں گا۔ میں انگریز راج کے تحت ایک تعمیراتی ٹھیکیدار کی حیثیت سے دوبارہ جیوں گا۔

وہ پھنکار کر کہتے ہیں: ''کیا آپ کو ہندوستانی ہونے پر فخر نہیں ہے؟ کیا آپ کو سو سال سے زیادہ عرصے تک ہمارا استحصال اور تذلیل کرنے والے غیر ملکی حکمرانوں

کی تعریف کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کیا آپ بھلا چکے ہیں کہ انہوں نے 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد آپ کے آباؤ اجداد کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ کیا آپ نے 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں معصوموں کا قتل عام کرنے کا ان کا جرم معاف کر دیا ہے؟ کیا آپ نے ہزاروں آزادی کے مجاہدین کو پھانسیاں دینے' قید کرنے اور ان پر تشدد کرنے کا انگریزوں کا جرم معاف کر دیا ہے؟

میں ممکنہ حد تک سکون کے ساتھ جواب دیتا ہوں: "میں نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں بھلایا ہے۔ نہ ہی میں نے وہ کچھ بھلایا ہے جو ہندوستانیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا تھا۔ ہندوستانیوں نے ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا ہے۔ کوئی ایک مثال بھی ہے کہ انگریزوں نے ہندوؤں' مسلمانوں یا سکھوں کی کسی ایک عبادت گاہ کو بھی مسمار کروایا ہو؟ ہندوستان کے ہر بادشاہ نے سروں کے مینار تعمیر کروائے' شہریوں کا قتل عام کروایا۔ کوئی ایک بھی مثال ہے کہ انگریزوں نے قتل عام کروایا ہو۔ حد تو یہ ہے کہ تمہاری نام نہاد پہلی جنگ آزادی میں دلی' لکھنؤ اور کان پور میں انگریز عورتوں اور بچوں کو ہلاک کیا گیا لیکن انگریزوں نے اس جنگ کے بعد تمہاری عورتوں اور بچوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ انہوں نے تو بس چند ایک لوگوں کو پھانسیاں دی تھیں اور کچھ بازار مسمار کروا دیے تھے اور کیا کیا تھا؟"

وہ سب چلا کر کہتے ہیں: "بس یہی کچھ نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کتوں جیسا سلوک کیا۔ بلکہ کتوں سے بھی بدتر کیونکہ وہ تو کتوں کے پجاری ہیں' وہ ہمیں کالے کہتے تھے' ان کے کلب صرف یورپیوں کے لیے ہوتے تھے اور ریل گاڑیوں میں انگریزوں کے لیے مخصوص ڈبے ہوتے تھے۔ سفید فاموں کے لیے قانون الگ تھا اور سیاہ فاموں کے لیے الگ۔"

میں بھی چلا کر کہتا ہوں: "انگریز کی آمد سے پہلے ہندوستان میں انصاف نام کی کوئی شے نہیں ہوتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی ہندوستان میں انصاف نہیں ہے۔

انہوں نے تمہیں اپنے خلاف "بک بک" کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی اور صرف اسی وقت کوئی اقدام اٹھاتے تھے جب تم تشدد پر اتر آتے تھے۔ کیا انگریزوں کے علاوہ تم کوئی اور قوم ایسی دکھا سکتے ہو جو اپنی مخالفت کرنے والے گاندھیوں اور نہروؤں کو عزت واحترام دے؟ اگر جرمنی، فرانسیسی، روسی، اطالوی، چینی یا جاپانی ہوتے تو وہ تمہارے 'کانگرس والوں' کو قریب ترین درختوں کی شاخوں سے لٹکا کر پھانسی دے دیتے۔"

"اگر وہ کوشش کرتے تو انگریز راج کی مدت میں کمی ہو سکتی تھی۔ ہمارے مجاہدین آزادی انہیں دوسری عالمی جنگ کے دوران ملک سے نکال سکتے تھے۔"

میں چلا کر کہتا ہوں: "کیا تھے تمہارے مجاہدین آزادی؟ نعرے لگانے والے بھاڑے کے ٹٹو' جو اپنی کھولیوں سے زیادہ آرام وسکون سے جیلوں میں رہتے تھے۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ انہیں زندگی بھر پنشن دی جائے۔ میرے ساتھ مجاہدین آزادی کی بات مت کرو۔ مجھے ان کے ذکر سے گھن آتی ہے۔"

وہ کہتے ہیں: "آپ کا برین واش کیا جا چکا ہے۔" وہ کہتے ہیں کہ "انگریز راج ختم ہونے کے بعد ہندوستان بہت ترقی کر چکا ہے۔" ہندوستان نے انگریز راج کے سو برسوں کی نسبت آزادی کے دس برسوں میں زیادہ ترقی کی ہے۔ ہم نے ڈیم اور نہریں بنائی ہیں جن کی وجہ سے ہم اپنی ضرورت کی اجناس خود اگا رہے ہیں۔ ہم دنیا کا بہترین کپڑا تیار کرتے ہیں۔ ہم اپنی کاریں، جہاز، ٹینک اور بندوقیں بنا رہے ہیں، ہم ایٹم بم بنا سکتے ہیں، خلا میں مصنوعی سیارے بھیج سکتے ہیں اور ہندوستانی ترنگا انٹارکٹیکا کے ویرانوں میں لہرا رہا ہے۔ کیا آپ کو اپنے ملک کے کارناموں پر فخر محسوس نہیں ہوتا؟"

"کیوں نہیں، میں ان کارناموں پر فخر کرتا ہوں لیکن یہ بھی تو سچ ہے نا کہ ہندوستانی قوم دنیا کی غریب ترین قوم ہے۔ ہندوستانی جہالت میں بھی دنیا میں سب سے آگے ہیں۔ ہماری آبادی خرگوشوں کی طرح بڑھ رہی ہے۔ جلد ہی ہماری آبادی اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ ہم انہیں نہ کھانے کو روٹی دے سکیں گے نہ پہننے کو کپڑا اور نہ رہنے کو

مکان۔ تب ہم ایک دوسرے سے اسی طرح لڑیں گے جیسے کتے گوبر کی ڈھیری پر لڑتے ہیں۔ ہم دنیا کے کرپٹ ترین لوگ ہیں۔ وزیراعظم سے لے کر پولیس کانسٹیبل تک' ہر شخص بکاؤ ہے۔ ہم دنیا میں سب سے زیادہ تشدد پسند لوگ ہیں۔ 1947ء کے موسم گرما اور موسم خزاں میں ہم نے ایک دوسرے کو بکریوں کی طرح ذبح کر کے اپنی اصل فطرت عیاں کر دی تھی۔ تم آنے والے برسوں میں اس سے بھی بدترین قتل و غارت دیکھو گے۔ ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی' بودھ...... سب ایک دوسرے کو بڑے پیمانے پر قتل کریں گے۔ تمہارا گاندھی اور اس کی اہنسا ویسے ہی مردہ ہیں جیسے کہ' جیسے کہ...... کیا کہتے ہیں مرے ہوئے پرندے کو؟"

"ڈوڈو۔"

"ہاں بالکل! ڈوڈو کی طرح مردہ! تم لوگ ایسے ہی ہو۔ تمہارے بعد تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستانی قوم عظیم ہے۔ شاید تمہیں پتا ہے یا نہیں کہ ہمارا قومی موٹو ہے: سچ ہمیشہ فتح یاب ہوتا ہے۔"

بھاگ متی

بھاگ متی کا میرے علاوہ دوسرا جنون آم ہیں۔ (مجھے ایسا سوچنا اچھا لگتا ہے کہ بھاگ متی مجھے بہت پسند کرتی ہے)۔ یہ سال آموں کے لیے تو اچھا رہا لیکن ساون کے لیے نہیں۔ اور دلی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ آموں کی پہلی فصل اپریل میں تامل ناڈو سے آنا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ آم بڑے بڑے، گودے سے بھرپور لیکن بے مزہ ہوتے ہیں۔ مئی میں مہاراشٹر کا الفانسو آم دلی کے بازاروں میں نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ آم ذائقے دار تو بہت ہے لیکن اس کی قیمت قاتلانہ ہوتی ہے۔ میں الفانسو سے تبھی لطف اندوز ہوتا ہوں جب کوئی صنعت کار یا وزیر مجھے اس کا کریٹ بھجواتا ہے۔ میں اپنے پڑوسیوں کو بھی کچھ الفانسو آم بھیجتا ہوں۔ مجھے امید ہوتی ہے کہ جب اتر پردیش کا آم آئے گا تو وہ بدلے میں وہ آم مجھے بھیجیں گے۔ آج کل مجھے زیادہ سے زیادہ آم اکٹھے کرنے پڑتے ہیں کیونکہ بھاگ متی سارے آم کھا جاتی ہے اور میرے لیے ایک بھی نہیں بچتا۔ جتنی دیر میں تم ایک آم کھاؤ وہ تین چار آم کھا چکی ہوتی ہے۔ وہ اس کی گٹھلی اس طرح چوستی ہے کہ اس پر کچھ بھی نہیں چھوڑتی۔ وہ آم کھانے کے بعد زوردار ڈکار مارتی ہے اور ہاتھ منہ دھوتی ہے۔ پھر باقی ماندہ آم گھر لے جانے کے لیے اپنی

ساڑھی کے پلو سے باندھ لیتی ہے۔ وہ مجھ سے کہتی ہے: ''مجھے پتا ہے' آپ کو یہ آم مفت ملتے ہیں۔ میرے غریب گھر والوں نے اس موسم میں آم چکھے تک نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چلی جاتی ہے۔

اتر پردیش کے دسہری' لنگڑا اور رٹول آموں کا مقابلہ دنیا کا کوئی پھل نہیں کرسکتا۔ آم کی تقریباً ایک ہزار قسمیں ہیں۔ مجھے مذکورہ بالا تین قسم کے آم سب سے زیادہ پسند ہیں۔ بدقسمتی سے بھاگ متی کو بھی یہی قسمیں زیادہ پسند ہیں۔ آموں کے موسم میں وہ میرے ہاں تواتر سے آنا شروع کر دیتی ہے۔ جب وہ آتی ہے تو کھانے کی جگہ آم کھاتی ہے اور جو کھا نہیں سکتی ہے انہیں ساتھ لے جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے آموں سے اس کا ہاضمہ اچھا ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ قبض کا بہترین علاج ہیں۔ اسے وزن بڑھنے کی فکر نہیں ہے۔

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں' اس سال ساون کا موسم اچھا نہیں رہا۔ میں نے جون کے پہلے ہفتے ساون کے پرندے کو چہچہاتے سنا۔ اس کے چند دنوں بعد بارش برس جانی چاہیے تھی۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بارش ہونے کی خبریں ملتی ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ میں اتنی بارش ہوتی ہے کہ سڑکوں اور گلیوں میں پانی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ جبکہ آسام میں سیلاب تباہی پھیلا دیتا ہے۔ تاہم دلی میں جون سے لے کر جولائی تک بارش بالکل نہیں ہوتی۔ اگست میں چند ایک بار چھینٹا پڑتا ہے۔ پچھلے تین ماہ سے پپیہے کی پی ہو' پی ہو سنائی نہیں دی ہوتی۔ بھاگ متی پانچواں لنگڑا کھاتے ہوئے پیش گوئی کرتی ہے: ''قحط پڑنے والا ہے' دلی کی گلیاں لاشوں سے بھر جائیں گی۔''

پھر وہ فلسفیانہ انداز میں کہتی ہے: ''کوئی بات نہیں۔ لوگ تو اس منحوس شہر میں ہمیشہ سے مر رہے ہیں۔ قحط نہیں تو ہیضہ' طاعون' چیچک' قتل و غارت' خودکشی! یا بڑھاپا!!''

❁❁❁

اَچھوت

ہم دلی کس وجہ سے آئے' اسے اختصار سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہم ایک وسیع صحرا کے وسط میں ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ مشرق میں دریائے جہلم بہتا تھا' شمال میں بنجر پہاڑیاں تھیں جن پر کچھ نہیں اگتا تھا البتہ ان سے نمک نکالا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی ریت کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ ہڈالی میں تقریباً دو سو خاندان آباد تھے جن میں سے کم از کم ایک سو ساٹھ خاندان مسلمانوں کے تھے اور باقی ہندوؤں اور سکھوں کے۔ مسلمانوں کے پاس اراضی اور اونٹ تھے۔ وہ کنوؤں کے اردگرد سبزیاں اور گندم اگاتے تھے یا صحرا میں اگے ہوئے کھجور کے درختوں سے کھجوریں اکٹھی کرتے تھے۔ وہ اپنے بیٹوں کو فوج یا پولیس میں بھرتی کروا دیتے تھے۔ وہ اپنی تنخواہیں گھر بھیج دیا کرتے تھے اور ریٹائر ہونے پر ہڈالی میں رہنے کے لیے واپس آ جاتے تھے۔

ہم ہندو اور سکھ تاجر اور ساہوکار تھے۔ ہم مسلمانوں کو روپیہ ادھار دیا کرتے تھے۔ جب وہ ہمارا روپیہ اور اس پر لگنے والا سود واپس نہ ادا کر سکتے تو ہم ان سے اپنی خدمت لیا کرتے تھے۔ ہم نمک خرید کر ان مسلمانوں کے اونٹوں پر لدوا کر لاہور' امرتسر'

لدھیانہ اور جالندھر جیسے دور افتادہ شہروں تک لے جاتے تھے۔ ہم نمک بیچ کر چائے' چینی' مصالحہ جات اور ریشمی کپڑے لاتے اور اپنی صحرائی بستیوں میں فروخت کرتے تھے۔

ہم ہندو اینٹوں سے تعمیر کیے گئے مکانوں میں رہتے تھے۔ ہمارے پاس بھینسیں ہوتی تھیں' جو ہمارے مکانوں کے صحنوں میں بندھی رہتی تھیں۔ مسلمان جھونپڑوں میں رہتے تھے اور تھوڑے سے دودھ کے بدلے سارا سارا دن ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ہم ان کو اس لیے تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ غریب تھے۔ وہ ہمیں اس لیے تحقیر کی نظر سے دیکھتے کہ ہم تعداد میں کم تھے نیز ان کی طرح قدآور اور جسیم نہیں تھے۔

ان کی عورتیں بھی ہمارے مردوں سے زیادہ لمبی اور طاقتور ہوتی تھیں۔ وہ کنویں سے پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں بڑی آسانی سے نکال لیتی تھیں۔ وہ پانی سے بھرے چار چار گھڑے بآسانی اٹھا لیتی تھیں ـــ دو سر پر اور دو بغلوں میں۔ ان کے مرد چھ فٹ سے زیادہ لمبے اور کشیدہ قامت ہوتے تھے۔ ہم ان سے ڈرے رہتے تھے۔

میں آپ کو وہ واقعہ سناتا ہوں' جس نے ہمیں ہڈالی سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ واقعہ اگست 1947ء کے آخری ہفتے میں رونما ہوا تھا۔

کئی ماہ سے ہم سن رہے تھے کہ راولپنڈی اور لاہور کے مسلمان وہاں آباد ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کر رہے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ ہندو اور مسلمان مشرق کی طرف فرار ہو رہے ہیں' کہ جدھر مسلمان زیادہ نہیں تھے۔

پھر ہم نے سنا کہ مسلمانوں نے اپنا ملک حاصل کر لیا ہے' جسے پاکستان کہا جاتا ہے اور ہڈالی پاکستان میں ہے۔ ہمارے کچھ بڑوں نے مشورہ دیا تھا کہ ہم بھی ہڈالی چھوڑ کر دوسرے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ہندوستان چلے جائیں۔ لیکن ہم نے تو اپنا قرض وصول کرنا تھا' ہمارے اینٹوں کے مکان تھے اور ان کے صحنوں میں بھینسیں

بندھی تھیں۔ پس ہم نے اس وقت تک وہیں رہنے کا فیصلہ کیا جب تک قرض واپس نہیں مل جاتا اور جب تک ہم اپنی ساری املاک فروخت نہیں کر دیتے۔

اس وقت میری یعنی رام رکھا کی عمر سولہ سال تھی۔ میر ایک بہن تھی۔ اس کا نام بچھی تھا۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی۔ اس کی منگنی پیدا ہوتے ہی ہمارے ایک عم زاد کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ (یہ ہمارا عام رواج تھا! حاملہ عورتیں طے کر لیتی تھیں کہ اگر ان کے بچے مختلف صنف کے ہوئے تو وہ ان کی شادی کر دیں گی)۔ میرے والدین نے سوچا کہ پندرہ سالہ غیر شادی شدہ لڑکی کا گھر میں رہنا عقل مندی نہیں ہے۔ چنانچہ شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

ہماری بستی کے رواج کے مطابق مسلمانوں کے گھروں سمیت ہر گھر کو ''بھاجی'' بھیجی گئی۔ دلہا کے باپ کو مہمانوں کی ضیافت کے لیے رقم درکار تھی۔ اس نے شادی کی مقررہ تاریخ سے پندرہ دن پہلے اپنے ایک مقروض شخص سے قرض کی رقم واپس مانگی۔ جب مقروض شخص نے کہا کہ اس کے پاس رقم نہیں ہے تو دلہا کے باپ نے اس پر مقدمہ کر دیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

مسلمانوں نے ہماری ''بھاجی'' واپس کر دی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔

ہم شادی کی تیاریاں کرتے رہے۔ رواج کے مطابق میری بہن نے شادی سے پہلا ہفتہ میلے کپڑوں میں ایک کمرے میں محدود رہ کر گزارا۔ ساتویں دن خاندان کی خواتین نے اسے نہلایا' اس کی ہتھیلیوں پر مہندی لگائی اور اس کی کلائیوں میں ہاتھی دانت کی چوڑیاں پہنائیں۔ انہوں نے ڈھولک بجا بجا کر گیت گائے۔ شام ہوئی تو بچھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ رفع حاجت کے لیے باہر گئی۔ وہ اکڑوں بیٹھی رفع حاجت میں مصروف تھیں کہ مسلمان نوجوانوں کی ایک ٹولی نے انہیں گھیر لیا۔ لڑکیاں اتنی سہم گئیں کہ مدد کے لیے چیخ و پکار بھی نہیں کر سکیں۔ ان بدمعاشوں کو بچھی کو پہچاننے میں کوئی وقت

نہیں ہوئی۔ ایک لڑکے نے اسے اٹھا کر گھوڑے کی پشت پر ڈالا اور اسے لے کر گھوڑا صحرا میں دوڑا دیا۔ میرے باپ کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ چیخنے چلانے اور اپنے بال نوچنے لگا۔

وہ مسلمانوں کو گالیاں بکتا' انہیں سور کی اولاد قرار دیتے ہوئے بستی کی گلیوں میں پھرنے لگا۔ وہ دوڑتا' ریت کے ٹیلے پھلانگتا تیرہ میل دور واقع تھانے گیا اور وہاں اغوا کی رپورٹ درج کروائی۔ اس نے انسپکٹر کو نوٹوں کی ایک گڈی بھی دی۔ اگلے دن وہ پولیس والوں کے ساتھ واپس آیا۔ اس نے مشتبہ لڑکوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کروا لیے تھے۔ دو دن بعد ہم ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے۔ ملزموں کو ہتھکڑی لگا کر لایا گیا تھا۔ وہ شیطان ہمیں دیکھ کر مونچھوں کو بل دینے اور غلیظ اشارے کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا: "ذرا مجھے بڈالی واپس پہنچنے دو' اگر میں نے ان کافروں کی...... نہ پھاڑ دیں تو میرا نام طرہ باز خان نہیں!"

ان کے وکیل نے کہا کہ "میرے باپ کی درج کرائی ہوئی رپورٹ جھوٹی ہے کیونکہ میری بہن اپنی مرضی سے اس لڑکے کے ساتھ گئی ہے' جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ اس نے طرہ باز کو کہا کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ اس کے بعد نچھی کو پیش کیا گیا۔ اس نے برقعہ اوڑھا ہوا تھا' اس لیے ہماری اور اس کی نظریں نہ مل سکیں۔ اس نے کہا: "ہاں میں طرہ باز خان سے محبت کرتی ہوں اور اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہوں۔ میں مسلمان ہو چکی ہوں اور میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر واپس نہیں جانا چاہتی۔"

انسپکٹر اور سپاہی مسلمان تھے۔ ملزم اور وکیل بھی مسلمان تھے۔ ہمارا وکیل بھی مسلمان تھا۔ (سارے ہندو وکیل فرار ہو کر ہندوستان جا چکے تھے)۔ مجسٹریٹ بھی مسلمان تھا۔ اس نے مقدمہ خارج کر دیا اور ملزموں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ وہ خوشی سے چھلتے ہوئے کمرۂ عدالت سے نکلے۔

ہم نے تحفظ کی درخواست کی تو مجسٹریٹ نے مسلمانوں کو بلا کر کہا: ''تم جو کچھ چاہتے تھے وہ پا چکے ہو۔ اب ان بے چارے کافروں کو معاف کر دو۔''

انسپکٹر نے ہمیں حفاظت میں ہڈالی پہنچانے کے لیے مزید پیسے لیے۔ ہمارے گھروں کے باہر کانسٹیبلوں کو پہرے پر متعین کر دیا گیا۔ انہوں نے بھی ہم سے پیسے لیے۔

ہم ایسے حال میں ہڈالی میں کیسے رہ سکتے تھے کہ تھوڑی دور واقع ایک گھر میں ہمارے جگر کے ٹکڑے کو بھنبھوڑا جا رہا ہو؟ ہماری عورتوں نے کہا کہ وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب وہ کنویں سے پانی بھر کر واپس آ رہی ہوتی ہیں تو ان کے انتظار میں کھڑے مسلمان ان کے سامنے ننگے ہو جاتے ہیں۔ ہم نے پولیس والوں سے اس کی شکایت کی لیکن انہوں نے کچھ نہ کیا۔ ایک شام کو جب آندھی چل رہی تھی' ہم نے اپنا سامان باندھ کر اپنی بھینسوں پر لادا اور ہڈالی سے روانہ ہو گئے۔

ہم ساری رات اور سارا دن گرم ریت کے تھپیڑے سہتے سفر کرتے رہے۔ ہم سرگودھا میں اس کیمپ میں پہنچ گئے جہاں ہزاروں ہندو اور سکھ ہندوستان جانے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ ہم سے ہماری بھینسیں لے لی گئیں۔ ہم وہاں کئی دن رہے۔ اس دوران ہم نے سوکھی روٹی اچار کے ساتھ کھا کر گزارا کیا۔ پھر فوجی آئے انہوں نے ہمیں ٹرکوں میں سوار کرایا۔ وہ ہمیں لاہور لے گئے۔ ہم پیدل اور بیل گاڑیوں پر سوار لوگوں کے قریب سے گزرے۔

ہم جس سمت جا رہے تھے' اس سمت جانے والے ہندو اور سکھ تھے۔ دوسری سمت سے ادھر آنے والے مسلمان تھے۔ ہم نے بہت سے سکھوں کی لاشیں دیکھیں۔ ان کے سر کے لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور ڈاڑھیوں والے چہروں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ہم نے ہندوستان اور پاکستان سرحد عبور کی۔ وہاں بھی سڑکوں پر لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے اعضائے تناسل دیکھ کر میں نے جان لیا کہ وہ مسلمان تھے۔ وہاں بے

شمار بچوں اور عورتوں کی لاشیں بھی پڑی تھیں۔

ہمیں کوروکشیتر کے ایک کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں ستر ہزار پناہ گزین خیموں میں رہ رہے تھے۔ بہت دنوں تک ہم نے اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا کہ راشن لینے کے لیے قطاروں میں کھڑے رہتے اور ہر ملنے والے سے باتیں کرتے۔ میری ماں ہر وقت میری بہن کا نام لے کر روتی رہتی تھی۔ پھر افسروں نے آ کر ہمیں کہا کہ ہمیں وہاں سے نکل کر کام ضرور ڈھونڈنا چاہیے۔ میرے باپ نے کہا: ”کیسا کام؟ ہم ساہوکار تھے۔ اب ہمارے پاس ادھار دینے کو رقم نہیں ہے۔“

تاہم اس نے اپنے ہڈالی کے لڑکپن کے ایک شناسا کو پوسٹ کارڈ بھیجا۔ اس سکھ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ تعمیراتی ٹھیکیدار ہے' اس نے اس کام میں بہت پیسہ کمایا ہے اور بہت عرصے سے دلی میں مقیم ہے۔ دو دن بعد ہمیں اس کا جواب ملا۔ اس نے ہمیں دلی بلایا تھا۔ ہم ریل کے ذریعے دلی روانہ ہو گئے۔

سفر کے دوران میرے باپ نے اس سکھ کے حوالے سے بتایا کہ وہ دونوں ہڈالی کے قریب ریت کے ٹیلوں میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ ہم جوں جوں دلی کے نزدیک ہوتے گئے' میرے باپ کو بچپن کی باتیں بہت زیادہ یاد آتی گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا باپ اور وہ سکھ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کوجھی ڈال لیں گے۔

ہمیں اپنا سامان سروں پر لاد کر ریلوے سٹیشن سے چھ میل دور تک پیدل جانا پڑا۔ ہمیں اس سکھ کا گھر بڑی مشکل سے ملا۔ میرا باپ ہمیں گیٹ پر ٹھہرا کر خود اس کا پتا کرنے اندر گیا۔ وہ دس قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک جسیم کتے نے اس پر حملہ کر دیا۔ میرا باپ واپس دوڑا۔ اس کے ہمارے پاس واپس پہنچنے سے پہلے ہی کتے نے اس کی قمیض کا ایک ٹکڑا پھاڑ لیا تھا۔ خاکی یونیفارم پہنے ایک شخص گھر سے باہر آ کر غصے سے ہم سے پوچھنے لگا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ میرے باپ نے بڑی لجاجت سے پوچھا کہ یہ گھر فلاں صاحب کا ہے نا۔

اس آدمی نے غرا کر کہا: ''ہاں۔کیا کام ہے تمہیں؟''

میرے باپ نے سکھ کا خط اسے دکھایا۔

وردی پوش نے کہا: ''یہیں انتظار کرو۔''

کتا وہیں کھڑا ہمیں دیکھتے ہوئے غراتا رہا۔ اس آدمی نے واپس آ کر کتے کو شُشکار کر بھگا دیا اور ہمیں جھڑکنے کے سے انداز میں اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ ہم اپنا سامان اٹھا کر اس آدمی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ ایک وسیع و عریض' دو منزلہ مکان تھا' جس میں ایک بڑا باغ بھی تھا۔ سکھ اور اس کی بیوی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

سکھ نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا: ''اچھا تو تم آ گئے سین دتہ!''

میرے باپ نے سر کا بوجھ اتارتے ہوئے اس سکھ کے پاؤں چھوئے۔ میری ماں نے فرش پر بیٹھ کر اپنا ماتھا سکھ لیڈی کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور رونے لگی۔ لیڈی نے کہا: ''تمہارے رونے سے کیا بنے گا؟ جو ہونا تھا' ہو چکا۔'' پھر اس نے وردی پوش آدمی سے کہا کہ وہ ہمیں باورچی خانے میں لے جائے اور ہمیں کھانے کو کچھ دے۔

ہمیں ایک گیراج میں جا کر آرام کرنے کا کہا گیا۔ آدھا گیراج ٹرنکوں اور کریٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ باقی آدھے گیراج کو ہمارا گھر بننا تھا۔ ہم ایسے لوگوں کی طرح فرش پر سوئے' جن کے گھرانے میں فوتیدگی ہوگئی ہو۔

نئی دلی میں ہماری نئی زندگی کی شروعات یوں ہوئی۔

☆☆☆

میرے ماں باپ میری نسبت نئے ماحول سے جلد مانوس ہو گئے۔ میرے باپ کو رات کے وقت پہرہ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ میرے باپ کو ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں ایک ڈنڈا پکڑے پورے گھر کے گرد چکر لگاتے ہوئے ہر کونے پر ''خبردار رہو'' کا نعرہ لگانا پڑتا تھا۔ اس نے اپنی قمیض پھاڑنے والے جسیم کتے

کو دوست بنا لیا تھا۔ کتا اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔ میرا باپ اس بات کا عادی ہو گیا کہ کسی زمانے کا اس کا بہترین دوست سکھ اسے ''اوئے'' کہہ کر بلائے اور وہ اسے ''جی'' کہہ کر جواب دے۔ میری ماں فرش صاف کرتی اور سکھ کی بیوی کے پاؤں دبایا کرتی تھی۔

مجھے اس بات نے زیادہ دکھ پہنچایا کہ میرے ماں باپ کا رویہ میرے ساتھ تبدیل ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں ان کا زندہ بچ رہنے والا واحد بچہ تھا۔ مجھے اس کی وجہ کا علم تھا۔ وہ اپنا سارا پیسہ کھو چکے تھے۔ ہم تینوں کے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے میری ماں کو اپنی سونے کی چوڑیاں اور بالیاں بیچ دینا پڑیں تھیں۔ اب حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر کھانے کے دوران میں ایک اور چپاتی مانگ لیتا تو وہ کہتی ہے: ''تیرا پیٹ ہے یا کنواں؟'' میرے باپ نے مجھے ''مسٹنڈا'' کہنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز وہ دونوں مجھ پر سخت ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں جا کر کوئی کام تلاش کروں۔ یوں مجھے اس اجنبی شہر کی اجنبی فضاؤں میں دھکیل دیا گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کام کی تلاش کہاں سے شروع کرنی چاہیے؟ میرے باپ نے مجھے کہا تھا کہ میں گھر گھر جا کر لوگوں سے پوچھوں کہ انہیں نوکر کی ضرورت تو نہیں۔ دلی کام کے متلاشی پنجابی پناہ گزینوں سے بھرا پڑا تھا۔

میں جس گھر بھی گیا' وہاں گیٹ پر چوکیدار کھڑا ہوتا تھا' جو مجھ سے میری آمد کا مقصد پوچھتا۔ جب میں اپنی آمد کا مقصد بتاتا تو وہ مجھے وہاں سے رفوچکر ہو جانے کا کہتا۔ میں پرانے اور نیو دلی سے واقف ہو گیا۔

میں ان عمارتوں سے واقف ہو گیا' جن میں بڑے بڑے افسر اپنی بڑی بڑی کاروں پر اور کلرک سائیکلوں پر کام کرنے آتے تھے' میں تمام بازاروں سے اور وہاں فروخت ہونے والی اشیاء سے واقف ہو گیا تھا۔ تاہم مجھے کام نہیں ملا۔ میرا باپ روز بروز زیادہ سخت ہونے لگا تھا۔ میری ماں مجھے اس کے غصے سے بچاتی۔ میں رات کو دیر

سے آنے لگا۔ میں مکان کے گرد چکر لگانے والے اپنے باپ کی نظروں سے بچ کر گیراج میں گھس جاتا۔ میری ماں مجھے کھانا دیتی اور میرے سو جانے تک میری ٹانگیں دباتی رہتی۔

مجھے اکثر ہڈالی کے خواب دکھائی دیتے تھے جہاں میں چاندنی راتوں کو اس کے درختوں سے خالی میدانوں اور صحرا میں کھیلا کرتا تھا۔ میں مسلمان عورتوں کے خواب دیکھتا۔

انہوں نے سروں پر پانی سے بھرے گھڑے اٹھائے ہوتے تھے اور ململ کی بھیگی ہوئی باریک قمیضوں سے ان کی کالی کالی بھٹنیاں دکھائی دے رہی ہوتی تھیں۔ میں خواب میں ان کی ٹانگوں کے درمیان بھنچنے کی لذت اٹھاتا۔ بعض اوقات میں ڈراؤنے خواب دیکھتا' جن میں گدھوں جتنے بڑے بڑے اعضائے تناسل والے مسلمان مرد مجھ پر جھپٹ رہے ہوتے تھے۔ میں کراہنے لگتا۔ میری ماں مجھے ہلا کر جگاتی اور بانہوں میں بھر کر دوبارہ سونے کا کہتی۔

میرے باپ نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اس کے رویے کا جواز دینے کی کوشش کرتی۔ وہ مجھ سے پوچھتی کہ میں نے کیا کیا دیکھا ہے۔ وہ کہتی: ''تم کبھی اپنی ماں کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟''

ایک روز اس نے میرے ساتھ جانے کے لیے اپنی مالکن سے اجازت لی۔ میں نے اسے گورنمنٹ سیکرٹریٹ اور پارلیمنٹ ہاؤس دکھائے۔ حیرت سے اس کا منہ یوں کھلا رہ گیا جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔ اس نے مجھ سے طرح طرح کے سوال کیے۔ میں نے بھی اسے طرح طرح کے جواب دیے۔ اس نے مجھے اہم ہونے کا احساس عطا کیا۔

جب وہ بسوں اور موٹر کاروں سے ڈرتی تو میرا ہاتھ تھام لیتی۔ اس نے مجھے احساس دلایا کہ میں ایک بالغ اور طاقتور مرد ہوں۔ میں اسے برلا مندر لے گیا۔ اس

نے شِو' پاربتی' گنیش' وشنو' لکشمی' کرشن' رادھا' رام اور سیتا نیز دوسرے سب دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا کی۔ اس نے بچھی کے لیے پرارتھنا کی۔ اس نے ایک پیسے کا سکہ میرے سر کے گرد گھما کر پنڈت کو دیا۔ اس نے اسے کہا کہ وہ میرے ماتھے پر مقدس راکھ ملے اور نوکری ملنے کی پرارتھنا کرے۔

ہم برلا مندر سے ہنومان مندر چلے گئے۔ وہاں بے شمار لوگ اور مٹھائیوں' کھلونوں' غباروں اور چوڑیوں کے کھوکھے تھے۔ یہاں بھی میری ماں نے پنڈت کو ایک پیسہ دیا اور ہنومان جی سے میری نوکری کے لیے پرارتھنا کی۔ ہم کھوکھوں کے درمیان گھومتے پھرتے رہے۔ اس نے مجھے شیشے کی چوڑیاں خریدنے کے لیے کچھ پیسے دیے۔ اس نے چوڑیاں اپنی کلائیوں میں چڑھالیں۔

جب ہم مندر سے نکلے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور آسمان ایک ایسے دیو جیسا لگ رہا تھا' جو سونے والا ہو۔ کناٹ سرکس کے درخت چہچہاتے ہوئے پرندوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میری ماں نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم نے خوبصورت لباسوں والی لیڈیز اور جینٹل مینوں کو چیزیں خرید کر اپنی خوبصورت موٹر کاروں میں بیٹھ کر جاتے دیکھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ میرا باپ لالٹین اور ڈنڈا لیے ''خبردار رہو'' کے نعرے لگانے کے لیے جا چکا تھا۔ اگرچہ ماں بہت تھکی ہوئی تھی' پھر بھی اس نے میرے لیے کھانا گرم کیا۔ جب میں لیٹا تو اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے میرے بالوں میں تیل کی مالش کی۔ جب میری آنکھ کھلی تو وہ کہہ رہی تھی: ''مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی دیوتا میری پوجا کے صلے میں تمہیں نوکری دے گا۔''

دیوتاؤں نے میری ماں دعائیں سن لیں اور اگلی ہی صبح مجھے نوکری مل گئی۔ آپ کو اندازہ ہے کہ مجھے کہاں نوکری ملی؟ سڑک پار والے گھر میں۔ یہ اپنی جگہ ایک کہانی ہے۔

جس مکان میں ہم رہتے تھے' اس کے سامنے ایک راؤنڈ اباؤٹ تھا' جہاں سے بہت سی سڑکیں نکلتی تھیں۔ ایک سڑک کے پار پاکستان کے بانی جناح صاحب کا گھر تھا۔

ایک مکان میں "گاؤ رکھشا سوسائٹی" کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہمارے گیراج کے سامنے سڑک کے پار والا بہت بڑا گھر سیٹھ برلا کا تھا۔ اس کے چچا نے برلا مندر تعمیر کروایا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ برلا ہندوستان کا امیر ترین شخص ہے۔ اس کے گیٹ پر ہر وقت لوگوں کا ہجوم اور پولیس کا پہرا رہتا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ وہ لوگ بھی میری طرح نوکری ڈھونڈ رہے ہیں' پس میں نے ان میں شامل ہونا بے فائدہ جانا تھا۔ میں پولیس والوں سے بھی ڈرتا تھا۔ میں نے لاؤڈ سپیکر سے گیتوں اور تقریروں کی آوازیں سنی تھیں اور مجھے پتا چلا تھا کہ وہاں مہاتما گاندھی رہتا ہے اور کوئی بھی اس کے درشن کرنے جا سکتا ہے۔

اگلی صبح میں گاندھی جی کے درشن کرنے چلا گیا۔ مجھے کسی نے نہیں روکا۔ لان میں سفید فام صاحبوں اور میم صاحبوں سمیت بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ سامنے پلیٹ فارم پر مائیکروفون رکھا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی آئی اور میرے نزدیک بیٹھ گئی۔

چند منٹ بعد مہاتما ایک عورت کے کندھے پر لدا ہوا سا آیا۔ سب کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے نعرہ لگایا' "مہاتما گاندھی کی جے۔" میرے نزدیک بیٹھے نوجوانوں نے جواباً زوردار آواز میں کہا: "بھارت ماتا کی جے۔" مہاتما گاندھی نے پلیٹ فارم پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مردوں اور عورتوں کی ایک ٹولی نے گانا شروع کر دیا:

رگھوپتی رگھو راجا رام

پتیت پاون سیتا رام

میں نے اس سے پہلے یہ گانا نہیں سنا تھا۔ مجھے یہ گانا بہت اچھا لگا۔ اس کے

بعد انہوں نے یہ گانا گایا:

ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سمتی دے بھگوان

یہ گانا بھی مجھے اچھا لگا۔ گانا ختم ہونے کے بعد ایک ڈاڑھی والا مسلمان مہاتما کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مائیکروفون اپنے سامنے رکھا اور ایک کتاب سے کچھ پڑھنے لگا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے نوجوان چیخ کر بولے: ''مسلمانوں نے ہماری ماؤں بہنوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اب ہم اس ملک میں قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' وہ اچھل کر کھڑے ہوئے اور نعرے لگانے لگے: ''بھارت ماتا کی جے۔''

مہاتما نے مائیکروفون اپنی طرف کھینچا اور مینڈک جیسی آواز میں بولا: ''بھائیو اور بہنو! میں تو تمام مذاہب کا احترام کرتا رہوں گا۔ اگر آپ مجھ سے متفق نہیں ہیں تو میری پوجا کی نشستوں میں مت آیا کریں۔ اگر آپ رکاوٹ بنیں گے تو میں اکیلا ہی پوجا کرلوں گا۔ اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور اس بات پر غور کرو کہ ہماری آزادی کا یہ انجام اچھا ہے کہ بھائی بھائی کو مارے۔''

اس نے کھڑے ہو کر نمسکار کیا اور وہاں سے چلا گیا۔

اس سے پہلے کہ میں واقعات کو سمجھوں' پولیس نے ہمیں گھیر لیا۔ مجھے بھی دوسرے نوجوانوں سمیت دھکیل کر ایک وین میں سوار کرا دیا گیا۔ نوجوان نعرے لگاتے رہے: ''بھارت ماتا کی جے۔'' یہاں تک کہ ان کے نعرے سننے کو کوئی نہ رہا۔

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس افسر نے پیچھے مڑتے ہوئے کہا: ''مہاتما بدھو کی جے۔''

نوجوان ہنسنے لگے۔ کانسٹیبل اور وین کا ڈرائیور بھی ہنسنے لگے۔ ایک نوجوان بولا: ''سب انسپکٹر صاحب! ہمیں زیادہ دور مت لے جایئے۔''

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ''آپ جہاں کہیں گے' آپ کو وہیں اتار دیا جائے گا''

لیکن پلیز برلا ہاؤس واپس مت جایئے گا' ورنہ وہ میرا گلا کاٹ دیں گے۔"

ایک نوجوان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "ہمیں برلا مندر کے پاس اتار دو' ہمارا آج کا اور کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

ہمیں برلا مندر کے پاس اتار دیا گیا۔ تب ایک لڑکے کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے پوچھا: "ارے! تم کون ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں ایک پناہ گیر ہوں اور مجھے غلطی سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

وہ ہنسنے لگے۔ ایک اور لڑکے نے کہا: "تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں مل جاتے؟ کیا تم اس بڈھے کے مسلمانوں کو چاہنے والے چیلے تو نہیں ہو؟"

میں نے انہیں بتایا کہ میری بہن کو پاکستان میں اغوا کر لیا گیا ہے' میں مسلمانوں کو چاہنے والا کیسے ہو سکتا ہوں؟

ان کے لیڈر دکھائی دینے والے نوجوان نے کہا: "تم ایک طاقتور پنجابی ہو۔ تمہیں ایک سچے کشتری کی طرح ہندو دھرم کے لیے لڑنا چاہیے۔"

اس نے میری کمر تھپکی اور میرے پٹھوں کو چھوا۔ اس سے پہلے کسی نے مجھے طاقتور نہیں کہا تھا۔

انہوں نے پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کچھ نہیں کرتا۔

ان کے لیڈر نے کہا: "تو پھر سنگھ میں شامل ہو جاؤ۔ تم دفتر میں کام کرنا اور ہماری کینٹین سے کھانا کھانا۔"

مجھے اس سنگھ کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا' مگر میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ مجھ سے ایک کاغذ پر دستخط لیے گئے اور ایک نمبر دیا گیا (صرف لیڈر کو لڑکوں کے ناموں کا پتا تھا' باقی سب ایک دوسرے کو نمبروں سے جانتے تھے)۔ مجھے فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کرنا

اور دفتر کے باہر بیٹھ کر صرف ایسے لوگوں کو اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا تھی، جنہیں اس دن کے پاس ورڈ کا علم ہو۔ مجھے ایک وردی دی گئی۔ مجھے اپنی تنخواہ میں سے پانچ روپے پیشگی بھی دیے گئے۔

میں جس سنگھ میں شامل ہوا تھا' اس کا سنسکرت نام بہت لمبا تھا۔ میں جب بھی "راشٹریہ" کہتا' لڑکے ہنسنے لگتے۔ میں جب بھی "سویم" کہتا' لڑکے ہنسنے لگتے۔ چنانچہ میں سنگھ کو اس کے انگریزی مخفف آر ایس ایس سے پکارنے لگا۔

میں نے اپنی ماں کو پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے حلوا پکایا اور سکھ اور اس کی لیڈی کو دیا۔ اس نے ملازموں کو بھی حلوا دیا۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے کتے کو بھی تھوڑا سا حلوا دیا۔ میرے باپ نے مجھے ڈانٹنا چھوڑ دیا۔

میں ہر روز صبح سویرے گھر سے نکل جاتا۔ دفتر پہنچ کر میں فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کرتا۔ پھر میں وردی پہن کر لڑکوں کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو جاتا۔ ہمارا لیڈر سنگھ کا زعفرانی رنگ کا جھنڈا لہراتا۔ ہم سینوں پر ہاتھ باندھ کر جھنڈے کو سلامی دیتے۔ اس کے بعد ہم ایک گھنٹے تک ڈرل اور پہلوانی کرتے۔

ہمیں لاٹھیوں سے لڑنا سکھایا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جلد ہی ہمیں بندوقیں دی جائیں گی اور گولیاں چلانا سکھایا جائے گا۔ شام کے وقت ہمیں ہندو دھرم اور تاریخ پر لیکچر دیے جاتے تھے۔ وہ ہمیں آریاورت یعنی آریاؤں کی سرزمین کی عظمت کے بارے میں بتاتے تھے۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ کس طرح مسلمان ہندوستان آئے' انہوں نے کس طرح ہمارے مندروں کو تباہ کیا' لاکھوں ہندوؤں کو ہلاک کیا اور ہندو عورتوں کو اغوا اور ان سے زنا بالجبر کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اپنے دھرم کے لیے لڑنا ہے' بھارت کو مسلمانوں اور عیسائیوں جیسے ملیچھوں سے صاف کرنا ہے' کہ عیسائی بھی غیر ملکی ہیں اور ہماری گاؤ ماتا کو کھاتے ہیں۔

مسلمانوں کو دلی یا ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں رہنے کا حق کیسے ہو سکتا ہے جبکہ انہوں نے ہم ہندوؤں اور سکھوں کو اپنے پاکستان سے نکال دیا ہے؟ ہم ان کی عورتوں اور املاک کو کیوں نہیں چھین سکتے اور انہیں پاکستان یا جہنم کیوں نہیں بھیج سکتے؟ ہمارے سامنے اس طرح کے سوالات روز رکھے جاتے تھے۔

ایک روز چیف نے مجھے بلا بھیجا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''کیا تم 840 ہو؟''

مَیں نے اٹینشن ہو کر اسے سلیوٹ کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تمہاری بہن کو پاکستان میں اغوا کر لیا گیا تھا؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں۔''

''کیا تم اس حوالے سے کچھ نہیں کرو گے؟ کیا تم یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے؟''

میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ میں نے کہا: ''سر! 840 اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکتا ہے۔ اس کے پاس نذر کرنے کو اور کچھ نہیں ہے۔''

چیف مسکرانے لگا۔ اس نے کہا: ''ہم ہندو اپنی جان دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں دوسروں کی جان لینی نہیں آتی۔ اس صورتحال کو لازماً بدلنا ہو گا۔ کیا تم اپنی قیادت میں دلی کے مسلمانوں پر حملہ کروانے کے لیے تیار ہو؟ یاد کرو انہوں نے تمہاری بہن کے ساتھ کیا کیا تھا!''

خون میرے چہرے پر اکٹھا ہو گیا۔ میں نے دوبارہ اٹینشن ہو کر اسے سلیوٹ کیا اور بولا: ''840 ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔''

چیف کے سامنے ایک کاغذ پڑا تھا۔ اس نے چند نمبر پڑھتے ہوئے کہا: ''یہ لڑکے تمہارے ساتھ ہوں گے۔ جب تم ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ تو مجھے اطلاع دینا۔ میں اس بات کا انتظام کروں گا کہ پولیس تمہارے راستے میں نہ آئے۔''

میں اسے سلیوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔ اصل مسئلہ یہ معلوم کرنے کا تھا

کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں۔ مسلمانوں نے کرنال' انبالہ' امرتسر اور جالندھر میں رونما ہونے والے واقعات سن لیے تھے' اس لیے انہوں نے اپنی سرخ ترکی ٹوپیاں اور جناح کیپس جلا کر گاندھی کیپس پہننا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے ڈاڑھیاں صاف کروا دیں' شیروانی پہننا چھوڑ دیا اور پاجاموں کی بجائے دھوتی باندھنے لگے۔ ان کی عورتیں گھر سے باہر جاتیں تو برقعہ نہیں اوڑھتی تھیں اور ماتھوں پر سرخ نشان لگاتی تھیں۔ وہ السلام علیکم کی بجائے نمستے کرنے لگے تھے۔ ہمارے پاس کسی مسلمان کو پہچاننے کا واحد طریقہ یہ بچا تھا کہ یہ دیکھیں کہ اس کا ختنہ ہو چکا ہے یا نہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم ہر کسی کو روک کر یہ کیسے کہیں: ''اپنا قضیب دکھاؤ!''

ہم احتیاط کے ساتھ منصوبہ سازی اور تیاریاں کیے بغیر ایکشن نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے اپنے ایکشن کا آغاز یوں کیا کہ مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں پر سواستیکا کا نشان لگا دیا۔ مسلمان غنڈوں کو پتا چلا تو انہوں نے ہندوؤں کے گھروں اور دکانوں پر سواستیکا کا نشان لگا دیا۔ ہم نے اپنے منصوبوں میں تبدیلی کی اور مسلمانوں کی مشہور دکانوں پر حملہ کر کے اس کا نتیجہ دیکھنے کا منصوبہ بنایا۔ نئی دلی کے وسط میں کناٹ سرکس میں ایک مسلمان کی بہت بڑی دکان تھی۔ چیف نے نئے منصوبے کی منظوری دے دی اور اس پر عمل کرنے کے لیے ایک دن کا تعین کر دیا۔

جوں جوں متعینہ دن قریب آ رہا تھا' میں نروس ہوا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سارے مسلمان مر جائیں لیکن میں کسی ایک بھی مسلمان کو قتل کرنے سے ڈرتا تھا۔ میں تو دلی سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ کوئی شخص ایسا نہیں تھا' جس کے سامنے میں اپنے ان خیالات کو بیان کر سکتا۔ اگر میں اپنی ماں پر اعتماد کر کے اسے بتاتا تو وہ یقیناً بڑی گڑبڑ پیدا کر دیتی — وہ یوں کہ وہ میرا راز میرے باپ اور سکھ لیڈی کے سامنے افشا کر دیتی۔

ایکشن سے ایک رات پہلے مَیں گھر جلدی چلا گیا۔ میری ماں گیراج میں

موجود تھی۔ وہ سکھ کے باورچی خانے کے لیے سبزی چھیل رہی تھی اور کتے سے باتیں کر رہی تھی' جو کہ اکثر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ میں اپنے گدے پر لیٹ گیا۔

''وے شمبیا! (اس کا نام سمبا تھا)' تم نے میری پچھی کو تو نہیں دیکھا؟ اگر ان مسلمان راکھشسوں نے اسے اغوا نہ کیا ہوتا تو وہ یہاں ہمارے ساتھ ہوتی۔ تم اس کی شادی ہوتے دیکھتے۔ تم آتش بازی کا مظاہرہ دیکھتے اور بینڈ سنتے لیکن اس کی قسمت!''

اس نے اپنے ماتھے پر دوہتڑ مارا اور رونے چلانے لگی: ''ہائے پچھی! ہائے بیٹی! تو کہاں ہے؟ بھگوان کرے تجھے اغوا کرنے والے مسلمان نرک میں جائیں۔''

کتا اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے میری ماں کے کان کے پاس منہ لے جا کر ہلکی سی آواز نکالی اور رونے لگا۔ میری ماں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے سینے سے لگا گیا۔ مجھ میں اس سے زیادہ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں نے اس سے کہا: ''ماں! تم کیوں رو رہی ہو؟ مسلمانوں نے ہماری پچھی کے ساتھ جو کچھ کیا ہے' میں اس پر انہیں سبق سکھاؤں گا۔''

اس کے بعد میں خود پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن تھا؟

مجھے زیادہ گہری نیند نہیں آئی تاہم جب صبح ہونے سے پہلے جیپ مجھے لینے آئی تو میں جاگ اٹھا۔ دوسرے لڑکے پہلے ہی ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔ ہم نے مختصری پوجا کی' چائے پی اور بسکٹ کھائے اور جیپ میں بیٹھ کر کناٹ سرکس چلے گئے۔ میں نے لڑکوں کو ان جگہوں پر کھڑا کیا' جن کا میں پہلے ہی تعین کر چکا تھا۔ میں نے انہیں وہ جگہ بھی دکھا دی تھی جہاں جیپ کھڑی ہوتی اور ہم کام مکمل کرنے کے بعد وہاں آ کر جیپ میں بیٹھ کر فرار ہو جاتے۔ ہم سب نے اپنی اپنی گھڑیوں کا وقت ملایا تاکہ ایکشن ٹھیک وقت پر ایک ساتھ شروع کر سکیں۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ میرے اشارے کا انتظار کریں۔ میں نے اپنی آستین میں لوہے کی ایک نوکیلی سلاخ چھپا رکھی تھی۔

میں کناٹ سرکس میں تفریحی انداز میں ٹہلنے لگا۔ میں نے دکانداروں کو آتے

دیکھا۔ وہ دکان کھولنے سے پہلے زیرلب دعا کرتے اور پھر قفل کھولتے۔ ہم نے جس مسلمان کی دکان کو چنا تھا' وہ ابھی تک بند تھی' تاہم چار نوکر باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ میں ان کے سامنے سے گزرا۔ اگرچہ انہوں نے گاندھی کیپس پہنی ہوئی تھیں تاہم ان کی باتوں سے پتا چل جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔

ابھی میں چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ ایک کار آ کر دکان کے سامنے والے فٹ پاتھ کے قریب درخت کے نیچے رک گئی۔ ہمارا جو لڑکا مسلمان دکاندار کو پہچانتا تھا' اس نے نشاندہی کے لیے پکڑی ہوئی بید کی چھڑی گرا دی۔ ہم سمجھ گئے کہ "یہ ہمارا آدمی ہے۔" میں ایک ستون کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ دکاندار نے کار کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے' دروازے مقفل کر کے ہینڈل کھینچ کر تسلی کی کہ وہ ٹھیک سے مقفل ہو گئے ہیں اور پھر سڑک پار کرنے لگا۔

اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور توند نکلی ہوئی تھی۔ اس نے فیشن ایبل دلی والوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا' یعنی سنہری کڑھائی والا ململ کا کرتا اور کلف دار سفید شلوار۔ اس نے ایک ہاتھ میں چاندی کا پاندان پکڑا ہوا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں سگریٹوں کا ایک ٹن (Tin) اور ماچس کی ڈبیا تھی۔ ایک آدھا پیا ہوا سگریٹ اس کے ہونٹوں سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ کسی حاملہ عورت کی طرح چل رہا تھا۔

لڑکے اپنی اپنی جگہوں سے نمودار ہوئے: تین ایک طرف سے اور تین دوسری طرف سے۔ میں ہنوز انتظار میں تھا۔ جونہی اس نے سڑک پار کر کے برآمدے میں قدم رکھا' میں اس کے پیچھے آ گیا۔ اس کے نوکروں نے جھک کر کہا: "السلام علیکم۔" اس نے سر ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ اس نے پاندان ایک نوکر کو دیا اور چابیاں نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے آستین سے سلاخ نکالی اور اس کی کمر کے بیچ کھونپ دی۔

اس نے چیخ ماری "ہائے اللہ" اور الٹ کر مجھ پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں سلاخ کھینچ کر اسے فٹ پاتھ پر دھکیل دیا۔ میں نے

سیٹی بجائی تو لڑکے اس کے نوکروں پر ٹوٹ پڑے۔
نوکر چیخنے لگے: "بچاؤ' بچاؤ' پولیس' پولیس' مت مارو۔"
کوئی ان کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ چند سیکنڈوں میں ہی پانچ مسلمان فٹ پاتھ پر خون کے تالاب میں پڑے کراہ رہے تھے۔ ہم نے دکان کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے اور اندر گھس گئے۔
وہ ایک جوتوں کی دکان تھی' جس میں چمڑے کی دیگر مصنوعات مثلاً بیگ بیلٹیں اور پرس وغیرہ بھی فروخت ہوتے تھے۔ میں نے دو بڑے سوٹ کیس اٹھائے اور جو کچھ ہاتھ لگا ان میں بھرنے لگا۔ میں نے دکاندار کی میز پر سے ایک ریڈیو' چاندی کا بنا ہوا ایک کیلنڈر اور چند فاؤنٹین پین اٹھائے۔ اسی اثنا میں کچھ دوسرے لوگ بھی' جن میں چوکیدار' چپراسی اور طالب علم وغیرہ شامل تھے' دکان میں گھس آئے تھے اور ہاتھ لگنے والی سب چیزوں کو لوٹ رہے تھے۔
ہم تیزی سے اپنی جیب تک پہنچے۔ اس وقت تک ساری کناٹ سرکس میں افراتفری مچ چکی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کی دکانوں پر حملے کرنے اور انہیں لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ پولیس وینیں چکر لگا رہی تھیں اور کانسٹیبل سیٹیاں بجاتے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہم بغیر کسی دشواری کے فرار ہو گئے۔
میرا جسم اس طرح کپکپا رہا تھا' جیسے مجھے تیز بخار ہو گیا ہو۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دھک' دھک' دھک۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ہم ہیڈ کوارٹر پہنچے تو میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ انہوں نے مجھے اسپرین کی دو گولیاں اور چائے کی پیالی دی۔ جو ہوا تھا' میری آنکھوں کے سامنے تھا۔
میں نے اس منظر سے بچنے کے لیے آنکھوں کو ایک تکیے سے ڈھانپ لیا' لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ مجھے اس مسلمان کے سفید سفید دیدے نظر آتے رہے' جسے میں نے قتل کیا تھا۔ میرے کانوں میں اس کی چیخ گونج رہی تھی: "ہائے اللہ۔" یہ چیخ

مسلسل میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ شام تک میں اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔ پھر شام کے وقت میں نہایا تو طبیعت کچھ سنبھلی۔ میں نے لوٹی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا۔ میں نے ان چیزوں کو الگ کیا' جنہیں میں گھر لے جانا چاہتا تھا اور باقی چیزوں کو دوسرے سوٹ کیس میں ڈال دیا۔

میں ان چیزوں کو صدر بازار لے گیا' لیکن چونکہ مسلمانوں کی بہت سی دکانوں کو لوٹا جا چکا تھا اور بازار میں لوٹی ہوئی چیزوں کی بہتات تھی' اس لیے مجھے ان چیزوں کی زیادہ قیمت نہ مل سکی۔ تاہم میں نے ڈیڑھ سو روپے کما لیے تھے۔ اکیلا ریڈیو ہی سو روپے کا بکا تھا۔

گھر واپس جاتے ہوئے میں نے اپنے باپ کے لیے ایک فلیش لائٹ اور ماں کے لیے ململ کا رنگین دوپٹہ خریدا۔

میں نے کچھ پھل اور صاف شدہ مکھن کا ایک ڈبا بھی خریدا۔ میں اندھیرا چھا جانے کا انتظار کرتا رہا تا کہ سکھ کے گھرانے کا کوئی فرد مجھے بڑے سے نئے سوٹ کیس کے ساتھ آتا نہ دیکھے۔ میں سیدھا گیراج میں چلا گیا۔ میری ماں چولہے کے سامنے بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔

میں نے ماں سے کہا کہ میں نے اپنی پوری تنخواہ خرچ کر کے یہ چیزیں خریدی ہیں۔ میں نے دوپٹہ اس کے شانوں پر پھیلایا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس نے میرے باپ کے قدموں کی آہٹ سنی تو اسے دوپٹہ دکھانے کے لیے دوڑی دوڑی باہر چلی گئی۔

وہ اتنے جوش میں تھی کہ اس کے منہ سے صرف ''دیکھ' دیکھ'' ہی نکلا۔ میں نے اپنے باپ کے ہاتھ سے لالٹین لے لی اور اسے فلیش لائٹ دی۔ وہ یوں خوش ہو گیا جیسے بچے کو نیا کھلونا مل گیا ہو۔ اس نے فلیش لائٹ کا بٹن دبایا اور گیراج کی دیواروں پر روشنی ڈالنے لگا۔ انہوں نے جوتے پہن کر دیکھے' بٹوؤں اور سوٹ کیس کو تھپتھپایا۔ وہ

دونوں بہت خوش تھے۔

میں اس رات سو نہ سکا۔ مجھے تو آنکھیں بند کرتے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ میں اس شخص کے بھوت سے خوفزدہ تھا' جس کو میں نے قتل کیا تھا۔ وہ مسلسل میرے کانوں میں چیخ رہا تھا: "ہائے اللہ۔" میں اپنے آپ کو محفوظ پانے کے لیے اپنے باپ کے قدموں کی آہٹ اور اس کی "خبردار ہو!" کی پکار سننے کا منتظر تھا۔ میں کانپنے اور سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ میری ماں جاگ گئی تھی۔ اس نے پوچھا: کیا ہوا ہے؟

میں زیادہ اونچی آواز میں سسکیاں بھرنے لگا۔ اس نے میرے پاس آ کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے اس کی کمر کے گرد بازو لپیٹ لیے۔ مجھے نیند آنے لگی۔ اس نے میری کمر سہلائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے ساتھ لیٹ گئی۔ میری کپکپی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے حرارت اور تحفظ اور بے خوفی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی چھاتیوں کے گرد بازو لپیٹ لیے' اپنی دائیں ٹانگ اس کے اوپر رکھی اور اسے اپنے مزید قریب کر لیا۔ پھر میں سو گیا۔

☆☆☆

قتل کے بعد والی صبح میں نے پیچش کا بہانہ کیا اور اگلے پانچ دن تک گھر ہی رہا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا ہوتا تو بھی میں باہر نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ شہر کے مختلف علاقوں میں بلوے شروع ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا' ان کے گھروں اور دکانوں کو لوٹ لیا گیا اور ان کی املاک پر قبضہ کر لیا گیا۔ وہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں پاکستان کی طرف بھاگ گئے۔ پرانا قلعہ اور بڑی مسجد کے اردگرد تھوڑے بہت مسلمان رہ گئے۔ دلی کے لیے پہلی جنگ جیتی جا چکی تھی۔ تاہم ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔ ہمیں نہرو اور گاندھی جیسے مسلمانوں کو چاہنے والے لوگوں سے لڑنا تھا' باقی رہ جانے والے مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیلنا تھا اور بھارت ورش سے اسلام کا ہر نقش مٹانا تھا۔

گاندھی ہمارا دشمن نمبر ایک تھا۔ وہ کہتا تھا: ''مسلمانوں کے مکانوں اور مسجدوں کو واگزار کردو۔''

میں اسے کہنا چاہتا تھا: ''اوئے بڈھے! اگر ہم ان کے مکانوں اور مسجدوں کو خالی کردیں گے تو رہیں گے کہاں؟ فٹ پاتھوں پر؟ سیٹھ برلا کے محل میں رہنے والے کو ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔''

نہرو ہمارا دشمن نمبر دو تھا۔ وہ ہمیں ''غنڈے'' کہتا تھا۔ ہم اس سے کہنا چاہتے تھے: ''اوئے پنڈت! جب مسلمان غنڈے ہمارے گلے کاٹ رہے تھے تب تمہاری پولیس اور تمہاری فوج کہاں تھی؟''

سردار پٹیل ہمارا دوست تھا۔ وہ کہتا تھا: ''یہ چور لٹیرے نہیں ہیں۔ یہ تو اپنے دیش سے محبت کرتے ہیں۔'' وہ صرف گاندھی اور نہرو کو خوش کرنے کے لیے ہمیں ''گمراہ'' کہا کرتا تھا۔

پولیس بھی ہماری دوست تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی؟ بیشتر سپاہی پنجاب سے آنے والے پناہ گیر تھے۔ وہ مسلمانوں کے حوالے سے صداقت کو جانتے تھے اور گاندھی اور نہرو کی بکواس پر یقین نہیں کرسکتے تھے۔

ایک روز سنگھ کے چیف نے مجھ سے کہا: ''ہمیں گاندھی کے خیالات سے لازماً آگاہ رہنا چاہیے۔ نمبر 840 تم اس بڈھے کی میٹنگوں میں شرکت کیا کرو اور اس کی باتوں اور وہاں آنے والوں کے بارے میں ہمیں اطلاع دیا کرو۔''

مجھے ایک سفید گاندھی کیپ' ایک موٹی کھدر کی قمیض اور پاجامہ اور اونی شال خریدنے کے لیے پیسے دیے گئے۔ میں نے صبح کے وقت برلا ہاؤس جانا شروع کردیا۔ میں میٹنگ میں آنے والوں کے نام نوٹ کرلیا کرتا تھا۔ میں وہ ساری ''بک بک'' نوٹ کرلیا کرتا تھا' جس میں بڈھا گاندھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا کرتا تھا۔

مجھے گاندھی کی آواز کی نقل کرنا آ گیا تھا۔ جب میں اس کی سنی ہوئی تقریر کی رپورٹ دیتا تو اسی کی سی پوپلی آواز میں گجراتی ہندی زبان بولتا تھا: ”میں اندر سے ہدایت ملنے کا انتظار کر رہا ہوں...... میں اندر کی آواز سننے کے لیے اپنا کان کھینچ رہا ہوں اور اس کے حکم کا انتظار کر رہا ہوں۔“ سب قہقہے لگانے لگتے۔ میں اس کی طرح ہاتھوں سے اشارے بھی کر سکتا تھا۔

میں آلتی پالتی مار کر اور چادر اوڑھ کر بیٹھ جاتا اور بولتا: ”میں ایک بھٹی میں ہوں۔ ہر طرف شعلے لپک رہے ہیں۔ ہم انسانیت کو پیروں تلے روند رہے ہیں...... میں روشنی کے لیے ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔“ اتنا کہہ کر میں ایک دیا سلائی جلاتا اور کہتا: ”لیکن میں صرف اس کی معمولی سی شعاعیں ہی پا سکتا ہوں۔“ میں دیا سلائی کو آنکھوں کے قریب لا کر کہتا: ”جب میں دلی کی دوستی کو مکمل طور پر دیکھوں گا تب یہ حقیقتاً دلی ہوگی۔“ سب ہنستے ہنستے دہرے ہو جاتے۔ لڑکوں نے میرا نام گاندھی جی مہاراج رکھ دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر بڈھا ہمارے سنگھ کا رکن ہوتا تو اس کا نمبر وہی ہوتا جو میرا تھا یعنی 840۔ جو کہ چار سو بیس کا دگنا ہوتا ہے اور پینل کوڈ کی دفعہ 420 فراڈ کے لیے ہے۔ اور گاندھی ڈبل فراڈ تھا۔

سنگھ کا چیف کہا کرتا تھا کہ ہم اپنی کمر کس لیں کیونکہ ہندوستان اور پاکستان میں جلد ہی جنگ چھڑنے والی ہے۔ ہم پاکستان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا دیں گے اور درۂ خیبر پر ہندو دھرم کا زعفرانی جھنڈا گاڑ دیں گے۔

ہمارا چیف درست کہتا تھا۔ پاکستانی قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ ہم روز انتظار کرتے کہ آج ہندوستان پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دے گا۔ تاہم گاندھی امن اور محبت کی باتیں کرتا رہا۔

گاندھی ہر پیر کے دن برت رکھا کرتا تھا۔ وہ اس روز کسی سے بات نہیں کیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ ہر ملاقاتی کے سامنے دانت نکالتا اور کاغذ کی چھوٹی

پرچیوں پر لکھ کر مکالمہ کرتا تھا۔

پیر کی صبح' جنوری 1948ء۔

سردی بہت تھی اور چونکہ اس روز بڈھے کا خاموش رہنے کا دن تھا' اس لیے میں برلا ہاؤس نہیں گیا اور رضائی لپیٹ کر گھر میں ہی پڑا رہا۔ سورج نکلا تو میں دھوپ میں آ بیٹھا۔ میں چائے کے ساتھ ایک باسی روٹی کھائی اور پھر برلا ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ بڈھا گاندھی دھوپ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کی سیکرٹری ڈاکٹر سوشیلا نائر اس کی کرسی کے قریب گھاس پر بیٹھی تھی۔

وہ کاغذوں پر لکھ لکھ کر اسے تھما رہا تھا۔ میں سوشیلا کو پسند کرتا تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا' بال گھنگھریالے تھے اور اس کے گالوں میں ڈمپل پڑتے تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہم بستری کروں۔ اس نے بڈھے کی تحریر پڑھی اور یوں اچھلی جیسے اس کے بڑے بڑے کولہوں پر بھڑ نے ڈنک مارا ہو۔ وہ بھاگی بھاگی گئی اور جو کچھ پڑھا تھا اپنے بھائی کو بتایا' اس کے بھائی نے وہ بات کسی شخص کو بتائی' اس شخص نے ایک اور شخص کو اور یوں ہر شخص کو اس بات کا پتا چل گیا۔ ایک اجلاس منعقد کیا گیا اور سوشیلا نے بڈھے کی طرف سے ایک بیان پڑھا۔ بڈھے نے کل سے تادم مرگ برت کا اعلان کیا تھا۔

میں زیادہ تو نہیں جانتا البتہ میں نے دو قسم کے برت کے بارے میں سنا ہے۔ ایک برت تو تب رکھا جاتا ہے' جب کوئی شخص موٹا ہو اور وہ اپنا وزن کم کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا برت تب رکھا جاتا ہے جب انسان نے کسی کے ساتھ کوئی برائی کی ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا ہے۔ بڈھا اس لیے برت رکھنا چاہتا تھا کہ ہم نے مسلمانوں کے ساتھ برائی کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ صرف اسی وقت برت ختم کرے گا جب بھگوان چاہے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں نے ٹیکسی لی اور ہیڈ کوارٹرز چلا گیا۔

وہ ریڈیو پر خبر سن چکے تھے۔ چیف نے کہا: ''بڈھے کو مر جانے دو۔ ہندو دھرم امٹ ہے۔ تاہم جو کچھ بھی ہو ہمیں صورتحال پر گہری نظر رکھنا ہوگی۔''

اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''تم برلا ہاؤس لازماً جایا کرو اور جو کچھ وہاں ہو اس کی اطلاع فوراً مجھے دیا کرو۔ جب ضروری ہو تو ٹیکسی لے لیا کرو۔'' (میں نے دل ہی دل میں کہا: ''تمہارا شکریہ! اس طرح چند دنوں تک چھ سات روپے تو بنیں گے۔'') چیف کہہ رہا تھا: ''ہمیں گاندھی کے چیلوں کے مقابلے میں مظاہرے کرنے ہوں گے۔''

میں برلا ہاؤس واپس چلا گیا۔

اس مرتبہ ہمیشہ سے زیادہ لوگ وہاں موجود تھے۔ باقاعدہ آنے والے اہم بنے پھر رہے تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار لوگ موجود تھے جن میں سفید فام اور کچھ حبشی بھی موجود تھے۔ اگرچہ پیر کا دن تھا' پھر بھی گاندھی بک بک کر رہا تھا۔ میں لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس کے قریب چلا گیا۔ بہت سے لوگ نوٹ بکس میں اس کی باتیں لکھ رہے تھے۔ بڈھے کو یہ احساس دلانے کے لیے بہت سے سوال کیے جا رہے تھے کہ وہ اس کے بارے میں کتنے متفکر ہیں۔

اس کا بیٹا دیوداس بھی وہاں موجود تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر الزام بازی کر رہے تھے۔ بیٹے نے کہا کہ اس کا باپ بانجھ ہے۔ باپ نے کہا کہ اس کے بیٹے کی سوچ بانجھ اور سطحی ہے۔ اس نے اسے کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔ صاف ظاہر تھا کہ باپ بیٹا ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ گاندھی اپنے تینوں بیٹوں کو ناپسند کرتا تھا۔

گاندھی اپنے برت کو بھگوان کی رضا قرار دے رہا تھا۔ اس نے متعدد لوگوں کے سامنے متعدد بار اس بات کو دہرایا۔ میں نے اس بات کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کی جائے۔ چنانچہ میں گھر جا کر سو گیا۔

اگلی صبح برلا ہاؤس کے ارد گرد ہمیشہ سے زیادہ پولیس والے اور فوجی موجود

تھے۔ اس کے علاوہ صحافی بھی ہمیشہ سے زیادہ تھے۔ نہرو، پٹیل، مولانا آزاد اور شیخ عبداللہ آف کشمیر بھی آئے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گاندھی کے حق میں جلوس نکالیں گے۔ میں نے ہیڈ کوارٹر جا کر رپورٹ دی اور واپس برلا ہاؤس آ گیا۔

برلا ہاؤس میں دن کے ساڑھے گیارہ بجے پوجا ہوئی۔ اس کا آغاز بڈھے کے (اور میرے) پسندیدہ مذہبی گیت سے ہوا:

جو دوسروں کا دکھ محسوس کرتا ہے
وہی حقیقتاً بھگوان کا بندہ ہوتا ہے

سوشیلا نے انگریزی میں کچھ گایا۔ مجھے اس کا سفید فام عورتوں کی ''ہو بہو'' کی نقل کرنا اچھا نہیں لگا۔ اس کے بعد ''ایشور اللہ'' والا نغمہ گایا گیا۔ پھر بڈھے نے مائیکروفون سنبھالا۔ اس نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ ان کے لیے برت رکھ رہا ہے۔ اس نے کشمیریوں سے کہا کہ وہ ان کے لیے برت رکھ رہا ہے۔ نیز اس نے بھگوان سے کہا کہ وہ اس لیے برت رکھ رہا ہے کہ بھگوان نے اسے برت رکھنے کا کہا تھا۔ اب وہ صرف لیموں اور سنترے کا رس پی رہا ہے۔

شام کو ہمارے چیف نے پناہ گیروں سے بھری تین بسیں برلا ہاؤس بھیج دیں۔ انہوں نے بسوں سے تھوڑی دور اتر کر جلوس نکالا اور ''خون کا بدلہ خون سے لیں گے'' کے نعرے لگاتے ہوئے برلا ہاؤس کی طرف بڑھنے لگے۔ نہرو نے ان کی طرف دیکھا لیکن چپ رہا۔ انہوں نے نعرہ لگایا: ''گاندھی بڈھا مردہ باد۔'' نہرو پر تو جیسے جن نے قبضہ کر لیا۔ وہ بازو لہراتا ہوا ان پر چڑھ دوڑا۔ اس نے کہا: ''گاندھی مردہ باد کہنے کی جرأت کس نے کی ہے؟ ذرا میرے سامنے تو یہ الفاظ دہراؤ۔ تمہیں یہ نعرہ لگانے سے پہلے مجھے قتل کرنا ہو گا۔'' اس نے غصے سے سب کو دیکھا، پھر اپنی لیموزین میں جا بیٹھا۔ لیموزین آگے بڑھی تو اس کے پیچھے مسلح پولیس والوں سے بھری ایک جیپ بھی تھی۔

میں چپکے سے گاندھی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ شال اوڑھے چارپائی پر لیٹا

تھا۔ صرف اس کا گنجا سر اور چہرا شال سے باہر تھا' جو ٹیبل لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا: "یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

سوشیلا نے کہا: "گاندھی مردہ باد" اور اپنے گال پر ڈھلک آنے والا آنسو پونچھا۔

گاندھی نے کہا: "رام' رام' رام" اور اپنا منہ شال سے ڈھانپ لیا۔

یوں ایک اور دن گزر گیا۔

اگلی صبح بڈھے کو چارپائی پر باہر لایا گیا تاکہ لوگ اس کا درشن کر سکیں۔ لوگوں نے نعرہ لگایا: "مہاتما گاندھی کی جے۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر دانت نکال دیے۔ کسی طور ایسا نہیں لگتا تھا کہ اس نے دو دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔

اب ہندوستان کی پوری حکومت برلا ہاؤس کے لان میں موجود تھی۔ پنڈت نہرو اور اس کے وزیر ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو 35 کروڑ روپے دینے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اسلحہ خرید سکے۔ انہوں نے جا کر گاندھی کو بتایا: "ہم نے وہی کیا ہے جو آپ چاہتے تھے۔ کیا اب آپ اپنا برت ختم کر دیں گے؟"

اس نے سر ہلایا اور بولا: "نہیں' ابھی نہیں۔ میں اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میرا واحد رہنما بھگوان ہے' جو ہر خطا سے پاک اور ہر جگہ موجود ہے۔"

☆☆☆

دریائے گنگا الٹے رخ بہنا شروع ہو چکا تھا۔ سمندر کی طرف سے اس کے پہاڑوں میں واقع سرچشمے کی طرف۔ میں رونما ہونے والے واقعات کو صرف اس طرح ہی بیان کر سکتا ہوں۔ تین دن پہلے ہم مسلمانوں کو دلی سے نکال رہے تھے اور ہر کوئی ہمارے ساتھ تھا۔ اب مسلمان دلی واپس آ رہے تھے اور ہر کوئی ہمارے خلاف لگ رہا تھا۔ مسلمانوں کی دکانوں کو لوٹنے والے برلا ہاؤس آ کر لوٹا ہوا مال واپس کر رہے تھے۔ مسلمان عورتوں کو اغوا کرنے والے انہیں برلا ہاؤس لے آئے اور ان سے التجائیں کر

رہے تھے کہ وہ گاندھی کے سامنے انہیں معاف کر دیں۔ مسلمانوں کا خون بہانے والوں نے اپنے خون سے درخواستیں لکھ کر پیش کیں کہ گاندھی اپنا برت ختم کر دے۔ ہر کوئی گاندھی کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ کسی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر رہنے والے ایک سفید فام بوڑھے نے بھی برت رکھا اور اعلان کیا کہ اگر گاندھی مر گیا تو وہ بھی مر جائے گا۔ انسان اس قسم کے پاگل پن کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟

چیف چاہتا تھا کہ میں ہر وقت برلا ہاؤس میں رہوں' کیونکہ کوئی بڑا واقعہ رونما ہونے والا تھا۔ اس نے مجھے اپنی رہائش گاہ کا فون نمبر دے دیا تھا تا کہ میں اسے رات کے وقت بھی فون کر سکوں۔

ان دنوں سورج غروب ہوتے ہی سخت سردی ہو جاتی تھی۔ میں برلا ہاؤس کے برآمدے میں ایک صوفے پر سو جاتا۔ میں نے پل اوور' کوٹ اور گرم جرابیں پہنی ہوتیں اور شال اوڑھی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود میں کانپتا رہتا اور سردی سے میرے دانت بجتے رہتے۔

بڈھا صبح ساڑھے تین بجے جاگتا تھا۔ آسمان تاریک اور تاروں بھرا ہوتا۔ بتیاں جلا دی جاتیں۔ خاموش مراقبے کے بعد مذہبی گیت گائے جاتے۔ پھر بڈھا اپنا کام شروع کر دیتا۔ میں دیکھتا کہ وہ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں میز پر سے خط اٹھا کر پڑھتا اور کچھ بولتا' جسے ایک شخص کاغذ پر لکھ دیتا۔ یہ سلسلہ چند گھنٹے جاری رہتا۔ پھر بڈھا بنگالی زبان کا سبق یاد کرتا۔ میں سوچتا کہ اگر وہ سچ مچ مرنے والا ہے تو ایک نئی زبان سیکھنے کی کیا تک ہے؟

اس دوران سورج طلوع ہو چکا ہوتا اور برآمدے میں دھوپ پھیل چکی ہوتی۔ میری کپکپاہٹ ختم ہو جاتی۔ میں تھوڑی دیر سونے کی کوشش کرتا۔ تاہم میرے اردگرد اتنا شور ہوتا کہ مجھے اٹھنا پڑتا۔ ڈاکٹر بڈھے کا معائنہ کرتے۔ وہ اسے سنترے کا رس پلاتے اور اپنے سر ہلاتے۔ بڈھا ہاتھ جوڑتا اور انہیں رخصت کر دیتا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ وہ

سب تماشا ہوتا تھا۔

بڈھا اپنا ڈاکٹر خود تھا۔ وہ نہ تو کوئی دوا لیتا تھا نہ انجکشن لگواتا تھا۔ وہ کہتا تھا: ''رام نام میرا فطری علاج ہے۔'' اس کے اس جملے کو درجن بھر منشی کاغذ پر لکھ لیتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ یہ ایک تماشا تھا۔

سارا دن مذہبی گیت' رامائن' گیتا' قرآن اور گرنتھ پڑھے جاتے رہے۔ سارا دن بے شمار لوگ اداسی سے منہ لٹکائے وہاں آتے رہے۔ نہرو روتا ہوا آیا۔ اس نے کہا اگر گاندھی مرا تو ہندوستان کی روح اس کے ساتھ ہی مر جائے گی۔ مولانا آزاد بھی روتا ہوا آیا۔ (دن میں اس نے ایک لاکھ افراد سے ایک گھنٹہ خطاب کیا' اسے اپنی آواز بہت پسند تھی)۔

شام کو لارڈ صاحب وائسرائے ماؤنٹ بیٹن' اس کی لیڈی صاحبہ اور مسی بابا برلا ہاؤس آئے۔ بڈھے نے انہیں برت کے حوالے سے لطیفے سنائے۔ پٹیالہ کا لمبا تڑنگا خوبصورت مہاراجا بھی اسے ملنے آیا۔ اس نے کہا کہ گاندھی نے ہزاروں مسلمانوں کو بچا لیا ہے۔ بڈھے نے اس پر یقین نہیں کیا۔ مالیر کوٹلہ کا نواب آیا تو اس نے گاندھی سے کہا کہ اس نے ایک سکھ یا ہندو کے قتل کے بدلے دس مسلمانوں کو قتل کرنے کی دھمکی دے کر ہزاروں سکھوں اور ہندوؤں کو بچا لیا ہے۔ گاندھی نے اس پر یقین کر لیا۔

دلی کا ہر شہری مسلمانوں سے محبت کرنے والا بن گیا تھا۔ ایک لاکھ افراد کا جلوس نعرے لگاتا برلا ہاؤس آیا:

ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی

بھارت میں ہیں بھائی بھائی

انہوں نے ''مہاتما گاندھی کی جے'' کے نعرے بھی لگائے۔ سب ہوٹل' کیفے' دکانیں بند تھیں۔ ایسا لگتا تھا اس روز چھٹی ہو۔ میں تو اسے دلی کی تاریخ کا سب سے بڑا تماشا کہتا ہوں۔

برت کے چھٹے دن بڈھے نے شکایت کی کہ وہ پیشاب نہیں کر سکتا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا: ''وہ جو تم نے اتنا سارا لیموں اور سنترے کا رس پیا ہے' اس کا کیا بنا؟''

وہ یوں بولتا ہے جیسے نیم خوابیدہ ہو۔ ریڈیو کہتا ہے کہ وہ مر رہا ہے۔ ہزاروں لوگ یوں اُمڈ آتے ہیں جیسے ان کے سگے باپ مر رہے ہوں۔ وہ اسے بتاتے ہیں کہ وہ اور ان کے ماں' باپ' بیویاں اور بچے بھی اس کے ساتھ برت رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مسلمان کے گھروں اور مسجدوں کو چھوڑ دیا ہے نیز پاکستان سے واپس آنے والے مسلمانوں کا خیر مقدم بھی کر رہے ہیں۔

وہ جہاں کہیں مسلمانوں کو دیکھتے تھے' انہیں ہار پہناتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ گلیوں میں جلوس نکالے۔ انہوں نے مسلمانوں کو زبردستی چائے اور سکنجبین پلائی اور مٹھائی کھلائی۔ انہوں نے امن کمیٹیاں بنائی تھیں۔ چیف نے کہا: اگر سب پاگل ہو گئے ہیں تو ہمیں بھی پاگل ہونے کی اداکاری کرنی چاہیے۔ آر ایس ایس نے امن کمیٹی میں اپنا نام لکھوا دیا۔ بڈھا لومڑ اسی بات کا انتظار کر رہا تھا۔ جونہی اس نے سنا کہ آر ایس ایس امن کمیٹی میں شامل ہو گئی ہے' وہ برت ختم کرنے پر راضی ہو گیا۔

وہ 18 جنوری اتوار کا دن تھا۔ سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ کی سالگرہ تھی۔ مسلمانوں نے اس کے باپ' اس کے بیٹوں' اس کے ہزاروں پیروکاروں کو ہلاک کرنے کے بعد اسے بھی قتل کر دیا تھا۔ ہم نے اس کی سالگرہ اس طرح منانے کے منصوبہ بنایا تھا کہ دلی سے باقی ماندہ مسلمانوں کو نکال دیا جائے۔ ہمارے چیف نے کہا تھا: ''ہم نے اس کام کا آغاز کیا تو سکھ یقیناً ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔'' تاہم جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ گنگا الٹے رخ بہہ رہی تھی۔ ہزاروں لوگ گردوارہ رکاب گنج میں موجود تھے۔

ایک سو بہتر سال پہلے مسلمانوں نے اسی جگہ گرو کے باپ کی چتا جلائی تھی۔ لیکن اس روز سینکڑوں مسلمانوں نے بھی سکھوں کی مقدس کتاب کو نذرانہ عقیدت پیش

کیا۔ بڈھے لومڑ نے کہا کہ آج ایک مبارک دن ہے اور چونکہ وہ جو کچھ چاہتا ہے' پا چکا ہے' اس لیے وہ اپنا برت ختم کر رہا ہے۔ دن بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر اس نے مولانا آزاد کے ہاتھ سے سنترے کے رس کا گلاس لے کر رام رام کہتے ہوئے پیا۔ منافق!

یوں جو کام ہم نے مہینوں میں کیا تھا' جو خون ہم نے بہایا تھا' اس پر بڈھے نے صرف چھ دنوں میں پانی پھیر دیا!

اس نے بڑی شان سے اپنی فتح کی خوشی منائی۔ نہرو دوڑا دوڑا اسے مبارک دینے آیا۔ گاندھی نے اسے کہا: ''جیتے رہو۔ تم ہندوستان کا جوہر ہو!'' اس نے انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کو فون کیا تاکہ وہ برت ختم کر دے کیونکہ جنگ جیتی جا چکی تھی۔ سہ پہر کے وقت برقعہ پوش مسلمان عورتیں آئیں۔ انہوں نے کہا: ''ہم آپ کو ساتھ ہی روزہ رکھے ہوئے تھیں۔''

بڈھے نے ہنستے ہوئے کہا: ''میں تمہارا باپو ہوں۔''

اس نے ہمارے زخموں پر مزید نمک چھڑکا۔ وہ یوں کہ اس نے ہندوؤں اور سکھوں سے کہا کہ وہ قرآن پڑھیں۔

سہ پہر کے وقت آسمان پر بادل چھا گئے اور مینہ برسنے لگا۔ آسمان میں رہنے والے دیوتا بھارت کی قسمت پر آنسو بہا رہے تھے۔

☆☆☆

مجھے نہیں معلوم پہلے یہ بات کس نے کی تھی تاہم سب لڑکے کہنے لگے تھے کہ دیوتا چاہتے ہیں کہ دھرم کو اس کے صحیح مرتبے پر بحال کرنے کے لیے انسانی قربانی دی جائے۔ چیف نے کہا کہ یہ اعزاز تو صرف اس کرم یوگی کے لیے مخصوص ہے' جو گیتا کے بقول کسی انعام کا لالچ کیے بغیر عمل کرے گا۔ تاہم دلی کے کسی لڑکے کو اس کام کے لیے موزوں تصور نہیں کیا گیا۔ ایک نے کوشش بھی کی تھی لیکن وہ ناکام ہو گیا۔

یہ گاندھی کے برت ختم کرنے کے دو دن بعد کا ذکر ہے۔ پوجا ختم ہو چکی تھی۔

بڈھا لومڑ معمول کے مطابق بک بک کر رہا تھا کہ سب سے محبت کرو ان سے بھی جو تم سے نفرت کرتے ہیں۔ اچانک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں نے خود سے کہا کہ ضرور یہ قریب سے گزرنے والی کسی کار کا بیک فائر ہوگا۔ تاہم وہاں دھواں پھیل گیا تھا اور گاندھی کے چیلے یوں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے جیسے ہنومان جی نے ان کی دموں کو آگ لگا دی ہو۔

گاندھی چیختا ہے: ''سنو! سب سنو! اگر ہم بلاوجہ یوں افراتفری مچائیں گے تو اگر حقیقتاً کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا حال ہوگا؟''

بڈھے کی بات پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ وہ تیزی سے بھاگ نکلے۔ میں بھی برلا ہاؤس سے نکلا۔ میں نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے فی الفور ہیڈ کوارٹر پہنچا دے۔ جب میں نے انہیں اس واقعے کی تفصیل سنائی تو چیف نے کہا: ''بس' یہی کچھ ہوا ہے؟''

وہ حکم دیتا ہے کہ دفتر میں موجود سارے کاغذات جلا دیئے جائیں۔ وہ مجھے برلا ہاؤس جانے اور بغیر بلائے وہاں سے نہ ہٹنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ فتح ہندو دھرم کی ہوگی۔''

☆☆☆

گاندھی ''اندر کی آواز'' کے حوالے سے بہت باتیں کرتا ہے۔ وہ یہ بھی اکثر کہتا ہے کہ بھگوان اسے سب کچھ بتاتا ہے۔ تاہم اسے دھماکے کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ پولیس نے مشق کی تھی۔ اصل میں تو ہمارے لڑکے مشقیں کر رہے تھے اور نشانہ خود بڈھا ہو سکتا تھا۔ دھماکہ ایک پنجابی پناہ گیر نے کیا تھا۔ اس کا نام مدن لال پاہوا تھا۔ پولیس نے اسے مسجد سے نکال دیا۔ وہ پاکستان سے آنے کے بعد سے اس مسجد میں رہ رہا تھا۔ پاہوا کے پاس دوسرا بم بھی تھا لیکن اسے پھینکنے سے پہلے ہی پولیس نے پاہوا کو پکڑ لیا تھا۔

اگلے روز گاندھی نے کہا کہ شاید پاہوا اسے (گاندھی کو) ہندو مت کا دشمن اور

خود کو اسے مارنے کے لیے بھگوان کا بھیجا ہوا نمائندہ سمجھتا ہو۔ اس نے پولیس سے کہا کہ وہ پاہوا کو ہراساں نہ کریں اور اس کی ''سوچ درست'' کریں۔ میں بڈھے سے کہنا چاہتا تھا کہ یہ ''شاید'' والا معاملہ نہیں ہے۔ وہ ہندوؤں کا دشمن نمبر ایک ہے۔

☆☆☆

گاندھی سب سے مختلف ہونا چاہتا تھا۔ 26 جنوری کو ہر شخص پریڈ دیکھنے گیا۔ گاندھی نے کہا کہ اسے پریڈیں پسند نہیں۔ وہ برلا ہاؤس میں رہا۔ میں اس دن چھٹی لے کر اپنے ماں باپ کو پریڈ دکھانے لے گیا۔ زبردست تماشا تھا وہ! ہزاروں فوجی سیکرٹریٹ کی طرف سے لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے آرہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے سینکڑوں ٹینک' توپیں اور آرمرڈ کاریں آرہی تھیں۔ انہوں نے نہرو کو سلامی دی۔ نہرو نے بھی انہیں سلیوٹ کی۔ ہوائی جہاز آسمان پر رنگین دھواں چھوڑتے ہوئے گزرے۔ پھر نہرو نے ہمیں بتایا کہ بھارت گاندھی کا دیش ہے' بھارت ٹینکوں' توپوں' آرمرڈ کاروں اور ہوائی جہازوں پر نہیں عدم تشدد پر یقین رکھتا ہے۔

گاندھی فوجی تماشے کو اس لیے پسند نہیں تھا کہ وہ اپنی طرز کا تماشا دکھاتا تھا۔ اس نے اگلے روز اعلان کیا کہ وہ مہرولی میں قطب مینار کے پاس واقع قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر جارہا ہے۔ اس روز بختیار کاکیؒ کا عرس تھا۔ آپؒ 600 سال پہلے ہندوستان آئے تھے۔

آپؒ نے بے شمار ہندوؤں کو مسلمان بنایا تھا۔ ملتان سے آنے والے ہندوؤں نے مہرولی سے مسلمانوں کو نکال دیا تھا اور خود وہاں رہنے لگے تھے۔ انہوں نے بختیار کاکیؒ کی قبر کے گرد بنی ہوئی سنگِ مرمر کی جالی توڑ دی تھی۔ تاہم جب انہوں نے سنا کہ گاندھی آرہا ہے تو وہ سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہو کر نعرے لگانے لگے۔ ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' اور انہوں نے مسلمانوں کو چائے پلا کر ان کی تواضع کی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا: ''حرامیو! تم نے یہ کیسے بھلا دیا کہ تمہاری

ماؤں کے ساتھ ملتان میں زنا کیا گیا تھا!''

گاندھی بختیار کاکیؒ کے مزار پر جا کر جھک گیا۔ مسلمانوں نے اسے کہا: ''آپ بھی فاتحہ پڑھیں۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بولا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

اس طرح وہ مسلمان ہوگیا تھا۔ کیا ایسا ہی نہیں ہے؟ اگر کوئی اسے قتل کر دیتا تو وہ ہندومت کے دشمنوں کی تعداد میں کمی کر دیتا۔

گاندھی نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ سنگِ مرمر کی جالی توڑنے پر ہندوؤں اور سکھوں کو معاف کر دیں۔ وہ انہیں کہتا ہے کہ اس نے ایک بہت اچھی خبر سنی ہے۔ پشاور کے نزدیک پاراچنار میں ایک سوتیں ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اچھی خبر اس لیے ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے ''غیر متشدد جرأت'' کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے کہا: ''شاباش!'' گاندھی کا ہمارا سب سے بڑا دشمن ہونے کا کوئی ثبوت چاہیے تمہیں؟

گجرات ریلوے سٹیشن پر ہونے والے ہندو مسلم فساد میں زندہ بچ نکلنے والے ایک شخص نے بڈھے سے کہا: ''تم بہت نقصان پہنچا چکے ہو۔ تم نے ہمیں بالکل برباد کر دیا ہے۔ اب تم فوراً ہماری جان چھوڑ دو اور ہمالیہ پر چلے جاؤ۔''

بڈھے نے کہا: ''میں کسی کے حکم پر اپنا کام ترک نہیں کر سکتا۔ میں صرف بھگوان کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔''

پناہ گیر نے کہا: ''بھگوان ہمارے ذریعے بول رہا ہے۔ ہم غم سے پاگل ہو گئے ہیں۔''

عظیم منافق نے کہا: ''مجھے تم سے کم غم نہیں ہے۔''

تم کسی ایسے شخص کی کھوپڑی میں عقل کس طرح ڈال سکتے ہیں، جو مسلسل یہ کہتا

ہو: ''میں ٹھیک ہوں' ہر شخص غلط ہے۔ مسلمان درست ہیں' ہندو اور سکھ غلط ہیں۔''

وہ جمعے کا دن' جنوری کی 30 تاریخ تھی۔ وہ دن' تاریخ' مہینہ اور سال (1948ء) میرے ذہن پر یوں نقش ہیں جیسے میرے دائیں بازو پر میرا نام نقش ہے۔

میں اس صوفے پر سویا ہوا تھا' جس پر کئی راتوں سے سو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سال کی سب سے سرد رات ہو۔ تین بجے بتیاں جلا دی گئیں۔ میں جاگ اٹھا۔ میں نے بازو گھمائے اور اوپر نیچے کودا تاکہ سردی میرے اعضا سے نکل جائے۔ میں نے برلا ہاؤس کے باہر جا کر خشک نالے میں رفع حاجت کی۔ میں نے باغ میں ایک نلکے سے نچلا دھڑ اور ہاتھ دھوئے۔ پھر ہاتھوں کو سردی سے بچانے کے لیے بغلوں میں دبا لیا۔ میں دیکھنے گیا کہ بڈھا کیا کر رہا ہے۔ میں نے اسے نمسکار کیا۔ اس نے عینک میں سے مجھے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ اس نے لیموں اور شہد ملے گرم پانی کا ایک گلاس پیا۔ اس کے بعد سنگترے کے رس کا ایک گلاس پیا۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کو وہ ایک سو چھبیس سال زندہ رہے گا۔ اسے بھگوان کی رضا کا بس اتنا ہی پتا تھا!

اس نے صبح کی پوجا کی۔ مذہبی گیت گائے گئے' مقدس کتابیں پڑھی گئیں اور مراقبہ ہوا۔ پھر سورج طلوع ہوتے ہی بے شمار لوگ آئے۔ معمول کے مطابق میلہ لگ گیا تھا۔ ہوتے ہوتے سہ پہر ہو گئی۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ سردار پٹیل اپنی بیٹی کے ساتھ آیا۔ دونوں کے چہروں پر درشتی طاری تھی۔ لڑکی کے چہرے سے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی مرد سے واقف ہی نہیں اور ہنسنا نہیں جانتی۔ وہ دونوں بڈھے کے ساتھ دیر تک کسی بات پر بحث کرتے رہے۔ گاندھی جو کبھی تاخیر نہیں کرتا تھا' دس منٹ تاخیر سے آیا۔

بڈھا سہ پہر کی نشست کے لیے باہر آیا تو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتا! اس نے دونوں بازو دو لڑکیوں کے کندھوں پر جو رکھے ہوئے تھے! دونوں لڑکیاں کم عمر اور حسین تھیں۔ وہ ان سے مذاق کر رہا تھا۔ اس کا مذاق بہت پست تھا۔

ایک لڑکی نے اسے گاجر دی تو وہ بولا: ''اچھا تو تم مجھے جانوروں کی خوراک دے رہی ہو۔'' سب ہنسنے لگے۔

اس نے اپنی دھوتی کی ڈب میں سے گھڑی نکالی۔ اس نے کہا: ''میں دس منٹ دیر سے آیا ہوں۔ مجھے دیر کرنا سخت ناپسند ہے۔ میں ٹھیک پانچ بجے پوجا کے لیے موجود ہونا پسند کرتا ہوں۔''

میں اس کے مزید قریب ہو گیا۔ میں اس کے قریب رہنا اس لیے پسند کرتا تھا کہ یوں میری تصویریں اخباروں میں چھپتی تھیں' جو میں اپنی ماں کو دکھایا کرتا تھا۔ لوگ اسے تعظیم دینے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا: ''بولو' بولو۔'' دوسروں نے کہا: ''مہاتما گاندھی کی جے۔'' بڈھے نے مسکرا کر نمسکار کیا۔

پھر سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے خود کو بھی یقین دلانا پڑا کہ وہ سب میں نے وقوع پذیر ہوتے دیکھا تھا۔ ایک مضبوط بدن والا نوجوان لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک لڑکی نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے اسے بھی ایک طرف دھکیل دیا اور گاندھی کے سامنے جھکا' جیسے اس کے پاؤں چھونا چاہتا ہو۔ اس نے جھکتے جھکتے اپنی دھوتی کی ڈب سے ریوالور نکالا اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھے اس نے بڈھے پر یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلائیں' ٹھاہ' ٹھاہ' ٹھاہ۔

گاندھی کے ہاتھ اس طرح جڑے رہ گئے جیسے وہ دنیا کو نمسکار کہہ رہا ہو۔ اس نے رام رام کہا۔ پھر وہ اپنے ہی خون کے تالاب میں گر گیا۔

مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے قاتل پر چھلانگ لگا کر اسے زمین پر گرا دیا۔ میں نے اس کے سر کے بال اکھیڑ دیے اور اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ میں اسے گالیاں دے رہا تھا: مادر...... 'کتے' حرامی' سور کی اولاد۔

ایک سپاہی نے مجھے گردن سے پکڑ کر دور دھکیل دیا اور اس آدمی کو پکڑ لیا۔ زبردست افراتفری پھیل گئی تھی۔ میں دوڑتے دوڑتے رونے لگا۔ کافی دور جا کر میں

ایک فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے ہائے ہائے کرنے لگا۔ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا: "بیٹا! تم کیوں رو رہے ہو؟"

میں نے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا اور کہا: "میرا باپو مر گیا ہے۔"

میں ان کی ہمدردی بھری آوازیں سنیں۔ ایک شخص بولا: "حوصلہ کرو۔ تمہیں اس دکھ کی گھڑی میں اپنی ماں کے پاس ہونا چاہیے۔ تمہیں اپنے باپو کے کام کو جاری رکھنا چاہیے۔"

پھر اس نے مزید سنجیدگی اپناتے ہوئے پوچھا: "تمہارا باپو کیسے مرا؟ کیا وہ بہت بیمار تھا؟"

"نہیں وہ بیمار نہیں تھا' اسے میں نے مارا ہے' اسے میں نے مارا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ماتھا پیٹا اور چیخنے لگا: "ہائے ہائے! میں نے اپنے باپو کو قتل کر دیا ہے۔"

❁❁❁

بھاگ متی

بدھ سنگھ گاندھی اور اس کے "دھوتی ٹوپی گینگ" سے بہت خفا ہوتا ہے۔ اس نے مہاتما کے پیروکاروں کو یہی خطاب دے رکھا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں۔ بدھ سنگھ چاہتا ہے کہ انگریز ہندوستان ہی میں رہیں۔ وہ "برٹش ری ٹینشن لیگ" قائم کر رہا ہے۔ اس نے برطانیہ کے بادشاہ کو اس کا سرپرست اعلیٰ بننے کی دعوت دی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے اعزازی خزانچی نامزد کیا ہے اور میرے اپارٹمنٹ کو بی آر ایل کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا ہے۔ وہ اقتدار کی بادشاہ سے "دھوتی ٹوپی والوں" کو منتقلی پر احتجاج کے اظہار کے لیے دس لاکھ ہندوستانیوں کے دستخط لینے کی مہم شروع کر چکا ہے۔

اب تک وہ صرف بھاگ متی کو قائل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ بھاگ متی لکھنا نہیں جانتی اس لیے اس نے دستخط کرنے کی بجائے انگوٹھا لگایا ہے۔ بدھ سنگھ اس کے انگوٹھے کے سامنے اس کا نام، جنس اور پیشہ لکھتا ہے:

نام: بھاگ متی

جنس: ہیجڑا

پیشہ: طوائف

وہ فخر کے ساتھ کاغذ مجھے دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں دوسرا دستخط کرنے والا شخص بن جاؤں۔ میں اس سے بحث کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہے اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں پاگل ہو چکا ہوں۔ چنانچہ میں اسے اس کی سوچ کے مطابق سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں: ''انگریز خود ہندوستان کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ کیا تم نے اخباروں میں نہیں پڑھا کہ وہ مسلمانوں کو ان کا ملک پاکستان دے دیں گے اور 15 راگست کو یہاں سے چلے جائیں گے۔''

وہ کہتا ہے: ''یہ سب بکواس ہے۔ یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن گاندھی کا چیلا ہے۔ میں اس کی شرانگیزی کی اطلاع بکنگھم پیلیس کو خط لکھ کر دوں گا۔''

''وہ بادشاہ کا رشتے دار ہے۔ اس کے بھتیجے کی شادی بادشاہ کی بیٹی سے ہوئی ہے۔''

''وہ غدار ہے۔''

''کیا تم نہیں چاہتے کہ ہندوستان آزاد ہو؟''

بدھ سنگھ نے اس مسئلے کے حوالے سے زیادہ سوچا نہیں ہے۔ وہ ڈاڑھی کے بالوں میں بڑبڑاتا ہے: ''کیا آزادی؟ کس کے لیے آزادی؟ لوٹ مار کے لیے' قتل و غارت کے لیے؟ ہر شخص آزادی کی بات کرتا ہے۔ جانتا کوئی نہیں کہ آزادی کا مطلب کیا ہے۔''

دروازے کی گھنٹی کی آواز مجھے بدھ سنگھ سے بچا لیتی ہے۔ ''مجھے اس پر غور کرنے کا موقعہ دو۔'' یہ کہہ کر میں دروازہ کھولنے چلا جاتا ہوں۔ وہ میرا دوست سکھ صحافی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ بدھ سنگھ میرے دوست کے سامنے بی آر ایل کے اغراض و مقاصد بیان کرے میں اسے نرمی سے باہر دھکیل دیتا ہوں اور کہتا ہوں: ''پھر کسی وقت

مجھے سوچنے کا وقت دو۔ انسان کو ایسے اہم معاملات پر جلدی میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

سکھ صحافی جوکر ہے۔ وہ مجھے ایک پرانا لطیفہ یوں سناتا ہے، جیسے وہ نیا ہو: جب رام، سیتا اور لکشمن چودہ سالہ جلاوطنی کاٹنے کے لیے ایودھیا سے نکل رہے تھے تو شہری انہیں الوداع کہنے آئے۔ شہر کے دروازے پر رام چندر جی نے ان سے کہا: "خواتین و حضرات اب آپ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔" شہریوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور واپس چلے گئے۔ جب چودہ سال بعد وہ ایودھیا واپس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ شہر کے دروازے کے باہر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ رام نے ان کے وہاں بیٹھے ہونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: "آپ نے ہمیں ہمارے گھروں کو لوٹنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ آپ نے تو صرف مردوں اور عورتوں کو واپس جانے کی اجازت دی تھی۔ ہم نہ مرد ہیں نہ عورتیں، ہم تو ہیجڑے ہیں۔" سری رام چندر جی ان کی وفاداری سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے کہا: "1947ء میں ہندوستان کی سلطنت تم ہیجڑوں کو ملے گی۔"

لطیفہ ختم کر کے وہ قہقہے لگانے لگتا ہے، ہا، ہا، ہا۔ میں بھی ہنسنے لگتا ہوں، ہی، ہی، ہی۔

ڈور بیل دوبارہ بجتی ہے۔ وہ بھاگ متی ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

"مجھے بھی لطیفہ سناؤ نا!"

میرا صحافی دوست گھڑی دیکھتے ہوئے کہتا ہے: "تم سنا دو، مجھے ٹھیک گیارہ بجے کافی ہاؤس پہنچنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپارٹمنٹ سے نکل جاتا ہے۔

بھاگ متی صوفے پر دھم سے بیٹھتی ہوئی پوچھتی ہے: "وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

بھلا میں اسے کیسے بتاتا؟

☆☆☆

بارشوں کے بعد دھند اور اوس والے مہینے آتے ہیں۔ مجھے ہر صبح ٹینس کھیلنے

جانے سے پہلے اپنی کار کی ونڈ سکرین پر سے اوس صاف کرنا پڑتی ہے۔ ڈسٹر اور کالک کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے۔

ایک صبح میں گھر واپس آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ بدھ سنگھ گھٹنوں میں سر دبائے اکڑوں بیٹھا ہے۔ وہ سر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں۔ وہ قاتلانہ انداز میں مجھے گھورتا ہے۔

میں ممکنہ حد تک نرم لہجے میں اس سے پوچھتا ہوں: "کیا بات ہے بدھ سنگھ؟"

وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھتا ہوا بڑبڑاتا ہے: "میری آنکھیں دکھنے آئی ہوئی ہیں۔"

"تو ڈاکٹر کو دکھاؤ نا۔"

وہ میرے مشورے پر کوئی توجہ نہیں دیتا ہے اور سر دوبارہ گھٹنوں میں دبا لیتا ہے۔

میں اپارٹمنٹ میں چلا جاتا ہوں۔ میرا باورچی قالین پر پڑا کراہ رہا ہوتا ہے۔

میں اس سے پوچھتا ہوں: "کیا بات ہے؟"

"میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ اس کا ہوم کلینک ساتھ والے بلاک میں ہے۔ وہ آتا ہے اور بدھ سنگھ پر ایک نظر ڈال کر کہتا ہے: "کنجنکٹی وائٹس۔ دلی میں ہر شخص کو یہ مرض لاحق ہو گیا ہے۔" وہ اس کے لیے ایک مرہم تجویز کرتا ہے۔

پھر وہ باورچی کا معائنہ کرتا ہے۔ وہ اسے منہ کھولنے اور "آ" کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ باورچی منہ کھول کر "آ" کرتا ہے۔

ڈاکٹر اس کے پپوٹے الٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے۔ وہ اس کے منہ میں تھرما میٹر رکھ دیتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا اسے الٹیاں یا دست تو نہیں آ رہے؟

باورچی کہتا ہے: "نہیں، میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

ڈاکٹر میری طرف رخ کر کے کہتا ہے: ''دلی میں ہیپاٹائٹس اور ہیضہ عام ہے لیکن اسے دونوں میں سے کوئی مرض نہیں ہے۔ اسے یا تو ملیریا ہے یا ڈینگو بخار یا شاید وائرس سے ہونے والا بخار ہے۔ دلی کا ہر شخص ان میں سے کسی ایک بخار کا شکار ہے۔ مجھے یقینی تشخیص کے لیے اس کے خون' پیشاب اور پاخانے کا ٹیسٹ لینا ہوگا۔''

وہ باورچی کے لیے درد کش اور میرے لیے ملیریا سے تحفظ کی گولیاں تجویز کرتا ہے۔ میں اسے ڈیڑھ سو روپے فیس ادا کرتا ہوں۔ میں کیمسٹ سے ادویات لا کر بدھ سنگھ اور باورچی کے حوالے کرتا ہوں۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ وہ اپنے کوارٹروں میں چلے جائیں۔

میں اپارٹمنٹ میں اکیلا ہوتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں اگر بھاگ متی آ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ ہم تھوڑا عمدہ کھجکی وائٹس اکٹھے بچا سکتے ہیں۔ شاید وہ کتیا پہلے ہی اپنے کسی گاہک کی وجہ سے ان میں سے کسی بیماری کا شکار ہو چکی ہے۔

ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد میں چائے میں جن سنگ ملا کر پیتا ہوں اور اخبارات لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پہلے میں ''دی ہندوستان ٹائمز'' اٹھاتا ہوں۔۔۔ جو دلی کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا بدترین اخبار ہے۔ میں صفحہ چار کھولتا ہوں' جو اموات کے اعلانات کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ دلی میں ہر موت بے وقت ہوتی ہے۔ جب دلی والوں کا وقت آتا ہے تو وہ صرف مرتے نہیں ہیں' وہ گیتا کی اس یقین دہانی کے ساتھ سورگ باشی ہوتے ہیں کہ موت لباس کی تبدیلی سے زیادہ کچھ نہیں ہے: ''جسم تو فنا ہو جاتا ہے لیکن روح نہیں' کیونکہ یہ لافانی ہوتی ہے۔'' چنانچہ اس امر کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کی ارضی باقیات کو نگم بودھ گھاٹ یا کسی اور شمشان گھاٹ میں جلا دیا جائے۔ روزانہ دلی کا ہر مردہ اپنے اگلے سفر پر جاتے ہوئے اچھا خاصا جنگل آگ کی نذر کرواتا ہے۔ برقی چتا سوز لکڑی کے مقابلے میں چتا جلانے کا کم معاوضہ لیتے ہیں لیکن ان کی خدمات صرف انگریزیت زدہ امیر حاصل کرتے ہیں یا لاوارث فقیروں کی

لاشیں یہاں جلائی جاتی ہیں۔ جمنا کے دائیں کنارے مجنوں کا ٹیلا پر واقع تبتی کالونی سے لے کر راج گھاٹ تک' کہ جہاں گاندھی کی چتا جلائی گئی تھی' وہار' مندر' شمشان گھاٹ' برقی چتا سوز اور نہرو' شاستری' چرن سنگھ' سنجے گاندھی' اندرا گاندھی اور اصل گاندھی بابائے قوم کی یادگاریں واقع ہیں۔ جمنا کا کنارہ عدم کی طرف سفر کا لانچنگ پیڈ بن چکا ہے۔

صفحہ چار کی طرف آتے ہیں۔ ایک باکس میں اطلاع دی گئی تھی کہ نگم بودھ جمنا میں سیلاب آنے کی وجہ سے بند ہے' لوگوں کو اپنے اعزہ کی چتائیں کسی اور جگہ لے جانی چاہئیں۔ شاید پہلی مرتبہ ایسا ہوگا کہ برقی چتا سوز منافع کمائیں گے۔

مجھے فراغت ہوتی ہے' اس لیے میں کافی ہاؤس جانے سے پہلے تھوڑی دیر گھومنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ میں پرانا قلعہ سے پہاڑی والی سڑک تک جاتا ہوں۔ میری بائیں طرف ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (ڈبلیو ایچ او) کا علاقائی ہیڈ کوارٹر اور دائیں طرف دلی میں بیماریاں پھیلنے کا سب سے بڑا سبب' فلٹریشن پلانٹ ہوتا ہے۔ اس کی چار چمنیاں دن رات دھواں چھوڑتی رہتی ہیں اور ڈبلیو ایچ او کے بروشرز کے لیے ماحولیاتی آلودگی کی بہترین تصویریں مہیا کرتی ہیں۔ یہ چمنیاں دلی پر کالک برساتی رہتی ہیں۔ اس کا فلٹر شدہ پانی دلی والوں کو ہیپاٹائٹس' ہیضہ' اسہال اور آنتوں کی دوسری بیماریاں دیتا ہے۔ میں اوور برج سے دیکھتا ہوں کہ جمنا کا گدلا پانی پرانے آہنی پل کی نچلی سڑک تک آچکا ہے گاندھی کی سمادھی سے آگے لہریں مار رہا ہے۔ پل کے قریب والے راؤنڈ اباؤٹ پر پولیس نے رکاوٹ کھڑی کی ہوتی ہے۔ پل پر گاڑیوں کی آمدورفت بند ہوتی ہے۔ میں کار کو گھما کر برقی چتا سوز کی طرف لے جاتا ہوں۔ صفائی کرنے والا عملہ سڑک اور ہال کی صفائی میں مصروف ہوتا ہے۔ چتا سوز میں پہلے سے وقت لینے والوں کی لائی ہوئی چتائیں جلائی جارہی ہوتی ہیں جبکہ تین فقیروں کی لاشوں کو ریڑھیوں پر لاد کر بعد میں جلانے کے لیے عمارت کے عقب میں بھجوایا جارہا ہوتا ہے۔

دفتر میں بیٹھا ہوا کلرک کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے پوچھتا ہے:

''کیا لاش پہنچ گئی ہے؟ صبح کے وقت تین لاشوں کے لیے بکنگ ہوئی تھی۔ میں نے ایک گھنٹہ پہلے انہیں جلوا دیا ہے۔''

میں اسے بتاتا ہوں کہ میں کوئی سوگوار نہیں بلکہ محض ایک ''تماش بین'' ہوں۔ وہ مجھ پر گندی سی نظر ڈالتا ہے اور تلخ لہجے میں کہتا ہے: ''اگر تمہیں اس قسم کے تماشے پسند ہیں تو میری جگہ کلرک بن جاؤ۔''

میں بروقت چتا سوز سے نکل آتا ہوں۔ سامنے سے پھولوں سے لدی ایک چتا آ رہی ہوتی ہے' جس کے پیچھے کاروں کی ایک لمبی قطار ہوتی ہے' جن پر فوجی نشانات بنے ہوتے ہیں۔ بوڑھے فوجی بھی مرتے ہیں۔

کافی ہاؤس میں بہت رونق ہوتی ہے۔ میرے صحافی دوست اور ہمارے سیاسی مشیر نے اس طرح اخباروں سے منہ ڈھانپے ہوتے ہیں جیسے ان میں بات چیت بند ہو۔ میں ان کے پاس بیٹھتا ہوں تو وہ اخبار رکھ دیتے ہیں: ''سناؤ بھئی! اتنے دن کہاں رہے تم؟''

میں انہیں بتاتا ہوں کہ میرے کتنے دوست' رشتے دار اور ملازم بخار اور کنجھکتی وائٹس کا شکار ہیں۔

سکھ صحافی کہتا ہے: ''تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایڈز نہیں ہوئی۔ تم ان غیر ملکی اندام نہانیوں کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے ہو' تمہیں دلی میں سب سے پہلے ایڈز ہونی چاہیے تھی۔''

میں کہتا ہوں: ''ایڈز تم جیسے ہم جنس پرستوں کو ہوتی ہے۔ سیدھے جنسی عمل سے کسی کو کچھ نہیں ہوتا۔''

سیاست دان ہمیں ڈانٹتا ہے: ''تمہارے ذہنوں میں جنس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ یہاں دلی میں لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں اور تم ہو کہ ہم جنس پرستی اور غیر ملکی عورتوں سے زنا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتے۔ کیا تمہیں اپنے شہر کے مستقبل کی

ذرا سی بھی فکر نہیں ہے؟"

ہم دونوں ایک ساتھ جواب دیتے ہیں: "نہیں۔" پھر میں کہتا ہوں: "جہاں تک میرا تعلق ہے تو دلی جائے جہنم میں۔ یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں میں پروان چڑھا تھا اور جس سے میں محبت کرتا تھا۔ 1947ء میں حملہ آور ہونے والے تم پنجابیوں نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے؟"

وہ مجھے ہدایت کرتا ہے: "سنجیدگی اپناؤ۔ 1947ء میں دلی آنے کے علاوہ ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو دوسرے لوگ دلی میں روزانہ آ رہے ہیں' وہی مسائل کو جنم دے رہے ہیں۔ کیا تمہیں پتا ہے ہر سال پورے ہندوستان سے ستر ہزار افراد دلی آتے ہیں؟ گویا دلی قومی یتیم خانہ ہے! وہ گھر' سکول' ہسپتال کہاں ڈھونڈیں؟ تمہیں پتا ہے 13 لاکھ دلی والے کھلی فضا میں رفع حاجت کرتے ہیں کیونکہ ان کے لیے لیٹرینیں نہیں ہیں!"

صحافی تجویز دیتا ہے: "تم ہفتے میں ایک بار رفع حاجت کرنے کی تحریک چلاؤ۔ میں اس کی خبر وائر سروس پر جاری کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

سیاستدان اٹھتے ہوئے کہتا ہے: "تم جیسے لوگوں سے بات کرنا بیکار ہے۔ قیمتی وقت کا ضیاع۔ میری بات یاد رکھنا' دلی مر رہا ہے۔ اس میں جتنے زیادہ تم جیسے لوگ آئیں گے' یہ اتنی جلدی مر جائے گا۔ میری اس پیشگوئی کے معاوضے میں تم میری کافی کے پیسے ادا کر دینا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل جاتا ہے۔

☆☆☆

زندگی میری توقع سے زیادہ تیزی سے گزر گئی۔ کب مجھے بھاگ متی دوپہر کے وقت دھوپ میں سڑک پر پڑی ملی تھی؟ میں نے اس کے ساتھ کتنی مرتبہ ہم بستری کی تھی؟ لاتعداد مرتبہ۔ اس دوران جہاں وہ اپنے پیشے میں مصروف رہی' وہیں میں نے

ایسے ایسے ملکوں کی بے شمار عورتوں کے ساتھ ہمبستری کی' جن کے نام صرف اقوامِ متحدہ کے سیکرٹریٹ کو معلوم تھے۔ آج مجھے ان میں سے صرف چند ایک نام اور چہرے یاد ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا تھا' اس پر شرمسار نہیں' تاہم اب میں مزید کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بھاگ متی نے اپنے لیے میری تشنگی میں کمی کو محسوس نہیں کیا۔ اب وہ کبھی کبھار آنے لگی ہے۔ پہلے وہ دو تین ماہ بعد اس وقت میرے پاس آتی جب اسے پیسوں کی ضرورت ہوتی۔ پھر گزشتہ تین چار سال سے اس نے صرف دیوالی پر آنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے ہیجڑے خاوند یا جنس کی باتیں کرنا بھی چھوڑ دیا (شاید وہ مر گیا ہے)۔ اب وہ رام جی اور ان ہندو مندروں اور مسلم درگاہوں کی باتیں کرتی ہے' جن میں وہ ہو کر آئی ہوتی ہے۔ (میرے ساتھ کئی سال کے جنسی تعلق کے باوجود اس نے کبھی سکھ مت میں زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔ شاید وہ کبھی کسی گردوارے میں گئی بھی نہیں تھی)۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کا باقی ماندہ عرصہ گنگا کے کنارے ہردوار یا بنارس میں گزارنا چاہتی ہے۔ کبھی کبھار وہ حج (یا عمرہ) پر جانے کی بات بھی کرتی ہے۔

وہ کہتی ہے: "کاش میں خود کو دلی کی گلیوں اور بازاروں سے الگ کر سکتی۔ میرا خیال ہے میں دلی ہی میں مروں گی۔" کبھی وہ کہتی ہے: "مجھے امید ہے آپ میری راکھ لے جا کر گنگا میں بہائیں گے۔" کبھی کہتی ہے: "حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے قریب میری قبر کے لیے دو گز زمین خرید لیں۔"

میں اسے کہتا ہوں کہ یہ یقینی بات ہے میں اس سے پہلے جاؤں گا اور اسے میری لاش جمنا میں پھینکنا ہو گی۔

ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی موت کے کئی ماہ بعد اس بات کا پتا چلے گا۔

بدھ سنگھ بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ عورتوں سے چھیڑ خانی کرنے والے واقعے کے بعد سے اس پر میلنکولیا طاری ہو گیا تھا۔ میں اسے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے

مینٹل وارڈ میں لے جاتا ہوں۔ ڈاکٹر اسے بجلی کے جھٹکے لگاتا ہے' جن سے وہ بہت پریشان ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کی مجھے دی گئی اس تجویز پر زیادہ پریشان ہوتا ہے کہ میں اسے آگرہ یا رانچی میں کسی پاگل خانے میں داخل کروا دوں۔ بدھ سنگھ پر جارحیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بہن کی گالی دے کر اسے مارنے کو لپکتا ہے۔ میں اسے روکتا ہوں تو ضرب مجھے لگتی ہے۔

وہ میرے اپارٹمنٹ کے سامنے بیٹھا رہتا ہے اور جب میں کہیں جاتا ہوں یا واپس آتا ہوں تو میری طرف دیکھتے ہوئے غراتا ہے۔ اس نے میرے اپارٹمنٹ کے عقب میں واقع گردوارے کے بھائی کو اپنا دوست بنا لیا ہے اور دونوں نے مجھے اذیت دینے کے لیے کئی طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ بھائی صبح چار سپیکروں کا رخ میرے گھر کی طرف کر کے بلند ترین آواز میں گرنتھ پڑھنے لگتا ہے۔ جب میں اس سے شکایت کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں۔ ایک مرتبہ میں نے پولیس سے اس کے خلاف شکایت کی تو اس نے سب انسپکٹر سے کہا کہ یہ سنگت (مذہبی اجتماع) کی خواہش ہے اور مجھے اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی سنگت صرف بدھ سنگھ تھا اور ہے۔ جب سب انسپکٹر چلا گیا تو بھائی نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے آئندہ پولیس سے اس کی شکایت کی تو وہ مجھے ٹھیک کرنے کے لیے سنت بھنڈرانوالہ کے چیلوں کو بلا لے گا۔ بدھ سنگھ نے نعرہ لگایا: ''سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ زندہ باد!''

میرا خانساماں اپنی سالانہ تعطیل پر چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ مجھے اپنے کام خود کرنے پڑتے ہیں۔ تنہا رہنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا میں سمجھتا تھا۔ میں چائے بناتا ہوں' انڈے ابالتا ہوں اور سینڈوچ بنا کر کھاتا ہوں۔ بھائی کا لاؤڈ سپیکر مجھے صبح چار بجے جگا دیتا ہے۔ میں چائے کا مگ تیار کر کے سٹڈی میں چلا جاتا ہوں' بھائی کی کرخت آواز میرے پیچھے نہیں آ سکتی۔ ساڑھے چار بجے میں بی بی سی سے خبریں سنتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے ہندی میں بائبل سوسائٹی کی سروس یا گولڈن ٹیمپل امرتسر سے صبح کی پوجا میں

سے انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ میں گولڈن ٹیمپل کا انتخاب اس وجہ سے کرتا ہوں کہ میں صبح کے مذہبی نغموں سے مانوس ہوں۔ شاید دبی ہوئی مذہبیت سر اٹھا رہی ہے۔ چونکہ "حق" سے آمنا سامنا ہونے کا وقت نزدیک آ رہا ہے تو شاید میں عظیم گرو سے صلح کر لوں۔

جب کچھ اجالا ہوتا ہے تو میں سیر کرنے لودھی گارڈنز چلا جاتا ہوں۔ یہاں سیر کو آنے والے بیشتر لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ کچھ سے میری سلام دعا ہے۔ میں اپارٹمنٹ واپس آ کر اپنے لیے چائے کا ایک اور مگ تیار کرتا ہوں اور دو سینڈوچ بناتا ہوں۔ صفائی کرنے والی عورت فرشوں کو صاف کر رہی ہوتی ہے تو میں اخبارات پڑھتا ہوں۔

پھر مجھے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا کرنا ہے۔ میں اپنی پرانی کار کو دن میں دو میل سے زیادہ چلانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تاہم مجھے اس کی بیٹری کو درست حالت میں رکھنے کے لیے اسے تھوڑا بہت چلانا ہوتا تھا۔ کبھی کبھار میں کار میں کافی ہاؤس چلا جاتا ہوں۔ مجھے لوگوں کو یہ کہتے سننا اچھا نہیں لگتا: "یہ بوڑھا یہاں چالیس سال سے آ رہا ہے۔" میں سہ پہر کا وقت انڈیا انٹرنیشنل سینٹر لائبریری میں گزارتا ہوں، جس کی لائف ممبر شپ میں نے اپنے خوش حالی کے زمانے میں لے لی تھی۔ کبھی کبھار کوئی مجھے چائے پینے کی دعوت دیتا ہے۔ وہاں ہمیشہ کوئی لیکچر، سینما شو یا رقص کا مظاہرہ ہوتا ہے، جس کو میں مفت دیکھ سکتا ہوں۔ لمبی شامیں یوں گزر جاتی ہیں۔

اپارٹمنٹ واپس جاتے ہوئے میں خان مارکیٹ سے چاپ سوائے یا سیخ کباب خریدتا ہوں۔ مجھے جس واحد شے کی حقیقتاً چاہت ہے، وہ وسکی ہے (اب تو ہندوستانی)۔ میں وسکی کی چسکیاں بھرتے ہوئے مہدی حسن یا اقبال بانو یا فریدہ خانم کی غزلوں کی پرانی کیسٹیں سنتا رہتا ہوں۔ مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آتی ہے۔ مجھے ڈراؤنے خواب ستاتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں اگر میں بیمار پڑ گیا تو کیا ہوگا؟ کوئی ایک شخص بھی تو ایسا نہیں

ہے جو میری دیکھ بھال کرے۔ ایسا خوب ہو گا کہ ایک شب میں سوؤں اور اگلی صبح کرنے والی لڑکی مجھے بستر میں مرا ہوا پائے۔ وہ میرے فلیٹ سے جو کچھ لے جانا چاہے گی' لے جائے گی۔ وہ ٹرانزسٹر ریڈیو' کیسٹ پلیئرز' گھڑیاں' کلاک' بال پوائنٹ پین اور نقد رقم اٹھا کر اپنے گھر لے جا کر چھپا دے گی اور پھر واپس آ کر چیخنے لگے گی کہ "بڈھا مر گیا ہے' کچھ کرو۔" اگر کوئی ڈاکو میرے فلیٹ میں گھس کر مجھے قتل کر دے تو یہ زیادہ اچھا ہو گا۔ اس طرح بہت سے لوگ مشکلات سے بچ جائیں گے۔ میں بھی ہسپتال میں بستر حاصل کرنے اور ڈاکٹروں کے بل ادا کرنے سے بچ جاؤں گا۔

دن گزرتے رہتے ہیں۔ میں نیم خوابیدگی کی حالت میں بستر سے نکل کر گھسٹتا ہوا سٹڈی میں چلا جاتا ہوں۔ ایک صبح میری ٹھوکر لگنے سے وہ سٹول گر جاتا ہے' جس پر بجلی کی کیتلی رکھی ہوتی ہے۔ میری خوش قسمتی کہ ابلتے ہوئے پانی کے صرف چند قطرے میرے پیروں پر گرتے ہیں۔ بعض اوقات میں گولڈن ٹیمپل سے کیرتن سنتے سنتے اونگھنے لگتا ہوں۔ مجھے اس سے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔ جس دن سے یہ بھنڈرانوالہ گولڈن ٹیمپل کے احاطے سے ہندوؤں کے خلاف نفرت بھری باتیں کرنے لگا ہے' یوں لگتا ہے جیسے کیرتن میں سے کچھ چلا گیا ہے۔ بھائی اور بدھ سنگھ اسے عظیم مذہبی انسان قرار دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ شیطان ہے۔

یکم جون 1984ء کو گولڈن ٹیمپل سے صبح کی نشریات میں کچھ گڑبڑ ہوتی ہے۔ مجھے یقین نہیں ہوتا کہ وہ آوازیں طبلے کے انتہائی قریب سے بجنے کی ہوتی ہیں یا کسی اور شے کی ہوتی ہیں۔ طبلے کی تھاپ گولیوں کی آواز جیسی لگتی ہے۔ اخبارات بتاتے ہیں فوج کو حکم دیا گیا ہے کہ بھنڈرانوالہ کو زندہ یا مردہ گرفتار کر لیا جائے۔ شاید اسے ہتھیار ڈالنے کے لیے خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔ مسز گاندھی سکھوں کو یقین دلاتی رہی ہے کہ وہ فوج کو ٹیمپل میں گھسنے کا حکم کبھی نہیں دے گی۔ دانا عورت! وہ جانتی ہے کہ ٹیمپل پر حملہ ہوا تو وہ میدان جنگ میں بدل جائے گا۔ کوئی سکھ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

میں اخبارات غور سے پڑھتا ہوں اور صبح کی نشریات کو زیادہ توجہ سے سنتا ہوں۔ تین جون کو ٹیمپل تعمیر کروانے والے کا یومِ شہادت ہے۔ ہزاروں زائرین مقدس تالاب میں نہانے کے لیے دورافتادہ بستیوں سے وہاں آئے ہوئے ہیں۔

میں کیرتن کے پیچھے ان کی آوازیں اور نیند سے اٹھنے والے بچوں کے رونے کی صدائیں سنتا ہوں۔ ان کی مائیں انہیں چپ کروانے کے لیے ان کے منہ میں چھاتیاں ڈال دیتی ہیں۔ کیرتن کے دوران ''واہ گرو'' کی زوردار آوازیں آتی ہیں۔ ان میں عورتوں کی آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ احمق لوگ! بھنڈرانوالہ کے آدمیوں کی ٹیمپل میں موجودگی اور فوج کی فائرنگ کے دوران یہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں؟ شہر میں کرفیو نافذ ہے پنجاب کو فوج کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ وہ باقی دنیا سے کٹ چکا ہے۔ پانچ جون کی صبح مجھے کیرتن سے زیادہ واضح طور پر بندوقوں سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اگلی صبح خاموشی ہوتی ہے۔ اخبارات کی سرخیاں فاتحانہ ہوتی ہیں: ''فوجی ٹینکوں نے بھنڈرانوالہ کے قلعے کو تباہ کر دیا۔'' بی بی سی کہتی ہے بھنڈرانوالہ سمیت ایک ہزار سے زیادہ افراد مارے گئے۔ شیر خوار بچوں کو گود میں دبوچے عورتوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں مقدس تالاب میں تیر رہی ہوتی ہیں۔ اندرا گاندھی نے ایسا احمقانہ اقدام کیوں کیا؟

مجھ پر گہری اداسی طاری ہو جاتی ہے۔ میں بار بار خود سے پوچھتا ہوں: ''کیا میں سکھ ہوں؟'' بلاشبہ میں نہ تو بھنڈرانوالہ جیسا ہوں نہ گردوارے والے بھائی جیسا۔ بھنڈرانوالہ بدھ سنگھ سے زیادہ پاگل تھا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں آخری بار کب کسی گردوارے میں گیا تھا۔ میں نے پچاس برس سے پوجا نہیں کی ہے۔

چھ جون کی صبح میں اپنے اپارٹمنٹ کے عقب میں واقع گردوارے جاتا ہوں۔ وہاں بہت سارے سکھ ہوتے ہیں۔ کئی لوگ رو رہے ہوتے ہیں۔ انہیں روتا دیکھ کر میرے بھی آنسو بہنے لگتے ہیں۔ میں انہیں میں سے ہوں نا! کیرتن کے بعد بھائی

ایک مختصر مگر شعلہ فشاں تقریر کرتا ہے:

''ہم سکھ نہ کبھی بھولتے ہیں نہ معاف کرتے ہیں۔ یاد ہے ہم نے افغانوں اور مسار نگھڑ کے ساتھ کیا کیا تھا؟ ہم نے ان کی مسجدوں کی بے حرمتی کی تھی اور مسا کا سر تن سے جدا کر دیا تھا۔ گرو کا کوئی فرزند ان شیطانوں کے ساتھ ایسا ہی کرے گا۔ تم دیکھتے رہو۔''

میں اس کی تقریر سن کر سوچتا ہوں کہ یہ سکھ بڑے شیخی خور ہوتے ہیں! وہ ماضی میں رہتے ہیں اور یہ سمجھنے کی زحمت نہیں کرتے کہ کسی مہذب معاشرے میں رہتے ہوئے تم مسجدوں کی بے حرمتی نہیں کرتے یا لوگوں کے سر تن سے جدا نہیں کرتے ہو۔

بھائی اور بیشتر سکھ کالے رنگ کی پگڑیاں باندھنا شروع کر دیتے ہیں۔ چند دن بعد میں بھی اپنی دو پگڑیوں کو کالے رنگ میں رنگوا لیتا ہوں۔ ہاں میں انہی میں سے ہوں!

بدھ سنگھ زیادہ غصیلا ہو جاتا ہے۔ جب بھی کوئی ہندو میرے اپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرتا ہے' وہ زوردار نعرہ لگاتا ہے: ''سنت بھنڈرانوالہ زندہ باد!''

وہ اس پر ہنستے ہیں۔ اگر وہ ان کی ہنسی پر توجہ نہ دیتا تو وہ اسے چھیڑتے:

''اوئے بھنڈرانوالہ کی اولاد! ذرا پھر سے نعرہ لگاؤ!''

موسم گرما اس طرح گزر جاتا ہے اور تیز بارشوں اور بادلوں کا موسم آ جاتا ہے' جسے ہم ساون کہتے ہیں۔ ستمبر کے بعد اکتوبر آ جاتا ہے اور میلوں ٹھیلوں والا خزاں کا موسم آ جاتا ہے۔

☆☆☆

وہ اکتوبر کا آخری دن ہوتا ہے۔ مجھ پر افسردگی سی طاری ہوتی ہے۔ اس کی کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی۔ مجھے نیند بھی ٹھیک طرح سے آئی تھی۔ رفع حاجت کے دوران میں نے لمبے لمبے پاد مارے تھے۔ میرے خصیے لٹک گئے تھے۔ ستر سال کی عمر میں ایسا

ہونا غیر متوقع نہیں ہوتا۔ گرم گرم جن سنگ کا ایک مگ اور آنتیں یوں صاف جیسے کسی توپ کی نالی اندر سے صاف ہوتی ہے۔ خبریں دوسرے دنوں سے زیادہ بری نہیں ہوتی ہیں۔ موسم بہتر ہو گیا ہے ــــ نہ زیادہ گرم نہ زیادہ ٹھنڈا۔ کھڑکیوں کے قریب اگی مدھومالتی پوری بہار پر ہوتی ہے۔ لان میں کی پھلواریاں گلابی اور سفید کلیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ صبح سویرے شبنم کے قطرے دھوپ میں ہیروں کی طرح چمکتے ہیں۔ اللہ مجھے یہ یقین دلانے کے لیے اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ آسمانوں میں موجود ہے اور اپنی تخلیق پر خوش ہے؟

میری طبیعت بحال نہیں ہوتی۔ میں اخباروں کی سرخیاں پڑھ کر انہیں فرش پر پھینک دیتا ہوں۔ میں ایک موڑھے پر ٹانگیں رکھ کر اونگھنے لگتا ہوں۔ مجھے خواب میں بھاگ متی دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ وہ اب مجھ سے بہت کم ملنے آتی ہے' اس لیے مجھے اس کے خواب اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم نے پچھلے دس سال سے جنسی عمل نہیں کیا تھا' لیکن وہ اب بھی خوابوں میں مجھے شہوت انگیز دکھائی دیتی ہے۔ میں اچانک جاگ اٹھتا ہوں۔ دروازے کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہوتی ہے اور کوئی اسے مسلسل تھپتھپا رہا ہوتا ہے۔ بھاگ متی؟ میں دوڑتا ہوا جاتا ہوں اور دروازہ کھولتا ہوں۔

وہ بدھ سنگھ ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے ہمیشہ سے زیادہ پاگل پن جھلک رہا ہوتا ہے۔ وہ نتھنے پھُلائے ہوتا ہے۔ وہ منہ میرے چہرے کے قریب لا کر' میرے منہ پر تھوک کے چھینٹے گراتے ہوئے چیخ کر کہتا ہے: ''اندرا گاندھی کو گولی مار دی گئی ہے! سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ زندہ باد!''

بدھ سنگھ کو برداشت کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ میں دروازہ بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ ایک پاؤں دروازے میں اڑا دیتا ہے اور مجھے دروازہ بند کرنے نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے: ''آپ کا خیال ہے بدھ سنگھ پاگل ہے؟ آپ کا خیال ہے بدھ سنگھ جھوٹ بول رہا ہے؟ تو ریڈیو بی بی سی سنئے۔'' وہ گھومتا ہے اور مارچ کرتا ہوا نعرے

لگاتا چلا جاتا ہے: ”خالصتان زندہ باد! اندرا گاندھی مردہ باد! سنت بھنڈرانوالہ امر رہے!“

میں ریڈیو چلاتا ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں سے فلمی گانے' کاشتکاروں اور دیش کے جوانوں کے لیے پروگرام خوشی خوشی نشر کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے بعد بی بی سی لگاتا ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ اندرا گاندھی کو اس کے سکھ باڈی گارڈوں نے گولی ماردی تھی اور اسے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ لے جایا جا چکا تھا۔ صدر ذیل سنگھ اور اندرا کے بیٹے راجیو گاندھی کے دلی واپس آنے سے پہلے اس کی حالت کے حوالے سے کوئی سرکاری بیان نہیں دیا جائے گا۔ اندرا گاندھی کے کمزور سے جسم پر سٹین گن اور پستول سے فائر کیے گئے ہیں۔ اس کا بچنا مشکل ہے' وغیرہ وغیرہ۔

میں سر ہاتھوں میں تھام کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا ہوتا۔ میں بک شیلفوں سے چھت کی طرف اور چھت سے بک شیلفوں کی طرف اندھوں کی طرح تکتا ہوں۔ دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجتی ہے۔ میں دبے قدموں دروازے تک جا کر جوڈاز ہول سے باہر جھانکتا ہوں۔ وہ بدھ سنگھ نہیں بلکہ پڑوس والے گردوارے کا بھائی ہوتا ہے۔ میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔ اس نے ایک طشت اٹھایا ہوتا ہے۔ وہ اس میں سے مٹھی بھر حلوہ نکالتے ہوئے کہتا ہے: ”پرشاد' گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی کا بدلہ لے لیا گیا ہے۔ سکھ پنتھ نے فتح پالی ہے۔ اندرا کتی مرگئی ہے۔“

میں کچھ بولے بغیر دھڑ سے دروازہ بند کر دیتا ہوں اور جا کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک کمزور سی چھوٹی سی عورت کے قتل کا جشن! سکھ اتنے پست کیوں ہو گئے ہیں؟ اس احمق عورت نے تو اپنی غلطی مان لی تھی۔ اس نے گولڈن ٹیمپل جا کر کہا تھا: ”میرے سکھ بھائیو اور بہنو! میں شرمندہ ہوں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔“ انہیں اسے معاف کر دینا چاہیے تھا۔ تاہم اس نے ایک گمراہ مذہبی پیشوا اور اس

کے مسلح غنڈوں کے گروہ کو انجام تک پہنچانے کے لیے فوج کو ایک ہزار معصوم زائرین کو قتل کرنے کی اجازت دے دی تھی' جن میں بوڑھے' عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ سکھوں کے لیے انتہائی مقدس اکال تخت کو تباہ کر دیا گیا۔ فوج کو نقدی اور اشیا لوٹنے اور نوادرات کو جلانے دیا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ چوہے کو مارنے کے لیے پورا گھر مسمار کر دیا گیا۔ ایک جرم کے بعد دوسرا جرم۔ ایک جھوٹ کے بعد زیادہ بڑا جھوٹ۔ ان غلطیوں اور دروغ بیانیوں کی قیمت ساری قوم چکاتی ہے۔

میں اپنے ٹرانزسسٹر پر آل انڈیا ریڈیو' بی بی سی' وائس آف امریکہ' ریڈیو جرمنی اور ریڈیو ماسکو سنتا ہوں۔ اے آئی آر کہتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ بی بی سی اور وائس آف امریکہ کہتے ہیں وہ مر چکی ہے۔ ماسکو دلی کی خبر دہرا دیتا ہے۔ کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ لان کے سامنے ایک فرد بھی نظر نہیں آتا۔ گردوارہ کے سامنے والی سڑک پر بھی کوئی فرد نظر نہیں آتا۔ چند بسیں معمول کے خلاف ہارن بجائے بغیر گزرتی ہیں' کچھ سائیکل سوار ہینڈل پر یوں جھکے ہوئے گھروں کی طرف تیزی سے جاتے دکھائی دیتے' جیسے سامنے سے تیز ہوا ٹکرا رہی ہو۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوتا ہے۔

سائے لمبے ہو جاتے ہیں۔ اخبار فروش لڑکا میرے دروازے کے نیچے سے ''دی ایوننگ نیوز'' کا تازہ شمارہ اندر دھکیل دیتا ہے۔ سرخی ہوتی ہے: ''اندرا گاندھی کو اس کے سکھ محافظوں نے گولی مار دی۔'' خبر کی تفصیل میں بتایا گیا ہوتا ہے کہ محافظوں میں سے ایک کو ہلاک کر دیا گیا تھا' دوسرا شدید زخمی تھا۔ آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں سرجنوں کی ٹیم اندرا کے جسم سے گولیاں نکالنے اور خون لگا کر اسے بچانے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ باسی خبریں۔ اس وقت تک بیشتر غیر ملکی ریڈیو سٹیشن کہہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ آپریشن ٹیبل پر مر گئی ہے۔ اب کیا ہوگا؟

گھنٹی بجتی ہے۔ پھر دروازے کو تھپتھپایا جاتا ہے۔ میں جوڈاز ہول سے جھانکتا ہوں۔ وہ کوئی موٹی سی بوڑھی عورت ہوتی ہے' جسے میں ہال وے کی مدھم روشنی میں

پہچان نہیں پاتا۔ وہ دروازے پر مکا مارتی ہے۔ میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔ وہ بھاگ متی ہوتی ہے۔ اس نے اپنے بالوں کو مہندی سے رنگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ پوپلی ہوتی ہے' اس کی ٹھوڑی پر بال اگ آئے ہوتے ہیں۔ کیا یہ وہی بھاگ متی ہے' جس کے ساتھ میں کئی شہوت بھرے برس گزار چکا ہوں؟

وہ پوپلے منہ سے کہتی ہے: "ہائے لام' ہائے لام!" پھر وہ کان پکڑ کر اور پیلی پیلی زبان باہر نکال کر کہتی ہے: "توبہ' توبہ' میں نے جو کچھ دیکھا ہے' بھگوان کسی کو ایسا منظر نہ دکھائے۔ وہ سڑک پر نظر آنے والے ہر سکھ کو قتل کر رہے ہیں' ان کی ٹیکسیوں' ٹرکوں اور سکوٹروں کو جلا رہے ہیں۔ کناٹ پیلس میں آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ سکھوں کی دکانوں' دفتروں اور ہوٹلوں کو لوٹ رہے ہیں۔ اور آپ یہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ وہ آئیں اور آپ کو قتل کر دیں! ہیں؟ میں آپ کو لال کنواں لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ کوئی شخص ایک ہیجڑے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ چلیں۔"

میں دروازہ کھول کر اسے اندر آنے دیتا ہوں اور کہتا ہوں: "صبر کرو' اگر وہ ہر سکھ کو دیکھتے ہی قتل کر رہے ہیں' تو ہم لال کنواں کیسے پہنچیں گے؟ بہتر یہی ہے کہ جو جہاں ہے وہیں رہے۔ پولیس کا فرض ہے کہ وہ انہیں بروقت روکے۔"

وہ حقارت سے کہتی ہے: "پولیس' وہ بہن ...... تو بلوائیوں کے ساتھ ہے۔ انہوں نے بلوائیوں کو کہا ہے' ہم تمہیں شہر سے سکھوں کا صفایا کرنے کے لیے 36 گھنٹے دے رہے ہیں۔"

وہ صوفے پر بیٹھ کر منہ ڈھانپ لیتی ہے اور سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ اب اس کو دلاسا دینے کی میری باری ہوتی ہے۔ میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں: "یہ ایک مہذب ملک ہے۔ یہاں اتنا برا نہیں ہو سکتا ہے۔"

وہ آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے اور کہتی ہے: "کیا آپ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں؟ چلیے چھت پر اور دیکھیے۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر صوفے سے اٹھتی ہے۔ ہم اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کی چار منزلوں سے گزرتے ہوئے چھت پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہ شمال میں کناٹ سرکس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آسمان پر روشنی ہوتی ہے: الیکٹرک لائٹس کی نہیں بلکہ شعلوں کی۔ میں شہر کے مختلف حصوں سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دیکھ سکتا ہوں۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ بہت سی سڑکوں پر آگ لگی ہوتی ہے اور دھواں اٹھ رہا ہوتا ہے۔ بھاگ متی مجھے جتاتی ہے کہ یہ سکھوں کی ٹیکسیاں اور ٹرک جل رہے ہیں۔ شام کی ہوا کے دوش پر ہجوم کی چنگھاڑ سنائی دے رہی ہوتی ہے: ''اندرا گاندھی زندہ باد۔ سکھ ہتیاروں کو ختم کرو۔''

ایک ہجوم میرے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ بھاگ متی گھبرا کر چیختی ہے: ''چلو، چلو۔ میں جلدی جلدی آپ کے سر اور ڈاڑھی کے بال کاٹ دیتی ہوں۔ پھر ہم بحفاظت نکل جائیں گے۔ وہ صرف آپ کی کتابوں کو جلا سکتے ہیں۔ دلی والوں کے لیے یہ بیکار ہیں۔''

میں اسے ڈانٹ دیتا ہوں: ''احمق مت بنو۔ میرے سر اور ڈاڑھی کے بال کوئی نہیں کاٹے گا۔''

میں اس کے ساتھ تاریک زینے اترتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ میں چلا جاتا ہوں۔ میرے پاس اتنی مہلت نہیں ہوتی کہ اپنی نیم پلیٹ کے پیچ کھول سکوں۔ میں لوہے کی ایک سلاخ سے پلیٹ کو اکھاڑ دیتا ہوں۔ پلیٹ دو ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ ''کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ یہاں کون رہتا ہے۔''

وہ غصے سے کہتی ہے: ''آپ ایک احمق سکھ ہیں۔ وہ آپ کے ہمسایوں سے پوچھ لیں گے۔ جیسا میں کہتی ہوں ویسا کریں۔ مجھے اپنے سر اور ڈاڑھی کے بال کاٹنے دیں۔ پھر ہم کسی ہوٹل میں یا کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔''

میں بھی دہاڑ کر کہتا ہوں: ''نہیں۔ وہ جو کر سکتے ہیں کر لیں۔ مرنے سے پہلے میں بھی ان میں سے دو ایک کو تو مار ہی دوں گا۔''

''اور میں۔تم احمق ہو بڈھے بیوقوف! تمہیں کبھی عقل نہیں آئے گی۔''

میں کبھی بھاگ متی کی گالیاں سننے کا عادی نہیں رہا ہوتا۔ میرا غصہ بڑھ جاتا ہے۔ اسی اثنا میں ہجوم کے میرے باغ کے عقب میں نعرے لگانے کی آوازیں سن کر ہمارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ ہم تاریک باغ میں چلے جاتے ہیں اور پودوں کے پیچھے چھپ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ پچاس کے قریب نوجوان ہوتے ہیں' جو آہنی سلاخوں سے مسلح ہوتے ہیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں پٹرول کے کنستر ہوتے ہیں۔ وہ گردوارے کا گھیراؤ کر لیتے ہیں۔ کچھ نوجوان اندر چلے جاتے ہیں۔ وہ بھائی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آتے ہیں اور اسے مکوں اور آہنی سلاخوں سے پیٹتے ہیں۔ وہ چیختا ہے: ''بچاؤ! بچاؤ! پولیس!'' بلوائی بھی چیخ کر کہتے ہیں: ''بھنڈرانوالہ کے بچے! بلا اسے' وہ تجھے بچائے گا۔''

وہ گرنتھ' اس کے چھتر' قالینوں اور دریوں کو نکال کر سڑک پر ڈھیر کر دیتے ہیں اور اس پر پٹرول چھڑک دیتے ہیں۔ ایک بلوائی ماچس جلا کر اس پر پھینکتا ہے تو ڈھیر میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ بھائی کے کیس (بال) اس کے خون آلود چہرے پر بکھرے ہوتے ہیں۔ وہ التجا کرتا ہے: ''تم میرے ساتھ جو چاہو کر لو' لیکن گرنتھ کی بے حرمتی مت کرو۔ رب دا واسطہ!''

کوئی چیخ کر کہتا ہے: ''اس حرامی کو بھی اس کی گرنتھ کے ساتھ جلا دو۔'' وہ اس کے سر اور ڈاڑھی پر پٹرول انڈیل دیتے ہیں اور اسے جلتے ہوئے ڈھیر پر دھکیل دیتے ہیں۔ اسے آگ لگ جاتی ہے۔ ذرا سی دیر میں وہ مر جاتا ہے۔ اس کی لاش جلتی رہتی ہے۔ وہ فاتحانہ نعرہ لگاتے ہیں: ''اندرا گاندھی امر رہے!''

میرے گھٹنے جواب دے جاتے ہیں اور میں گیلی گھاس پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میرا پیشاب نکل جاتا ہے۔ بھاگ متی میرے پاس بیٹھ کر میری کمر سہلانے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے سہارا دے کر اٹھاتی ہے اور میرے کان میں سرگوشی کرتی ہے: ''اس سے پہلے کہ انہیں ہماری موجودگی کا علم ہو' ہمیں اندر چلے جانا چاہیے۔''

میں وہیں کھڑا رہتا ہوں اور پتوں میں سے دیکھتا رہتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک بلوائی اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذ سے کچھ پڑھتا ہے۔ وہ سکھ مکینکوں کے گیراجوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بلوائی ان کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ وہ گیراجوں کے باہر مرمت کے لیے کھڑی کاروں کو آگ لگا دیتے ہیں اور گیراجوں کے دروازے توڑ دیتے ہیں۔ لوگ بالکونیوں سے انہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ کوئی التجا کرتا ہے: ''یہ کاریں تو ہندوؤں کی ہیں۔ سکھ مکینک بھاگ گئے ہیں۔ اگر تم گیراجوں کو آگ لگاؤ گے تو ساری عمارت کو آگ لگ جائے گی۔ یہاں صرف ہندو، مسلم اور عیسائی رہتے ہیں۔ تم ٹیکسی سٹینڈ کیوں نہیں جاتے؟''

بلوائی مان جاتے ہیں۔ وہ بھائی کی لاش کو جلتا چھوڑ کر ٹیکسی سٹینڈ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مجھے گالیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور مزاحمت کر رہے ہوتے ہیں۔ میں باغ کے دوسرے کونے کی طرف جاتا ہوں۔ بھاگ متی میرے بازو سے لپٹی مجھ سے التجائیں کر رہی ہوتی ہے کہ میں اندر کمرے میں چلا جاؤں۔

چھ غیر مسلم ٹیکسی ڈرائیور ایک مسلح ہجوم کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں۔ بلوائیوں کی تعداد اب دو سو سے زیادہ ہو چکی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دینے کے بعد وہ ایک دوسرے کو پتھر مارتے ہیں۔ مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ اس غیر مساوی جنگ کو دور کھڑے دیکھتا رہتا ہے۔ بلوائی پتھراؤ کر کے ٹیکسی کے شیشے توڑ دیتے ہیں۔ تاہم ڈرائیوروں نے انہیں ابھی تک نزدیک آنے سے روکا ہوتا ہے۔ ایک فائر ہوتا ہے اور ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنی ٹیکسی کے قریب گر جاتا ہے۔ باقی پانچوں سرپٹ بھاگ نکلتے ہیں۔ مسلح پولیس والے ٹیکسیوں کو گھیر کر ان میں سے بڑے ریڈیو اور کیسٹ پلیئر نکال لیتے ہیں۔ پھر وہ بلوائیوں کو ٹیکسیوں کو آگ لگانے دیتے ہیں۔ پولیس والے بلوائیوں کو سکھوں کی دکانوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ وہ میرے اپارٹمنٹ سے دور چلے گئے ہوتے ہیں۔ بھاگ متی ٹراؤزر تبدیل کرنے کا کہتی ہے۔ مجھے شرم محسوس ہونے لگتی

ہے۔ میں ٹراؤزر بدل لیتا ہوں۔ ہم کمرے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ بھاگ متی خاموش بیٹھی خالی خالی نگاہوں سے دیوار کو تکتی رہتی ہے۔ میں ایمرجنسی کے لیے رکھی ہوئی ایک سکاچ کی بوتل نکالتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں: ''مشکل وقت کی بہترین ساتھی۔''

وہ کہتی ہے: ''اور تمہاری اس بوڑھی کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی لیکن آج مجھے زہر دے دو یا شراب۔''

میں گلاس میں کافی ساری شراب انڈیل کر اس کو میٹھا کرنے کے لیے اس میں کیپا کولا ملا کر بھاگ متی کو دیتا ہوں۔ وہ شراب کو یوں پی جاتی ہے' جیسے وہ لسی ہو۔ اس کا جھریوں بھرا' پوپلا چہرا دمکنے لگتا ہے۔ وہ کہتی ہے: ''مجھے اور دو۔''

''اتنی تیزی مت دکھاؤ۔ تم بیمار ہو جاؤ گی۔''

میں دوسرا اور پھر تیسرا جام پیتا ہوں۔ وہ خالی گلاس ہلاتے ہوئے مجھے شکوہ بھری نگاہوں سے تکتی رہتی ہے۔ میں اپنے لیے چوتھا جام بھرتا ہوں اور اسے پہلے کی نسبت چھوٹا جام بنا کر دیتا ہوں: ''ایک دم نہ پینا۔ معزز عورتوں کی طرح پینا سیکھو۔''

وہ کہتی ہے: ''معزز عورتیں...... تمہارے پاگل سکھ کا کیا ہوا؟ کیا نام تھا اس کا؟ بدھو یا شاید ایسا ہی کوئی نام تھا۔''

''بدھ سنگھ۔ وہ آج صبح تو یہیں پاگلوں کی طرح پھر رہا تھا۔ اگر وہ ان بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اس کا سیخ کباب بنا دیں گے۔ اگر وہ ادھر آیا تو ہمیں اسے کمرے میں بند کر دینا ہوگا۔''

میں ایک پلیٹ میں چیز کریکر رکھ کر اس کے سامنے رکھتا ہوں: ''گھر میں یہی کچھ ہے۔'' وہ ایک کریکر اٹھا کر کہتی ہے: ''میں لکڑی کا بسکٹ کیسے کھا سکتی ہوں؟ میرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔'' وہ ایک کریکر کو شراب میں ڈبو دیتی ہے' جب وہ بھیگ کر نرم ہو جاتا ہے تو اسے کھاتی ہے۔ وہ یہ فکر کیے بغیر کہ میرے لیے کچھ بچا ہے یا نہیں' سارا پیکٹ کھا جاتی ہے۔ بہرکیف مجھے بھوک بالکل بھی نہیں ہوتی۔ میں اسے کہتا ہوں کہ وہ

میرے بستر پر سو جائے' جبکہ میں صوفے پر سو جاؤں گا۔ وہ میری پیشکش قبول کر کے خواب گاہ میں چلی جاتی ہے۔ چند منٹ بعد مجھے اس کے ڈکار مارنے' خراٹے لینے اور پاد مارنے کی آوازیں آتی ہیں۔

میں ریڈیو پر غیر ملکی سٹیشن سنتا ہوں۔ سب ریڈیو اندرا گاندھی کے اپنے سکھ محافظوں کے ہاتھوں قتل ہو جانے کی خبر تفصیل سے نشر کرتے ہیں۔ صرف ریڈیو پاکستان خبر دیتا ہے کہ دلی میں سینکڑوں سکھوں کو قتل کر دیا اور سینکڑوں گردواروں کو جلا دیا گیا ہے۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ میں ریسیور اٹھاتا ہوں۔ فون کرنے والا میرا نام لے کر پوچھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں میں ہی فون سن رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے: ''خونی! حرامی! تم نے اپنی ماں کو قتل کر دیا ہے۔'' میں بھی چیخ کر کہتا ہوں: ''تم خود خونی' مادر...... حرامی! تم نے ہی اپنے باپو گاندھی کو قتل کیا تھا۔ کون ہو تم بک بک کرنے والے؟''

فون بند ہو جاتا ہے۔ گالیاں میرے ذہن کو منتشر کر دیتی ہیں۔ فون کی گھنٹی دوبارہ بجتی ہے۔ اس مرتبہ کوئی بڑی ملائمت سے کہتا ہے: ''ٹونٹی سے آنے والا پانی مت پینا۔ سکھوں نے پانی میں زہر ملا دیا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ فون بند کر دیتا ہے۔

چند منٹ بعد فون کی گھنٹی پھر بجتی ہے۔ ''پنجاب سے سکھوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے ہندوؤں کی لاشوں سے بھری ٹرینیں دلی پہنچ رہی ہیں۔ ہندو اس قتل و غارت کا بدلہ ضرور لیں گے۔'' اس مرتبہ بھی میرے کچھ بولنے سے پہلے ریسیور رکھ دیا جاتا ہے۔

میں بیٹھ کر فون کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ تاہم اب یوں لگتا ہے جیسے فون خراب ہو گیا ہو' دیر تک کوئی فون نہیں آتا۔ آدھی رات کو ہنگامہ مچ جاتا ہے۔ نعروں' چیخوں اور لوگوں کے اِدھر سے اُدھر بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

سب جاگ جاتے ہیں۔ ٹرک میں لد کر بے شمار لوگ پہنچ گئے ہوتے ہیں۔ وہ درجن بھر مزید کاروں کو جلا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنی کھڑکیوں سے جھانکتے رہتے ہیں۔ رائفلوں سے مسلح پولیس والے وہاں تھوڑی دیر کے لیے رکتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تھکن مجھ پر حاوی ہو جاتی ہے اور میں کرسی میں ہی اونگھنے لگتا ہوں۔ مجھے گردوارے کی طرف سے چیخنے چلانے کی آوازیں جگا دیتی ہیں۔ میں اٹھ کر باغ کی طرف دوڑتا ہوں تاکہ دیکھ سکوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ابھی صبح طلوع ہی ہوئی ہوتی ہے لیکن ہر شخص اپنی کھڑکیوں میں بالکونیوں میں موجود ہوتا ہے اور گردوارے کی طرف دیکھ رہا ہوتا ہے۔ بھاگ متی چیختی ہوئی آتی ہے: ''اندر چلو' اندر چلو۔'' میں اس کی بات نہیں مانتا اور پودوں کی اوٹ سے باہر کا منظر دیکھتا رہتا ہوں۔

مجھے گرنتھ اور بھائی کی سلگتی ہوئی لاش کے پاس بدھ سنگھ نظر آتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ میں کرپان پکڑے کسی رقصاں درویش کی طرح چکرا رہا ہوتا ہے۔ آہنی سلاخوں سے مسلح نوجوانوں نے اسے گھیرا ہوتا ہے۔ بدھ سنگھ انہیں گالیاں دے رہا ہوتا ہے: ''تم بہن ......' تم مادر......' گرو تمہاری نسل ختم کر دے' تم نے ہماری مقدس کتاب کو جلایا ہے۔ گرو تمہارے ویدوں اور شاستروں کو جلا دے!''

نوجوان بلوائی اس کے ساتھ بلی چوہے والا کھیل رہے ہوتے ہیں۔ وہ باری باری آہنی سلاخیں بدھ سنگھ کی کمر میں چبھوتے ہیں۔ آخر بڈھا سنگھ تھک جاتا ہے۔ وہ اتنے زیادہ لوگوں کے ساتھ لڑ نہیں سکتا۔ جونہی وہ دم لینے کے لیے رکتا ہے' آہنی سلاخ کی ضرب اس کے کندھے پر پڑتی ہے اور وہ گر جاتا ہے۔ کرپان اس کے ہاتھ سے گر جاتی ہے۔ ایک بلوائی کرپان اٹھا لیتا ہے اور اس کی نوک اس کے کولہوں میں چبھوتا ہے۔ دو بلوائی اس پر کود پڑتے ہیں اور اس کے ہاتھ اس کی کمر پر باندھ دیتے ہیں۔ ایک بلوائی قینچی نکال کر بدھ سنگھ کی ڈاڑھی کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ بدھ سنگھ اس

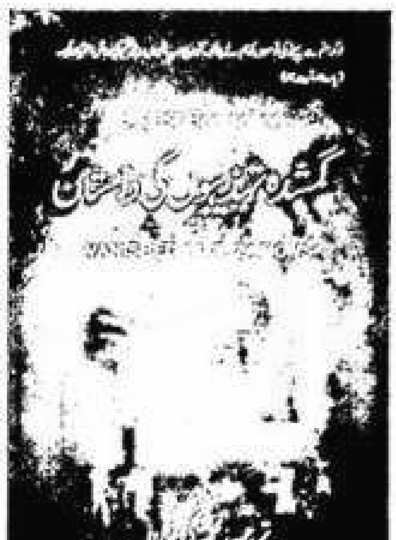
کے چہرے پر تھوک دیتا ہے۔ بلوائی اس کے چہرے پر تھپڑ مارتا ہے اور اس کے لمبے لمبے کیس پکڑ کر ایک گچھا کاٹ دیتا ہے۔ وہ مذاق کر چکے ہوتے ہیں۔ اب وہ سنجیدہ کام کی طرف آتے ہیں۔ ایک لڑکا ایک کار کے ٹائر اندرونی خالی حصے میں پیٹرول بھر کر اسے آگ لگا دیتا ہے۔ وہ ایک آتشیں ہار ہوتا ہے۔ دو لڑکے اسے بدھ سنگھ کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ بدھ سنگھ زمین پر گر جاتا ہے۔ وہ اذیت سے چیخ رہا ہوتا ہے۔ لڑکے ہنستے ہیں اور سکھوں کا فتح کا نعرہ لگاتے ہیں: ''بولے سونہال! ست سری اکال!''

❀❀❀









ISBN-976-969-23173-0-6

THE SOURCE OF KNOWLEDGE

نگارشات پبلشرز

میاں چیمبرز 3 ٹمپل روڈ، لاہور۔ پاکستان

+92-42-36303438

nigarshat@yahoo.com

& nigarshat publishers